جامعہ

مکتبہ جامعہ دہلی

جامعہ

(مدیر اداری) نور الحسن ہاشمی ایم۔اے

جلد ۳۶ - نمبر ۱ | بابتہ ماہ جنوری سنہ ۱۹۴۲ء | چندہ سالانہ صہ فی پرچہ آٹھ آنہ

فہرست مضامین

(پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکسن) محبوب المطابع دہلی)

مکتبہ جامعہ

مکتبہ جامعہ دہلی

کو

دارالمصنفین اعظم گڈھ، دارالترجمہ حیدرآباد، ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد، دائرہ حمیدیہ سرائے میر اعظم گڈھ، ندوۃ المصنفین اور دوسرے مشہور اداروں کی مطبوعات کی ایجنسی حاصل ہے اس لیے مکتبہ سے ہر موضوع کی کتابیں اصلی قیمت پر حاصل کی جاسکتی ہیں۔

اگر آپ اردو کی تازہ ترین مطبوعات کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں تو **اردو اکادمی** کی ممبری قبول فرمایئے اور قواعد و ضوابط ایک کارڈ لکھ کر مفت طلب فرمایئے۔

سنہ ۱۹۴۱ء

بعض قوموں کا خیال ہے کہ تہذیب کی ترقی کے ساتھ ہر ایسے برے کام کی تنظیم بھی ہونا چاہیے چنانچہ دروغ اور فریب، خلوص اور ریاکاری، رعایت اور زبردستی، دوستی اور دغابازی ہر صورت کے لیے پروگرام جانتی ہیں، اور جنگ کا نقشہ تیار ہو جاتا ہے تو صلح کی گفتگو شروع کرتی ہیں۔ یہ طریقہ مہذب لوگوں کو بہت ناگوار معلوم ہوتا ہے اس لیے ایسے اعتراضات کرنے اور الزام لگانے کا ایک پروگرام بھی بنایا جاتا ہے جو ہر کارروائی کو حق بجانب ثابت کرتا ہے۔ اخلاق کو انسان کے کاموں میں کوئی دخل نہیں ہوتا اور زندگی کی ہر موجودہ صورت اصولاً اچھی بری مان لی جاتی کہ اسے بگاڑنے کا حق ہر شخص یا ہر جماعت کو دیا جا سکتا تو پروگرام کی حیثیت پروگرام تولیت یا تنقید کی جا سکتی لیکن انسان کو بہت سی چیزیں عزیز ہوتی ہیں جنھیں چھوڑنے پر آمادہ نہیں کیا جا سکتا اور اسے یہ سوچ کر ذرا بھی تسلی نہیں ہوتی کہ ان کو مٹانے کا ایک مکمل پروگرام بن گیا ہے۔ دوسری طرف یہ بھی کوئی نہ کہے گا جو صورت حال اچھی اور مفید ہو اسے قائم رکھنے کا کوئی انتظام اور اگر وہ خطرے میں ہو تو اس کی حفاظت کی مناسب تدبیریں نہ کرنا چاہییں۔

جرمنی کا پروگرام | جرمنی نے دنیا کو فتح کرنے کا مقصد سامنے رکھ کر سیاست اور جنگ کا ایک مفصل پروگرام بنایا ہے۔ اس کا پہلا حصہ یہ تھا کہ یورپ کی جرمن آبادی کو جرمن ریاست کے ماتحت لایا جائے اور اس سلسلے میں مخالف قوتوں کو آزمایا جائے دوسرا حصہ یا دائرہ عمل یہ تھا کہ یورپ پر تسلط حاصل کیا جائے تیسرا دائرہ عمل دنیا کے ان حصوں پر قبضہ کرنا تھا جو یورپ پر تسلط قائم رکھنے کے لیے ضروری ہوں پروگرام کے ان حصوں پر عمل کرنے کی کوشش کی جا چکی ہے لیکن ان میں حسب منشا کامیابی ہوئے پر ایک اور زیادہ وسیع پروگرام مرتب ہوگا جس کا مقصد یہ ہوگا کہ جرمنی کو ساری دنیا کا مرکز بنایا جائے۔ پروگرام کے پہلے حصے کی تکمیل سنہ ۱۹۳۸ء تک ہو چکی تھی پولینڈ پر جو حملہ کیا گیا وہ دوسرے حصے کی ابتدا تھی اور یہ اس سال مکمل ہو جاتا اگر جرمنی کو روس میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی ہوتی۔ پروگرام کا تیسرا حصہ جس میں مغربی اور شمالی افریقہ بحر روم

اور مشرق قریب کے ممالک پر نیز خلیج فارس تک قبضہ کرنا داخل ہے شروع کیا جا چکا ہے کریٹ اور لیبیا کی جنگوں کو اور اس سمجھوتے کو جو نومبر میں گورنگ اور مارشل پیتین کے درمیان فرانس کی افریقی نوآبادیوں کے متعلق ہوا ہے اسی میں شامل سمجھنا چاہیے پروگرام کے ان تینوں حصوں کے درمیان صلح کی ایک تحریک بھی رکھی گئی تھی، غالباً پروگرام بنانے والوں کو امید تھی کہ فوجی کارروائیوں کی طرح صلح کی تحریکیں بھی کامیاب ہوں گی اور اگر پوری صلح نہ ہوئی تب بھی مخالفوں کی نیت ڈانواڈول ہو جائے گی اور اس سے سیاست اور جنگ کے مقاصد حاصل کرنے میں کچھ نہ کچھ مدد ملے گی پروگرام کے ان تمام حصوں کو حسب ضرورت کم یا زیادہ اہمیت دی گئی ہے پہلے ہر ہٹلر کا دل ان جرمنوں کی ہمدردی میں تڑپ رہا تھا جو دوسری ریاستوں کے ماتحت تھے اور وہ قسمیں کھاتے تھے کہ جرمن قوم کی یہ آرزو کہ وہ ساری کی ساری ایک جرمن ریاست کے ماتحت ہو پوری ہو جائے تو وہ اور کوئی مطالبہ نہ کریں گے۔ اس کے بعد ان کی نیند اس وجہ سے حرام ہو گئی کہ جرمنی پر ایک طرف سے روس اور دوسری طرف سے فرانس کا حملہ ایک ہی وقت میں ہو سکتا تھا۔ اب وہ اس یورپ کو جس نے ان کی غلامی منظور کر لی ہے امن اور آزادی عطا کرنا چاہتے ہیں اور ان قوموں پر اپنا غصہ اتارتے ہیں جن کی ضد لڑائی کو سرد نہیں ہونے دیتی۔

جنوب مشرقی یورپ اور مشرقی بحر روم | ۱۹۴۰ء کے وسط تک ہر ہٹلر فرانس سے فارغ ہو گئے تھے ناروے سے لے کر پرتگال تک شمال مغربی اور مغربی یورپ کے ساحل کو محفوظ کر لیا اور پھر انھوں نے جنوب مشرقی یورپ میں اپنے پروگرام کے مطابق عمل کرنا شروع کر دیا اس سلسلے میں رومانیہ کا بہت بڑا حصہ روس، ہنگری اور بلغاریہ کے درمیان تقسیم کر دیا گیا اور باقی ملک پر جرمن ماہروں اور سپہ سالاروں کی حکومت ہو گئی۔ فرانس سے جنگ بند کرنے کی شرطیں طے کرتے وقت ہر ہٹلر نے مسولینی اور اٹلی کے مطالبوں کا کوئی لحاظ نہیں کیا تھا جنوب مغربی یورپ میں بھی انھوں نے من مانی کارروائیاں کیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسولینی کو مفت مال ملنے کی امید نہیں رہی اور آخر اکتوبر میں اٹلی نے یونان کے خلاف اعلان جنگ کر دیا سال کے دوران میں اٹلی کی ایک بڑی فوج مصر اور لیبیا کی سرحد پر آ کر ڈٹ گئی تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ اٹلی کا بھی کوئی پروگرام ہے جس پر اب عمل کیا جائے گا لیکن اٹلی نے دونوں طرف منہ کی کھائی یونانیوں نے البانیہ

میں ... کی فوجوں کو متواتر شکستیں دیں اور مصر کی برطانوی فوج ایک حملے میں بن غازی تک پہنچ گئی اور اٹلی کی فوج کے بڑے حصے کو گرفتار کر کے اس کے سارے جنگی سامان پر قبضہ کر لیا جرمنی نے شاید اٹلی کو موقع دیا تاکہ اپنے بل بوتے سے جو کچھ حاصل کر سکتا ہو کر لے۔ ممکن ہے ترکوں کا رویہ بدل جاتا اگر وہ دیکھتے کہ جرمنی اٹلی کی سیاست کا آلۂ کار بن گیا ہے اس لیے جرمنی نے اٹلی کی ذرا بھی مدد نہ کی اور اس کی ناکامیوں سے حکومت کی جو مزاخیری ہوئی تھی اس سے فائدہ اٹھا کر اپنی خفیہ پولیس اپنے ماہر اور اپنی فوج اٹلی میں مسلط کر دی ادھر مشرقی افریقہ میں برطانیہ نے اٹلی کی تمام نوآبادیاں خالی کرا لیں۔

۱۹۴۱ء شروع ہوا تو جرمنی کے پروگرام کے لیے میدان صاف تھا یوگوسلاویہ سے کہا گیا کہ فاشسٹ اتحاد میں شامل ہو جائے اور جب وہاں کی حکومت میں انقلاب ہو گیا اور جرمنی کا مطالبہ منظور ہونے کا امکان باقی نہیں رہا تو جرمنی نے اعلان جنگ کا تکلف برتے بغیر یوگوسلاویہ اور یونان دونوں پر حملہ کر دیا ۶ اپریل اس کے ایک دن بعد برطانیہ نے یونان میں اپنی فوج اتاری برطانیہ نے یونان کو مدد پہنچانے کا وعدہ اس وقت کیا تھا جب اٹلی نے اس کے خلاف اعلان جنگ کیا شروع نومبر ۱۹۴۰ء میں برطانیہ نے جزیرہ کریٹ پر حفاظتی قبضہ بھی کر لیا تھا لیکن جو فوج یونان کی مدد کے لیے بھیجی گئی تھی وہ یوگوسلاویہ اور یونان کی کمزوری کے سبب سے جرمن فوجوں کا مقابلہ نہ کر سکی یوگوسلاویہ پر جرمنی نے تین طرف سے اتنا سخت حملہ کیا کہ یوگوسلاویہ فوج اس کے سامنے ٹھہر نہیں سکتی تھی اور اسے منتشر کر کے جرمن فوجیں واردار اور ستروما کی وادیوں سے یونان میں داخل ہو گئیں یہ سب اتنی جلدی ہوا کہ یونانی کوئی ایک محاذ قائم نہ کر سکے ان کی فوج کا ایک حصہ جو وادی ستروما کی طرف جرمنوں کا رستہ روکنے کے لیے بھیجا گیا تھا گھیر لیا گیا اور دشمن نے سالونیکا پر قبضہ کر لیا برطانوی فوج کی دشمن سے پہلی جھڑپ درہ موناستیر میں ہوئی اور اس کے بعد جرمن اپنی تعداد کے زور سے برطانوی فوجوں کو پیچھے ہٹاتے رہے۔ اگر اس وقت وہ یونانی فوج جو البانیہ میں تھی پیچھے ہٹ کر مقدونیا کو چھوڑ کر برطانوی فوج سے مل جاتی اور شمالی یونان میں ایک محاذ قائم کر لیا جاتا جو لمبائی میں کم اور گہرائی میں زیادہ ہوتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ جرمن سیلاب روک نہ لیا جاتا لیکن یونان کی یہ فوج گھر گئی تھی اور اس نے ہتھیار ڈال دیے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ برطانوی فوج کا بایاں بازو مارا جا سکتا تھا اس کے علاوہ

مستقل محاذ قائم کرنے کی کوئی صورت نہیں رہی تھی۔ اس لیے برطانوی فوجیں واپس بلا لی گئیں (۲۴ اپریل - یکم مئی)

اس جنگ کی مختصر مدت کے اندر جرمنی نے بحر ایجین کے تمام جزیروں پر قبضہ کر لیا تھا اور برطانوی فوج کو یونان چھوڑے بیس دن نہیں ہوئے تھے کہ کریٹ پر ہوائی حملہ ہوا اور پھر ہوائی جہازوں کے ذریعہ بڑی تعداد میں فوج اتاری گئی۔ بارہ دن تک اس جزیرے میں گھمسان کی لڑائی ہوئی اور آخر میں یہ مناسب سمجھا گیا کہ برطانوی فوج وہاں سے ہٹالی جائے (۲۰ مئی - یکم جون)

برطانیہ نے جو فوج یونان بھیجی تھی وہ بڑی حد تک وہی تھی جس نے لیبیا فتح کیا تھا شروع فروری میں وہ ادھر سے فارغ ہوئی تھی اور اس کے بعد اسے یونان پہنچانے کا انتظام کیا گیا۔ اسی دوران میں جرمنی نے صقلیہ اور طرابلس کی طرف سے ایک زبردست فوج لیبیا میں اتار دی۔ برطانوی سپہ سالاروں کا یہ منشا تھا کہ بن غازی یا تمام لیبیا پر مستقل قبضہ رکھیں اور اس کے لیے ان کے پاس سامان اور آدمی بھی نہ تھے اس لیے جو تھوڑی سی فوج لیبیا میں تھی وہ مصری مورچوں پر واپس آگئی اور اٹلی سے جو مورچے چھینے گئے تھے ان میں سے صرف طبرق میں ایک محافظ فوج چھوڑی گئی۔ لیبیا کا ریگستان اس قابل نہیں تھا کہ اس کے لیے سپاہی اور سامان جنگ کی قربانی کی جائے۔ برطانیہ نے اٹلی کی فوج کو اس لیے بھگا دیا تھا کہ وہ مکھی کی طرح مصر پر آکر بیٹھ گئی تھی۔ غالباً افریقہ میں جنگ کرنا جرمنی کے پروگرام یا یوں کہیے کہ پروگرام کے دوسرے حصے میں جس پر عمل کیا جا رہا تھا شامل نہیں تھا لیکن اگر برطانوی فوجیں طرابلس کی سرحد تک پہنچ جاتیں تو اس سے جرمنی کی آئندہ سیاست یعنی پروگرام کے تیسرے حصے پر بہت برا اثر پڑ سکتا تھا۔ اس سال کے آخر میں فرانس اور جرمنی کے درمیان وہ سمجھوتا ہو گیا جس کی عرصے سے کوشش جاری تھی اور نومبر کے آخر میں ایک زبردست معرکے کے بعد جرمن فوجیں بتدریج مغرب کی طرف ہٹنے لگیں۔ ممکن ہے وہ لیبیا کو خالی کر دیں اور طرابلس ہی میں اپنے قدم جمائیں جو اٹلی سے بہت قریب ہے اور جہاں فوج اور سامان جنگ بھیجنا بہت آسان ہوگا۔

جرمنی اور روس

جرمنی اور روس کی صلح بھی بڑی بات تھی اور جنگ بھی بڑی بات ہے۔ ان کے درمیان صلح ہو جانے کے معنی یہ تھے کہ جرمنی آزادی سے مغربی یورپ کی قوموں سے جنگ کر سکتا ہے اور ہر ہٹلر یہ سمجھتے تھے

ان کے درمیان جنگ ہونے کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ مغربی یورپ کی قومیں جرمنی سے صلح کر لیں گی اسی خیال سے ہر ہٹلر کے نائب ہرہیس مئی میں برطانیہ پہنچے لیکن جو کچھ وہ کہہ سکتے تھے اس کے باوجود برطانیہ اور امریکہ کا رویہ نہیں بدلا اور ۲۲ جون کو جرمنی نے روس پر حملہ کر دیا لوگوں کو عادت ہے کہ جب لڑائی ہو تو اس کے اسباب پوچھیں۔ جرمنی نے اعلان جنگ کیا تو اس کے اسباب معلوم کرنے کی کوشش کی گئی۔ ہر ہٹلر نے یہ غلط فہمی پیدا کرنا چاہی کہ روس نے درہ دانیال کا مطالبہ کیا تھا اور جرمنی کو دغا دینے کا ارادہ کر رہا تھا لیکن اس کا منشا لوگوں کو روس سے الگ رکھنا تھا اور غالباً اس الزام کی کوئی بنیاد نہیں جرمنی نے یورپ پر تسلط حاصل کرنے کا ارادہ کیا ہوا اور یہ ارادہ صرف لڑ کر ہی پورا کیا جا سکتا ہے وہ یہ نہیں چاہتا کہ مشرق میں روس اور مغرب میں فرانس سے ایک ہی وقت میں لڑنا پڑے ۱۹۳۹ء میں اسے روس سے دوستی کا معاہدہ کرنے کا موقع مل گیا اور ۱۹۴۰ء میں اس نے فرانس کی طرف سے اطمینان حاصل کر لیا برطانیہ اگر اس نے ذرا بھی ڈھیل دی ہوتی تو ممکن تھا کہ روس سے پہلے جنگ ہو جاتی اور اس سے بعد کو ہوتی بہرحال دونوں طرف جنگ کرنا جرمنی کے پروگرام میں تھا اور جب غربی اور جنوب مشرقی یورپ کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں رہا تو روس پر حملہ کر دیا گیا غالباً اس حملہ کا کوئی دوسرا سبب نہیں تھا۔

اس جنگ کو جس لحاظ سے بھی دیکھیے دنیا کی تاریخ میں ایک یادگار رہے گی اس سے پہلے اتنے بڑے پیمانے پر اور اس شدت کے ساتھ کوئی جنگ نہیں ہوئی ہے اور نہ شاید رسد کے مسائل کبھی اتنے مشکل ہوئے ہوں گے جنگ شروع ہونے کے مہینہ ڈیڑھ مہینہ بعد جرمن سپہ سالاروں کو معلوم ہو گیا کہ لڑائی کا وہ طریقہ جو فرانس میں کامیاب ہوا تھا روس میں کارآمد نہ ہوگا۔ اس لیے کہ ملک بہت بڑا تھا شہر بہت دور دور تھے اور فوج کی طرح عام آبادی بھی اس پر تلی ہوئی تھی کہ کبھی ہار نہ مانے فرانس میں جب جرمن ٹینک فرانسیسی فوج کے پیچھے پہنچ گئے تو تمام آبادی اور فوج میں وحشت اور مایوسی کی ایک وبا پھیل گئی جس نے جرمنی کا کام بہت آسان کر دیا روس میں یہ کیفیت کبھی پیدا نہیں ہوئی اگرچہ جرمن فوجیں برابر بڑھتی رہیں روسی فوج کے جو حصے جرمن ٹینکوں اور پیادہ فوج کے درمیان گھر جاتے وہ ہتھیار ڈال دینے کے بجائے جان کے بدلے جان لیتے اور اس طرح جرمن ٹینک جن کا کام یہ تھا کہ روسی فوج میں گھس کر اس کے پیچھے پہنچ جائیں رسد کا انتظام درہم برہم کر دیں اور روسی فوج

کو پسپا ہو کر نیا محاذ قایم کرنے کا موقع نہ دیں پیادہ فوج سے بہت دور نکل جاتے اور ان کے درمیان اتحاد عمل جو اس طریقے کی کامیابی کے لیے لازمی ہے قایم نہ رہتا۔ ٹینکوں کا بہت کچھ نقصان اٹھانے کے بعد جرمن سپہ سالاروں نے پھر پرانا طریقہ اختیار کیا مگر اس کے ساتھ اس علاقہ میں جس پر ان کا قبضہ ہوتا رسد پہنچانے کے لیے ریلیں اور سڑکیں بناتے جاتے۔ جرمن لشکر کشی کا مقصد یہ تھا کہ روس کا محاصرہ کر لیا جائے اور جو روسی فوجیں جنگ کے میدانوں سے سلامت بچ نکلیں انہیں لینن گراڈ، ماسکو اور جنوبی روس کے کسی مرکزی مقام پر گھیر لیا جائے۔ اس وقت تک جب کہ سردی کی شدت نے لڑائی جاری رکھنا محال کر دیا تھا لینن گراڈ کا پورا محاصرہ کر لیا گیا تھا ماسکو تین طرف سے گھر گیا تھا اور جنوبی روس میں جرمن فوجیں روسٹوف تک پہنچ گئی تھیں۔ سردی کی شدت کے باوجود روسی فوجیں مقامی طور پر لڑتی رہیں اور آخر سال تک ان کے جگہ جگہ پیش قدمی کرنے اور جرمن فوجوں کو پیچھے ہٹانے کی خبریں آتی رہیں۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو جرمنی نے لینن گراڈ، ماسکو اور ٹگن روگ سے مغرب کی طرف کے سارے علاقے پر قبضہ کر لیا ہے۔ روس کی بھاری صنعت کے مرکز زیادہ تر اسی علاقے میں ہیں اور یہیں کی زرعی پیداوار سے روس کا کام چلتا ہے۔ دوسری طرف جرمنوں کے لیے یہ بہت الجھن اور کسی قدر نقصان کی بات ہے کہ وہ انتہائی کوشش کے باوجود روس کی فوجی طاقت کو زائل نہ کر سکے، اور ان کا نہ لینن گراڈ پر قبضہ ہو سکا نہ ماسکو پر۔ روسٹوف سے انہیں پسپا ہونا پڑا اور اس طرح شمالی ایران اور قفقاز کی طرف سے جو مدد روس کو بھیجی جا رہی ہے اس کا رستہ نہیں روکا جا سکا اور قفقاز کا تیل بھی ان کے ہاتھ نہ آیا لیکن اس جنگ کے حساب کتاب کو ابھی بند نہ سمجھنا چاہیے۔

عراق، شام اور ایران پر برطانیہ کا تسلط | وسط اپریل میں جب جنوب مشرقی یورپ میں میدان کارزار گرم تھا برطانیہ کو عراق کے معاملات میں مداخلت کرنے اور ملک پر تسلط حاصل کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ شروع مہینے میں وہاں راشد عالی نے جو وزیر اعظم رہ چکے تھے فوج کی مدد سے حکومت پر قبضہ کیا اور ان کے رویے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس معاہدے کی پابندی نہیں کریں گے جس میں عراق اور برطانیہ کے حقوق اور فرائض معین کیے گئے ہیں۔ ۱۸ اپریل کو برطانیہ کی ایک فوج بصرہ بھیجی اور اس کا مقصد یہ تھا کہ عراق میں برطانیہ کے جو فوجی مرکز ہیں ان کے درمیان رستہ صاف رکھے۔ راشد عالی نے فوج کے آنے پر تو اعتراض نہیں کیا لیکن ۲ مئی کو بغداد کے قریب

ایک ہوائی مرکز پر عراقی فوج نے حملہ کر دیا یہ کارروائی ایسی تھی کہ جس سے راشد عالی کی سیاست کے بھید کھل
گئے۔ اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ راشد عالی نے جرمنی سے مدد مانگی اور جب مدد نہیں ملی تو عراق سے بھاگ کر
[illegible] گئے۔ برطانیہ نے امیر عبداللہ کو دوبارہ ریجنٹ بنا دیا اور عراق کا ہنگامہ ختم ہو گیا۔

یہاں جو کچھ ہوا تھا صرف ایک حد تک جرمن سازشوں کا نتیجہ تھا۔ شام میں فرانسیسی حکومت نے جو رویہ اختیار کر رکھا تھا اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ جرمنی کا آلہ کار بننا چاہتی ہے۔ اس نے جرمنی کو اپنے ہوائی اڈے استعمال کرنے کی اجازت دے دی تھی کہ وہ ادھر سے عراق جا سکیں۔ جرمنی کی سمت سے ہوائی جہاز اور ماہرین شام پہنچ گئے تھے اور ان دونوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جاتی تھی۔ وسط مئی میں برطانیہ نے آزاد فرانسیسی حکومت کے مشورے سے شام پر لشکر کشی کرنے کا ارادہ کیا۔ برطانوی اور آزاد فرانسیسی فوجیں شروع جون میں شام کے اندر داخل ہوئیں اور قریب ایک مہینے میں پورے ملک پر قبضہ ہو گیا۔ ۱۵ جولائی کو ایک معاہدہ ہو گیا جس میں سب کی عزت اور سب کے حق کا یکساں طور پر لحاظ رکھا گیا اور اس کا اندیشہ نہ رہا کہ جرمنی فرانسیسی حکومت کی نیازمندی سے فائدہ اٹھا کر شام میں فساد برپا کرے گا۔

عراق و شام ہی جرمن سازشوں کا مرکز نہیں تھے۔ ایران میں بھی جرمنوں کی بہت بڑی تعداد تھی جن میں سے بعض پرانے سرکاری ملازم تھے اور بہت سے جنگ شروع ہونے کے بعد بھی آئے تھے۔ برطانیہ اور روس دونوں کے لیے لازمی تھا کہ اس طرف سے اطمینان حاصل کر لیں اور جب رضا شاہ سے گفتگو کرنے کا کوئی نتیجہ نہ نکلا تو روس اور برطانیہ نے متفقہ طور پر کارروائی کرنا مصلحت سمجھا۔ ۲۵ اگست کو شمال سے روسی اور جنوب سے برطانوی فوجیں ایران میں داخل ہوئیں۔ فوج نے کہیں کہیں پر مخالفت کی مگر رضا شاہ نے دو دن کے بعد صلح کی درخواست کی۔ معلوم ہوتا ہے کہ رضا کی حکومت سے ایرانی بہت ناخوش تھے کیونکہ برطانیہ سے صلح ہوتے ہی رضا شاہ حکومت سے دستبردار ہو گئے۔

[illegible] سیاست اور جنگ کی ان وارداتوں کو اس پروگرام کی روشنی میں دیکھیے جو جرمنی نے بنایا ہے تو خیال ہوتا ہے کہ جرمنی نے پروگرام کے دوسرے حصے کو پورا کر لیا ہوتا اگر روس اتنے استقلال سے مقابلہ نہ کرتا۔ اب جرمنی کے لیے اس حصے کی تکمیل باقی ہے۔ اگلے سال پر چھوڑ دی گئی ہے لیکن مسلسل جنگوں میں جرمنی کے اتنے آدمی

اور اتنا سامان مہیا دیا گیا ہے کہ وہ اس کام کو نہ کر سکے تو کوئی تعجب کی بات نہ ہوگی۔ روس کے استقلال کا ساتھ برطانیہ کا استقلال بھی ایسی رکاوٹ ہے جو جرمنی کو ایک نہ ایک دن بالکل عاجز کر دے گا۔ برطانیہ جرمنی کے پروگرام کے دوسرے حصے کی تکمیل میں اس طرح مخل ہے کہ وہ جرمنی پر ہوائی حملے کر رہا ہے اور روس کو مدد بھیج رہا ہے لیکن برطانیہ سے اصل مقابلہ پروگرام کے تیسرے حصے میں ہوگا جب جرمنی اس کی کوشش کرے گا کہ بحرِ روم کے جنوبی ساحل اور مشرقِ قریب کے ممالک پر تسلط حاصل کرے۔ اس جنگ کے محاذ جبرالٹر، مالٹا، مصر، فلسطین شام، عراق، ایران میں ہوں گے اور ان محاذوں پر برطانیہ نے اپنے آپ کو ہر طرح سے مضبوط اور مقابلے کے لیے تیار کر لیا ہے۔ ان محاذوں پر جرمنی کے لیے لڑنا ضروری ہے کیونکہ بحر روم یورپ سے الگ نہیں کیا جا سکتا اور یہاں پر جرمنی کی شکست یقینی ہے اگر جنگ کا سامان اسی رفتار سے تیار کیا جاتا اور ہر طرف بھیجا جاتا رہا جیسے کہ اب ہو رہا ہے۔

برطانیہ اور امریکہ | یورپ کی ہر لڑائی پر امریکہ کے رویے کا بہت اثر پڑتا ہے، اس لیے کہ یہاں کے کارخانے اور کاروبار، دولت اور اسے صرف کرنے اور بڑھانے کی خواہش ایسی ہے کہ جسے اس کا سہارا ملے اس کا پلہ بھاری ہو جاتا ہے۔ برطانیہ کو جنگ شروع ہونے سے پہلے بھی پریزیڈنٹ روزولٹ کی ہمدردی حاصل تھی جنگ شروع ہونے کے بعد برطانیہ کو ہر قسم کا خام اور تیار کیا ہوا مال امریکہ سے ملتا رہا اور جب برطانیہ نے نقد قیمت ادا کرنے سے معذوری ظاہر کی تو پریزیڈنٹ روزولٹ نے ادھار اور پٹے کا قانون پیش کر دیا جسے فروری ۱۹۴۱ء میں کانگریس نے منظور کر لیا۔ قانون کی تجویز پیش کرنے سے پہلے ادائگی کی ایک اور صورت بھی اختیار کی گئی تھی۔ وہ یہ تھی کہ برطانیہ نے مغربی بحر اٹلانٹک کے مورچے اور بندرگاہیں جن پر اس کا قبضہ تھا ۹۹ سال کے لیے امریکہ کے حوالے کر دیے۔ یہ صرف لین دین کا معاملہ نہیں تھا بلکہ اس میں یہ مصلحت بھی تھی کہ مغربی اٹلانٹک میں پہرہ دینا امریکہ کے بیڑے کے ذمہ ہو گیا اور برطانیہ کے بہت سے جنگی جہاز ملک کی حفاظت اور تجارتی جہازوں کی نگہبانی کے لیے خالی ہو گئے۔ اس کے علاوہ مورچوں کے بدلے برطانیہ کو بہت سے ڈسٹرائر بھی مل گئے جن کی اسے سخت ضرورت تھی۔ ادھار اور پٹے کے قانون کے ساتھ برطانیہ اور امریکہ کے درمیان اتحاد عمل بڑھنا بھی لازمی تھا چنانچہ دونوں نے مل کر آئس لینڈ اور گرین لینڈ پر قبضہ کیا، اور

تجارتی جہازوں کی آمد و رفت کے لیے ایک رستہ صاف ہو گیا کہ جس پر مسلسل پہرہ رہتا اور جہاں دشمن کا پہنچنا مشکل تھا اسی بحث پر چھاپے مارنے کے لیے جرمنی کا جہاز بسمارک بھیجا گیا تھا جو ایک بڑے معرکے کے بعد ڈبو دیا گیا۔

پریزیڈنٹ روزویلٹ خود برطانیہ کی ہر طرح مدد کرنا چاہتے تھے امریکہ اور برطانیہ کے اخلاقی اتحاد کو ... بنانے کے لیے انھوں نے بحر اٹلانٹک میں مسٹر چرچل سے ملاقات کی لیکن ان کے لیے بڑی رکاوٹ یہ تھی کہ امریکہ کے قانون غیر جانبداری کی وجہ سے امریکہ کے تجارتی جہاز مشرقی بحر اٹلانٹک میں ایک خاص حد سے آگے جا نہیں سکتے تھے گرین لینڈ اور آئس لینڈ پر قبضہ کیا گیا اور امریکہ کے جہاز وہاں تک جانے لگے تو جرمن آبدوزوں نے ان کو ڈبونا شروع کر دیا اس کے جواب میں پریزیڈنٹ روزویلٹ نے امریکہ کے تجارتی جہازوں کو توپیں رکھنے اور آبدوزوں سے بچنے کے لیے ان پر گولہ باری کرنے کی اجازت دے دی۔ مگر سینٹ اور جنگ کے معاملہ میں دونوں فریق آخری فیصلہ کرنے کا اختیار اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتے تھے جہازوں اور آبدوزوں کے کپتانوں کو دینا نہیں چاہتے تھے۔ اس لیے کچھ دن بر پا رہنے کے بعد یہ ہنگامہ دب گیا پھر بھی پریزیڈنٹ روزویلٹ نے قانون غیر جانبداری میں ایسی ترمیم کرا لی کہ جرمن آبدوز امریکہ کے تجارتی جہازوں کا شکار نہ کر سکے اور تجارتی جہاز جنگی جہازوں کی نگہبانی میں برطانیہ تک جا سکیں۔

جاپان، امریکہ اور برطانیہ | یورپ میں جنگ شروع ہونے سے پہلے ہی جاپان نے چین کے آباد اور زرخیز علاقے پر قبضہ کر لیا تھا لیکن اسے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ اس قبضے کی وجہ سے وہ تمام ناگوار صورتیں پیدا ہوتی رہیں گی جو غیروں کی حکومت کے ساتھ لازمی ہیں اور ایسا کوئی بڑا فائدہ حاصل نہ ہوگا جس کی خاطر زبردستی کی جاتی ہے اور بدنامی گوارا کی جاتی ہے دوسری طرف برطانیہ اور امریکہ جن کی مدد سے چین کی قومی حکومت لڑائی جاری رکھ سکی تھی، دونوں یہ دیکھ رہے تھے کہ جاپان انھیں چین سے بے دخل کر رہا ہے اور کسی قسم کے سمجھوتے پر راضی نہیں ہوتا۔ اس وجہ سے ایک عرصے تک کشیدگی رہی جو آہستہ آہستہ بڑھتی گئی۔ کانگرس نے بحر الکاہل کے جزیروں کی مورچہ بندی اور ایسی بندرگاہوں کی تیاری کے لیے بہت بڑی رقم منظور کی جو جنگ کے بحری مرکزوں کا کام دے سکیں پریزیڈنٹ روزویلٹ نے اس معاہدے کو جس کے ماتحت امریکہ اور جاپان کے درمیان تجارت

ہو رہی تھی منسوخ کرنے کا نوٹس دیا اور چھ مہینے بعد جنوری ۱۹۴۱ء میں یہ منسوخ ہو گیا برطانیہ اور جاپان کے درمیان تجارت خود ہی کم ہو رہی تھی ۱۹۴۱ء کے وسط میں جاپان نے فرانسیسی ہند چینی کی بندرگاہوں اور ریلوے لائنوں پر قبضہ کیا اور وہاں فوج اور سامان جنگ جمع کرنے لگا تو امریکہ اور برطانیہ کو یقین ہو گیا کہ وہ جنوب مشرقی ایشیا پر تسلط حاصل کرنا چاہتا ہے خصوصاً اس وجہ سے کہ جاپان نے ڈچ مشرقی ہند کی حکومت سے اسی انداز سے گفتگو شروع کی جو اس نے ہند چینی میں اختیار کی تھی جاپان کی ان کارروائیوں کے جواب میں پریزیڈنٹ روزویلٹ نے جاپان کے ہاتھ پٹرول اور لوہے کا سامان بیچنے کی ممانعت کر دی برطانیہ اور امریکہ میں اس وقت تک ایسا اشتراک عمل ہو گیا تھا کہ جو ایک کرتا وہی دوسرا بھی کرتا برطانیہ نے بھی جاپان کے ساتھ تجارت بند کر دی اور پھر روپیہ کا لین دین بھی روک دیا۔ تجارتی بائیکاٹ کی یہ حالت قائم نہیں رہ سکتی تھی خصوصاً جب فرانسیسی ہند چینی کی جاپانی فوجوں کے مقابلے میں برطانیہ نے مجبوراً ملایا اور برما میں فوجیں بھیجیں اور اس بیڑے میں اضافہ کیا جو سنگاپور میں رہتا تھا جاپان نے امریکہ سے گفتگو شروع کی جس کے متعلق وضاحت سے ابھی تک کچھ معلوم نہیں کیا جا سکا ہے اسی گفتگو کے دوران میں جاپان کی حکومت بدلی، جنرل ٹوجو وزیر اعظم ہوئے اور امریکہ سے گفتگو جاری رکھتے ہوئے یہ بھی طے کر لیا گیا کہ جنگ کی جائے گی۔ ۷ر دسمبر کی صبح کو جاپان کے ہوائی جہازوں نے جزائر فلپائن اور ہوائی پر بمباری کی اور اسی کے ساتھ ہانگ کانگ اور سنگاپور پر حملے ہوئے اور شمال مشرقی ملایا میں ایک جاپانی فوج اتار دی گئی۔ اعلان جنگ کی کارروائی بھی جاپان نے کیا تھا جرمنی اور اٹلی نے بھی امریکہ کے خلاف اعلان جنگ کر دیا اس طرح تمام فاشست ملک ایک طرف اور جمہوری ایک طرف ہو گئے اور وہ جنگ جو اب تک اصل یورپی تھی واقعی عالمگیر ہو گئی۔

مشرقی دنیا کی جنگ امریکہ اور جاپان کے درمیان فاصلہ اتنا ہے کہ ان کے لیے ایک دوسرے سے جم کر لڑنا بہت مشکل ہے اور امریکہ نے اس خیال سے کہ جاپان کو اعتراض ہو گا بحرالکاہل کے ان جزیروں کی جو جاپان کے رستہ قریب ہیں جیسا کہ چاہیے تھا مورچہ بندی بھی نہیں کی جاپان نے جنگ شروع کرتے وقت یہ ارادہ کیا کہ امریکہ کے لیے محاذ قائم کرنے کی کوئی صورت ہی نہ رکھے اور اسی وجہ سے جزائر ہوائی ویک، مڈوے، گوئم اور

ملایا پر حملے کر کے وہاں کے بندرگاہوں کو شاد دینے کی کوشش کی قبل اس کے کہ امریکہ جنگ کے لیے تیار ہو سکے لیکن جاپان کا اصل محاذ جزیرہ نما ملایا میں ہوگا اس کے جنوب میں سنگاپور کا مورچہ ہے شمال میں برہما۔ جاپانیوں کے قدم یہاں جم گئے تو وہ سمجھتے ہیں کہ ایک طرف وہ سنگاپور کا محاصرہ کر سکیں گے جب یہ حالت بحری اور ہوائی حملے کرنا بے سود ہوگا اور دوسری طرف برہما میں بھی بڑھ سکیں گے لیکن یہ سب وہ امکانات ہیں جو پروگراموں میں پہلے رکھے جاتے ہیں۔ برطانیہ اور امریکہ جنگ کے لیے تیار رہتے لیکن خاص اس وقت جب جاپانیوں نے پہلے وار کیے وہ تیار نہ تھے مگر یہ جنگ ایسی نہیں ہے کہ ایک دو وار کرنے سے اس کا فیصلہ ہو جائے اب جو یہ شروع ہو گئی ہے تو جاری بھی رہے گی اور جاپان کے لیے بڑے اندیشے کی بات یہ ہے کہ جاری رہے اور چند ابتدائی کامیابیوں کے سوا ان کے کچھ ہاتھ نہ لگے۔

محمد مجیب بی۔ اے (آکسن)

رفتار تعلیم سنہ ۱۹۴۱ء

ہندوستان میں تعلیم کا مسئلہ عمل سے زیادہ ہنوز بحث و گفتگو کا مسئلہ ہے خود ہندوستان کی بدنصیبی کہیے یا ہندوستانی کیریکٹر کی کمزوری کہ یہاں کام اکثر غلط لوگوں کے ہاتھ میں چلا جاتا ہے یا نام و نمود کی دنیاوی اور ذاتی اغراض بعض لوگوں کو ایسی ذمہ داریاں اپنے سر لینے پر مجبور کرتی ہے جنہیں پورا کرنے کی ان میں اہلیت نہیں ہوتی ہمارے ہندوستان میں تعلیمی ترقی تو درکنار یہاں یہ بنیادی بات ہی قطعی طور پر طے نہیں ہوئی ہے کہ بالآخر ہماری تعلیم کا نصب العین کیا ہونا چاہیے ایسا فی الحقیقت ہے کیوں؟ اس کی وجہ کچھ وہی ہے جس کا ابھی ابھی ذکر کیا جا چکا ہے نصب العین سامنے رکھ کر ہی اس کی حصول یابی کے ذرائع سوچے جا سکتے ہیں چنانچہ ظاہر ہے کہ جب اس بنیادی بات پر بھی ہندوستانیوں کی ایک رائے نہیں تو اس کے ذرائع کی وسعت میں کیا کچھ اختلاف نہ ہوگا لیکن یہاں اس اختلاف سے بحث کرنے کے بجائے بہتر یہ ہوگا کہ آپ کے سامنے زیادہ سے زیادہ اختصار کے ساتھ وہ باتیں پیش کر دی جائیں جن پر عمل کیا جانا شروع ہو چکا ہے یا جنہیں کم از کم تحریر کا جامہ پہنا دیا گیا ہے اور جو یقیناً ہمیں کسی نہ کسی وقت ایک صحیح تعلیمی نصب العین کی طرف لے جائیں گی

ہندوستان میں سترہ یونیورسٹیاں ہیں اور اس وقت ایک لاکھ سے کچھ زائد طلبا ان میں زیر تعلیم ہیں یہ تعداد ملک کی آبادی کو دیکھتے ہوئے کسی شمار میں لائے جانے کے قابل نہیں ہے پھر بھی آج بے روزگاری جس قدر تعلیم یافتہ طبقے میں ہے اتنی ہاتھ سے کام کرنے والے طبقے میں نہیں ہے خدا کا شکر ہے کہ ابتدائی، ثانوی تعلیم کے ساتھ ساتھ اعلیٰ تعلیم کی حیات و بقا سے تعلق رکھنے والوں کو بھی یہ تکلیف دہ احساس ہو چلا ہے چنانچہ ختم ہونے والے سال کے بعض کانووکیشن کے خطبوں میں اعلیٰ تعلیم کو زمانہ کی ضرورتوں کا احساس دلانے کی کوشش کی گئی ہے اور کچھ اسی قسم کے احساس کا نتیجہ ہے کہ بمبئی یونیورسٹی نے اپنے یہاں لازمی فوجی تعلیم شروع کی ہے ساتھ ہی ساتھ آگرہ یونیورسٹی نے یہ طے کیا ہے کہ جب تک اس کے طالب علم ملٹری سائنس کے لکچر ایک مقررہ تعداد میں نہ سنیں اس وقت تک انہیں امتحان میں بیٹھنے کی اجازت نہ دی جائے۔ امسال

ی الٰہ آباد یونیورسٹی نے طبعی سائنس کو باضابطہ طور پر اپنے یہاں نصاب کا ایک مستقل مضمون قرار دیا ہے کچھ
اسی قسم کی کوششیں لکھنؤ اور بنارس یونیورسٹیوں میں بھی جاری ہیں۔

اعلیٰ تعلیم میں ایک دوسرا اہم سوال مادری زبان کا تھا۔ غیر زبان کے ذریعہ تعلیم اور ذریعہ امتحان ہونے سے ہندوستانی طلبا کے راستے میں جو دشواریاں تھیں وہ محتاج بیان نہیں۔ ثانوی تعلیم میں مادری زبان کو جو حق ملنا چاہیے تھا وہ مل گیا۔ اعلیٰ تعلیم میں مادری زبان کو ذریعہ امتحان بنانے کا اقدام لکھنؤ یونیورسٹی سے ہوا ہے۔ چنانچہ ۱۹۴۳ء سے بی اے، بی ایس سی، اور بی کام کے امتحانات میں طلبا کو مادری زبان میں جوابات لکھنے کی اجازت ہو گئی ۔ ۱۹ دسمبر کو لکھنؤ میں پہلی انگلش کانفرنس میں بھی یہ تذکرہ چھیڑا گیا تھا اس کانفرنس میں شریک ہونے والوں نے فیصلہ وہی کیا جو اس قسم کے لوگوں کو کرنا چاہیے تھا یعنی جب تک مادری زبان پر خاطر خواہ ادب تیار نہ ہو جائے اس وقت تک ذریعہ تعلیم انگریزی ہی رہے یہ فیصلہ کچھ ایسا ہی ہے جیسے آپ کسی شخص سے کہیں کہ تم پہلے تیرنا سیکھ لو اس کے بعد تمہیں پانی میں اترنے کی اجازت ہوگی ادب کی تیاری کوئی ایسا بڑا مسئلہ نہیں جو اس کی ضرورت پیدا کرنا اصلی چیز ہے اور ضرورت پیدا کرنے کی صورت اس سے بہتر کوئی نہیں ہو سکتی کہ مادری زبان کو ذریعہ تعلیم اور ذریعہ امتحان بنا دیا جائے اسی سلسلے میں حکومت کے مرکزی تعلیمی بورڈ نے ہندوستان کی مختلف زبانوں میں اصطلاحات کے ترجمے کے سوال پر اپنی جنوری کی نشست میں غور کیا تھا اور ہمیں خوشی ہے کہ مرکزی تعلیمی مشاورتی بورڈ کے اس اقدام سے متاثر ہو کر صوبہ سند کے بعض صوبوں نے یہ کام نہایت سرگرمی سے شروع کر دیا ہے۔

وقت کی آواز پر اعلیٰ تعلیم کے ناخداؤں نے بھی صنعت و حرفت کی طرف توجہ دینی شروع کر دی ہے۔ گزشتہ سال انہیں ایام میں (دسمبر ۱۹۴۲ء) سولہویں کل ہند تعلیمی کانفرنس کے موقع پر سر شاہ محمد سلیمان مرحوم نے اعلیٰ تعلیم میں ریسرچ کی کمی کی طرف اشارہ کیا تھا شکر ہے کہ اس کمی کا احساس تو ہوا اور ہندوستان میں بھی اگرچہ دیر سہی، ایک علمی اور صنعتی ریسرچ بورڈ بنا تو سہی لیکن اس کام کے لیے صرف پانچ لاکھ روپے کی سرکاری منظوری کس قدر ناکافی ہے یہ کوئی راز کی بات نہیں انگلستان میں یہ بورڈ ۱۹۱۶ء میں قائم کیا جا چکا تھا اور اب اس کی سرکاری منظوری ایک کروڑ روپیہ سالانہ ہے گویا جس کی آبادی صرف سوا کروڑ ہے۔

نیشنل ریسرچ کاؤنسل پر تقریباً تیرہ لاکھ روپیہ ہر سال صرف کرتا ہے لیکن ہندوستان۔ انگلستان ہے یہ کینیڈا ہندوستان ہندوستان ہے

اعلیٰ تعلیم میں جدید رجحانات او تنظیم و تعمیر کے سلسلہ میں ان سفارشات سے بہت کچھ روشنی پڑتی ہے جو یو پی گورنمنٹ کی قائم کردہ تنظیمی کمیٹی نے پیش کی ہیں اس کمیٹی کا خیال ہے کہ جلد از جلد اعلیٰ تعلیم کو صوبے میں زندگی کے ہر شعبہ کی ضروریات پوری کرنے کا اہل بن جانا چاہیے اور حرفتی تعلیم کی عام سفارش کے ساتھ ساتھ شعبہ فنون لطیفہ اور شعبہ تعلیم میں اضافوں کی تجویز کی ہے کانپور میں صنعتی اور حرفتی تعلیم کی تنظیم کے لیے ایک نئی یونیورسٹی کھولنے کا مشورہ بھی سفارش میں شامل ہے یونیورسٹیوں کے باہمی مراسم میں خوشگواری پیدا کرنے کے لیے اس بات کی سفارش کی گئی ہے کہ ایک یونیورسٹی کے ریسرچ اور پوسٹ گریجویٹ طلبا کو دوسری یونیورسٹی میں لکچر سننے اور کام کرنے کا موقع دیا جانا چاہیے ہندوستانی کا ایک پرچہ ڈگری کورس میں اُن طلباء کے لیے داخل کر دینا چاہیے جو ثانوی تعلیم میں ہندوستانی سے بے بہرہ رہتے ہیں، اور ساتھ ہی ساتھ پبلک سروس کمیشن کے امتحانات میں بھی ہندوستانی ایک لازمی مضمون ہونا چاہیے۔

یہ سفارشات یو پی میں یونیورسٹیوں کی تنظیم کے متعلق ہیں لیکن کیا اچھا ہو اگر اور صوبے بھی اس طرف توجہ کریں کل ہند انٹر یونیورسٹی بورڈ کی بعض سفارشات بھی قابل ذکر ہیں میڈیکل کالج کے طلبا کے لیے خاص طور پر ایسے تجربے کے اضافہ کے لیے ملک کے دوسرے میڈیکل کالجوں میں تعلیم کے بقیہ مدارج طے کرنے کی تجویز پیش کی گئی ہے اسی کے ساتھ بعض مقامات پر قانون کے کلاسوں میں صرف انٹرمیڈیٹ پاس کیے ہوئے طلبا کو داخلہ دینے کی مخالفت کی گئی ہے بورڈ نے خواتین کے لیے ان کی صنفی خصوصیات کے اعتبار سے گھریلو سائنس، موسیقی اور فنون لطیفہ کی قسم کے مضامین پر زور دیا ہے۔ اور اس طرح عام نصاب کے علاوہ اقتصادیات سیاست، امور عامہ تنقید تاریخ اور نفسیات وغیرہ مضامین میں ڈگری اور ڈپلوما دینے کی سفارش کی ہے یونیورسٹی کے دائرہ عمل میں تعلیم بالغاں وغیرہ کی قسم کی سماجی خدمت کو بھی شامل کرنے کا مشورہ دیا ہے اور سب سے زیادہ دلچسپ تجویز ایک یونیورسٹی کے استادوں کے دوسری یونیورسٹی میں تبادلے کی ہے تاکہ ہر یونیورسٹی کے طلبا ملک کے بہترین دماغوں کی سعی و کاوش سے براہ راست فائدہ اٹھا سکیں

طلبا کو تاریخی اور صنعتی مقامات پر بھیجنے اور سیاحتوں اور کھیلوں میں آسانی سے حصہ لے سکنے کے لئے ریلوے پر خاص رعایتی ٹکٹوں کا مطالبہ بھی اپنی جگہ بہت مستحسن ہے۔

اعلیٰ تعلیم چند گنے چنے لوگوں کا سوال ہے اس سے کہیں زیادہ اہم سوال ثانوی اور ابتدائی تعلیم کا ہے۔ ثانوی تعلیم کے متعلق ابھی کوئی بات نہ ایسی طے پائی ہے اور نہ ہوئی ہے جسے ترقی کے لفظ سے موسوم کیا جائے ہو۔ ثانوی تعلیم کے نظام میں کچھ اس نقص کا احساس کیا جانے لگا تھا کہ ہمارا موجودہ دسواں درجہ اسکول ہونے کلاس بھی ہے اور میٹرکیولیشن کلاس بھی۔ اس مسئلہ پر مرکزی تعلیمی مشاورتی بورڈ نے بھی گزشتہ سال جنوری میں غور کیا تھا لیکن ابھی تک کوئی عملی صورت سامنے نہیں آئی ہے۔ وقت کے تقاضوں کی گونج بعض مدارس میں ضرور سنائی دیتی ہے۔ یہ جنگ کا زمانہ ہے لہٰذا صوبہ بہار کے ثانوی مدرسوں میں فوجی تعلیم جاری ہونے کی اسکیم زیر غور تھی ناگپور کے بعض اسکولوں میں رائفل کلب بھی کھولے گئے ہیں ممالک کی حکومت نے ہندوستانی مدارس میں صنعتی تعلیم کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے ایسے چھ ہائی اسکولوں کو زراعتی اور حرفتی ہائی اسکولوں میں تبدیل کر دیا ہے۔ ملک میں ان طلبا کے حرفتی تعلیم کے انتظام کی ضرورت شدت کے ساتھ محسوس کی جانے لگی ہے جو ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کر سکتے حکومت نے وقتی مصلحت کو مدنظر رکھتے ہوئے ہندوستان میں جنگی مستری مہیا کرنے کی غرض سے کافی حرفتی تعلیم کے مرکز قائم کر دیے ہیں۔ ان مرکزوں میں سب سے سا مرکز مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا "ٹکنکل کالج" ہے۔ اس نوع کے انتظامات کی سب سے شاندار صورت دہلی "پولی ٹکنک" ہے۔ "پولی ٹکنک" کے چار شعبے ہیں۔ ایک ٹکنکل ہائی اسکول۔ دوسرا پیشوں کا شعبہ تیسرا پیشوں کے استادوں کے لئے ٹریننگ کالج اور چوتھا جنگی مستریوں کا شعبہ ٹکنکل ہائی اسکول مروجہ ہائی اسکول کے متوازی ہے اس میں ۱۱ سے ۱۴ سال کی عمر کے لڑکوں کا داخلہ ہوتا ہے ان کے پڑھنے لکھنے کی تعلیم عملی کام کے ساتھ ہی ہوگی جس کو بہ اعتبار فوقیت رہے گی۔ اس کی اونچی جماعتوں میں ۱۴ سال کی عمر میں ایک امتحان کے بعد داخلہ ہو سکے گا چوتھے اور پانچویں سال میں ۵۰ فیصدی کام پیشہ کا کام ہوگا حکومت کی کوششوں سے الگ بعض ریاستوں میں بھی صنعتی تعلیم کے لیے انتظامات اور بھی ہیں ان میں سے پہلا نمبر ریاست حیدرآباد کا ہے ریاست رامپور گو بہت چھوٹی سی ریاست بھی

لیکن اپنے موجودہ سکریٹری تعلیمات کے خلوص و محنت کے باعث صوبہ کا تعلیمی کام کر رہی ہے دوسری تعلیمی ترقیوں کے ساتھ یہاں بھی سال رواں میں ایک مختصر مگر منظم طریق پر ایک صنعتی اسکول کھلنے والا تھا جس میں آٹھویں درجہ کے بیس اچھے طلبا کو معقول وظیفہ دے کر داخل کرنے کی تجویز تھی اور پارچہ بافی چرم سازی وغیرہ قسم کی چار صنعتیں داخل نصاب ہونا قرار پائی تھیں اور ساتھ ہی ساتھ ڈرائنگ حساب اور عام سائنس میں معقول تعلیم دینے کی تجویز بھی تھی۔

لیکن یہ چند مساعی ایسی نہیں ہیں جنھیں بہت زیادہ اہمیت دی جا سکے بات دراصل یہ ہے کہ ہمارے ملک میں ابھی کوئی صحیح تعمیری کام قابل ذکر پیمانے پر شروع ہی نہیں ہوا ہے ثانوی تعلیم کے سلسلے میں جو کچھ عرض کیا گیا وہ پورے ہندوستان کی فضا میں اتنی بھی تو اہمیت نہیں رکھتا جیسے تاریکی کی ایک پوری کائنات میں کسی دور دراز تارے کی ایک ہلکی ہوئی کرن۔ عنقریب ثانوی تعلیم کے سلسلہ میں میرٹھ میں کچھ لوگ تعلیم پر پر بات چیت کرنے کے لیے اکٹھا ہوں گے۔

مروجہ ابتدائی تعلیم کی داستان کسی خاص ذکر کے قابل نہیں ہے بنگال میں ایک مستقل پنج سالہ پروگرام تیار ہوا ہے احمد آباد نے ابتدائی مدرسوں میں بچے بچیوں کی تعلیم ایک ہی ساتھ کر دی ہے بمبئی میں صحت کے خیال سے اسکول جانے کی عمر ۵ سال کی بجائے ۶ سال کر دی گئی ہے اور ۳۵ بچوں کی جماعت کے بجائے ۴۰ بچوں کی جماعت سے کا حکم دیا ہے سندھ میں لازمی ابتدائی تعلیم کی اسکیم زیر غور ہے اور تمام ابتدائی اور ثانوی مدارس میں موسیقی لازمی کر دی گئی ہے بعض جگہ ایک استاد والے ابتدائی مدرسوں کو دو استاد والا بنا دیا گیا ہے اور بس۔

فی الحقیقت ابتدائی تعلیم کے سلسلے میں ہمارا سب سے قیمتی تجربہ بنیادی قومی تعلیم کا تجربہ ہے بنیادی قومی تعلیم کے لیے ختم ہونے والا سال ایک بدشگونی کے ساتھ شروع ہوا تھا یعنی یکم مارچ سے اڑیسہ کی حکومت نے اپنے پندرہ بنیادی مدرسوں اور ایک ٹریننگ اسکول کو بند کر دینے کا اعلان کر دیا یہ چیز تکلیف دہ بھی تھی اور باعث مسرت بھی تکلیف دہ اس لیے کہ جس تجربہ کو مشکل سے سات ماہ ہوئے تھے اس کے ناکارہ یا بیکار ہونے کا فیصلہ اڑیسہ کی حکومت نے اس قدر عجلت میں کیا جس کی عقل رکھنے والے لوگوں

کی حکومت سے امید نہیں ہو سکتی تھی اور باعث مسرت اس لیے کہ ایک صحیح چیز جس قدر جلد حاصل ہو تھوڑا ہے … ہو۔ ایک طرف اڑیسہ کی حکومت کا یہ اعتراض ہو کہ ہم مدرسوں کو کتائی گھر بنانا نہیں چاہتے … دوسری طرف بنیادی تعلیم کو شکل و صورت دینے والے کے یہ الفاظ ہیں کہ چرخہ وہ لیا جائے جو ماحول … مدرسوں میں ایک اہم مرکز ہو اور جو اپنے اندر زیادہ سے زیادہ تعلیمی اہمیت رکھتا ہو۔ اب اگر اڑیسہ کے … کتائی کو جسے شاید اڑیسہ والے بہت ذلیل سمجھتے ہیں، اب بھی جاتے تو قصور کس کا تھا بنیادی تعلیم کا یا اڑیسہ میں اسے جاری کرنے والوں کا۔ لیکن اڑیسہ میں یہ تجربہ حکومت کی حمایت کے بغیر بھی جاری ہے محترمہ آشا دیوی (ہندوستانی تعلیمی سنگھ کی معاون معتمد) کچھ مہینے اُدھر اڑیسہ کے ان بنیادی مدرسوں کے معائنہ کرنے کے لیے گئی تھیں جو اب نجی طور پر چلائے جا رہے ہیں انھوں نے اس کام میں پورے چھ دن صرف کیے ان سات بنیادی مدرسوں کے لیے جو ہنوز جاری ہیں آشا دیوی صاحبہ نے ایک مرکزی اقامت گاہ، ایک کتب خانہ اور ایک مستقل نانا تجویز کیا ہے تجربے کو جاری رکھنے کے لیے ہندوستانی تعلیمی سنگھ ہر شکل مالی اور اخلاقی امداد کے لیے تیار ہے۔

صوبہ بہار میں یہ تجربہ اپنی پوری قوت کے ساتھ جاری ہے اور اس پر پورے سات سال صرف کیے جا چکے ہیں یہاں تجربہ بتیا تھانہ ضلع چمپارن میں ہو رہا ہے اور اس علاقہ کے پورے ۲۷ مدرسوں کا معائنہ ۱۰ مئی میں بہت چھان بین کے ساتھ کیا گیا تھا اور صحیح تعلیم کے جتنے اچھے نتائج ممکن ہو سکتے ہیں۔ ہر بندی ضبط، ذہانت، اچھی عادتیں، تحقیق و شوق، سماجی اور طبعی ماحول سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت اشتراک کا جذبہ وغیرہ سب ہی خصوصیات ان مدرسوں میں تعلیم پانے والے بچوں میں دیکھی گئیں۔

یو پی میں بھی یہ اسکیم حکومت کے ہاتھوں جاری ہے پاول پرائس صاحب کی کوشش سے دیہات کے مدرسوں کے لیے ایک نمونے کی عمارت بن کر تیار ہوئی ہے اس عمارت میں بچوں کے لیے ہر ضروری آرام ہوگا اس عمارت کی لاگت صرف دو سو پچاس روپے آتی ہے کشمیر میں بھی یہی بنیادی تعلیم رائج کی گئی ہے اور اس کا تجربہ بہت کامیاب ثابت ہو رہا ہے اور بچے بہت ذوق و شوق سے اس میں حصہ لے رہے ہیں۔

سی پی میں گو یہ تجربہ ہوا حکومت کے ہاتھ میں لیکن اس کے ساتھ جو سلوک کیا جا رہا ہے وہ مسٹر آریہ نائکم
سکریٹری ہندوستانی تعلیمی سنگھ کی اس رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے جو حال ہی میں شائع کی گئی ہے۔

۔ یکم مئی ۱۹۴۸ء کو سرکار نے ڈسٹرکٹ کاونسل کے تیس پرائمری مدرسوں کا پورا انتظام
اپنے ہاتھ میں لے لیا لیکن حالت کچھ ایسی تھی کہ مدرسوں میں دستکاری کا سامان
اگست تک نہ پہنچ سکا تقریباً تین مہینہ تک بنیادی تعلیم کا نصاب بغیر کسی دستکاری کے پڑھایا
گیا پورے پانچ مہینے تک ان استادوں کو تنخواہ ملی ہی نہیں جن کو سرکار نے ڈسٹرکٹ
کاونسل سے اپنے ماتحت لے لیا تھا۔

واقعات اور حالات کی یہ صورت دیکھ کر ممکن ہے تعلیم سے دلچسپی رکھنے والے اور تعلیم کا کام کرنے والے کچھ مایوس ہوں لیکن حکومت اور تعلیم کے رشتے پر ایک قطعی بات پیش کرنے کے لیے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے وہ الفاظ کافی ہوں گے جو انھوں نے ۱۱ر اپریل کو بنیادی قومی تعلیم کی دوسری کانفرنس میں اپنے خطبہ میں کہے تھے۔

" بنیادی تعلیم کا کام ہے کس کا کام، حکومت کا یا نجی آدمیوں اور اداروں کا؟ . . .
میں سمجھتا ہوں کہ بنیادی تعلیم کا کام ریاست کا کام ہے مگر بعض ریاستوں کی بنیاد اخلاق پر ہوتی ہے اور بعض کی نہیں ہوتی بنیادی تعلیم کا کام پہلی قسم کی ریاست کا کام ہے دوسری قسم کی ریاست کے ہاتھ میں یہ کام نہ پہنچے تو اچھا ہے۔ ہمارے ملک میں ابھی اس اخلاقی ریاست کا بننا باقی ہے۔ پھر جب تک وہ نہیں بنتی کیا ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں نہیں اگر ہمیں بھروسہ ہے کہ بنیادی تعلیم کا کام ہماری قوم کے لیے ضروری کام ہے تو ہمیں بیٹھے بیٹھے ریاست کا منہ تکنا نہ چاہیئے اچھی سے اچھی ریاست بھی تو اپنے ایک اشارہ سے وہ چشمے نہیں بہا سکتی جن کے سوتے پہلے سے رستے نہ ہوں اس لیے اس کام کو تو چلانا ہی ہے اور اس طرح چلانا ہے کہ جب کوئی حکومت بنیادی تعلیم کے کام کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہے تو وہ یہ نہ کہہ سکے کہ ہم جانتے نہیں کہ یہ کام کیسے ہوگا اور ہو بھی سکے گا یا نہیں۔

اور یہی نہیں جب حکومتیں اس کام کو سنبھال لیں اور اسے ہماری منشا کے موافق ہی چلائیں

تو کیا اس وقت ہمارا کام ختم ہو جائے گا؟ میں تو سمجھتا ہوں کہ نہیں۔ ... غیر سرکاری

لوگوں پر کام کا بوجھ آج بھی اور کل بھی رہے گا "

[illegible] آگے چل کر ڈاکٹر صاحب موصوف نے تعلیمی کام کی نوعیت واضح کرکے ان لوگوں کو بتلایا

[illegible] ۔ تعلیم کے کام کو گناہ سمجھتے ہیں۔

"ہر کام تعلیمی کام نہیں ہوتا کام تعلیمی جب ہی ہو سکتا ہے کہ اس کے شروع میں ذہن کچھ تیاری

کرے لیکن ہر بے دلی تعلیم نہیں ہے بنا سدھے جو ربھی ہوتے ہیں ہنرمند ہو کے بھی دیتے ہیں

... تعلیم کا ذریعہ تو وہی کام ہو سکتا ہے جو کسی ایسی قدر کی خدمت میں کیا جائے جو ہماری

خودغرضی سے پرے ہو کام کو تعلیم کا ذریعہ بنانے والوں کو ہر دم یاد رکھنا چاہیے

کہ کام بے مقصد نہیں ہوتا کام ہر نتیجہ پر راضی نہیں ہوتا کام بس کچھ کرکے وقت کاٹ دینے

کا نام نہیں کام دل لگی نہیں کام کھیل نہیں کام کام ہے۔ ا مقصد محنت ہے کام دشمن کی طرح

اپنا محاسبہ کرتا ہے پھر اس میں جو پورا اترتا ہے تو وہ خوشی دیتا ہے جو اور کہیں نہیں ملتی۔ کام ریاضت

ہے کام عبادت ہے لیکن ریاضت اور عبادت میں بھی تو لوگ خودغرض ہو جاتے ہیں اپنی

جنت بھی کر لی دوسرے سے کیا مطلب کام کا سچا مدرسہ اگر صحیح تعلیم کی جگہ ہے تو کام کو کبھی

اکیلے کی خودغرضی نہیں بننے دیتا بلکہ سارا مدرسہ کا مدرسہ ایک کام میں لگی ہوئی جماعت

بن جاتا ہے جس میں سب مل کر کام کرتے ہیں اور سب کے کام ہی سے سب کا کام پورا ہوتا

ہے... اور پھر کام کا مدرسہ اس پر بھی راضی نہیں ہو جاتا کہ بچوں نے کام سے اپنی

تربیت کر لی کام سے ان کے بچے ایک سماج سی بن گئے اور اس کے فرض اور

ذمہ داریاں جانے اور سمجھنے ہی نہیں بلکہ برتنے اور نبھانے بھی لگے بلکہ کام کا اچھا مدرسہ

اس مدرسے کی سماج کو بھی کسی اونچے مقصد کا خادم بناتا ہے تاکہ کہیں یہ نہ ہو کہ بچے اکیلوں

کی خودغرضی سے تو بچ جائیں مگر اس سے بچ کر سماجی خودغرضی کی دلدل میں پھنس جائیں۔"

آگے چل کر ہمارے رہنما نے ان لوگوں کو بھی ایک لمحہ کے لیے دعوت غور و فکر دی ہے جو بنیادی تعلیم کو برا جانتے ہیں۔

"شاید آپ کو بنیادی تعلیم کے اس نصاب میں جو ایک نئی کمیٹی نے بنایا تھا کچھ باتیں نہ بھائی ہوں گی   مگر نصاب بنیادی تعلیم کی اسکیم نہیں نصاب اصول نہیں نصاب ایسا نہیں کہ بدلا نہ جا سکے   ۔شاید آپ اس تجویز کو اس وجہ سے ناپسند کرتے ہوں کہ جنھوں نے اسے بنایا آپ کو وہ لوگ پسند نہیں لیکن اچھی اور ٹھیک بات تو اچھوں کا کھویا ہوا مال ہے جہاں بھی ہو وہ اسے اٹھا لیتے ہیں اس بات سے آپ کیوں اپنے فیصلہ پر اثر پڑنے دیں کہ پہلے یہ تجویز کس نے سنائی تھی اور کہاں بنائی اور کن لوگوں نے پہلے اسے مانا ہو ناموں کی نہ پرستش ہی کرنی چاہیے نہ ناموں سے یوں بھڑکنا چاہیے۔"

تعلیمی کام کی نوعیت کے متعلق کچھ یہی چیز ڈاکٹر صاحب موصوف نے ستر ہویں کل ہند تعلیمی کانفرنس میں تعلیمی نمائش کا افتتاح کرتے وقت فرمایا تھا لیکن ایک ڈاکٹر ذاکر حسین کس کس کو سمجھائیں اور کہاں کہاں جا کر ان باتوں کو کہیں۔ ملک کے ہر پڑھے لکھے آدمی کا یہ فرض ہے کہ وہ اس مسئلے پر سوچے اور اگر خود سوچ کر اپنے خیالات کو اچھے الفاظ میں ظاہر نہ کر سکتا ہو تو ڈاکٹر موصوف کے یہ الفاظ زبانی یاد کر لے اور جہاں اسے موقع ملے ـــ دوستوں کے مجمع میں، ریل کے ڈبے میں، سینما میں وقفے کے دوران میں ـــ لوگوں تک یہ پیغام پہنچاتا رہے کسی پروگرام کو کامیاب بنانے کے لیے عوام کی ہم خیالی بڑی چیز ہے اور یہ چیز کوئی مشکل نہیں اگر ہر تعلیم یافتہ اپنے حلقۂ اثر میں اپنا فرض انجام دے۔

بنیادی تعلیم میں سات سال کی عمر سے تعلیم کی ابتدا ہوتی ہے لیکن تعلیم کی اس سے پہلے بھی ایک منزل آتی ہے سمجھ بوجھ رکھنے والوں نے ابھی اس مسئلہ کو اس لیے نہیں چھیڑا تھا کہ کام بہت ہے اور کام کرنے والے تھوڑے اس لیے انھوں نے اتنا کام تجویز کیا جو ہو سکتا تھا لیکن ہماری ستر ہویں کل ہند تعلیمی کانفرنس میں صدارت کرنے مشہور وائس چانسلر جناب امرناتھ جھا صاحب نے اپنے مخصوص ادبی انداز میں نرسری اسکولوں کی ضرورت پر روشنی ڈالی ہے لیکن میرے خیال میں نرسری اسکولوں کی ضرورت

ـ ستان میں ہماری قوم کی ضرورت نہیں ہے ضرورت زیادہ سے زیادہ ۲ فی صدی ہندوستانیوں کی ہوگی ہمیں نرسری اسکولوں سے زیادہ ایسے مدرسوں کی ضرورت ہے جہاں بچے پیدا کرنے والے [illegible] سکھایا جائے کہ بچوں کو پالا کس طرح جاتا ہے۔ اس چیز کو فی الحقیقت تعلیم بالغان کا جزو ہونا چاہیے [illegible] کے خطبہ صدارت میں آرٹ کی تعلیم پر بھی بہت زور دیا گیا ہے کچھ تعلیم بالغان کا ذکر ہے، اور کچھ مذہبی تعلیم اور شعبہ انٹر کالج اور جوہر ہائی اسکول کی نوع کے اداروں کا ان تمام عنوانات پر جو کچھ کہا گیا ہے اس کی ادبی قدر و قیمت تو زیادہ ہے لیکن تعلیم کا وہ کام کرنے والے جن کے سامنے آسمان کی بادشاہت کے بجائے ہر وقت وہ خطۂ خاک جس رہتا ہے جسے ہندوستان کہتے ہیں اس بات سے میں بہت کم عملی اشارہ پائیں گے۔ تعلیم بالغان کا مقصد ہر قسم کے بالغوں کی تعلیم کو زندگی کی عمر تک جاری رکھنا ہونا چاہیے اور وہ ا[illegible]ے ہے ہو تو یونیورسٹی کے گریجویٹ کے لیے بھی ہو۔" یہ نصب العین تو بہت اچھا ہے لیکن اتنا ۔ [illegible] جہاں ہم اس وقت کھڑے ہوئے ہیں وہاں سے اس کی طرف لپکنے کی کوشش کی تو شاید پیروں تلے کی زمین بھی ہاتھ سے جائے۔ یہاں مسئلہ تیس کروڑ مرد اور عورتوں کو اپنا نام لکھنا سکھانا ہے اخیر ریلوے اسٹیشنوں پر ٹکٹ خریدنے کا سلیقہ سکھانا ہے اور انھیں جھونپڑی میں بھی ایک ڈھنگ سے رہنے کی ترغیب دینی ہے خواجہ غلام السیدین صاحب کا یہ ارشاد اس ضمن میں کس قدر بامعنی ہے کہ ہمارے تعلیم بالغان کے مرکزوں کو ہمارے بالغوں کے لیے دلکشش بنانے کی ضرورت ہے۔ اسی طرح اور باتیں ہیں جن پر یہاں تنقید و تبصرہ کی گنجائش نہیں۔ مدرس کو بھی اچھا بننے کی تلقین فرمائی گئی ہے لیکن مدرس کا اچھا بننا ایک پورے سماج کی اچھائی پر منحصر ہے یہ بات نہ معلوم کیوں فراموش کر دی گئی۔ اونچی اونچی تنخواہیں پانے والے کیا جانیں یہ تو کچھ مدرس ہی سمجھ سکتا ہے کہ موجودہ حالات میں اس کا اچھا رہنا حقیقتاً کتنا دشوار ہے۔ کیا ہمارا موجودہ مدرسہ ہمارے اچھے مدرس کے لیے جاودانی موت سے کم ہے؟

اصل میں اس سترہویں کل ہند تعلیمی کانفرنس میں جو کچھ ہوا وہ ان تلخ حقیقتوں سے بہت کچھ ہٹ کر ہوا جو آج ملک اور قوم کے سامنے ہیں اور کس قدر ہٹ کر ہوا اس کا اندازہ لگانے کے لیے اس کانفرنس کا خطبۂ صدارت پڑھیے۔ خواہ نرسری اسکول کا ذکر ہو یا آرٹ کی تعلیم کا، بالغوں کی تعلیم کا مسئلہ ہو، مدرسوں میں مذہبی

تعلیم کا سب میں بڑا واذہیت تعلیمی ہے ہندوستان میں آج جماعتی تعلیم کا سوال نہیں ہے ہمارا تعلیمی مسئلہ عوام کی تعلیم کا مسئلہ ہے۔

فی حقیقت ہم لوگوں کی سب سے بڑی غلطی تو یہ ہے کہ ہم انگلستان کے ۔وہاں سے متاثر ہو کر اس ملک زندگی کو بھول جاتے ہیں جس کی گرد ہمارے چاروں پرانی ہوئی ہے اور واقعات کو دیکھ کر صورت بہتر بنانے کی تدبیر سے زیادہ ان خوبصورت الفاظ کی رو میں بہنے لگتے ہیں جو دوسرے لوگ ہم تک کتابوں کے ذریعہ پہنچاتے ہیں اور لوگ بھی وہ لوگ ہم سے جن کے خیالات جدا، حالات جدا۔

یہاں تک پہنچ کر مجھے تعلیم بالغان کے سلسلے میں آپ کو پھر کچھ پیچھے لے جانا ہے —— تعلیم بالغان کا چرچا بھی جاری ہے دہلی یو۔پی۔ بمبئی اور پنجاب میں یہ کام خاص اہتمام سے جاری ہے ریاست کشمیر نے اپنے تمام ناخواندہ ملازمین کو ایک سال میں خواندہ بنانے کا اعلان کیا تھا میسور میں بھی یہ کام پوری سرگرمی سے جاری رہا اور اس میں یونیورسٹی کے طلبا کی خدمات قابل ستائش ہیں موسم گرما کی تعطیلات کے دوران میں ۴۴ جماعتوں نے مختلف مرکزوں پر کام کیا۔ ضروری نقشوں کاغذ اور پنسلوں وغیرہ کا انتظام ریاست کی طرف سے تھا ان مساعی کا نتیجہ یہ ہے کہ امسال میسور میں خواندہ مردوں کی تعداد ۲۰ فی صدی ہے اور خواندہ عورتوں کی تعداد ۵ فی صدی ہے ریاست رامپور میں بھی یہ خدمت بہت منظم صورت میں جاری ہے گزشتہ تعلیمی سال کے چند مہینوں میں تعلیم بالغان کے مرکزوں پر اکسٹھ ہزار کی حاضری تھی امسال یہ تعداد بڑھ گئی ہوگی جس کے لیے محکمہ تعلیمات رامپور قابل مبارکباد ہے اس سلسلے کی سب سے دلچسپ کوشش بہار میں ہوئی ہے جمال پور ورکشاپ میں گرد و نواح سے تقریباً چھ ہزار مزدور روز جمال پور پہنچتے ہیں ان مزدوروں کا آنے جانے کا سفر قریب دو گھنٹہ کا ہوتا ہے چنانچہ اس خیال سے کہ

کیوں خموشی میں کٹے لمحہ بربادیٔ دل
اتنی فرصت میں مرتب نئی دنیا نہ کریں

مسٹر حامد علی صاحب انسپکٹر مدارس نے ایک اسکیم تیار کر کے ریلوے افسران کے پاس بھیجی ہے اسکیم کے مطابق ان مزدوروں کو ان کے سفر کے دوران میں نہ صرف لکھنا پڑھنا سکھایا جائے گا بلکہ ان کو ان کے پیشے

سے متعلق ایسی معلومات بھی بہم پہنچائی جائیں گی جو انھیں اور اچھا کارگر بنا سکیں تعلیم بالغان کے سلسلے میں یہ سال کچھ زیادہ نتیجہ خیز نہیں رہا۔ نئی مردم شماری کے اعداد و شمار آپ کی نظر سے گزرے ہوں گے اس میں خواندہ لوگوں کی تعداد میں صرف تین چار فیصدی کا اضافہ ہوا ہے کاش ہمارے ملک کے تعلیم یافتہ نوجوان ڈاکٹر لوباک صاحب کے EACH ONE TEACH ONE والی رائے پر کام کرتے جہاں تک تعلیم بالغان کے مطالعہ میں ادب کی ترتیب و تدوین کا تعلق ہے اس سلسلے میں جامعہ ملیہ میں خاصا کام ہو رہا ہے۔

کلکتہ یونیورسٹی نے اندھوں کو لکھنا پڑھنا سکھانے کا تجربہ شروع کیا ہے اس کام کے لیے ایک خاص آلہ [illegible] کی ضرورت پڑتی ہے جو یہاں جنگ کی وجہ سے یورپ سے نہیں منگائے جا سکتے لیکن ہمیں خوشی ہے کہ کلکتہ یونیورسٹی نے اپنا تجربہ جاری رکھنے کے لیے خود اپنے معمل میں پچاس ایسے آلے بنا لیے ہیں۔ بمبئی نے پڑھنا لکھنا سیکھنے والوں اور زیادہ اچھی طرح تعلیم دینے کے لیے کچھ فلم تیار کیے ہیں انھیں فلموں کو ماحول کے مطابق بنا کر سی۔ پی میں بھی استعمال کیا جائے گا۔

بہرحال یہ سال تعلیمی لحاظ سے کچھ نہ کچھ بیداری کا تو ضرور رہا ہے لیکن عمل تقریباً مفقود رہا اور کہا نہیں جا سکتا کہ کب تک مفقود رہے گا خدا کرے نیا سال بہتر حالات پیش کرے

فضل الدین اثر ایم اے

یا سیاسی، اخلاقی ہو یا جمالی، مذہبی ہو یا روحانی، اس وقت ایک عجیب خلفشار میں گھری ہوئی ہے رات کی تاریکی ایسی انتہا تک پہنچی ہوئی ہے تمدن انسانی کے انتشار کی سب سے بڑی مظہر موجودہ ہیبت ناک جنگ ہے لیکن رات جب انتہائی تاریک ہو جاتی ہے تو اسی وقت سے اس کا زوال بھی شروع ہو جاتا ہے نصف [illegible] کے بعد صبح کے آثار شروع ہو جاتے ہیں۔ اس وقت گو کہ انسانیت شب کی انتہائی تاریکی میں لپٹی ہوئی ہے اس کا مستقبل تاریک دکھائی دیتا ہے لیکن اسی تاریکی ہی میں [illegible] بھی دکھائی دینے لگے ہیں۔

طلوع صبح کے یہ آثار اس وقت عوام اور سیاستدانوں، حکام اور اہل زر کے دلوں میں پیدا ہوئے ہیں مگر شعرا و فنکار کے حساس دلوں میں پائے جاتے ہیں بعض بعض قومی رہنماؤں کے دلوں میں بھی یہ تصور اب جاگزیں ہونے لگا ہے اس وقت ایک ایسی شاعری کی ابتدا ہو رہی ہے جو انسانیت کا تصور پیش کرتی ہے جو انسانیت کو دوبارہ اخوت اور بھائی چارے کا سبق دینا چاہتی ہے جو اس کو دوبارہ اس کی روحانی بنیادوں کی طرف رجوع کرنا چاہتی ہے جو انسانیت میں ظلم و سرکشی کی جگہ محبت و رفاقت کی کارفرمائی دیکھنا چاہتی ہے۔ اسی قسم کی شاعری کے سب سے بڑے نمائندے اقبال اور ٹیگور ہیں اقبال نہایت بلند آہنگی اور جوش سے انسانیت کو محبت کی دعوت دیتا ہے ٹیگور نہایت نرم اور میٹھے سروں میں اس کو اس طرف مائل کرنا چاہتا ہے۔ انگلستان میں ایک عالمگیر انسانیت کا تصور پیش کرنے والے ادیب برنارڈ شا اور ویلز ہیں شا اشتراکیت کے ذریعہ اس مقصد کو حاصل کرنا چاہتا ہے ویلز دنیا کی ایک متحدہ ریاست کا خواب دیکھتا ہے فرانس میں روماں رولاں، جرمنی میں تامس مان، روس میں گورکی اسی تحریک کے حامل ہیں، ترکی ادب میں خالدہ ادیب خانم اسی انسانیت کے نصب العین کی ترجمانی کر رہی ہیں۔

اہل سیاست میں گاندھی جی اور ابوالکلام آزاد ہندوستان میں اسی نصب العین کے لیے جد و جہد کر رہے ہیں لیکن ان کی کوششیں اس وقت تک عملاً بار آور نہیں ہو سکتیں جب تک کہ ہندوستان آزاد نہ ہو۔ ترکی کی موجودہ پالیسی کلیتاً انسانیت کی دوستی پر مبنی ہے وہ خود کسی لڑائی میں حصہ لینا نہیں [illegible] اس کا خواہش [illegible] دنیا میں امن و امان قائم کرے جس طرح کہ اس کے صدر عصمت انونو کے اعلانات

سے ظاہر ہوتا ہے تقریباً تمام عالم اسلام کی پالیسی امن وامان پر مبنی ہے لیکن چونکہ وہ خود آزاد نہیں ہے اس لیے اس کی کوششیں زیادہ موثر نہیں ہیں

غرضیکہ نفس انسانی میں موجودہ حیوانیت [illegible] بربریت کے خلاف ایک رد عمل شروع ہو گیا ہے اس کے نفس میں ایک انقلاب [illegible] لیکن یقینی طور پر پیدا ہو رہا ہے اسی نفسی انقلاب کے خارجی مظاہرات وہ عالمگیر ادب اور شاعری ہیں جس کی طرف ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں اور جس کے حامل یہ چند صفحات بھی ہیں جو اس وقت پیش کیے جا رہے ہیں۔ اس کی مظہر وہ مختصر کوششیں بھی ہیں جو اس مقصد کے حصول کے لیے بعض جگہ کی جا رہی ہیں لیکن اس وقت تک کوئی عالمگیر تحریک کا منظم وجود نہیں ہے اور جو کچھ خصیہ کوششیں کی گئی تھیں وہ بھی اقوام کی خود غرضیوں کے باعث تباہ ہو چکی ہیں۔

انسانیت کی تحریک کو وسیع اور منظم کرنے کے لیے تمام دنیا کے انسانوں کی معاشی، سیاسی، تعلیمی اور مذہبی زندگی کو منظم کرنے کی ضرورت ہے۔ لیکن یہ تنظیم اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ ہم ان خارجی مظاہرات کے داخلی محرکات کو نہ سمجھ لیں ان تمام محرکات کا اصل اور حقیقی سرچشمہ نفس انسانی ہے جب تک نفس انسانی سے کلیتاً واقف نہ ہوں ہم اس میں انقلاب پیدا نہیں کر سکتے اور جب تک داخلی انقلاب نہ ہو خارجی انقلاب کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ایک جدید انسانیت پیدا کرنے کے لیے زندگی کی ایک طرح نو ڈالنے کے لیے ہم کو نفس انسانی کی طرف متوجہ ہونا چاہیے اس کی مختلف صلاحیتوں کو سمجھنا چاہیے نفس انسانی کے اس علم کی بنیادوں پر ہم جدید انسانیت کی عظیم الشان عمارت کھڑی کر سکیں گے اور اس کو ایک نئی زندگی دے سکیں گے احیائے انسانی کے لیے نفس انسانی کے [illegible]

إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ بِقَوْمٍ حَتَّى يُغَيِّرُوا بِأَنفُسِهِمْ — خدا اس وقت تک کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک کہ وہ اپنے نفس میں انقلاب نہ پیدا کرے

ڈاکٹر عبدالحمید قاضی ایم اے پی ایچ ڈی

خطبۂ صدارت

(یہ خطبہ میسویں تا اوی تعلیمی کانفرنس یو۔پی منعقدہ میرٹھ کے شعبۂ اردو میں پڑھا گیا)

میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے اپنی کانفرنس کی صدارت کے لیے یاد کیا ہماری [illegible] طرح خانوں میں بٹ گئی ہے کہ ایک ہی پیشہ اور ذوق کے لوگ بھی مشکل سے ایک جگہ جمع ہو پاتے ہیں۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے معلموں کو اتنا موقع نہیں ملتا کہ اسکولوں اور مدرسوں کے اساتذہ [illegible] ل کر تبادلۂ خیالات کر سکیں ان کی سن سکیں اور اپنی کہہ سکیں۔ تاکہ دونوں کو فائدہ ہو اور دونوں کا رشتہ مضبوط رہے میں اسی خیال سے آپ کی دعوت قبول کر کے یہاں حاضر ہوا ہوں [illegible] آپ کی مشکلوں اور آسانیوں، آپ کی پابندیوں اور آزادیوں کو بہتر طور پر سمجھ سکوں اور شاید اس میں یونیورسٹیوں اور کالجوں کے تجربہ کی روشنی میں آپ کو کچھ مدد دے سکوں مجھے آپ کو کوئی رائے نہیں دینا ہے میں اس کا حق نہیں رکھتا آپ سے بعض گزارشیں کرنی ہیں اگر آپ نے انھیں توجہ اور دلچسپی سے سنا تو میں آپ کا ممنون ہوں گا اور اپنے طور پر ان سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تو یہ میری بڑی خوش نصیبی ہوگی۔

خواتین و حضرات

شاید آپ مجھے یہاں پا کر تھوڑے سے پشیمان ہو رہے ہوں آپ کو اندیشہ ہو کہ میں آپ کے سامنے اردو کی ابتدا اور ارتقا کے متعلق نئے نئے نظریے پیش کر کے آپ کو [illegible] میں ڈال دوں گا یا اردو ہندی، ہندوستانی کے مسئلہ کے سلجھانے یا بالفاظ دیگر الجھانے کی کوشش کروں گا یا تحقیق و تنقید کے مغربی اصولوں سے آپ کو مرعوب کرنے کی کوشش کروں گا لیکن آپ اطمینان رکھیے میرا یہ ارادہ نہیں ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ آپ کی کانفرنس کا کام یہ نہیں ہے کہ تحقیق و تنقید کے مسائل کے حل تلاش

گرسے یہ کام دوسرے ادارے بہتر طور پر کر سکتے ہیں آپ کا کام تو ہماری درسگاہوں میں اردو کی تعلیم
کی حیثیت زبان اور بحیثیت ادب کے نگرانی کرنی ہے آپ [illegible] زبان
سکھائی جاتی ہے وہ سیکھی بھی جا سکتی ہے یا نہیں دوسرے الفاظ میں زبان سکھانے کا طریقہ صحیح ہے یا غلط لغات
کی تدوین جن اصولوں پر ہوئی ہے وہ ٹھیک بھی ہیں یا نہیں جو طالب علم ان [illegible] سے نکلتے ہیں انہیں
صحیح اردو بولنا اور صحیح اردو لکھنا آتا ہے یا نہیں وہ جب کسی سے اختلاف ظاہر کرتے ہیں تو یہ تو نہیں کہتے
کہ اس میٹر میں آپ کے خیالات [illegible] کے Entirely against ہوں وہ جب لکھتے
ہیں تو ان کا املا غلط تو نہیں ہوتا ان کی تحریروں میں موٹے موٹے ثقیل الفاظ میں اپنی کم فہمی کو چھپانے
کی کوشش تو نہیں کی جاتی وہ اپنی درسی کتابوں میں سے چلے کے چلے نقل کرنے کے عادی تو نہیں
ہوتے وہ قواعد کی موٹی موٹی غلطیاں تو نہیں کرتے وہ اپنی زبان بولنے یا لکھنے میں شرم تو محسوس
نہیں کرتے۔ اور آپ کا کام صرف یہیں ختم نہیں ہوتا بلکہ جب سے اردو ثانوی مدارس میں ذریعہ تعلیم
اور ذریعہ امتحان ہو گئی ہے اس وقت سے آپ کے فرائض اور بڑھ گئے ہیں اب آپ کو وہ سب
کام کرنے ہیں جو دراصل شروع سے آپ کو کرنے تھے مگر ایک غلط ذہنیت کی وجہ سے آپ سے چھین کر
[illegible] سے دئے گئے تھے۔ آپ کو یہ دیکھنا ہے کہ تاریخ یا جغرافیہ اردو میں پڑھانے والوں
کو کوئی دشواری اصطلاحات کی وجہ سے پیش تو نہیں آتی آپ کو محض علمی نقطۂ نظر سے اس کا جائزہ
لیتے رہنا ہوگا ذریعہ تعلیم اردو ہو جانے سے طلبا کی ذہنی استعداد پر کیا اثر پڑ رہا ہے۔ آپ کو ان لوگوں
کو جواب دینا ہے جو سمجھتے ہیں کہ اردو میں تعلیم ہونے سے انگریزی کمزور ہو جاتی ہے مختصر طور پر اس انقلاب
[illegible] آپ کی ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں۔ پہلے تو آپ کے مدرسوں میں اردو کی
حیثیت ایک نیچ ذات یا اچھوت کی سی تھی۔ آپ کا کام یاد کرا دینے اور معنی سے زیادہ نہ تھا اردو
کے استاد کی حیثیت سے آپ گویا سیڑھی کے سب سے آخری زینہ پر تھے اور پھر ذرا سی کش مکش ہوتا
[illegible] آ رہنا یقینی تھا آپ کی تنخواہوں میں اور آپ کے دوسرے رفیقوں کی تنخواہوں میں کوئی
نسبت نہ تھی۔ آپ کے کام میں اور دوسروں کے کام میں کوئی مناسبت نہ تھی۔ آپ فارسی اور عربی

کے استادوں سے ہی گئے گزرے سمجھے جاتے تھے مگر اب یہ صورت بدل گئی ہے یہ تو آپ کا کام ہے کہ
[illegible] کے اثرات پوری طرح محسوس نہیں ہوتے وہاں انھیں پھیلائیں اور ان کا احساس
دلائیں جہاں یہ تبدیلی ہی رونما نہیں ہوئی وہاں اس کے لیے جد وجہد کریں۔ اردو پڑھانے والوں کی
[illegible] کے سرکاری اور نیم سرکاری اداروں میں دوسرے مضامین پڑھانے والوں
سے کم نہ ہوں ان کا درجہ ان کی حیثیت، ان کی قدر و منزلت ویسی ہی ہو جیسی انگریزی کے اساتذہ
[illegible] کے لیے آپ کی [illegible] کو عملی جد وجہد کرنی پڑتی ہوگی اور ابھی اور کرنی پڑے گی۔ مجھے
امید ہے کہ اس میں آپ ضرور کامیاب ہوں گے۔ کیونکہ آپ کے مطالبے حق اور انصاف پر مبنی ہوں گے
[illegible] حق اور انصاف کو لوگ کچھ عرصے تک دبا سکتے ہیں کچل نہیں سکتے

مگر صرف قرار دادیں پاس کرنے اور حکومت کو توجہ دلانے اور جلسے کرنے سے یہ کام پورا نہ ہوگا
اس کے لیے آپ کو بار بار اپنا بھی سختی سے احتساب کرنا ہوگا۔ اپنے پیشے سے محبت بلکہ اس سے عشق پیدا
کرنا ہوگا زبان و ادب کا علم ہی نہیں بلکہ اس کا ذوق بھی حاصل کرنا ہوگا قواعد سے واقفیت اور عربی
[illegible] کے معنی ہی نہیں، شعر و ادب کا اعلیٰ مذاق بھی سیکھنا ہوگا ادب کی تعلیم کا مقصد کیا ہے
اس تعلیم کا رشتہ دوسرے مضامین سے اور بحیثیت مجموعی ثانوی تعلیم کے نظام سے کیا ہے اور اسے
کس طرح استوار کرنا ہے یہ اور اس قسم کے بہت سے سوال آپ کے ذہن میں پیدا ہوں گے
آپ کو ان کا جواب دینا ہوگا آئیے اس سلسلے میں میں آپ کی کچھ مدد کردوں اور اردو زبان اور
اردو ادب دونوں کی تعلیم کے سلسلے میں جو مسایل پیدا ہوتے ہیں ان کا نقشہ پیش کروں۔

اردو کی تعلیم کے سلسلے میں ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ ہم ثانوی مدارس میں کس قدر
اردو سکھانا چاہتے ہیں اگر ہمارے ابتدائی مدارس اچھے ہوتے تو ہمارا کام بہت ہلکا ہوتا۔ کیوں کہ
طالب علم ثانوی مدارس میں داخل ہوتے وقت اپنے خیالات کا اظہار تقریر و تحریر میں کر سکتے
لیکن میرا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہے اور اس لیے ثانوی مدارس میں آپ کو وہ کام بھی کرنا
ہوگا جو اس سے پہلے کرنے کا تھا اور اس کا بھی خیال رکھنا ہے کہ آئندہ [illegible] کام میں مدد ملے یا سہولت

ہو اگر ہمارے نظام تعلیم میں ہر بچے کی صلاحیت دیکھی جاتی تو ثانوی مدارس میں بہت سے مضامین
بے ربط طریقے سے نہ پڑھائے جاتے بلکہ عمر اور استعداد کو دیکھتے ہوئے ان میں تفریق کی جاتی مگر
پھر بھی ہمارے صوبے میں ان میں سے ہر مدرسے میں اردو زبان اظہار خیال کے ایک ذریعہ کی حیثیت
سے ضرور پڑھائی جاتی کیونکہ یہی اس صوبے کی مادری زبان ہے۔ مگر موجودہ حالت میں جب
جبکہ سب ثانوی مدارس ایک قسم کے ہیں اور کہا جاتا ہو کہ ان میں ایک قسم کی ادبی تعلیم دی جاتی ہو ہمارا
یہ ضرور فرض ہے کہ طلبہ کو اردو اچھی طرح لکھنا اور بولنا سکھائیں۔ آپ کہیں گے کہ اتنی سی بات کے لیے اس
قدر تمہید کی کیا ضرورت تھی مگر ذرا غور سے دیکھیے تو یہ صحیح اور اچھی اردو اتنی آسان اور اتنی عام نہیں ہو
جتنی آپ سمجھے ہیں۔ یہ زبان آپ اسی وقت سکھا سکیں گے جب آپ اردو زبان کو ایک آزاد،
مستقل اور ترقی یافتہ ہندوستانی زبان کی حیثیت سے دیکھیں میرا خیال ہو کہ ہمارے مدرسوں میں
اب تک اردو کو فارسی، عربی کا ایک ضمیمہ سمجھا جاتا ہو یہی وجہ ہو کہ جب مشرقی زبانوں کو بچانے اور
محفوظ رکھنے کا سوال پیدا ہوتا ہو تو ان میں اردو بھی شامل کر لی جاتی ہو ممکن ہو کہ آپ میں سے
[illegible] ایک آزاد، مستقل اور ترقی یافتہ زبان سمجھتے ہوں اور اسی حیثیت سے اس کی تعلیم
دیتے ہوں مگر کیا آپ اسے ایک ہندوستانی زبان کی حیثیت سے بھی پڑھاتے ہیں۔ اردو کی تعلیم
اور اردو کی اشاعت کا مسئلہ ہندی کی مخالفت کے مترادف نہیں ہو جہاں تک اردو کا تعلق ہو وہ
ہندی اور [illegible] بلکہ ہندی سے ابھی اردو کو اور قریب ہونا چاہیے
ہندی سے قریب ہونے کے معنی ہندی میں ضم ہو جانے کے ہرگز نہیں ہیں اور کم از کم میں تو اس کا تصور
[illegible] زبان بھی کسی دوسری زبان میں ضم ہو سکتی ہو یا کی جا سکتی ہو میرا مطلب تو صرف
یہ ہو کہ اردو کو ہندوستان کی ایک زبان کی حیثیت سے پڑھایا جائے صرف ایک فرقہ کی زبان کی
حیثیت سے نہ پڑھایا جائے [illegible] ہو کہ یہ کسی ایک فرقہ کی زبان نہیں ہو بلکہ ہندوستان کے ان
تمام باسیوں کی زبان ہو جو اسے اپنانے کے لیے تیار ہوں اور جو اسے بولنے اور لکھنے میں فخر محسوس
کریں ہاں وہ لوگ بڑے بدنصیب ہیں جنہوں نے ماں کی گود میں آنکھ کھولی تو اسی زبان کی لوریاں

اُردو ادب ۱۹۴۱ء میں

اس سال یورپ میں بڑی خوفناک لڑائیاں ہوئی ہیں اور جنگ کے شعلے اب مشرق میں بھی بھڑکنے لگے ہیں دنیا چھوٹی سی ہو گئی ہے اور پھیل بھی گئی ہے اب کسی ملک کا مسئلہ صرف اسی ملک کا نہیں رہا ساری دنیا کا مسئلہ ہو گیا ہے۔ زلزلہ کسی جگہ آئے اس کی دھمک ساری دنیا میں محسوس ہوتی ہے ابھی تک ہندوستان والے ساحل دور سے تماشا دیکھ رہے تھے اب معلوم ہوتا ہے کہ جنگ ان کے دروازے تک آ گئی۔ کچھ گھبراہٹ پھر کچھ تسلی کچھ سکون، کچھ ہیجان، کچھ پریشانی مگر پھر یہ اطمینان کہ ابھی بڑے دن دور ہیں کچھ نامعلوم سا خوف، کچھ نامعلوم سی امیدیں یہی اب تک ہماری کل کائنات ہے۔ اور ادب تو ہماری ہی زندگی کا آئینہ ہے گزشتہ چند سال سے اس میں بڑی تیزی سے بعض نئی باتیں آ گئی ہیں۔ ذہنی اعتبار سے ہم کچھ آگے بڑھے ہیں، بڑھے کیا ہیں حالات و واقعات نے آگے ڈھکیل دیا ہے مگر ہمارا دل پیچھے ہے، یہی وجہ ہے کہ ہمارے ادب میں کچھ اس تیزی سے نئے اثرات آ گئے ہیں جیسے ایک ساتھ گرمی پڑنے سے بہت سے پھل پک تو جائیں مگر ان میں اچھی طرح رس نہ آیا ہو تیزی میں تلخی ملی ہوئی ہے۔ ہماری معلومات بچوں کی سی، ہماری امیدیں جوانوں کی سی مگر ہمارے عمل بوڑھوں کے سے ہیں یہ بات بعض لوگوں کو کچھ عجب سی معلوم ہوگی مگر ماضی کے سارے بوجھ کو لے کر مستقبل کی چڑھائی چڑھنا اور اس بوجھ سے ایک ایک چیز کو بادل ناخواستہ پھینکتے جانا اور پھر اس کی طرف حسرت سے دیکھتے بھی جانا کچھ آگے بڑھنا کچھ ٹھہر جانا، اس پر تعجب کرنا کہ جب ہمارے بزرگوں کو کوئی چڑھائی طے نہ کرنا پڑی تو ہم پر یہ مصیبت کیوں نازل ہو پھر کچھ ہمت کر کے تیز قدم بڑھانا مگر اس تیزی کی وجہ سے جلد تھک جانا محض استعارہ نہیں ہماری زندگی کی بہت واضح تمثیل ہے۔

جنگ کی وجہ سے جو مشکلات پیدا ہوئی ہیں ان میں کاغذ کی روزافزوں گرانی خاص طور پر قابل ذکر ہے سعدی نے لکھا کہ دمشق میں ایسا قحط پڑا تھا کہ لوگ عشق کرنا بھول گئے تھے ہمارے یہاں بھی کاغذ کے قحط کی وجہ سے اظہار عشق پر اثر پڑا ہے۔ مگر اردو کی ترقی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اچھے اچھے سے رسالے

سنیں مگر جواب نہ دے سکیں ہو کر اسے سمجھے، بولے اور لکھے سے شرماتے ہیں۔ مجھے اس پر افسوس ہوتا ہے کہ اس صوبے میں کچھ ہندو اور دوسرے لوگ اردو زبان کو چھوڑتے جاتے ہیں جو ہم سب کی مشترکہ زبان ہے۔ ایک حد تک اس کی وجہ میں یہی سمجھتا ہوں کہ اردو کو اب تک صحیح طور پر نہیں پڑھایا گیا اور درسی کتابوں میں اس کی ہندوستانی حیثیت پر زور نہیں دیا گیا۔ لیکن جب میں ہندوستانی حیثیت پر زور دینا چاہتا ہوں تو میری مراد یہی ہوتی ہے کہ وہ رہے اردو وہ بدل کر کوئی اور زبان نہ بن جائے۔ ابھی اور [illegible] ہم زبان سکھائیے اور پڑھائیے تو ممکن ہے کہ یہ بڑھتی ہوئی خلیج کم ہو جائے یا کم از کم اس کا بڑھنا رک جائے۔

مگر ان درسگاہوں میں آپ کا کام صرف زبان کی تعلیم دینا نہیں، ادب سے بھی آشنا کرنا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ ہم اب تک ادبی تعلیم پر ضرورت سے زیادہ زور دیتے رہے ہیں اور ہمارے ثانوی مدارس کو لازمی طور پر صنعتی یا حرفتی بننا ہے اس لیے ادب کی تعلیم کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ ادبی تعلیم پر جو لوگ اعتراض کرتے ہیں ان کا خیال ہے کہ شاعروں، ادیبوں اور پرانے دیوانوں کے متعلق معلومات [illegible] آج کل جب سائنس کی جدید ایجادات نے دنیا کو قیامت کا نمونہ بنا رکھا ہے ہمارا فرض ہے کہ سائنس کے تمام نئے آلوں سے مسلح ہو جائیں تاکہ دنیا میں ہمارا بھی کہیں ٹھکانا ہو۔ یہ لوگ شاعروں کی کثرت دیکھ کر اقبال کے الفاظ میں کبھی کبھی پکار اٹھتے ہیں کہ ؎

جو کام کچھ کر رہی ہیں قومیں انھیں مذاق سخن نہیں ہے

یہ اپنی گفتگو میں اکثر دہراتے رہتے ہیں کہ شاعری بیکاری کا مشغلہ ہے کبھی یہ لوگ اخلاق کے دیوتا بن کر کہہ دیتے ہیں کہ ہمارا ادب العالیہ (classics) مخرب اخلاق ہے مگر آج جبکہ جنگ کے شعلے اتنی تیزی سے ہر طرف بھڑک رہے ہیں ہمیں بنیادی باتوں اور ضمنی باتوں میں فرق کرنا ہے۔ آج بھی بنیادی چیز ٹینک اور ہوائی جہاز تیار کرنا نہیں ہے بلکہ جذبۂ انسانیت کی توسیع و تہذیب ہے آج بھی یہ بات یاد رکھنا ہے کہ یہ خون کی ہولی جو آج کھیلی جا رہی ہے اس ذہنیت کا نتیجہ ہے جو ایک خاص ادب کے ذریعہ سے خاص خاص قوموں کو سکھائی گئی تھی۔ آج بھی یہ ذہن نشین کرنا ہے کہ موجودہ جرمنی کو یہ قدریں

سب سے پہلے نیٹشے کی کتابوں میں دی گئی تھیں اور ان کا اثر اس وجہ سے اور بھی زیادہ ہوا تھا کہ وہ بڑی جاندار اور دلکش نثر میں لکھی گئی تھیں۔ آج بھی اس کا اعلان کرنا ہے کہ آدمی قدریں محض سیاسی کی قاعدے نہیں بلکہ ادب اور تہذیب انسانی کے دوسرے سرچشموں سے ملتی ہیں یعنی بڑی چیزیں وہ نہیں ہیں جو آج نظر آتی ہیں بڑی وہی ہیں جنھیں آج لوگوں نے چھوٹا بنا رکھا ہے اور ان بڑی چیزوں کا مقابلہ بھی انھیں بظاہر چھوٹی چیزوں سے کامیابی سے کیا جا سکتا ہے۔ اقبال نے جب کہا تھا ––

غلامی میں نہ کام آتی ہیں تدبیریں نہ شمشیریں جو ہو ذوق یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

تو یہ محض شاعرانہ خیال نہیں تھا یہ ایک حقیقت تھی اس ذوق یقیں کو پیدا کرنے میں اور اقبال ہی کے الفاظ میں اسے لوائے سینہ تاب بنانے میں اور اس سے زندگی میں گرمی پیدا کرنے میں ایک ادب کی تعلیم ہی سب سے زیادہ کامیاب ہو سکتی ہے اور علموں میں خاص طور سے ادب کا علم امتیازی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ یہ آدمی قدریں ادب ہی ایک نسل سے دوسری نسل کو زیادہ خوش اسلوبی کے ساتھ منتقل کر سکتا ہے اگر ہندوستان میں ادب کی صحیح تعلیم دی جاتی اور ادبی ذوق عام ہو جاتا تو ہمیں ضمیر میں خدا کی بنائی ہوئی جنت میں انسان کی بنائی ہوئی دوزخ نہ دکھائی دیتی ہمیں پھر دنیا [illegible] اور دیہات کی شام کا وہ حسن جو ستر نے اپنے مضامین بیان کیا ہے۔ ایک بے رحم طنز [illegible] ہم ایک بے رحم آسمان اور بے پروا زمین کے بیچ کھڑے [illegible] ہوتے ہم خوبصورت چیزوں کو بدصورت اور بے قرار نہ کر دیا کرتے ہم اعلیٰ جذبات کو اس آسانی سے نہ ٹھکراتے ہم انسانیت [illegible] طاقت سے اس قدر [illegible] نہ ہوتے۔ ہم ساحل پر بے بس اور لاچار کھڑے اس کا انتظار نہ تکتے ہوتے کہ دیکھیں کوئی موج آئے اور ہمیں بہا لے جائے [illegible] دریا میں اترتے موجوں کو آزماتے، طوفان کو دعوت دیتے، ڈوبتے، اچھلتے اور شاید اسی طرح اس پار بھی پہنچ جاتے جہاں امن ہے اور آزادی اور سکون لیکن ہم نے تو ادب کی تعلیم کا حقیقی مقصد سمجھا ہی نہیں یا ہمیں تو اس کے سمجھنے کا موقع ہی نہیں دیا گیا، ہم کو تو شاید اس کا احساس ہی نہیں ہوا کہ "ادب کے شاہکار زندگی کے مسائل اور محرکات کو [illegible] میں سائنس اور تاریخ کے خشک اد

علمی بیانات سے کہیں زیادہ کامیاب ہوتے ہیں" ہم نے حالی کا مرثیہ غالب کے متعلق پڑھا مگر یہ خیال نہ آیا کہ اس میں یہ بھی بتایا گیا ہو کہ ادیب کس طرح دوسروں سے زیادہ اثر رکھتا ہو

لاکھ مضمون اور اس کا ایک ٹھول　　سو تکلف اور اس کی سیدھی بات

اگر ہمیں یہ اندازہ ہوتا کہ انسان میں خوبصورت چیزوں سے متاثر ہونے کا جو جذبہ موجود ہے ادب اس کی تسکین کا سامان بہم پہنچاتا ہے اگر ہم یہ مانتے کہ ایک مرصع یعنی مکمل شعر یا نثر کا ایک قابل قدر ٹکڑا ویسا ہی حسن رکھتا ہو جیسا ایک دلنواز نغمہ یا ایک حسین نقش یا ایک پیاری صورت اگر ہم حسن [illegible] طریقے سے یہ نہ جانتے بلکہ اس پر ایمان رکھتے کہ تخلیق کا جذبہ جو بچوں میں فطرت [illegible] موجود ہے نہیں بلکہ اچھی نثر لکھنے یا اچھا شعر کہنے سے بھی ترقی کرتا ہوا گر [illegible] بلندی، اخلاق کی پاکیزگی، احساس کی بیداری، انسانیت کی تہذیب، ہمیں واقعی عزیز ہوتیں، [illegible] الفاظ ہی تو طیبۂ لب نہ ہوتیں تو ہم ادب کی تعلیم پر اور زیادہ زور دیتے اور زیادہ زور سے یہ مراد نہیں کہ ہم صرف ادب ہی کی تعلیم دیتے بلکہ ادب کی صحیح تعلیم پر اصرار کرتے [illegible] بہت الفاظ کے معنی بتا کر، محاوروں کا استعمال سکھا کر، قاعدے کے اصول ذہن نشین کرا کے مطمئن نہ ہو جاتے اگر ادب کی اچھی اور سچی تعلیم ہوتی تو سستے اور پست ناولوں سے جن میں کوئی حسن اور کوئی معیار نہیں ہمارے نوجوانوں کو اس قدر دلچسپی نہ ہوتی۔ وہ اتنی آسانی سے بہا لے جانے والی رو میں نہ بہہ جاتے ان کا ذہن خالی اور دل مایوس نہ ہوتا۔ وہ ہر عزیز شے کو ذرا سے فائدے کے لیے قربان کرنے کے لیے تیار نہ ہوتے پرانی نسلوں کے مقابلے میں نئی نسل ذہن [illegible] تو بہتر رکھتی ہو مگر یہ چھوئی موئی کا پیڑ وہ ذرا سی سختی سے تلے اوپر ہونے لگتی ہے اس کا خیال اس کا ایمان ایک اوپری تہہ سے زیادہ نہیں۔ اس کے مقابلے میں پچھلی نسل چونکہ ریاضت پر زور دیتی تھی اصول صحیح نہیں رکھتی تھی مگر چونکہ محنت زیادہ لیتی تھی اور کام زیادہ جانفشانی اور شاید زیادہ خلوص سے کراتی تھی اس لیے وہ اچھے طالب علموں میں ایک صلاحیت ضرور پیدا کر دیتی تھی۔ کیا کوئی صورت ایسی نہیں کہ ہمارے ادب کی تعلیم خیال کے لیے چند مرکز عطا کرے اور ان کے گرد زیادہ سے

زیادہ آزادی دلائے جو آنکھ بند کر کے تقلید کرنے کی بجائے اپنے اوپر اعتماد کرنا سکھائے گر بے راہ روی سے بچائے رکھے وہ حسن کو صرف حسن نسوانی میں تلاش نہ کرے بلکہ کائنات میں جہاں تناسب موزونیت، اعتدال، توازن نظر آئے۔ وہ [illegible] جو کسی پست چیز پر قانع نہ ہو اور کبھی بدصورتی سے راضی نہ ہو۔ گر جو صرف امیروں کے شیش محل کے جگمگاتے نظاروں [illegible] مزدوروں کے گھروندوں [illegible] پا سکے۔ جو محض شاعر ہو کر نہ رہ جائے بلکہ دنیا میں ہر چیز کی شاعری دیکھے برتے اور سمجھائے اقبال کے الفاظ [illegible]

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم — دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

شاید آپ ان خیالی باتوں سے اکتا جائیں اور پوچھیں کہ ایسی تعلیم ہمارے اسکولوں میں کیسے حاصل ہو۔ آپ کا یہ سوال کچھ ایسا بے محل نہ ہوگا۔ مگر شاید آپ بھی اس سے انکار نہ کریں کہ حال میں اردو ادب کی کتابیں اس نقطۂ نظر سے بھی لکھی گئی ہیں کہ وہ ادبی ذوق پیدا کر سکیں۔ آپ کی جماعت میں تو شاید ایسے لوگ نہ ہوں گے جو اردو ادب میں اس کی صلاحیت نہ سمجھتے ہوں کہ وہ اعلیٰ ادبی معیار کے مطابق تعلیم دے سکے اگر ہیں تو میں انھیں یاد دلاؤں گا کہ ہم حالی، اسمٰعیل میرٹھی، نظیر اکبرآبادی، شوق، اقبال، جوش کی منظر نگاری، سودا کا شہر آشوب اور تضحیک روزگار اکبر کی طنزیات، میر، درد، غالب، حالی، حسرت، فانی، جگر، اصغر کی غزلیں، چکبست کی وطنی شاعری [illegible] کے مرثیوں کی اخلاقی تعلیم، اقبال کے کائناتی، آفاقی اور انقلابی زندگی کے تصورات پریم چند کے اعلیٰ درجے کے ناول اور افسانے، سرشار کی مضحک گر جیتی جاگتی تصویریں، سرسید، حالی، عبدالحق وحیدالدین سلیم کی سنجیدہ، متین اور رومی نثر کے خزانوں میں سے ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ تینوں مدارج کے لیے سرمایہ نکال سکتے ہیں۔ اردو ادب اب تقلیدی، مصنوعی اور تنگ نظر نہیں رہا اس میں زندگی کی حرکت اور روانی ہے۔ اس میں ہر [illegible] دروازے کھلے ہیں اور ہر طرف سے ہوائیں آتی ہیں۔ اس میں ہر تجربے کی گنجائش ہے اور ہر ادب سے کوئی اچھی چیز لینے کی صلاحیت۔ مگر یہ صرف مانگنے پر مجبور نہیں ہے۔

کچھ دینے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے اور یہی ایک اچھے ادب کی خصوصیت ہو سکتی ہے۔

پچاس ساٹھ برس سے برابر اردو ادب کی پستی اس کے انحطاط اس کی تہی مائگی کا رونا رویا گیا ہے اس کی وجہ سے ہم لوگوں میں ایک عجیب احساس کمتری پیدا ہو گیا ہے اب وقت ہے کہ اسے دور کیا جائے ہر ادب میں قوت پھیلنے اور بڑھنے سے آتی ہے اردو ادب کی قوت اور صلاحیت کا یہ سبب بڑھنے کے عناصر برابر کام کر رہے ہیں خصوصاً جنگ عظیم کے بعد تو اس کا سرمایہ اس قدر بڑھا ہے جتنا شاید پہلے کبھی بڑی سے بڑی مدت میں بھی نہ بڑھا ہوگا اسی وجہ سے آپ کا فرض ہے کہ اپنے آپ کو جدید رجحانات سے باخبر رکھیں اور ادب کو صرف کتاب میں بند نہ کر دیں بلکہ زندگی سے اس کا متاثر ہونا اور زندگی پر اس کا اثر ڈالنا دیکھیں آپ کے مدرسوں میں بہت تھوڑی سی توجہ اردو ادب کی کتابیں پڑھائی جا سکتی ہیں ایسا نہ ہو کہ آپ اس کی وجہ سے ذہنی کاہلی کا شکار ہو جائیں۔ آپ کو کتابوں میں آپ کی ہدایت کے لیے اب ہر قسم کی مشقیں نمونے کے سوالات، درس کے متعلق اشارے ملتے ہیں یہ نہ سمجھیے کہ آپ کا کام محض کتاب پڑھا دینا ہے آپ کو کتاب سے متاثر کرنا ہے لکھنے والے کی تصویر اگر سامنے کھڑی کرنی ہے دل و دماغ پر ایک غیر فانی نقش چھوڑنا ہے آپ کو کتاب خواں نہیں بلکہ صاحب کتاب بنانا ہے اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب آپ خود کتاب خواں یا کتاب کے کیڑے نہ ہوں بلکہ صاحب کتاب ہوں۔ صاحب کتاب ہونے کے لیے عمر نوح کی ضرورت نہیں خلوص اور ذوق کی ضرورت ہے۔

میں جانتا ہوں کہ موجودہ نظام تعلیم کی بے اصولی، بے مرکزی اور طبقاتی تقسیم بہت جلد آپ کا خلوص آپ کا ولولہ، خدمت کا جذبہ، حسن کا ذوق چھین لیتی ہے آپ چاہتے ہیں کہ اُن قدروں کو بچائے رکھیں جو آپ نے استادوں کے مدرسے میں یا اپنی اعلیٰ تعلیم کے دوران میں سیکھی تھیں۔ مگر زندگی کا سخت اور تیز دھارا آپ کو بہائے جاتا ہے اور پھر آپ کی وہ حالت ہو جاتی ہے جو جگر نے اسے ایک مصرع میں بیان کی ہے ؎

سینہ خالی، آنکھیں ویراں دل کی حالت کیا کہیے

شاید آپ کو اس سے کچھ تسلی ہو کہ یہ ہم سب کا حال ہے ہم سب کے دل ویران ہیں، کوئی اُمنگ نہیں، کوئی آرزو نہیں، کوئی ولولہ نہیں، اگر ہے تو یا تو ایک سیڑھی اوپر پہنچ جانے کا یا اپنی جگہ کی حفاظت کرنے کا، اس نظام تعلیم نے ہمیں اس حالت کو پہنچا دیا ہے سماجی حالات کی وجہ سے ایک شریف پیشہ ذلیل ہوتا جا رہا ہے جس کی کہیں سماجی عزت نہیں ہوتی وہ اسکول میں مدرس ہو جاتا ہے مگر کیا جب تک حالات نہ بدلیں، کیا جب تک تعلیم کو اس کی اصل جگہ واپس نہ ملے ہمیں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا چاہیے۔ ادب کے ایک خادم کی حیثیت سے میرا فرض ہے کہ اس روش کے مضر اثرات سے آپ کو آگاہ کر دوں۔ یہ ذہنی موت ہوگی اور اس سے اپنے آپ کو ہر حال میں بچانا ہی ہے۔

[illegible] ہے کہ قوت، جرأت، ذکاوت، احساس، ذہانت پیدا کرنا تعلیم کا مقصد ہے ادب کی تعلیم سے اور اپنے ادب کی تعلیم سے یہ مقاصد بہتر طریقے سے پورے ہو سکتے ہیں آپ کا ادب اگر قوت و شوکت کا پیام نہیں تو مایوسی اور پناہ گزینی کا پیام پیش کرے گا اس پناہ گزینی، اس بے بسی سے آپ کی ذہنی غلامی کی زنجیریں کتنی استوار ہوں گی۔ آپ میں حق بات کہنے اور حق بات سکھانے کی جرأت نہ ہوگی تو آپ کی زندگی میں، اور آپ کے خیالات میں ہم آہنگی کہاں سے آئے گی، آپ [illegible] اس پر یقین نہ رکھتے ہوں گے تو دوسرے کو کیسے یقین دلائیں گے حالات ایسے ہیں کہ اس یقین کو کمزور اور بیکار کرنے کے لیے ویسے ہی سینکڑوں طاقتیں جمع ہو جاتی ہیں۔ اقبال کے کلام میں فقر و قلندری کی کیسی شان نظر آتی ہے اور ان کی زندگی سے جو واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ ان کے یہاں یہ تلقین رسمی نہیں بلکہ اُن کے خون جگر سے لکھی گئی ہے مگر مجھے اکثر درس کے دوران میں ایسے [illegible] جو سمجھتے تھے کہ سو پچاس سے پانسو روپیے ماہوار لے کر فقر کی تلقین بے معنی ہے آپ کو بھی ایسے تجربے پیش آتے ہوں گے کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کی وجہ سے خود آپ میں (cynicism) کلبیت پیدا ہو جائے۔ اور آپ اچھے اور بُرے شعر کو ایک ہی لہجہ اور ایک ہی آواز سے پڑھتے ہوں اگر آپ کے دل میں کبھی اقبال یا حالی یا اکبر کے کسی اچھے شعر سے کوئی تھرتھری نہ پیدا ہوئی ہو اگر آپ [illegible] خیالات کی دنیا [illegible] نہ گزری ہوئی ہو اور آپ تھوڑی دیر [illegible]

اس دنیا سے بلند نہ ہو گئے ہوں تو آپ اپنے طالب علموں کے احساس کو کیسے بیدار کر سکیں گے دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت یہاں تک کہ خدا سے انکار کر دینا بہت آسان ہے چھوٹی سی چھوٹی چیز کو برتنا اور اسی طرح برتنا بہت مشکل ہے کاش سہل اور دشوار کے اس معیار پر آپ غور فرمائیں۔

[illegible]

میں نے آپ کا کافی وقت ضائع کیا لیکن مجھے یہی خیال تھا کہ آپ کی محبت اور عنایت کا اس طرح ادا کر سکتا ہوں کہ اپنی سب سے بڑی متاع میں آپ کو شریک کروں مجھے اپنے ادب سے محبت ہے مجھے یقین ہے کہ آپ کو بھی اس سے محبت ہوگی ہم اس سے زیادہ کیا کر سکتے تھے کہ اسی کے متعلق تبادلۂ خیالات کریں میں نے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اپنے خیالات ادب کی تعلیم کے متعلق پیش کر دیے ہیں جہاں تک اُن کا تعلق اسکولوں اور ثانوی مدارس کی [illegible] سے ہے تو شاید اُن سے آپ کا جذبۂ خدمت اور بیدار ہو اور ہم سب اس آنے والی نسل کو جو ہمارے ہاتھوں میں امانت پا رہی ہے اردو ادب کے خزانے سے زیادہ فیض یاب کر سکیں اور اس کی شخصیت زیادہ شاداب، زیادہ پُرسوز اور زیادہ روشن ہو سکے اس شخصیت کو بنانے اور سنوارنے میں کیا اقبال کا تصور ہماری مدد نہیں کر سکتا۔

وہی جواں ہے قبیلے کی آنکھ کا تارا — نگاہ جس کی ہے بے داغ ضرب ہے کاری
اگر ہو جنگ تو شیرانِ غاب سے بڑھ کر — اگر ہو صلح تو رعنا غزالِ تاتاری

آج کی کانفرنس میں آپ اپنی سال بھر کی کوششوں کا جائزہ لیجیے، آئندہ کے لیے تدبیریں سوچیے، کوشش کیجیے کہ آپ کے نصاب کے بنانے میں، اس کے چلانے میں، اس کی کامیابی اور ناکامی کے پرکھنے میں خود آپ کا زیادہ حصہ ہو، امتحانات محض روپیہ کمانے کا ذریعہ اور بھرے ہوؤں کو بھرنے کا آلہ نہ ہوں۔ بلکہ وہ لوگ بھی اس میں حصہ لے سکیں جو اس تعلیم سے زیادہ واقف ہیں، پھر آپ اُن لوگوں سے اور زیادہ ربط پیدا کیجیے جو ابتدائی مدارس میں زبان کی تعلیم دے رہے ہیں۔ اُن کو مشورہ

دیجیے۔ اُن کی رہنمائی کیجیے، اُن کی معلومات سے فائدہ اٹھائیے۔ ان سے بچے نہیں جو یونیورسٹیوں اور کالجوں میں تعلیم دیتے ہیں وہ آپ سے کسی طرح بلند نہیں ہیں۔ مگر اُن کا کام دوسرے قسم کا ہے۔ آپ کی تعداد خدا کے فضل سے کافی ہوگی اسے اور بڑھائیے۔ اپنی جماعت کو نمائندہ جماعت بنائیے اس لیے نہیں کہ آپ عہدوں پر قبضہ کرسکیں بلکہ اس لیے کہ خدمت کے اور افادیت کے زیادہ وسیع ہوں۔ اگر آپ چاہیں تو ہمارے سارے صوبے میں اُردو ادب کی تعلیم بہت اچھی ہوسکتی ہے آپ غفلت کریں تو کسی کے کیے کچھ نہیں ہوسکتا۔ سیاسی یا فرقہ وارانہ جماعت بندیوں کا اثر آپ پر نہ پڑے تو اچھا ہے۔ آپ کی اردو زبان کسی کی سیاست کی پابند نہیں ہے نہ کسی ایک فرقہ کی زبان ہے۔ ایسا نہ ہو کہ آپ کی بے توجہی سے اس کی عمومیت پر اثر پڑے۔ کسی زبان اور ادب کے خادم اس زبان کا حق ادا کر کے اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ آپ بھی یہ حق ادا کرسکیں۔

آل احمد سرور ایم اے

تعلیم اور موسیقی

حیات انسانی کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے معاشرہ کی ذہنی شعور پذیری کے ساتھ ہی تعلیم کی اہمیت بھی تسلیم کر لی گئی اسی لیے صدیوں سے ماہرین تعلیم بچہ کی دماغی صلاحیتوں، اس کے احساسات، اس کے فطری نشوونما اور اس کے ترقیاتی امکانات کے نئے نئے تجربات کرتے رہے اس تحلیل یعنی اس کا یہ منشا رہا ہو کہ بچہ کی جبلی صلاحیتوں کی ساخت و پرداخت ایسے اعلیٰ طریقہ پر کی جائے کہ اس کی روحانی جسمانی اور دماغی ترقیوں میں ہم آہنگی قایم رہے۔

تعلیم کو موثر اور بامقصد بنانے کے لیے اس کو بچہ کی نفسیاتی مبادوں پر استوار کرنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ جہاں اور وسایل اختیار کیے گئے وہاں موسیقی کا نام بھی کبھی کبھی زبان پر آیا لیکن جیسا کہ ظاہر ہوا کہ اس کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی موسیقی جس زمانے اور جس قوم میں جزو عبادت رہی ہو مثلاً یونان اور ہندوستان کی قدیم تہذیبوں میں، وہاں بھی اس کا مقصد روحانی ضبط کی تعلیم دینا تھا۔ غالباً اسی اثر سے موسیقی نے قدرتی اور غیر شعوری طور پر رفتہ رفتہ اپنی جگہ سماج میں پیدا کر لی اور ممالک کی طرح قدیم ہندوستان کے نظام تعلیم میں بھی موسیقی شامل تھی، اسی طرح قدیم یونان میں بچوں کی تعلیم کے لیے موسیقی اور رقص ضروری سمجھا جاتا تھا۔ فلاطون کی ریاست میں ابتدائی تعلیم کے دوران میں تمام تر زور ورزش اور موسیقی پر دیا گیا ہے اور موسیقی کا معیار روحانی بالیدگی قرار دیا گیا۔ اس باب میں فلاطون آرٹ برائے آرٹ کا بالکل قایل نہیں تھا اسی لیے اس کے نزدیک موسیقی میں ایسی راگ راگنیوں کو دخل نہ ہونا چاہیئے جو جذبات کے نسائی حد تک نرم و نازک پہلو کو چھو سکیں بلکہ صرف وہ راگ اور گیت شامل ہیں جو ضبط نفس اور شجاعت کی تعلیم دیں اسی نوع کی اور مثالیں دوسرے تعلیمی نظاموں سے پیش کی جا سکتی ہیں اگرچہ یہ ممکن ہو کہ وہاں موسیقی اپنی نوعیت اور اہمیت میں مختلف نظر آئے۔

موجودہ دور میں کچھ دنوں سے ماہرین تعلیم نے موسیقی کو تعلیمی نظام میں جگہ دی ہو ہر چند کہ اس کی جگہ کا

صحیح تعین نہیں ہو سکا اس سے ان کا منشا لڑکوں اور لڑکیوں میں مجہول جمالیاتی ذوق یا اضافی تزئین پیدا کرنا نہیں ہے بلکہ موسیقی کے ذریعہ بچہ کی فطری صلاحیتوں کا ابھارنا اور چمکانا ہے۔ انہوں نے اس تجرباتی مقصد میں موسیقی کے واسطہ سے سوچنے اور سمجھنے کی کوشش کی ہے تاکہ اس کے اثر سے بچہ کی خصوصیات کو تربیت پانے اور کام میں آنے کا موقع ملے اور وہ اس کے مستقبل کی تعمیر میں امداد کر سکیں۔

تعلیمی مسایل کے حل کرنے میں اگر ہم اگر تجربے انکشافات کرنے میں کامیاب نہ بھی ہوں تو کم از کم دوسروں کے تجربات کی آزمایش تو کر سکتے ہیں کیونکہ بہر صورت اس سے ہمارا مقصد ایک ہی ہے ہماری سب کی تمنا یہی ہوتی ہے کہ بچوں کی خوابیدہ قوتوں کو بیدار کرکے انھیں پھلنے پھولنے کا ایسا موقع دیا جائے تو آگے چل کر ان کو بہتر شہری اور بہترین انسان بنا سکیں۔

کیا بچہ کی نفسیات میں موسیقیاتی تجربہ کی گنجایش ہے؟ کیا موسیقی بچہ کا مستقبل سنوارنے میں کسی طرح کی امداد کر سکتی ہے؟ روانی اور ترنم (RyThm) کی حس کو بچہ کے ادنیٰ محسوسات میں شمار کیا جا سکتا ہے یہ بہت چھوٹے بچوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ شاید انسان پر اس کا انکشاف ابتدائے آفرینش ہی سے ہوا جب دنیا خود اپنے دور طفلی میں تھی۔ یہ ہمیشہ دیکھا گیا ہے کہ شیرخوار بچہ گھڑی کی ٹک ٹک ڈھول کی دھم دھم گھنٹی کی ٹن ٹن بہت خوش ہو کر سنتا ہے اگر اس کی ماں اپنی محبت بھری گود میں لے کر اسے لوریاں دیتی یا کوئی ساز بجایا جاتا ہے تو اس کو تسکین ہوتی ہے ہم کے اس احساس کی پرچھائیاں اپنی مختلف صورتوں اور حالتوں میں بچہ کی ساری زندگی پر چھائی رہتی ہیں یہ شعور آہستہ آہستہ اپنا کام کرتا اور بڑھتا [illegible] مدرسہ میں یہ طریق عمل جاری رہتا ہے ہمارا تخیل ہمیں ایسے مذہبی اداروں کی تصویر پیش کر سکتا ہے جہاں آج سے نہیں صدیوں سے بچوں کا عقیدت سے بھرا گروہ اپنی معصوم دعاؤں کو موسیقی کے [illegible] دھارے کی شکل میں فضا میں پھیلا دیتا ہے۔ آثار چڑھاؤ کی دوسری مثال جو روزانہ ہمارے مشاہدہ میں آتی ہے کسی بچہ کا ریاضی سیکھنے میں گننا، جوڑنا یا پہاڑے یاد کرنا ہے ترنم کی یہ حس اسی طرح کی اور باتوں سے بھی ظاہر ہوتی ہے۔

اسی طرح تناسب اور موزونیت کا تجربہ فنون لطیفہ کے مضامین میں ہو سکتا ہے یعنی موسیقی، آرٹ اور ادب میں اگر موسیقی کو تعلیمی نصاب میں شامل کر لیا جائے تو ان صلاحیتوں کی نشوونما ہو سکتی ہے جو بچہ کی زندگی

برابر نکل رہے ہیں اور اچھی اچھی کتابیں برابر شائع ہو رہی ہیں۔ اس مضمون کے آخر میں ایک مختصر سی فہرست ہو اس سال میں مطبوعہ تمام ادبی کتابیں ہیں یہ فہرست مکمل نہیں ہو — تک سب کتابیں چھاپنے والے کتابوں پر اشاعت کا سال نہ چھاپیں اور پرانی کتابیں پھر ریویو کرنے بیٹھیں نہ بھیجیں، سال بھر کی مطبوعات کا جائزہ لینا کافی مشکل ہو جاتا ہے شکر ہے بعض اداروں نے اپنی کتابوں پر اشاعت کے سال بھی چھاپے گئے ہیں۔

اس سال کی کتابوں پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعری اب بھی ہمارا محبوب مشغلہ ہے اب بھی دوسرے اور تیسرے درجے کے شاعروں کا ایک ٹڈی دل رسالوں، اخباروں اور آئے دن مشاعروں کے ذریعے سے اپنے افکار کی نمائش کرتا رہتا ہے ہر شاعر کو یہ ارمان ضرور رہتا ہے کہ وہ مرنے سے پہلے ایک مجموعہ بھی چھوڑ جائے یا مجموعوں کی کثرت سے اردو ادب میں گراں قدر اضافہ کر دے جس نوجوان کے کلام کی ذرا شہرت ہوئی اور رسالوں کے ہاں کلام کی فرمائش ہونے لگی اس کا ایک مجموعہ احباب کے اصرار سے تیار ہو جاتا ہے مگر ان لوگوں کے علاوہ بعض اچھے شاعروں کے بھی مجموعے شائع ہو ہی جاتے ہیں۔ اس سال جو مجموعے شائع ہوئے ہیں تین قسم کے ہیں۔ پہلی قسم میں وہ مجموعے آتے ہیں جو قدیم شاعروں کے ہیں ان میں سلطان محمد قلی قطب شاہ کا کلیات ہر طرح اہم ہے۔ محمد قلی قطب شاہ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہے اسی کے دیوان میں ردیف وار ترتیب بھی ہے قصیدوں اور غزلوں کی کثرت تھی اس کا کلام ہر صنف سخن میں ہے اور اس سے غیر معمولی فنی قدرت کا اظہار ہوتا ہے اس نے ہر موضوع پر نظمیں لکھی ہیں اور دراصل نظیر سے بہت پہلے مرقع نگاری، ہندوستانی، حرل، الم و درد، میلے ٹھیلوں کا ذکر کیا ہے۔ ڈاکٹر زور نے اس کلیات کا ایک صاف ستھرا اڈیشن شائع کر کے اردو ادب پر ایک احسان کیا ہے عبدالقادر سروری نے کلیات سراج بڑی صحت سے مرتب کیا ہے سراج بہت بلند پایہ شاعر ہے ولی کی عظمت نے اسے پس پشت ڈال دیا ہے۔ دہلی کے شاعر جب تتلا تتلا کر ریختہ کہہ رہے تھے اس وقت سراج بڑی بلند فضاؤں میں پرواز کر چکا تھا۔ ولی کے وقت تک ہندی اور عجمی نقطۂ نظر کا توازن ملتا ہے سراج نے عجمی نقطہ نظر کو اور بھی ترقی دی ان دو مجموعوں کے علاوہ طوطی نامہ اور قصۂ بے نظیر قدیم دکنی ادب کے غیر فانی کارنامے ہیں ان کی اشاعت سے دکنی کارنامہ اور بھی وسیع ہو جاتا ہے دراصل گزشتہ چند سالوں میں دکن کے اتنے ستہ پارے روشنی میں

اور کام پر بڑا اثر ڈالتی ہیں۔ یہ نشو و نما کیا ہے؟ گویا ترنم کے جذبہ کو ابھارنا، تناسب، باضابطگی اور ہمواریت کی حس
کو ترقی دینا ہے۔ [illegible] صرف ہماری جسمانی حرکت، دستکارانہ کام اور ذاتی خصائل کے لیے مفید ہے بلکہ ہماری
تخیل کے لیے اس کا وجود ضروری ہے۔

[illegible] سامنے گاتی یا گنگناتی ہے تو اس کا مقصد صرف بچہ کو خوش کرنا ہوتا ہے اگرچہ وہ اس کے
ترنم کی حس کی تسکین کر رہی ہے لیکن ایسے موقع پر اس کے ذہن میں یہ نہیں آتا کہ اس کا اس وقت کا گانا بچہ کے لیے
نفع رساں بھی ہو سکتا ہے مگر چونکہ وہ اپنے بچہ کو خوش دیکھنا چاہتی ہے اس لیے گاتی ہے اگر وہ خوش رہا تو ہنسی خوشی
کھیلے گا اور سکون کے ساتھ سو جائے گا اور اس طرح اس کے دماغ اور جسم کو بڑھنے کا بہترین موقع مل جائے گا۔ مدرسہ
میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے اگر بچہ خوش ہے تو وہ ان چیزوں سے پوری طرح لطف اندوز ہوگا جنھیں وہ پسند کرتا ہے اور
ان چیزوں کو استعمال کرنے میں زیادہ سرگرم نظر آئے گا جو باوجود ضروری ہونے کے کچھ زیادہ مسرت بخش نہیں ہیں۔

اگر ہم بچوں کی اچھی موسیقی کی قدر اور سمجھ میں امداد کریں تو ہم ان کو ایک ایسے انمول خزانہ کا کھوج دے
سکیں گے جو ان کی زندگیوں کو مالا مال کر دے گا۔ وہ موسیقی جس سے ہم محظوظ ہوتے ہیں ماہرین فن کی زندگی اور
خیال کے تاثرات کا نام ہے۔ انسانی دماغ کے ایک گوشہ میں کم یا زیادہ جمالیاتی احساس ضرور پایا جاتا ہے اور یہی
رفتہ رفتہ ترقی پاکر زندگی پر چھا جاتا ہے اور ایک بات اس احساس میں یہ ہوتی ہے کہ اس کا ایک گوشہ ہمیشہ
اشیائے محسوسہ سے ملا ہوتا ہے جیسے سمندر میں گہرا ہو باوجود بلند ہونے کے سطح آب سے ملا ہوتا ہے۔ یہ احساس حسن کیا
ہے؟ والٹر پیٹر کا قول ہے کہ حسن محض ایک انفرادی کیفیت کا نام ہے جس سے عام قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم یہ کہہ
سکتے ہیں کہ حسن ایک روحانی کیفیت کو کہتے ہیں جو حواس تخیل اور تفکر کے باہمی امتزاج سے مرتب ہوتا ہے جب
ہم جتنا اس حسن کو جو دوسری زندگیوں کی رگ و پے میں جاری و ساری ہے دیکھ اور محسوس کر سکیں گے اسی قدر
ہماری زندگی میں بالیدگی اور نمو کے امکانات زیادہ پیدا ہو جائیں گے۔ ایک چیز میں حسن پالینے سے ہم میں دوسری
چیزوں میں حسن کی تلاش اور انکشاف کرنے کی اہلیت اور آمادگی پیدا ہو جاتی ہے اس طرح ہم خود بھی حسن کاری کی
تخلیق کر سکیں گے پھر شاید دوسروں کی زندگیوں کو بھی حسین بنانے میں مدد کر سکیں۔ ہمارے بچوں کی خوشی کا اندازہ
تمہیں کیا جا سکتا ہے [illegible] اس روحانی مسرت کی کیفیت سے پیدا ہوگی جس کو ہم جذبہ حس کی بیداری کہہ سکتے ہیں

معاً جساطہی زندگی کی رگوں میں گرم خون دوڑا کے جسمانی اور دماغی قوتوں کو حرکت میں لاتا ہو
بچے مدرسہ میں زیادہ دنوں نہیں رہتے اور اس لیے ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہمیں اس مختصر زمانہ میں انہیں
آیندہ زندگی کی جدوجہد کے لیے تیار کرنا ہو ان کو بنیادی اور ابتدائی باتوں سے ایک ذہنی واقفیت رکھنا ضروری
جس میں لکھنا پڑھنا معمولی تصویریں بنانا، رنگ بھرنا، ریاضی اور سلائی کا کام شامل ہیں یہ استاد کا فرض ہو کہ ان
کاموں کی اہمیت اور تناسب میں لڑکوں اور لڑکیوں کے درجہ اور مدرسہ کی ضرورتوں کا لحاظ رکھے
ایک مسلمہ حقیقت ہو کہ بچہ سبق یاد کرنے اور اپنا کام کرنے میں اپنی قوتوں کا بہترین استعمال اسی وقت کر سکتا ہو
جب اس کا جسم و دماغ تندرست و توانا ہوں بعض غیر دلچسپ اور رکھے دلکش مضامین کی گرانباری سے
دلا کر موسیقی تھکے ہوئے اعصاب کے لیے آسودگی بخش ثابت ہو سکتی ہو اس سے بچہ کی جسمانی نقل و حرکت میں
مناسب موقع پر کام لیا جا سکتا ہو جب وہ کسی ڈرامائی کھیل میں تال کی لہروں کے ساتھ بہا جا رہا ہو جب بچہ
کا دماغ اس خیال کو سننے اور تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہو جس کی تصویر موسیقی کے پردہ پر کھینچی گئی ہو تو موسیقی
کے زیر و بم کے دوران میں تو ڑ دل وقفہ کا کام بھی دے سکتی ہو۔ یہ وقت ایسا ہوتا ہو کہ چھوٹی عمر
کے بچے اس میں لَے سے واقف ہو سکیں اور بڑے بچے سروں میں ہم آہنگی پیدا کر سکیں پانچ سال کا ایک اوسط
درجہ کا بچہ عام طور پر اس سے لطف اندوز ہو سکتا ہو اور اس میں کسی سادہ گیت کو ٹھیک ٹھیک دہرا دینے کی
خاصی صلاحیت ہوتی ہو اگرچہ بچوں کے گیت کے گانے میں غالباً اس کو امداد دینے کی ضرورت پڑے گی۔
مگر اس میں کوئی دشواری نہیں ہوتی کیوں کہ اس منزل پر استاد یا استانی بھی بچوں ہی میں سے ایک ہوتے ہیں اور
مدد اس طرح دی جاتی ہو کہ بچہ کو اس کا احساس بھی نہیں ہوتا ہو

علاوہ ان اوقات کے جو اس کے لیے مخصوص کیے جائیں موسیقی بعض غیر دلچسپ اسباق کے دوران
میں چند منٹ کے لیے دماغ کو تر و تازہ کر سکتی ہو خصوصاً کنڈرگارٹن کے طریقۂ تعلیم میں یہ بعض سنجیدہ اور خشک
پیریڈوں کو ذہن سے تھوڑی دیر کے لیے ہٹا کر دماغ کو کام کے دوسرے وقفہ کے لیے تیار کرتی ہو اس وقت
بچوں کے گیت اور گانے کے کھیل فائدہ مند ثابت ہو سکتے ہیں یہ گانے سادہ اور آسان ہوتے ہیں اور
ت کا تقاضا کرتی ہو گیت ایسے انتخاب کرنا چاہئیں جن کی ڈرامائی حرکت میں بہت زیادہ طوالت نہ ہو۔

اور اسی طرح لے ایسی اختیار کی جائے جس [illegible] ٹوں کا حرج نہ ہو۔

جیسا کہ پہلے اشارہ کیا گیا موسیقی میں بچہ کو سب سے پہلے کشش اس کے ترنم کی وجہ سے محسوس ہوتی ہو مگر مدرس کی تکمیل سے پہلے نظر کر لی جائے تو یہ کہا جا سکتا ہو کہ [illegible] سے ترنم کی رنگا رنگ دلفریبیاں اپنے رنگین پردوں سے نمایاں ہونے لگتی ہیں ترنم میں رنگ آمیزیاں اور تازگی کی بڑی گنجایش ہو اور اس لیے اگر ترنم کی تعلیم نہ دی جائے تو بھی کسی گیت کا بار بار گایا جانا اور بچہ کا اس میں شریک ہونا بچہ کو اس قابل بنا سکتا ہو کہ وہ اپنی دلچسپی کا گیت بنا سکے یہی وہ طریقہ ہو جس سے ایک ماں اپنے بچہ کو سکھاتی ہو اور اگر ہم موسیقیاتی واقفیت اور لطف اندوزی کا عکس گہرا کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں کم از کم ابتدائی سالوں میں ماں کا یہی طریقہ کام میں لانا پڑے گا بچوں کے گیت کو بڑی اہمیت حاصل ہو وہ اپنی ایک روایاتی اور رواجاتی جگہ پیدا کر چکے ہیں جس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا انھوں نے زمانہ کے انقلاب انگیز تغیرات کا مقابلہ کیا ہو جو موسیقی یا سماج کی کیا بلکہ قوموں اور ملکوں کی [illegible] ڈالتے ہیں ان سے ہر ملک کے بچوں میں ایک مشترک وابستگی اور محبت پائی جاتی ہو۔ ان میں تیزی اور سادگی [illegible] موجود ہو اور انھیں ڈرامائی صورت میں آسانی سے تبدیل کیا جا سکتا ہو۔

اس ڈرامائی اظہار کی بڑی قدر و قیمت ہو کیونکہ اس اظہار سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ بچہ کے لیے موسیقی کیا معنی رکھتی ہو۔ یہ عضلاتی حرکت پر قابو پانے میں امداد کرتی ہو جو خود ایک بڑی تربیت ہو کیونکہ موسیقی کے ذریعہ تعلیم حاصل کرنے کے زمانہ میں جو کچھ ضبط نفس اختیار کیا جاتا ہو اس کا اثر دوسرے زمانہ پر بھی پڑنا لازمی ہو۔

جس طرح اس نغمہ اور الفاظ میں خوبصورتی ہو جس کی تمثیل بچے پیش کر رہے ہیں اسی طرح ان کی کوشش ہوتی ہو کہ نقل و حرکت میں بھی خوبصورتی پیدا ہو جب نغمہ خاموش ہو تو ان کو لازمی ہو کہ وہ بغیر دوسروں کو چھوتے ہوئے ان کے کام میں گڑبڑ پیدا کیے ادھر ادھر چلنے کی کوشش کریں اس کے بعد عوام کے ناچ اور گانے زیادہ تر گیت اور کھیلوں میں منظم اور خوش اسلوب حرکت کی شدید ضرورت ہو۔ تیاری ناچ خوش اسلوب اور صحت افزا ڈرامائی حرکات کی تربیت میں کافی امداد کر سکتے ہیں اس طرح خاص طور پر لڑکیاں بغیر کسی الجھن اور دشواری کے آزادی اور خوشنمائی سے حرکت کر سکتی ہیں اور زیادہ بڑی اور بھدی لڑکیوں کی اس طرح بڑی ہمت افزائی ہوتی ہو۔ نغمہ اور خیال جس کا الفاظ میں اظہار کیا جاتا ہو ان میں خوش اسلوب اور منظم حرکت پیدا کرنے کا ولولہ پیدا کر دیتے ہیں۔

بچہ کے گیت کی منزل کے بعد کچھ اور انکشاف کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہو اس میں کچھ تو موسیقی کی اہمیت اور سپیکر سے واقفیت حاصل کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے وہ یہ معلوم کر سکتا ہو اونچے اور نیچے پردوں کا اتار اور ہلکی، بلند اور دھیمی موسیقی کا ادراک یا ساز کی گت دوہری ہو یا تہری یا چوہری۔ بعد میں ہم آہنگ سروں کی قدر اور شکل سے واقفیت حاصل ہوتی ہے [illegible] اس وقت لطف اندوز ہو سکے گا جب اسے واقفیت ہو جائے گی کہ گیت کے ٹکڑوں کی تشکیل کس طرح ہوتی ہے۔

گیت بحیثیت [illegible] موسیقیاتی نصاب تعلیم میں خود اپنی جگہ رکھتے ہیں مگر گیتوں کو بلا مقصد سامنے نہ دیا جائے بلکہ انہیں بچہ کی نفسیات کی روشنی میں دیکھ لینا ضرور ہے اور ساتھ ہی ساتھ حال کی ضرورت اور مستقبل کی مصلحت کو بھی [illegible] جاہیے گیتوں کا ان کے موسیقی کے خیال سے یا کسی سُر کو ٹھیک کرنے کی مثال کے طور پر یا گیت کی نظم کے لیے یا اس کے ڈرامائی تناسب کا لحاظ کرکے [illegible] کیا جا سکتا ہو گیت بچوں کے لیے مفید [illegible] ہوں گے جب ان میں اس قسم کی باتوں کا لحاظ رکھا جائے۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ بچوں کو گانے اور غل شور مچانے کی ممانعت کر دی جائے جو ہر بچہ کی فطرت کا تقاضا ہو۔ قدرتی طور پر ہم سب کو اور خصوصاً بچوں کو اپنے من بھائے گیت گانے سے بڑی مسرت حاصل ہوتی ہو لیکن اگر گیت گائے جانے کے لائق ہوں تو ضرورت اس بات کی ہو کہ ان کو سامنے رکھنے کے لیے ایک خاص سبب اور مقررہ وقت ہو۔

ساز کی موسیقی کی جو تجرباتی قیمت ہو اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ بہت سے مدرسوں میں کسی طرح کا آلہ موسیقی رکھنا یا اس طرح کا کوئی مستقل انتظام تقریباً ناممکن ہوتا ہو آواز اولین اور قدرتی آلہ موسیقی ہو اور تعلیم کی ابتدائی منزلوں میں شاید سب سے اہم بھی ہم سب آوازیں رکھتے ہیں اور ان سے بہت کچھ کام بھی لے سکتے ہیں اور بچوں کے سامنے نظموں اور گیتوں کو پیش کرتے وقت آواز کا استعمال بہت ضروری ہو مثلاً بچہ سے یہ توقع کرنا لاحاصل ہو کہ وہ بچوں کا گیت اس وقت سیکھ جائے جب وہ پیانو پر گایا جا رہا ہو آواز اس کے لیے وسیلہ کا کام کرتی ہو اور پیانو سے اس میں سُر ملانے کا کام لیا جاتا ہو پھر بھی آلات موسیقی کی اہمیت اپنی جگہ باقی رہتی ہو۔ بچوں کے دلوں میں مسرت کی لہریں دوڑ جاتی ہیں جب کسی آلہ موسیقی پر کوئی نغمہ چھیڑا جاتا ہو جب کوئی گت بجائی جائے تو بچے اسے خاموشی [illegible] سے سنیں گے اور اس طرح ان مختلف آلات کا اثر محسوس کر سکیں گے۔ وہ موسیقی کے رنگین ٹکڑوں کے ترنم، روانی اور اعا[illegible] کو بھی سن سکیں گے اور کچھ دریافت بھی کر سکیں گے۔

ساز کی موسیقی میں بچوں کے لیے اظہار کا ایک اور امکان پیدا کیا جاتا ہے اور یہ لڑکوں سے زیادہ لڑکیوں کے لیے موزوں ہوگا۔ حال میں انگلستان میں پرکشن بینڈ (ایک قسم کا سازوں کا نغمہ) نے بڑی مقبولیت حاصل کر لی ہے اور مدرسوں میں اس کے تعلیمی افادہ کو تسلیم کیا گیا ہے۔ مجیرہ، ڈھول، دف اور طنبورہ کا استعمال کر کے ہر لڑکی مشترک نغمے کے اظہار میں اپنا اپنا کام دکھا سکتی ہے۔ وہ جذباتی طور پر لطف اندوز ہوتی ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ ایسے کام میں اتحاد عمل کرتی ہے جس کی کامیابی کے لیے عمومی طور پر دوسروں کو اس پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔ اس کے لیے ضبط درکار ہے جو [illegible] ناگزیر نہیں۔ یہ مشترکہ کام کی ابتدا ہے اور اس طرح بچہ متفقہ جذبہ کی اصلی قیمت کو سمجھنے لگتا ہے۔ اسکولی زندگی میں اس اشتراک عمل کو جو اہمیت حاصل ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ جزو یا جو [illegible] ایک ہو کے کل میں مل کر ایک موج کی طرح دریا کے بہاؤ میں سما جاتا ہے۔

اگر موسیقی کے تار ہائے رنگین انسانی زندگی کے تار و پود سے بالکل علیحدہ اور مختلف ہوتے تو کیا ضرورت تھی کہ مدرسہ کے نصاب میں اس کو جگہ دی جائے یا تعلیمی وقت کا کچھ حصہ اس پر صرف کیا جائے لیکن نغمہ زندگی کا ساز اور روح کی آواز ہے موسیقیاتی ارتقا اور نمو آہستہ آہستہ نہ صرف اسکولی زندگی میں اپنا افادہ ظاہر کرتا ہے بلکہ یہ توقع کی جاتی ہے کہ اس کے اثرات مستقل تک پہنچتے ہیں۔ تربیت نفس کی ایک مستقل قدر و قیمت ہے اور ضرورت ہے کہ اس کی ضیا سے زندگی کا ایک ایک گوشہ روشن ہو۔ ترنم اور تناسب (Rythm) صرف موسیقی تک محدود نہیں بلکہ اس کے اثر یت کا دائرہ بہت وسیع ہے اس کے عناصر عالم جاگیر کے موسیقار ذرات سے مرکب ہیں جس کا اثر عدد، خاکہ اور شعر اور ہمارے اسکولی نصاب کے ہر حصہ پر پڑتا ہے۔ موسیقی میں حسن کی قدرشناسی دوسری چیزوں میں احساس حسن کی جانب رہبری کرتی ہے تخیل کی دنیا میں ہی نہیں بلکہ اپنی عملی زندگی میں بھی ہم رنگ، شکل، آواز اور حرکت میں حسن کی تلاش کرنے لگتے ہیں۔ پھر موسیقی کی رنگارنگی کسی ایک ملک تک محدود نہیں بلکہ ہر ملک کا ایک مخصوص انداز موسیقی ہے اور صدا اسلوب بیان جس طرح ہم نغمہ سے اپنی قوم کے افراد کے کچھ خیالات سے واقف ہو سکتے ہیں اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ یہی نغمہ دوسری قوموں کے کچھ خیالات ہم تک پہنچانے میں کامیاب ہو سکے۔ اسی طرح موسیقی ہمیں دوسروں کی زندگیوں سے علیحدہ نہیں کرتی بلکہ انھیں قریب سے قریب تر لے آتی ہے اور رواقیت اور قدرشناسی کی مدد سے ان کے دبے ہوئے نقوش کو ابھار کر انھیں اپنے اصلی روپ میں سامنے لا کھڑا کرتی ہے۔

مقبول الرحمٰن ایم اے

قدیم مصری ادب

تمام تہذیبوں کا اس پر اتفاق ہے کہ اپنے خیالات و افکار کو ضبط کرنے کی اختراع مصریوں نے کی اور اس اعلیٰ فضیلت کا سہرا ان کے سر ہے انھوں نے طویل غور و فکر کے بعد ایک کتابت ایجاد کی جو پتھروں پر کندہ کی جاتی تھی لیکن جب اور آگے چل کر فکری دائروں میں وسعت پیدا ہوئی اور انسانی ذہن نے وہ علوم و آداب ایجاد کیے جن میں یہ صلاحیت دیکھی گئی کہ انھیں دوسروں تک پہنچایا جائے اور ان کا سلسلہ معرفت وسیع ہو تو اس وقت ضرورت اس کی داعی ہوئی کہ ان پتھروں کی جگہ صحیفے ہوں چنانچہ اس حاجت کے انسداد کے لیے نباتاتی اوراق ایجاد ہوئے [illegible] جن سے کتابت کی ایک بڑی مشکل حل ہو گئی اس اہم اختراع نے دنیائے علم و ادب کے لیے ایک وسیع میدان کھول دیا اور ہر عالم ادیب اور مفکر اپنے خیالات کو بڑی آسانی سے کاغذ پر ضبط اور مدون کرنے لگا اور یہاں سے تصنیف و تالیف کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا مصر کی تہذیب و تمدن کے ساتھ یہ ادب بھی ترقی کرتا رہا اور آخر میں آکر اس ساری جد و جہد نے ایک مستقل ادبی عمارت کی حیثیت اختیار کی جس میں کچھ تو اپیکورس اور خیام اسکول کا حصہ ہے۔ جہاں سراسر بزم و تماشا ساقی و خمر اور رندی و ہوسناکی کا وجود ہے اور کچھ ایسے ہیں جنھوں نے اپنی تعمیر روایتوں کے طریقہ پر کی ہے اور ہر جگہ زہد و تقشف اور روحانیت و خدا کی تعلیم دیتے پھرتے ہیں۔

مصری آثار کے محققین نے بہت سے نباتاتی اور صحیفے پائے ہیں جن میں کچھ تو حکایات و قصص کا ذخیرہ ہے اور کچھ اشعار و منظومات کا ان ذخیروں سے مصر کی گزشتہ ادبی عظمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور ہم ان کے ذریعہ مصر قدیم کے ادب پر ایک نگاہ ڈال سکتے ہیں۔

توت خدائے علم و ادب | قدیم مصریوں کا یہ اعتقاد تھا کہ مصری کتابت کا اولین موجد خدائے (Tehuti یا توت Thoth) ہے اسی عقیدے کی بنا پر انھوں نے کتابت کو ہیروغلیفی یا مقدس کتابت

کے نام سے موسوم کر رکھا تھا نیران کا یہ عقیدہ تھا کہ علم الحساب کا موجد بھی توت ہی ہے اور شمس و قمر نجوم و کواکب کے فاصلوں کی تحدید اور ان کے احوال و کوائف سے معرفت و آگاہی کی بنیاد بھی اسی نے رکھی ہے اور علم الفلک کا خیال عالم بھی وہی ہے۔ المختصر ان کے عقائد کے لحاظ سے توت تمام آداب و حکم اور سارے ارضی و سماوی علوم کا خدا تھا اور انسان کی برگزیدگی اور سیر لفق و کتابت کا موجد ایک کے علوم و محدود اور [illegible] ہمیشہ حقائق پر پڑی تھیں اسی عقیدے کی بنا پر کہ توت عارف الحقائق بھی ہے اسیوں نے اسے سرت کا قاضی القضاۃ مان لیا تھا قدیم ناولوں سے یہ بات [illegible] جنت میں کا قاضی بنا اوزیریس اور اس کے بھائی ست میں ایک طویل مخاصمہ چھڑ گیا تھا جس کی بنا دیہ تھی کہ ست نے اپنے بھائی اوزیریس پر یہ اتہام رکھا تھا کہ اس نے بعض اہم [illegible] کی تفتیش توت نے کی اور آخر میں اپنا اٹل اور حق فیصلہ تمام خدا اور دیوتا [illegible] سامنے پیش کر دیا کہ ست کے دعاوی غلط اور بے بنیاد ہیں اور اوزیریس کے اقوال بالکل صحیح اور [illegible] مصریوں نے توت کے متعلق ایک اور خیال قائم کر لیا تھا کہ [illegible] لیے بھی وہی فیصلہ کرے گا جو اس نے روز اول اوزیریس کے لیے کیا تھا قدیم ناولوں سے یہ بات بھی آشکار ہوتی ہے کہ توت کی بہت سی کتابیں لکھی تھیں جو تمام علوم پر حاوی تھیں اور ان کے [illegible] میں انھیں [illegible] کی وجہ سے مصر کو عالمگیر علمی شہرت حاصل تھی۔ ان کتابوں کی تعداد ۳۶۵۲۵ کے قریب بتلائی جاتی [illegible] مصری اپنے مصنفین کی بہت زیادہ تعظیم کرتے تھے کیونکہ ان کے خیال میں ہر [illegible] توت کی روح حلول کر آتی تھی یہی وجہ ہے کہ ان کے نزدیک علما سے بڑھ کر کسی اور کا مرتبہ نہیں ہوتا تھا [illegible] کی شکل اس طرح مستور ہے کہ ایک آدمی ہے جس کا سر ائیبس کے سر جیسا ہے اور اس کے ساتھ [illegible] کے قریب ایک کتاب ہے اس کا نام استطیس ہے

قدیم عہد حکومت: مصر کے پہلے عہد یعنی قدیم حکومت کے زمانہ میں مصری ادب پر ایک خاص دینی رنگ چھایا [illegible] حقیقت اس دور کے عام دینی و کاہنی میلان کا نتیجہ تھا اس ادب کا اصلی مرجع وہ عبادتیں ہیں

لہ [illegible] مصریوں کے اس لقل کے تسم کی ایک مقدس جڑیا ہوتی تھی۔

جو آج کل نشانات کی شکل میں اہرام کی دیواروں پر منقوش پائی گئی ہیں۔ یہ نشانات اصل میں ہیروغلیفی عبارتیں ہیں جو پانچ اہرام کی دیواروں پر مکتوب ہیں۔ ان میں سب سے پہلا اہرام شاہ ونیاس (...) کے بنایا گیا تھا جو پانچویں شاہی خاندان کا فرد تھا بقیہ چار تیتا پیپی، مرنورا اور پیپی دوئم کے لیے بنائے گئے تھے۔

یہ عبارتیں دینی ادب کی سب سے پہلی تصویر ہیں اس لیے کہ جن عقاید کی طرف اشارہ کرتی ہیں ان کا زمانہ چھٹے خاندان سے ہزاروں برس پہلے کا ہے۔ رائج خیال یہ ہے کہ اسے مصری پنڈتوں نے جب قدیم زمانوں میں جب کتابت ایجاد نہیں ہوئی تھی، صالح اموات کے لیے دعاؤں کے ایجاد کیا تھا اور اسے ہر بادشاہ کی موت کے وقت پڑھا کرتے تھے ان دعاؤں کو ان کے دینی علما نے زبانی یاد کر لیا تھا اور نسلاً بعد نسل زبانی یاد کراتے چلے آتے تھے مگر جب کتابت ایجاد ہو گئی تو مصریوں نے اس خوف سے کہ کہیں بھول کر ضائع نہ ہو جائیں انھیں اہرام کی دیواروں پر نقش کر دیا۔

ان ہیروغلیفی عبارتوں سے جس طرح اور دوسرے غیر معروف تاریخی حقایق معلوم ہوتے ہیں اسی طرح بعض اولین قدمائے مصر کے دینی معتقدات کا بھی پتہ چلتا ہے۔ بایں ہمہ ان میں زندگی کی ایسی عجیب اور عجیب و غریب تہذیبوں اور طرز معاشرت کے ایسے اشکال بھی ہیں جو اب تک اس متمدن دور میں بھی نہیں حل ہو سکے۔ یہ عبارتیں جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں بادشاہوں کے لیے موت کے وقت اور موت کے بعد دعاؤں کے طور پر پڑھی جاتی تھیں تاکہ اس عالم میں اسے راحت و سکون حاصل ہو اور وہاں بھی اسی طرح شہنشاہ رہے جس طرح وہ اس سے پہلے زمین پر تھا چنانچہ ان کے بہت سے دعائیہ فقروں کا مطلب یہ ہے کہ "تو شہنشاہ کی زندگی کو برقرار اور صحیح و سالم رکھ! تاکہ وہ وہاں بھی تخت نشیں ہو سکے۔"

اس عہد کی اس دینی خصوصیت کے علاوہ اس دور کے بعض ایسے نغمات اور نقوش بھی پائے گئے ہیں جن کا تعلق دنیاوی امور سے ہے کہ اس طرح کا ادب بہت ہی کم ہے۔ مغنیوں کے مقبرے پر چرواہوں اور بار برداروں کے دو گیت دریافت ہوئے ہیں جو انتہائی دلکش ہیں۔

<u>عہد انقلاب</u> | قدیم حکومت کی تباہی اور نئی حکومت کی تعمیر کا وقت عہد انقلاب کے نام سے معروف ہے۔ درحقیقت اس وقت ملک کی ساری فضا ایک انقلابی روح سے معمور تھی اور اس وقت کا منظر ایک اجتماعی انقلاب کی سچی تصویر تھا۔ اسی انقلاب کے پردے میں ایک اجتماعی انقلاب بھی پوشیدہ تھا جس کا منظر [illegible] یہ کہ اس وقت ادب دین کی محدود بندشوں سے آزاد ہوگیا اور دوسرے [illegible] کتابت کی ایک پریشان کن مشکل بھی حل ہوگئی یعنی اب پتھر کے نقش و تصویر کو چھوڑ کر نباتات کے اوراق علوم و آداب میں استعمال کیے جانے [illegible]

اس دور میں مصری قوم کی بھی وہی حالت تھی جو انقلاب کے زمانوں میں اور اقوام کی ہوتی ہے یعنی سطوت و جبروت اور جاہ و حشم اور دنیاوی الجھنوں اور مشکلوں کو دیکھ کر ہمیشہ قومیں مذہب [illegible] طرف اور دین سے کنارہ کشی اختیار کر لیتی ہیں۔ مصر میں بھی اس وقت یہی حالت تھی دینی روح دلوں سے زائل ہو رہی تھی اور مذہبی قیود سے انحراف پیدا ہو چلا تھا ان انقلابات سے ادب کا متاثر نہ ہونا غیر ممکن ہے پس کس طرح ممکن تھا کہ مصر کے اس انقلاب عظیم سے وہاں کا ادب متاثر نہ ہو لیکن اس طرح کے غیر مذہبی ادب کو اس وقت نشو و ارتقا کا موقع نہیں ملا البتہ ہیراکلیوپس کے بادشاہان اسرۂ تاسعہ و عاشرہ کے عہد میں اس ادب کو اچھا خاصا فروغ و انتشار حاصل ہوا اور اس وقت وہاں کے دل کھول کر بے روک ٹوک اپنے غیر مذہبی خیالات کا اظہار کیا۔ شاہ مریکارع کی تعلیمات نقد تجارت اور حکایت فلاح وغیرہ اسی عہد کی چیزیں ہیں اور یہ تمام قصے اس وقت کے ان سیاسی اور اجتماعی حالات کی سچی تصویر ہیں جن سے کہ ملک دوچار تھا مگر باوجود اس کے کہ اس دور کا ادب انقلابی اور انقلابی دور کا ادب ہے ہم اسی میں کھلے ہوئے [illegible] نغمات جیسی صدائیں بھی سنتے ہیں جن سے یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ ہم ایک ایسے دور میں ہیں جہاں انقلاب و حوادث کا مسموم عکس بھی نہیں ہے۔

<u>[illegible]</u> | اس کے بعد جب بارہواں خاندان برسر حکومت آیا تو اس وقت ایک منظم نظام قائم ہوگیا زمانہ آہستہ آہستہ امن و سکون کی طرف آنے لگا اور انقلاب و اضطراب کی چنگاریاں برابر بجھتی رہیں اس امن و سکون کی زندگی میں پھر ادب پر ایک دینی حلقہ نظر آنے لگی اور پھر عالم آخرت کی پرسکون زندگی کا

ذکر اور حیات ارضی میں اخلاق اور خوش خلقی کی تلقین ہونے لگی۔ اس دور میں ملک کے اندر بعض خاص ادبی اسکول بھی قائم ہوگئے جو زبان و ادب کے دلکش اور نادر اسالیب ایجاد کرتے تھے اس دور کے بعض عمدہ عمدہ قصے بھی حاصل ہوتے ہیں جن میں سنوہی اور غریق ملاح کی حکایتیں خاص دلچسپ ہیں اسی طرح کے بعض دوسرے ادب مثلاً مرثیہ، لعنات اور گانے، مواعظ حکم وغیرہ بھی دستیاب ہوئے ہیں جو اس وقت کے وزرا اور داناؤں کے نام سے منسوب ہیں۔

عہد شہنشاہیت | پھر جب اس درمیانی حکومت کا دور بھی انتہا کو آیا اور نئی شہنشاہیت کا عہد شروع ہوا تو اس وقت کے ادب پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہو کہ وہ آہستہ آہستہ سوسائٹی کے لحاظ سے آگے کو بڑھ رہا تھا۔ قدیم طرز سے منقطع اور پرانے قیود سے آزاد ہوکر ایک دوسری راہ پر آرہا تھا جس کی اصل وجہ یہ ہو کہ [illegible] شہنشاہیت کے قیام اور دینی اصلاح کے لیے جس میں شاہ اخناتون نے بھی حصہ لیا تھا خود مصریوں نے بھی جدوجہد اور کوشش کی تھی اس رجحان کی تخلیق کے لیے انھیں اپنے اسپ تخیل و فکر کی عنان دوسرے میدان کی طرف موڑنی پڑی [illegible] اسلوب میں تبدیلی کرنی پڑی جس سے ان کا ادب قدیم راستوں سے ہٹ کر بہت دور نکل گیا اس عہد کے ادب کا ایک اچھا منظر ان قصوں میں نظر آتا ہو جو آثار میں دریافت ہوئے ہیں اور جن کے بارے میں مورخین کا خیال ہو کہ یہ یوں ہی لکھے گئے تھے مگر حقیقت یہ ہو کہ جب ہم انھیں پڑھتے ہیں تو ہمیں ان میں وہ لذت ملتی ہو اور [illegible] بھی پیدا ہوتا ہو جو اس سے پہلے کے ادب کے مطالعہ سے حاصل نہیں ہوتا۔

اس دور کا دینی و اخلاقی ادب | مصری ادب و فکر پر دین و مذہب کا اثر ایک ایسی چیز تھی جو اس سے کسی منفک نہیں ہوتی چنانچہ اس دور میں بھی اس طرح کے دینی ادب کا ایک بہت بڑا ذخیرہ پایا جاتا ہو لیکن چونکہ [illegible] ادب قدیم راہ سے الگ ہوکر ایک دوسرے رجحان پر آگیا تھا اس لیے اس میں بھی ایک خاص امتیاز ہوگیا تھا جو اسے دوسروں سے بالکلیہ ممیز کردیتا ہو۔ اس دور کے ادب کی ایک اچھی مثال اخناتون کے نغمات میں پائی جاتی ہو جس میں خدائے واحد کی پرستش اور انسانوں سے ایک بے پایاں محبت کی تلقین کی گئی ہو اسی طرح اخلاقی دعوت اور علم عظیم کی تعلیم بھی اس دور کا امتیاز ہے حکیم آنی

آئے ہیں اور معلومات کا اتنا اہم ذخیرہ ہمارے ہاتھ آگیا ہو کہ اردو کے قدیم اور اردو شہ پارے ابتدائی کتابیں معلوم ہوتی ہیں ضرورت ہو کہ دکن میں اردو کی داستان تاریخی نقطہ نظر سے نہیں بلکہ تنقیدی نقطہ نظر سے پھر سے لکھی جائے اس میں بہت سے نئے بت بنیں گے اور بہت سے پرانے بت ٹوٹیں گے۔

نول کشور پریس سے جناب آسی لکھنوی کی نگرانی میں کلیات میر کا ایک نیا اڈیشن شایع ہوا ہے پچھلے اڈیشن میں اس قدر غلطیاں تھیں اور اس کی ظاہری حیثیت ایسی گئی گزری تھی کہ ایک حسین گر بدقوارہ عورت کا تصور ہوتا تھا اس اڈیشن میں فورٹ ولیم والے نسخے سے خاص طور پر مدد لی گئی ہے اور اگرچہ اب بھی بعض غلطیاں رہ گئی ہیں اور تنقیدی حصہ دراصل تبرک ہی ہو۔ مگر پھر بھی میر کے مطالعہ کے لیے یہ اڈیشن دوسرے نسخوں سے زیادہ مفید ہوگا

ابھی تک ہمارے نقادوں نے انتخابات کی طرف پوری توجہ نہیں کی ہو۔ قدما کو جو فرصت اور اطمینان میسر تھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے شعرا نے بڑے بڑے دفتر چھوڑے ہیں ان میں اچھے اچھے شعر بھی ہیں اور پست اور مبتذل اشعار بھی ہر شخص کو نہ اتنا مقدور ہو نہ اتنی فرصت کہ اساتذہ کے سارے کلام کا مطالعہ کرے اس لیے انتخابات کی صورت میں قدما کا کلام پیش کرنا زیادہ مناسب ہو۔ میر کے دو انتخاب موجود ہیں اور مولوی عبدالحق صاحب کا مقدمہ اور انتخاب دونوں آنکھوں پر رکھنے کے قابل ہیں مگر حق تو یہ ہو کہ حق ادا نہ ہوا۔ اس سال کے دوران میں داغ کے دو انتخاب شایع ہوئے ہیں ایک منتخب داغ کے نام سے آپ کے شاگرد مولانا احسن مارہروی مرحوم کا ہو یہ انتخاب کا انتخاب ہو اور دیوان کا دیوان پہلے حصے میں صرف وہ اشعار ہیں جو علمی اضافت سے خالی ہیں دوسرے حصے میں ہر طرح کے اچھے اشعار ہیں۔ دوسرا مدیر نیازی کا ہو بہار داغ کے نام سے دونوں کا تنقیدی حصہ بہت اچھا نہیں مولانا احسن مرحوم نے تو یہ کیا ہو کہ دوسرے نقادوں کی رائے نقل کرنے پر اکتفا کی ہو مدیر نیازی نے جو کچھ لکھا ہو وہ بہت ناکافی ہو مگر یہ دونوں کتابیں داغ کے شائقین کے لیے بہت مفید ہیں۔

اگست ۱۹۴۱ء میں اس دور کے مشہور غزل گو شاعر فانی بدایونی کا انتقال ہوا۔ یگانہ نے ٹھیک کہا تھا غالب وقت و میر ثانی مرد، قدیم رنگ کے پرستاروں میں اس وقت فانی جس بلندی پر تھے

ایک جگہ اپنے لڑکے کو مخاطب کرتے ہوئے ماں کے فرائض و واجبات کی طرف منعطف کرتا ہے:۔

[illegible] دو تم اپنی ماں کا بوجھ اس طرح اٹھائے رہو جس طرح [illegible] تک اٹھائے رہی۔ اس نے تمھیں مہینوں حمل میں رکھا اور اس کے [illegible] بعد بھی [illegible] ایک گودوں پر لیے پھرتی رہی۔ تین سال تک تم اس کے پستان [illegible] دودھ کی دھاریں پیتے رہے اور طرح طرح کی گندگیوں سے اس کے جسم کو ناپاک [illegible] مگر اس نے کبھی اس کو ناگوار نگاہوں سے نہ دیکھا اور تم سے یہ کبھی نہیں کہا کہ تم نے ایسا کیوں کیا۔ اس کے بعد اس نے تمھیں مدرسے بھیجا تاکہ وہاں پڑھنا لکھنا سیکھو [illegible] دونوں وہ ہر شام تمھارا گھر پر اچھے اچھے کھانوں اور فرحت بخش پانی سے انتظار کرتی رہی مگر تم جب بڑھ گئے اور خود صاحب عروس و خانہ ہو گئے تو دیکھو ایسا نہ ہو کہ تم اپنی ماں کو بھول جاؤ تمھیں ہمیشہ چاہیے کہ تم ماضی پر ایک نظر ڈال لیا کرو تاکہ وہ زمانہ تمھارے سامنے آجائے جبکہ تم اس کی عنایتوں کا مرکز تھے ــــــ کیا تم اسے جائز رکھتے ہو کہ اپنی ماں سے اس طرح بے تعلق ہو جاؤ کہ وہ تمھیں برا بھلا کہے اور خدا کے دربار میں اس کے ہاتھ تمھاری خاطر بددعاؤں کے لیے اٹھیں۔"

اسی طرح کا ایک اور دلکش اخلاقی قطعہ ہے:۔

"شہر کی غیر معروف اور اجنبی عورت سے بچو کیونکہ وہ ایک ایسی گہری ندی ہے جس کی کوئی حد نہیں اور نہ کوئی انسان اس کے حدود سے واقف ہو سکتا ہے لہذا کہیں ایسا نہ ہو کہ تمھارے قدم اس عمیق دریا میں جا پڑیں ــــ اگر کوئی عورت [illegible] اس کا شوہر غائب ہو تم سے کہے کہ میں حسین ہوں جمیل ہوں تو اس وقت تمھارا خوش ہونا ایک ایسی غلطی ہے جس کی سزا محض موت ہو سکتی ہے۔"

---

[1] قدیم آداب کا یہ مروج اسلوب تھا کہ ہمیشہ وعظ و نصیحت اور اخلاقی تعلیم کے لیے خطاب کے وقت پسر یا ولد کے قسم کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ امثال لقمان اور دیگر کتب نصائح میں یہی اسلوب مستعمل ہے۔

یہ اس ادب کا ایک نمونہ جو اس وقت کے حکما اور اصحاب دانش وفضل کی کاوش کا نتیجہ تھا۔ ہم آج ان شہپاروں کی قدر وقیمت نہیں سمجھ سکتے لیکن اگر اپنی آنکھوں کے سامنے کچھ دیر کے لیے گزشتہ عہد کا ایک منظر لے آئیں جبکہ انسان حضارت و مدنیت کے ابتدائی درجوں میں تھا تو [illegible] ادب و فکر کے اعلیٰ نمونے معلوم ہوں گے، اور ان کا اسلوب بیان اور بلاغت کی خوبیاں بہت دلاویز اور دلکش دکھائی دیں گی

عشقیہ نغمے | اس دور کے ان دینی ادب کے علاوہ اس کے اور دوسرے پہلو بھی تھے چنانچہ اس عہد میں عشقیہ نغمات بھی رواج پا گئے تھے اور ایسے گانے ایجاد ہو گئے تھے جن میں حسن وعشق [illegible] کیفیات محبت کا ذکر تھا مگر یہ نغمات محض ایک حظ و سرور حاصل کرنے کے لیے ایجاد ہوئے تھے اس لیے کہ مصر میں ان کے گانے کا رواج عود و رباب کے ساتھ تھا۔

یہ مصری نغمے مکالمہ [illegible] ہوتے تھے جس میں ایک مرد اور عورت باہم تبادلۂ کلام کرتے تھے اور یہ دونوں ایک دوسرے کو بھائی اور بہن سے خطاب کرتے تھے اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ مصر قدیم میں بھائی اور بہن کی شادی نہ صرف جائز تھی بلکہ بہترین جوڑ سمجھا جاتا تھا۔ عام طور پر یہ دستور تھا کہ پہلے مرد گانے کو شروع کرتا تھا اور جب اپنا ٹکڑا ختم کر لیتا تھا تو عورت اپنا بقیہ حصہ گاتی ذیل میں ایک نغمہ درج کیا جاتا ہے جس میں مرد نے اپنی محبت کا ذکر کیا ہوا ہے کہا ہے کہ میں نیل کے صفحات سے گزرتا ہوا ممفیس کے پاس جاؤں گا۔ اور وہاں اپنی بہن ممفیس سے ملوں گا اس کے دلنواز بوسوں سے اپنے اندر سعادت کی ایک لہر پاؤں گا جو رگ رگ میں دوڑ گئی ہو وغیرہ وغیرہ اصل یہ ہے:۔

"میں نیل کے [illegible] سے گزرتا ہوا ممفیس کے پاس جاؤں گا اور میرے کاندھوں پر جھاڑیوں کا ایک جھنڈ ہوگا میں وہاں جا کر شہنشاہ عدالت بتاح سے کہوں گا کہ آج کی شب مجھے میری بہن عطا کر دو یہ نہر ایک چمنستان ہے جس کی بتاح بتاح جھاڑیاں ہیں اور نکہت اس کے نیلوفر ہیں ایارٹ جس کی کلیاں اور نفرتم جس کے نودمیدہ پھول ہیں [illegible] اس کے بعد طلوع صبح کے وقت ممفیس اس طرح نمودار ہوگی جیسے [illegible]

پتّاں کے سامنے ایک [illegible] اور چھلکتا ہوا جام رکھا ہے۔

پھر جب میں اپنے گھر میں بیدار ہوں گا تو زخمی مریض کا سوانگ بھروں گا اس وقت [illegible] کو میرے دردمند ہمسایے آئیں گے آئیں میں تیری سن بھی ہو گی جو میرے حق میں اطبا سے بڑھ کر شفا بخش ہے اس لیے کہ وہ مقام مرض سے خوب آشنا ہے جب [illegible] دیکھوں گا تو میرا دل بہجت و سرور سے مملو ہو جائے گا میں اپنے ہاتھ کو بڑھاؤں گا تاکہ اسے خود سے لگا لوں جب وہ میرے پاس آ جائے گی تو میرا دل بھی مضطربانہ دھڑکنے لگے گا اور اس وقت جبکہ میں اسے خود سے لگاؤں گا اور اس کے ہاتھ بھی میری طرف بڑھتے نظر آئیں گے تو مجھے ایسا محسوس ہوگا گویا میں ملا اونت پہنچ آیا ہوں اور جب میں اس کے شگفتہ ہونٹوں کا بوسہ لوں گا تو معلوم ہوگا کہ میری رگ رگ میں شراب کی ایک سعید لہر دوڑ گئی ہے حالانکہ میں نے شراب مس تک بھی نہیں کی ہے۔

مرد کا کلام ہے جو نہایت سادہ اور لے غم و پیچ محبت کے وجد و کیف کا آئینہ دار ہے۔ مگر آپ عورت کا کلام دیکھیں گے تو معلوم ہوگا کہ وہ اپنے کر و فن میں مرد سے مختلف ہے وہ اسے ابھارنے اور گرفتار منشوہ کرنے میں ہر اس وسیلے کو استعمال کر رہی ہے جس سے اس پر فتح حاصل کی جا سکتی ہے ذیل میں جو نغمہ درج کیا جا رہا ہے اس میں یہ بات دکھائی گئی ہے کہ ایک عورت چڑیوں کے شکار کی عادی ہے اور ہر روز شام کو چڑیاں کو لے کر ماں کے پاس واپس آتی ہے مگر وہ محبت کے بعد اپنے محبوب کو چڑیوں اور ماں وغیرہ تمام پر ترجیح دے رہی ہے اور اس کے نزدیک یہ زیادہ افضل ہے کہ وہ اپنے محبوب کے ساتھ ہو اور صرف یہی نہیں کہ دونوں شکار کے خوشگوار لمحات باہم بسر کریں بلکہ اس سے بھی خوش آیند یہ ہے کہ وہ ان چڑیوں کو شکار نہ کرے وہ نغمہ سرائی کریں اور یہ باہم ان کے پیارے نغموں سے محظوظ ہوں اور پھر سب سے [illegible] وہ چند خوشنما الفاظ کے اندر اس تمنا کا اظہار کر دیتی ہے کہ وہ ایک دائمی اتحاد اور خالص ازدواج کی طالب ہے۔ نغمے کے الفاظ یہ ہیں

اے محبوب بھائی! میرا دل تیری محبت کے پیچھے دیوانہ ہو رہا ہے حالانکہ خود اپنے نفس سے کہتی ہوں کہ میں یہ کیا کر رہی ہوں؟ میں آتی ہوں اور اپنے ہاتھوں سے جال نصب کرتی ہوں صبح کو جنت کی تمام چڑیاں آسمان معمر پر نمودار ہوتی ہیں جن پر مرگ کا خوشگوار رونق آویزاں ہوتا ہے اس کے جھنڈ کا پہلا پرند دانے کی طرف بڑھتا ہے اور قریب آکر بلاد جنت کی ایک عنبرین خوشبو ہوائیں بکھیر دیتا ہے ناکس وقت تیری چڑی سنا ہوتی ہے کہ کاش اس وقت ہم تم دونوں تنہا ہوتے اور اسے چھوڑ دیتے کہ نغمہ سرائی کرے اور ہم اس کے نغمات سے لطف اندوز ہوتے۔

میں اس وقت کتنی خوش وقت ہوتی کہ جب جال نصب کرتی تو تم بھی ہمراہ ہوتے۔ محبت مجھے اپنی طرف کھینچتی اور میں جال نصب کرنا بھی چھوڑ دیتی اور پھر جب شام کو اپنی ماں کے پاس واپس جاتی تو وہ مجھے چڑیوں سے خالی دیکھ کر پوچھتی کیا آج تم نے جال نصب نہیں کیا؟ تو میں اسے کیا جواب دیتی؟ میں تو خود تمہاری محبت میں گرفتار ہوں۔ تمہارا بوسہ میرے دل میں حیات کے پناہ جذبوں کو بیدار کر دے گا۔ اس وقت میں آہوں سے دعا مانگوں گی کہ اس حیات کو دائم رکھو!

اے حبیب من! میرے دل کی تمنا ہے کہ میں تیرے مال و متاع کی سیدہ منزلہ کی طرح مالک بنوں۔ میری باہیں تیری باہوں میں ہوں۔ اس وقت جب تیری محبت مجھ سے منقطع ہو کر دوسری طرف منعطف ہو جائے گی اور میں دل میں کہوں گی کہ آج میں تم سے دور ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوگا کہ گویا میں قبر میں ایک میت کی طرح دراز ہوں۔ اور ایسا کیوں نہ ہو، بتاؤ کیا تم میرے لیے زندگی و توانائی نہیں ہو!

پیچھے ایک دوسرا اور نغمہ ہے جس میں ایک دوشیزہ جاجتہ کو خطاب کر کے کہہ رہی ہے جب اس نے اسے صبح کو اپنے میٹھے نغموں سے بیدار کیا:

حامہ اپنی میٹھی صداؤں سے کہہ رہی ہے کہ کیا آج تو نہیں اُٹھے گی؟ نہیں اے حامہ!
کیونکہ میں نے آج اپنے بھائی کو اس کے اپنے بستر پر پایا ہے۔ میرا دل سرور سے لبریز
ہے اس لیے کہ اس نے کہا ہے کہ میں کبھی تجھ سے جدا نہ ہوں گا اور تیرا ہاتھ برابر میرے
ہاتھوں میں ہوگا اور میں جہاں بھی جاؤں گا وہاں تو میرے [illegible] ہوگی۔ اس نے
میرے دل کو سماتے اُلم کے لذت سے پُر کر دیا ہے۔"

ان نغمات کے علاوہ جو عشق و محبت کی کیمیات کے آئینہ دار ہیں ہیں ایسے نغمے [illegible] ہیں جو شکوہ [illegible] اور گلۂ جور و جفا سے پُر ہیں۔ ان کے علاوہ نظم کی ایک اور قسم پائی جاتی ہے جسے ہم تسبیب و تغزل سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اس میں محبت کا بیان اور عورت کے حسن [illegible] کی نسوانی نزاکت کی داستان سرائی ہے اس تیسری قسم کے نغمات سے قدیم مصری مذاق کا پتہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے ہاں عورت کے حسن و جمال کا معیار کیا تھا!

<u>علماء اور حکایات نگاری</u> | مصریوں نے جب کتابت ایجاد کی اس وقت سے ان کے کتاب اور مصنفین برابر اس کے اسالیب اور اسرار کتابت کے حامل رہے۔ انھیں حاملین کتابت کا ایک طبقہ ایسا ہوتا تھا جو حکومت اور ملکی ادارہ کے اعمال کا متولی ہوتا تھا۔ ٹیکس، زمینوں کی پیمائش و [illegible] اور حکومت کا میزانیہ نیز حکومت کے دیگر دفتری اُمور اسی سے متعلق ہوتے تھے۔ حکومت میں اس طبقہ کا ایک اہم درجہ اور مقام تھا اور وہ اپنے کاموں کو بڑی خوبی سے انجام دیتے تھے۔ ان کے علاوہ علما کا ایک طبقہ تھا جو اپنے فن کا خادم تھا اور علم و تدریس میں مشغول رہتا ہے۔ آج ایسے شواہد ملے ہیں جو قطعی طور پر ان کی خدمت علم دین اور اس وقت کے بلند پایہ اسالیب پر دلالت کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ ایک طبقہ ایسا بھی تھا جسے ہم مغنی اور حکایت گو کے لفظ سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ یہ طبقہ اپنی زندگی کو محض عام قوم کے لیے وقف کر دیتا تھا۔ اس قسم کے ادب کا اثر ہمیں آج بھی جدید مصر میں نظر آتا ہے جبکہ رات کے پُر سکون اور فرحت زا لمحات میں دیہات کے کسان حلقہ سا کر اس قسم کے نغمات گاتے ہیں۔ اُن نغمات کو جسے ملاح اپنی کشتیوں میں اور کسان اپنے کھلیانوں میں گاتے تھے اور جن کو بعض قدیم مصری محرّروں نے

مقبروں کی دیواروں پرنقش کیا ہے اور مغنیوں کی تصویریں بھی ضبط کی ہیں جیسے "پٹاموتن کا مقبرہ میں بہت سی رقاصاؤں کی تصویریں ہیں وہ بیشک وہی ہیں جو سربازار اپنے فن کا اظہار کرتی تھیں۔ اس طرح ایک شاعر کی تصویر ہے جو ایک شہر کے چوراہے پر منبر پر بیٹھ کر حاضرین کو اپنے کلام سے محظوظ کر رہا ہے اس کے بارے میں اے آرمن صاحب کا خیال ہے کہ وہ ان شعرا کی تصویروں کا ایک نمونہ ہے جو اپنے فن شعر وغنا سے قوم کے عوام کو محظوظ کرتے تھے اور اپنے فن و کمال کی نمائش عامۃ قوم میں کرتے تھے آرمن صاحب کہتے ہیں کہ یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ مصر قدیم میں جن چیزوں کو ضبط کیا گیا وہ محض وہی ہیں جن کا تعلق شاہوں، نوابوں اور ان کے خواص اور حلقہ نشینوں سے تھا۔ وہ چیزیں نہ ضبط کی گئیں جو عوام کی زندگی اور ان کی دلچسپیوں کی آئینہ دار تھیں۔ اگر عوام کی زندگی کی تصویر ضبط کی جاتی تو یقیناً ان حکایت نگار شعرا کے نقوش بھی ہم تک پہنچتے جن کا مطمح نظر عوام ہوتے تھے اور وہ سڑکوں اور عام اجتماعوں میں ان کی زندگی کے واقعات اور گزشتہ ابطال و ملوک اور ساحروں کی حکایتوں کے ذریعہ ان کے جذبات و احساسات کو ابھارتے تھے آرمن صاحب کا یہ بھی خیال ہے کہ مصر قدیم کے اکثر قصے جو ہم تک پہنچے ہیں وہ اس پر اچھی طرح دلالت کرتے ہیں کہ اس وقت بھی موجودہ طرز کے شعرا کا وجود تھا اس لیے کہ وہ کل کے قبلی شعرا جن حکایتوں کو نظم کرتے تھے وہ وہی ہیں جو ان تاریخی شخصیتوں سے متعلق ہیں جو شجاعت و کرامت اور اسی طرح کی دوسری خوبیوں میں مشہور تھیں اور یہ اغلب ہے کہ یہ واقعات جیلاً بعد جیل انھیں پرانے شعرا سے ان تک پہنچے ہیں اس کے علاوہ بحث و آثار میں ایسے معلوم قصے بھی دستیاب ہوئے ہیں جو تاریخی ہیں مثلاً عہد مسیحی سے متعلق قمبیز کا قصہ، اغریقیوں کے عہد سے متعلق نکتنبوس کا قصہ اور جدید شہنشاہیت کے عہد سے متعلق قصے جیسے تحتمس سوم اور شاہ بکوسی آپاپیس کی حکایتیں اور پھر آخر میں مملکت متوسط کے قصے جیسے قوقو وغیرہ ان تمام سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ان حکایت نگار شعراء اور مغنیوں کا وجود تھا۔

قدیم مصری قصص | یہ ایک سخت وسیع موضوع ہے جس کی خاطر تنہا ایک کتاب درکار ہے اس لیے کہ مصر قدیم کے متعدد ادوار کے بے شمار قصے دریافت ہوئے ہیں جن میں بعض خدا اور ابطال و ملوک کے قصے ہیں۔

اور بعض خدائی جانور مثلاً گائے، سانپ اور گدھ وغیرہ سے متعلق ہیں اور کچھ قومی زندگی کے واقعات قومی افراد کی داستانیں ہیں۔ ان میں [illegible] قصہ ایک مبسوط [illegible] کی تحلیل و درس کا محتاج ہے لہٰذا یہ ناممکن ہے کہ مختصر الفاظ میں ان پر کچھ لکھا جا سکے۔ البتہ ایک چیز لائق ذکر اور قابل اہتمام نظر و فکر ہے وہ یہ کہ ادب مصر قدیم کے ایک مصری محقق جمال الدین الشیال استاذ تاریخ در جامعہ مصر کا خیال ہے کہ معروف حکایات الف لیلہ و لیلہ اور مصر وسطیٰ کے عربی قصے قدیم مصری قصوں سے بہت حد تک متاثر ہیں صاحب مذکور نے بتلایا ہے کہ قدیم مصری قصہ ملاح غریق اور قصہ سندباد البحری میں کہاں تک تشابہ ہے۔ اسی طرح الف لیلہ و لیلہ کا قصہ قمر الزمان یا قصہ موسیٰ و یوسف قدیم مصری قصہ "دو حقیقی بھائی" سے کس حد تک مشابہ ہے۔ اسی قسم کی انھوں نے ایک طویل فہرست تیار کی ہے اور کافی درس و تحقیق کے بعد قدیم مصری حکایات و مصر وسطیٰ کے عربی قصوں میں باہم تعلق اور مماثلت کو واضح کیا ہے ہم یہاں پر اس فہرست کو طوالت کے خیال سے نظر انداز کرتے ہیں۔

صدر الدین حکیم

سنہ ۴۳-۱۹۴۲ء کا بجٹ

جمہوری حکومتوں کے ممبران یا عوام یا ان کے نمایندوں کی جانب سے نکتہ چینی ہوا کرتی ہو مگر جتنے سخت اعتراضات اور شدید نکتہ چینی بجٹ پر ہوتی ہو اتنی اور کسی چیز پر نہیں ہوتی اور وجہ صاف ظاہر ہو کہ بجٹ کا سیدھا تعلق عوام سے ہوتا ہو اور وہ اس سے براہ راست یا بالواسطہ متاثر ہوتے ہیں مثلاً نمک پر محصول بڑھا دیا جائے تو ہر وہ شخص جو نمک استعمال کرتا ہو اس سے متاثر ہوتا ہو اور دنیا میں ستاید چند مرتبہ [illegible] یا جیبوں نے نمک کے ٹیکس کی مخالفت کی ہو ہر مرد و عورت اور بچہ و بوڑھا نمک استعمال کرتا ہو اور ہر وہ شخص جو کسی مقدار میں نمک استعمال کر رہا ہو غیر محسوس طریقہ پر حکومت کو محصول بھی ادا کر رہا ہو یہی حال اور دوسری چیزوں کا ہو حکومت ہند کا بجٹ ہر سال مارچ کی پہلی تاریخ کو وزیر مالیہ سنٹرل لیجسلیٹو اسمبلی میں پیش کرتے ہیں جہاں اس پر بڑا بحث و مباحثہ ہوتا ہو بلکہ اس زمانے میں اخباروں، کانفرنسوں، انجمنوں اور جلسوں میں بھی اسی کا تذکرہ رہتا ہو اس سال کا بجٹ اسمبلی میں پیش ہو چکا ہو اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہو کہ ہندوستانی بجٹ اور اس سال کے بجٹ پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے۔

ہندوستانی مالیہ مختلف درجوں اور منزلوں سے گزرتا ہوا موجودہ شکل تک پہنچا ہو اس کی مختصر کیفیت یہ ہو کہ سب سے پہلے ۱۸۵۹ء میں وزیر مالیہ کا تقرر ہوا اور ۱۸۶۰ء میں ہندوستان کا پہلا موازنہ تیار ہوا ابتدا میں برطانوی ہند کا کل موازنہ مشترک تیار ہوتا تھا اور ساری آمدنی اور خرچ مرکزی حکومت کے ہاتھ میں رہتا تھا البتہ وہ صوبہ واری حکومتوں کو کچھ رقم خرچ کرنے کے لیے دیتی تھی جو ان کو حسب ہدایت خرچ کرنا پڑتی تھیں ۱۸۷۰ء میں چند محکمے اور ۱۸۷۷ء میں بعض اور نئے محکموں کا انتظام صوبہ واری حکومتوں کے سپرد ہوا اور اس میں صوبوں اور مرکزی حکومت کے درمیان پنج سالہ مالی معاہدے ہوا کرتے تھے جس میں صوبوں کو نقصان اٹھانا پڑتا تھا ۱۹۱۲ء میں کچھ مزید

اصلاحات ہوئیں اور اس کے بعد اہم اصلاح ۱۹۱۹ء میں ہوئی اور مرکزی حکومت اور صوبہ واری حکومتوں کی آمدنی و خرچ کی مدیں الگ الگ کر دی گئیں ۱۹۳۵ء سے یہ تقسیم اور زیادہ قطعی ہو گئی اور مرکزی حکومت نے بعض نئے صوبوں کو امداد دینے کا وعدہ بھی کر لیا ہے اور محصول آمدنی میں مرکزی حکومت صوبہ واری حکومتوں کو کچھ حصہ دیتی ہے چنانچہ اس سال صوبوں کو ۲۷۹ لاکھ اور آئندہ سال ۲۷۰ لاکھ روپیہ ملے گا ۱۹۲۵ء سے قبل ریل کا بجٹ مرکزی حکومت کے بجٹ کا ایک حصہ ہوا کرتا تھا مگر اس سال پہلی مرتبہ ریلوے کا بجٹ علیحدہ پیش کیا گیا اور اب یہ الگ ہی پیش ہوتا ہے۔

جیسے جیسے انسانی ضروریات بڑھتی جاتی ہیں اور تمدن و معاشرت میں ترقی ہو رہی ہے اور لوگوں کی آمدنی میں اضافہ ہو رہا ہے اس طرح حکومت کی آمدنی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اس کے اخراجات بڑھتے ہیں ذیل میں ہندوستان کے چند نمایاں سالوں کی آمدنی اور خرچ کے اعداد دیے گئے ہیں

(کروڑ روپیوں میں)

	آمدنی	خرچ	کمی یا بیشی
۱۹۱۴-۱۵ء	۷۶٫۱۵	۷۸٫۸۳	۲٫۶۸ -
[illegible]	[illegible]	[illegible]	۱۲٫۱۳ +
۱۹۱۹-۲۰ء	۱۳۷٫۱۴	۱۶۰٫۳۹	۲۳٫۶۵ -
۱۹۲۱-۲۲ء	۱۴۴٫۸۶	[illegible]	[illegible] +
۱۹۳۸-۳۹ء	۸۵٫۹۲	۸۵٫۸۳	[illegible]
۱۹۴۰-۴۱ء	[illegible]	۹۲٫۵۹	[illegible] -
۱۹۴۱-۴۲ء	۱۲۹٫۶۲	۱۴۶٫۸۹	[illegible]
۱۹۴۲-۴۳ء (تخمینہ)	۱۴۰٫۰۰	[illegible]	[illegible]

جب سے جنگ شروع ہوئی ہے ہندوستان کی مدافعت کے اخراجات میں برابر اضافہ ہو رہا ہے چنانچہ جنگ کے ان سالوں کا بجٹ حسب ذیل ہے

(کروڑ روپوں میں)

	۱۹۴۰-۴۱	۱۹۴۱-۴۲	۱۹۴۲-۴۳ (تخمینہ)
(۱) عام سالانہ بجٹ	[illegible]	[illegible]	[illegible]
(۲) قیمتوں میں اضافہ کی وجہ سے بجٹ میں اضافہ [illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
(۳) ہندوستان کی مدافعتی تدابیر [illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
(۴) [illegible]	۸۰٫۱۲	۸۰٫۴۱	۱۴۱[illegible]
	۵۳٫۵۱	۱۰۲[illegible]	[illegible]

جنگ کی وجہ سے سالانہ بجٹ ہوگیا ہے آمدنی کی مدات میں کمی ہونے لگی ہے اور اخراجات میں برابر اضافہ ہورہا ہے مرکزی حکومت کی آمدنی کی سب سے بڑی مد محصول درآمد و برآمد ہے اور اس کا انحصار تجارت کی کمی و بیشی پر ہے مگر جنگ کی وجہ سے تجارت میں بڑی تخفیف ہوگئی ہے بین الاقوامی نازک صورت حال، جہازوں کی کمی، ان کے کرایوں میں زیادتی اور بیمہ کی شرح میں اضافہ سے بہت کم مال ملک سے درآمد ہوتا ہے پھر بیرونی ملکوں میں زیادہ تر آلات حرب تیار ہورہے ہیں اور تجارتی سامان کی پیدائش میں تخفیف ہوگئی ہے خود ہندوستان میں بھی جنگی اغراض کے لیے زیادہ سامان تیار ہورہا ہے جاپان کے جنگ میں شامل ہوجانے سے اور بالخصوص سنگاپور کے نکل جانے سے ہندوستان کی مشرقی تجارت کو بڑا نقصان پہنچا ہے مشرقی جزائر اور ملایا وغیرہ پر دشمن کے قبضے سے ان ملکوں سے تجارت بالکل ختم ہوگئی ہے رنگون کا بندرگاہ تو بالکل ہی ختم ہوگیا لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ کلکتہ، چٹاگانگ اور مدراس کی بندرگاہوں کو بھی بڑا سخت نقصان پہنچ گیا ہے اس نقصان کی تھوڑی بہت تلافی اس نئے راستے سے ہوجائے گی جو آسام سے گزرتا ہوا ہندوستان اور چین کو ملانے کے لیے زیر تعمیر ہے کیونکہ اس کے ذریعہ سے چین کے ساتھ آزادی سے تجارت ہوسکے گی مگر مجموعی حیثیت سے کروڑگیری کی آمدنی میں بڑی کمی ہوگئی ہے چنانچہ اس سال اس مد کی آمدنی کا تخمینہ ۳۶ کروڑ کے بجائے ۳۲ کروڑ کیا گیا ہے اس میں دو کروڑ کی وہ رقم بھی شامل ہے جو ایک نئے محصول کی صورت میں عموماً اور چھوٹے ریشہ والی روئی پر لگایا گیا ہے۔

وہاں مت سے لوگوں کا تصور بھی نہیں پہنچ سکتا، یہ نہ تھا کہ فانی اپنے گرد و پیش نہ دیکھتے ہوں مگر انھیں تو ہر طرف
ایک ہی چیز نظر آتی تھی وہ شب ہجر کے پرستار اور یاسیات کے امام اس لیے تھے کہ ان کی دنیا شب ہجر
اور یاس ہی کا دوسرا نام بن گئی تھی۔ غالب کی فکر اور میر کا احساس اس زمانے میں صرف فانی نے پایا تھا۔
غزلوں میں وہ میر کے اور بھی قریب ہو گئے تھے اور وجدانیات فانی میں جو ایک چھوٹا سا مجموعہ ان کے کلام
کا ان کے مرنے سے چند ماہ پہلے شائع ہوا تھا میر کا رنگ بہت گہرا نظر آتا ہے۔

فانی کے اس مجموعہ کے علاوہ مشہور شعرا میں سے سیماب کا بھی ایک مجموعہ ساز و آہنگ کے نام سے
نکلا ہے۔ سیماب غزل بھی اچھی کہتے ہیں اور نظم بھی۔ ان کے یہاں پختگی فن بھی ہے اور پاکیزگی ذوق بھی۔ وہ ان
شعراء میں سے ہیں جو پہلے تو پرانے رنگ کی غزلوں سے، مگر زمانے کا رنگ دیکھ کر نئے رنگ کی
نظمیں بھی لکھنے لگے ہیں۔ وہ بہت لکھتے ہیں اور بے تکان لکھتے ہیں۔ اور شاید انھیں احساس نہیں کہ اس
بسیار گوئی کی وجہ سے کہیں کہیں وہ سپاٹ ہو جاتے ہیں۔ اختر انصاری کے قطعات کا ایک مجموعہ آبگینے کے
نام سے نکلا ہے۔ اختر ہمارے نوجوان شعرا میں ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ وہ لوگوں کے کہنے سننے سے وہ نہیں
بن جاتے جو لوگ انھیں بنانا چاہتے ہیں وہ وہی رہتے ہیں جو ان کا دل انھیں بناتا ہے وہ حسن کے پجاری
اور نور و نغمہ کے شیدائی ہیں اور چاندنی کی ٹھنڈی اور لطیف روشنی کے گیت گاتے ہیں۔ ہماری اردو شاعری
میں کلیدی جذبہ بہت کچھ ضائع ہوتا ہے۔ نیم نظم خیالات کا ایک جنگل ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وار بھرپور نہیں ہوتا
اور تاثر پوری مکمل نہیں ہو پاتی۔ قطعات میں خصوصاً دو شعر کے قطعوں میں ایک ہی خیال یا ایک ہی جذبہ، دوسرے
الفاظ میں ایک ہی وار ہوتا ہے مگر اس کا اثر ذہن پر دور رس ہوتا ہے۔ اختر نے اس بات کو سمجھا بھی ہے اور برتا بھی۔

اقبال کے بال جبریل کا دوسرا اڈیشن بھی اس سال نکلا ہے اردو میں یہ بھی غنیمت ہے، معلوم ہوتا ہے کہ
اقبال کی مقبولیت میں ابھی کوئی کمی نہیں آئی اور ابھی کچھ عرصے تک ہمارے بڑے سے بڑے حکما اور لطیف
سے لطیف فن کار کے لیے اقبال کے کلام کی کشش باقی رہے گی۔ اسرار و رموز کا بھی ایک نیا اڈیشن
نکلا ہے اور ایک صاحب نے تو اس کی شرح بھی لکھی ہے اور وہ بھی منظوم۔ ان کو چاہیے تھا کہ کم از کم اقبال ہی
سے سبق لیتے۔ سنائی کے قصیدے کی بحر میں کچھ اشعار لکھتے لکھتے اقبال نے سنائی کے ادب کی وجہ سے

مرکزی حکومت کی آمدنی کا دوسرا اہم ذریعہ ریلیں ہیں مگر جنگ کے زمانے میں زیادہ مسافروں اور زیادہ مال و اسباب منتقل کرنے سے فایدہ نہیں اٹھایا جا سکتا کیونکہ جنگی اغراض کے لیے ریلوں کی شدید ضرورت ہوتی ہے اور اس وقت انجنوں، مال اور مسافروں کے ڈبوں اور دوسرے ضروری سامان کی قلت محسوس ہونے لگی ہے چنانچہ اکثر مقامات پر بعض ریلوں نے اپنی چند گاڑیوں کو بند کر دیا ہے۔ مخصوص ریلوں اور میلوں، جاتراؤں، اور عرسوں کے لیے جو اسپیشل چلا کرتی تھیں وہ بند کر دی گئی ہیں بعض رعایتیں جو [illegible] کر حاصل تھیں وہ واپس لے لی گئیں ہیں۔ "ویگنوں کو بیکار نہ رکھیے" "ویگنوں سے پورا پورا فایدہ اٹھایئے"، "بلا ضرورت سفر نہ کیجیے" اس قسم کی مانعتی اور حفاظتی تدابیر کی مختلف کڑیاں ہیں مگر ساتھ ہی ساتھ حکومت اس ذریعہ سے جنگی اخراجات میں مدد بھی لینا چاہتی ہے چنانچہ اس کی ایک ہی صورت ہو سکتی ہے کہ مسافر بھی کم سفر کریں اور ریلوں پر بار بھی زیادہ نہ پڑے اور حکومت کی آمدنی کم نہ ہو یعنی مسافروں اور مال کے کرایوں میں زیادتی کر دی جائے چنانچہ گذشتہ مہینہ جب ریلوے بجٹ اسمبلی میں پیش ہوا تو اکثر ریلوں نے کرایوں میں اضافہ کر دیا ہے۔

تیسری اہم چیز محصول آمدنی ہے ملک میں عام بے چینی اور تجارت میں تخفیف وغیرہ کی وجہ سے اس میں بھی کمی ہونے لگتی ہے مگر حکومت کے ہاتھ میں یہی ایک ایسا مجرب نسخہ ہے جو ایسے سخت اور کٹھن وقت آزمایا جا سکتا ہے یعنی حکومت ایسے وقت یا تو انکم ٹیکس کی شرح میں اضافہ کر دیتی ہے یا محصول عاید ہونے والی آمدنی کا معیار گھٹا دیتی ہے پھر بھی اگر خسارہ کی تکمیل نہ ہو سکے تو قرض لیکر کام چلایا جاتا ہے

دوسری طرف جنگ کی وجہ سے عام اخراجات اور بالخصوص جنگی اخراجات میں کافی اضافہ ہو جاتا ہے چنانچہ اس مرتبہ کے بجٹ میں مدافعت کے سلسلے میں ۱۳۲ کروڑ روپیہ خرچ ہونے کا اندازہ ہے جو ہندوستان کے عام فوجی سالانہ اخراجات سے ۹۰ کروڑ کے قریب زیادہ ہے بقول وزیر مالیہ آج کل ہندوستان جنگ پر روزانہ ۴۰ لاکھ روپیہ صرف کر رہا ہے اور یہ صرف [illegible] ہے جبکہ حکومت برطانیہ ۴۰ کروڑ روپیہ کی سالانہ امداد کر رہی ہے واضح رہنا چاہیے کہ اس رقم میں ہندوستان میں رہنے [illegible] کے اخراجات بھی شامل ہیں، اس کے علاوہ برطانیہ بلا کسی قیمت کے ہوائی جہاز

گاڑیاں، توپیں اور دوسرا فوجی سامان بھی فراہم کر رہی ہے اب تک ایسا جو سامان آ چکا ہے یا ۱۹۴۲ء کے اختتام تک جو سامان آئے گا اس کی مجموعی قیمت ۲۰ کروڑ روپیہ کے قریب ہوگی۔

ان جنگی اخراجات کی وجہ سے اس سال کے بجٹ میں ۔۔۔ کروڑ روپیہ کے خسارہ کا اندازہ کیا گیا اس خسارہ کا کچھ حصہ پورا کرنے کے لیے مندرجہ ذیل طریقے اختیار کیے گئے ہیں۔

(۱) انکم ٹیکس کا معیار کم کر دیا گیا یعنی ان آمدنیوں پر جو ایک [illegible] درمیان ہیں ان پر ۵۰۰ روپیہ کے بعد ۲ پائی فی روپیہ کے حساب سے ٹیکس لگایا جائے گا لیکن اس میں یہ رعایت رکھی گئی ہے کہ اگر وہ [illegible] سیکڑے کے حساب سے رقم سیونگ بینک کے ڈیفنس اکاؤنٹ میں جمع کر دی جائے تو یہ محصول ادا کرنا پڑے گا اس سے رقم جنگ ختم ہونے کے ایک سال بعد واپس لی جا سکے گی اس اثنا میں اس پر ۲½ فی صدی کے حساب سے [illegible] ملے گا مثال سے اس طرح یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ زید کی آمدنی ۱۲۵۰ روپیہ ہے اس کو [illegible] روپیہ پر کوئی ٹیکس نہ دینا پڑے گا اور بقیہ پانسو پر ۲ پائی کے حساب سے پندرہ روپیہ دس آنے ٹیکس ادا کرنا ہوگا لیکن اگر وہ چار روپیہ فی سیکڑے کے حساب سے پانسو کی رقم کے واسطے بیس روپیہ ڈاک خانے میں جمع کرا دے تو اس محصول سے بچ جائے گا وزیر مالیہ کا خیال ہے کہ یہ ٹیکس نہیں ہے بلکہ دراصل روپیہ پس انداز کرانے کی ایک موثر تدبیر ہے لیکن صاحب موصوف نے اس بات کو نظر انداز کر دیا کہ اس میں جبر کا پہلو شامل ہو گیا ہے اور جب کسی تعمیری اور مفید کام میں جبر شامل ہو تو عوام اس کی وہ افادیت محسوس نہیں کر سکتے جو بلا جبر ان کی سمجھ میں آ سکتی ہے۔

(۲) حکومت جو مزید (سرچارج) ٹیکس وصول کرتی ہے اس کی شرح میں بھی اضافہ کر دیا گیا ہے لیکن یہاں بھی یہ رعایت رکھی گئی کہ حکومت اس مزید محصول کا کچھ حصہ جنگ کے بعد واپس کر دے گی

(۳) زائد منافع والے ٹیکس کی شرح کو برقرار رکھا گیا ہے لیکن اس میں بھی یہ ترمیم کی گئی ہے کہ اس کا ۱/۵ حصہ جنگ کے بعد واپس کر دیا جائے گا۔

(۴) تمام درآمدہ اشیا پر موجودہ محصولوں کا ۱/۵ حصہ اضافہ کیا گیا البتہ خام روئی اور موٹر اسپرٹ

اس میں شامل نہیں، لیکن موٹر اسپرٹ کے محصول جنگی میں تین آنے فی گیلن کا اضافہ کر دیا گیا نیز برما سے
سے درآمد ہونے والی چند اشیا تجارتی معاہدے کی بدولت اس اصول سے مستثنیٰ رہیں گی نمک کا
درآمدی محصول [illegible] نمک کی جنگی [illegible] کے برابر ہو جائے گا

(ہ) ڈاک کا لفافہ سوا آنے کے بجائے ڈیڑھ آنے معمولی تار دس آنے کے بجائے بارہ آنے اور
ایکسپریس تار [illegible] روپیہ کے بجائے [illegible] ٹیلیفونوں کی فیس میں بھی اضافہ ہوگا۔
اور ٹرنک ٹیلیفونوں کی فیس میں بھی اتنی صدی سے ۲۰ فی صد تک اضافہ کیا جائے گا
[illegible] سے ۱۲ کروڑ کی آمدنی ہوگی [illegible] ۴۰ کروڑ [illegible] گا جو قرض
سے پورا کیا جائے گا۔

گویا اس ملک کے محصول میں ۱۲ کروڑ کا اضافہ ہوا جو کہ زیادہ [illegible]
[illegible] بہت بڑھ جاتا ہو کہ پچھلے دو سالوں میں بھی ۲۰ کروڑ کا اضافہ ہو چکا ہو گویا آغاز جنگ سے
اب تک نئے ٹیکسوں کی مقدار ۳۲ کروڑ ہو گئی ہے جو ہندوستان کی عام سالانہ آمدنی اور قیمت [illegible]
[illegible] بجٹ زائد اضافے کی وجہ [illegible] شدید [illegible] ہے مگر موجودہ بجٹ پر کوئی تنقید اس لیے نہیں
کی جا سکتی کہ یہ جنگ کے زمانے کا بجٹ ہے اور جنگ میں حکومتوں اور ان کے ساتھ [illegible]
[illegible] اٹھانا پڑتی ہیں وہ ناگزیر ہیں جرمنی جو اس وقت دنیا پر قبضہ کرنے
کی فکر میں لگا ہوا ہے اس کے قومی قرضہ کی مقدار ۱۰۷ ارب مارک یا ۴۳ ارب ڈالر یا ۱۲۹ ارب
روپیہ کے قریب تھی یہ قرضہ یکم ستمبر ۱۹۳۵ء سے آخر ستمبر ۱۹۴۱ء تک لیا گیا تھا گویا اب تو اس میں
[illegible] اضافہ ہو گیا ہوگا اس کے علاوہ عوام کی آمدنی کا بڑا حصہ ٹیکسوں کی صورت میں حکومت کی
[illegible] امریکہ کی متحدہ ریاستوں کا اس سال کا بجٹ اپنی تاریخ میں آپ مثال ہے نیوزی لینڈ
[illegible] چھوٹے جزیرے جنگ کے گزشتہ دو سالوں میں ۲½ کروڑ پونڈ مدافعت پر خرچ کر چکے
[illegible] سال [illegible] کے مدافعت کا بجٹ ۲½ کروڑ پونڈ یا ۸۵ کروڑ روپیہ کے قریب ہے جنگ
کے زمانے میں ملکی اخراجات میں کمی کرنا خودکشی کے مترادف ہے۔

گذشتہ جنگ سے امریکہ کی متحدہ ریاستوں نے بہت زیادہ اور ہندوستان نے بھی تھوڑا بہت معاشی فائدہ حاصل کیا تھا لیکن موجودہ جنگ میں حالات بالکل بدل گئے ہیں۔ امریکہ نے ابتدا میں تھوڑا بہت فائدہ ضرور حاصل کیا مگر اب تو وہ خود ایک [illegible] سیاسی اعتبار سے خطرے کے قریب آگیا ہے بلکہ معاشی اعتبار سے بھی کافی نقصان میں ہے جاپان کے جنگ میں شامل ہو[illegible] سے نہ صرف خطرہ بہت قریب آگیا ہے بلکہ [illegible] بہت کچھ بدل گئی [illegible] بالکل ختم ہو گئی ہے سنگاپور وغیرہ کے ہاتھ سے نکل جانے کی وجہ سے بحر ہند کی حالت بھی محفوظ نہیں رہی اس طرح ہماری تجارت کو بڑا بھاری صدمہ پہنچنے کا امکان ہے اور تجارت میں تخفیف کی وجہ سے محصول [illegible] کی آمد میں کمی ہو گی جنگی کی آمدنی کم ہو جائے گی ریلوں کی آمدنی میں تخفیف ہو گی اور خود لوگوں کی آمدنی کم ہو جانے کا بھی امکان [illegible] ملک میں عام اشیا کی قیمتوں میں بے انتہا اضافہ ہو رہا ہے اور نئے اور پرانے محصولوں کا بار بڑھ رہا ہے اس طرح معین آمدنی پانے والا طبقہ اور غریب و متوسط لوگ بڑی کشمکش میں گرفتار ہیں مگر اس کا علاج حکومت یا کسی ایک فرد کے بس میں نہیں لہذا ایسی صورت میں خطرات کو برداشت کرنے کی عادت ڈالنا ضروری ہے ضرورت ہے کہ اپنی روزمرہ زندگی کے ہر شعبہ میں کفایت سے کام لیا جائے ہندوستان کو اور اس کے شہروں اور دیہات کو جس حد تک ممکن ہو خود کفیل بنانے کی کوشش کی جائے اور خود اپنے ذرائع پر بھروسہ کیا جائے اور اپنے آپ کو پورے سودیشی ماحول کا عادی بنا لیا جائے کیونکہ اسی میں ملک کی بہتری مضمر ہے۔

محمد احمد سبزواری ایم اے

(مئے کہنہ)

واسطی

منشی سید فضل رسول خاں واسطی سندیلہ (یو پی) کے روسا میں سے تھے ۱۲۲۰ھ میں پیدا ہوئے جس کو آج ایک سو چھبیس سال [illegible] مروجہ فارسی استعداد اور شعر سے خاص مناسبت تھی ایام حوالی میں ریذیڈنسی گوالیار میں ملازم تھے بعد میں تعلقدار ہو گئے ان کے زمانے میں ان کے بعد ابھی تک بھی سندیلہ میں سالانہ مشاعرے ہوتے [illegible] صاحب ایم ایل اے (یو پی) ان کے پڑپوتے ہیں حافظ کلام ناسخ اہل دہلی کے شاعروں میں شمار ہونے کے قابل ہیں ان کے کلام میں بے ساختگی، سادگی، گہرائی فکر اور اثر آفرینی کی عمدہ عمدہ مثالیں نظر آتی ہیں اسیر کلکسری سے تلمذ تھا ان [illegible] میں مطبع نولکشور میں دوسری بار شائع ہوا۔ ان کے شاعرانہ کمال کا اندازہ ذیل کے اشعار سے بخوبی ہو سکتا ہے

ہو زیست وصل ہو اس جان جاں سے کیا
پردہ بغیر مرگ اُٹھے درمیاں سے کیا

کیوں نہ ساماں کروں بے سروسامانی کا
جمع اسباب ہی باعث ہے پریشانی کا

بار دوڑے ہے تعظیم بگولے کی طرح
جس جگہ تھک کے ترا آبلہ پا بیٹھ گیا

خامشی میں بھی اس کا نام لیا
ہم نے دل سے زباں کا کام لیا

رات دن پی شراب عشق، مگر
کبھی شیشہ لیا نہ جام لیا

فصل بہار آئی چلا میکدہ چمن
ہر پھول ساغر مے گلرنگ ہو گیا

تمنائیں ہزاروں، عمر تھوڑی
جہاں میں کیا میں کرتا، کیا نہ کرتا

وابستہ چشم لطف سے تھی ہستی جہاں
عالم تری نگاہ بدلتے ہوتے نہ [illegible]

وہی ہشیار ہے جو غیر کا احساں نہ لے
وہی دیوانہ ہے پہنے جو پرائی زنجیر

ہوا سے اُڑ کے جو آئی ہے آنکھ پردہ [illegible]
سیاہ ابر گھرا ہے شراب خانے پر

پردہ انھیں تمام زمانے سے ہو گیا
بے پردہ ہیں وہ طالب دیدار کے حضور

اس بزم میں ہو کون کسی کا شریک حال
کوئی بھی پوچھتا نہیں اشک رواں شمع

منظور یکشی ہو تو گلشن میں آئیے
ساغر لیے ہوئے ہو سر شاخسار پھول

نہ مجھے کفر سے مطلب ہے نہ اسلام سے کام
ہاں تری ذات سے مطلب ہو ترے نام سے کام

ساقی ہو میکدہ میں بھی برسات کا سماں
شیشے میں ہو شراب کہ بجلی سحاب میں

شکر خدا کہ فصل گل [illegible] ان کی
[illegible] چمن کی ہوائیں بدل گئیں

جاتا کہاں حوادث عالم سے بھاگ کر
[illegible] جا یہ آسماں نہیں یہ زمیں نہیں

[illegible]
[illegible] احسان [illegible] کرتا ہوں

حسن کے بیاں ہو کوئی [illegible]
کیا گزر رہے زمانے پہ جو بیتی نظر ہو

[illegible] کو
پکار اٹھیں نہ یہ بندے خدا کو

آنے سے جن کو ننگ ہو ان کو بلائیں گے
اے جذب شوق آج تجھے آزمائیں گے

صنم کدہ میں حرم میں چمن میں صحرا میں
کہاں کہاں تری ہم جستجو نہیں کرتے

سما گئی ہو جو اس میں خدا کی قدرت ہو
سبو ہو دل مرا دریا ہو آرزو تیری

طریقہ ہو مرا تسلیم لیکن ظلم پیہم سے
زباں پہ روستا نہ کچھ شکایت آ ہی جاتی ہے

[illegible] کو مر جائے گا سیما رحمت
تم آؤ عیادت کو تو درد دل سنبھل جائے

[illegible]لت گزیں جہاں سے جو قطع نظر کرے
مثل حباب چاہیے بند اپنا در کرے

[illegible] شمنوں کی تو انساں کو چاہیے
کانٹوں میں گھر کے پھول کی صورت بسر کرے

ارادہ مسجد و میخانہ دونوں میں ہو جانے کا
تردد ہو دوراہے میں مگر جاؤں کدھر پہلے

[illegible] آسرا تو ہو
کوئی اپنا نہیں خدا تو ہو

عبادت بے حضور قلب کیا کام آئے گی زاہد
بنا جس کی نہ ہو مضبوط وہ تعمیر کیا ٹھیرے

شراب پیے [illegible]
چنیں گے پھول آج دامن [illegible] رکھیں گے

قاتل کو دار و گیر قیامت کی دی خبر
دشمن سے اپنے ہم نے کہی دوستی کی بات

مرسلہ نجیب کیفوی

غزلیات

اب اس کا ذکر ہی کیا جب دل تپاں نہ رہا   [illegible] اس کے سوا کیا کہوں کہ ہاں نہ رہا
متاعِ عشق کے سودے میں کچھ زیاں نہ رہا   [illegible] دل کے بدلے یہ مال گراں نہ رہا
کمالِ مشقِ تصور نے راہ پیدا کی   کوئی حجاب مرے ان کے درمیاں نہ رہا
مرے بیان کا انداز جانِ محفل تھا   کہ میرے اٹھتے ہی وہ رنگِ داستاں نہ رہا
وجودِ غم سے جہاں میں ہے زندگی کا مزہ   وہ دل کی موت ہے جس دم یہ میہماں نہ رہا
یہ آفت آگئی اردو زبان پر ثاقب
کوئی کمالِ ہنر کا بھی قدرداں نہ رہا   (میرزا ثاقب قزلباش)

میری آواز کی رسائی دیکھ   موت نے وہ صدا لگائی دیکھ
جنگ میں جن کی تھی وفا مشہور   صلح میں ان کی بے وفائی دیکھ
جن کی تھیں پاکباریاں مشہور   ان کی دنیا میں جگ ہنسائی دیکھ
داغ ہیں آستانِ آدم پر   آسمانوں کی جبہ سائی دیکھ
تجھے کرنا ہو اپنی ہی لے دوست   کچھ برائی نہ کچھ بھلائی دیکھ
بن گئے ہیں گناہوں کے مدفن   پارساؤں کی پارسائی دیکھ
اے نظامِ کہن کچھ آہٹ لے   وہ دبے پاؤں موت آگئی دیکھ
تجھ پہ ہے تنگ وسعتِ کونین   قید سے چھوٹ کر رہائی دیکھ
[illegible] فراق روتا تھا
اس کو پا کے غمِ جدائی دیکھ   (فراق گورکھپوری)

[illegible] بھی ہو گر ستی مراد، روک نہیں روا نہ کر   حاجتِ ناخدا نہ رکھ، منتِ ناخدا نہ کر
[illegible] مضطرب ہے جلوؤں کی التجا نہ کر   آنکھیں کہ زخم ہیں انہیں ترسنے ہی دے دوا نہ کر

مجھ کو ملے خوشی کہ غم اپنی جگہ یہ ناتمام — ایسی امید وہم کو حاصل مدعا نہ کر
تابش بھروسہ کر چھوڑ جلوۂ لامکاں میں کھو — عشرت کہ تمام کو عشرت جاوداں نہ کر
میرا مآل بھی ترے واسطے ایک درس ہو — [illegible] وفا نہ چھیڑ حوصلہ وفا نہ کر
نخوت حسن میں نہ ڈھونڈ عشق کے عجز کی جھلک — پھول کو اس کی شاخ سے توڑ نہیں جدا نہ کر
تیری تباہیوں پہ ہو اس کی نگاہ [illegible]
عشق کی راہ میں سحر حرص کو رہنما نہ کر — (سحر رامپوری)

[illegible] — بندۂ گل میں یہ کہاں رعنائیاں
عشق کی ہمت بڑھاتے جایئے — کھینچئے جی بھر کے ظلم آرائیاں
[illegible] بھی سبھی — کٹ رہی ہیں مری تنہائیاں
کھنچ گئی اپنی طرف سب کائنات — اُف رے کافر یہ تری انگڑائیاں
اور بھی گستاخ حیرت ہو گیا
دیکھ کر تیری کرم فرمائیاں — (حیرت لدھیانوی)

[illegible]ے گو اب وہ ملاقات نہیں ہے — ہر بات میں پہلی سی کوئی بات نہیں ہے
ہر لحظہ نہیں سرخوشیٔ شوق کا عالم — اک کیف سا چھایا ہوا دن رات نہیں ہے
الجھی ہوئی سانسوں میں پریشاں ہو کوئی تو — اب روح میں تن میں وہ مساوات نہیں ہے
بیٹھے ہیں گر بیٹھے میں ہم صورت تصویر — اب سلسلۂ حرف و حکایات نہیں ہے
[illegible] تار شکستہ سا ہے اب بربط دل کا — وہ لطفِ ہم آہنگیٔ نغمات نہیں ہے
[illegible]س طرح رہ جسم میں ہیں سب قطع امید — جیسے مرے ہمراہ تری ذات نہیں ہے
آ جاؤ اسی طرح کہ جیسے نہیں آئے! — مل جاؤ یونہی جیسے کوئی بات نہیں ہے!!
ہلکی سی اک امید تھی عنبر ہمیں دل سے
ساز بھی سرمایۂ نغمات نہیں ہے — (مرزا عنبر بھوپال)

نعرۂ مزدور

نگاہِ اہلِ معنی کو بھی حیراں کرکے چھوڑوں گا
چراغِ زندگی ہر داغِ حرماں کرکے چھوڑوں گا

[illegible]ت میں دبے گی جب یہ ابھرے گی
مٹوں گا تو حیاتِ نو کے ساماں کرکے چھوڑوں گا

بنیں گے جل کے خاکستر امیروں کے یہ خس خانے
بہ رنگِ شعلہ گرمِ انجمن دہقاں کرکے چھوڑوں گا

جو ہنستے کھلکھلاتے مسکراتے ہیں غریبوں پر
انہیں بیدرد آقاؤں کو گریاں کرکے چھوڑوں گا

دلِ مزدور کیوں غمگیں ہو اپنی بے نوائی پر
میں اس کی جھونپڑی قصرِ سلیماں کرکے چھوڑوں گا

مجھے طعنہ [illegible] دو اے ہم صفیرو شکست کوشی کا
دو عالم کا یہ شیرازہ پریشاں کرکے چھوڑوں گا

نویدِ انقلاب تو مبارک بزمِ ہستی کو
پھر اس زندانِ غم کو میں خیاباں کرکے چھوڑوں گا

اٹھائے جس قدر چاہے ستمگر باغباں اس کو
وطن کے ذرے ذرے کو گلستاں کرکے چھوڑوں گا

یہ کس نے لکھ دیا پیشانیٔ مزدورِ بے کس پر
کہ ہر دولت کدے کو اب میں ویراں کرکے چھوڑوں گا

اڑیں گی دھجیاں اب دامنِ سرمایہ داری کی
اسے ناکام عاشق کا گریباں کرکے چھوڑوں گا

وطن کی خاک کا ہر ذرہ شمعِ زندگی ہوگا
انہیں تاریکیوں میں پھر چراغاں کرکے چھوڑوں گا

کہاں تک دستبرد اہلِ دولت گلشنِ دل پر
خزاں کب تک اسے جانِ بہاراں کرکے چھوڑوں گا

قفس کی زندگی میں آندھیاں بھی ہیں مگر ہے بھی
انہیں میں شمعِ آزادی فروزاں کرکے چھوڑوں گا

اسی تاریک زنداں سے نمایاں روشنی ہوگی
اسی ہندوستاں کو انجمستاں کرکے چھوڑوں گا

کہاں تک بے کسوں کی آہ یہ حق تلفیاں محویؔ
میں دے کر جان زندہ ذوقِ احساں کرکے چھوڑوں گا

محوی صدیقی لکھنوی

ایک خط کا جواب

([illegible] کے نام)

یہ خط حضور نے باغِ جناں سے بھیجا ہے — [illegible] نگر کے حسیں گلستاں سے بھیجا ہے

جسے مرقعِ [illegible] کہتے ہیں — [illegible] جنت [illegible] کہتے ہیں

جہاں اُبھرتے ہیں جذبات کوہساروں کے — جہاں برستے ہیں نغمات آبشاروں کے

جہاں مناظرِ فطرت کی بزمِ رعنائی — [illegible] لیتی ہے مست انگڑائی

وہیں ہیں آپ بہ آغوشِ جنتِ کشمیر — وہیں سے آپ نے کی ہے یہ رحمت تحریر

نقوش ایسے کہ گلکاریٔ چمن کہیے — [illegible] ایسے کہ شاخِ گل و سمن کہیے

[illegible] خط میں وہ تصویر دیکھتا ہوں میں — کہ جیسے وادیٔ کشمیر دیکھتا ہوں میں

[illegible] اپنی زندگی سے نا آسودہ رہوں میں — اب اپنے گھر کی فسردہ فضا کو [illegible] میں

مجھے حیات کی لاچاریاں نہیں معلوم — سکوت اور یہ بیکاریاں نہیں معلوم

[illegible] اپنی شاعریٔ مردہ سے نہیں واقف — اب اپنے نغمۂ افسردہ سے نہیں واقف

اداسیوں کو نظارے نہیں سمجھتا ہوں — اب آنسوؤں کو ستارے نہیں سمجھتا ہوں

سیاہ بختی کو تابندگی نہیں کہتا — غمِ زمانہ کو اب زندگی نہیں کہتا

اب اپنی صبح بیابانِ آب و تاب نہیں — اُداس رات کا سایہ مرا شباب نہیں

[illegible] بحرِ حوادث میں اک سکون سا آج — مری خوشی کے لیے بس یہی شگون ہے آج

کہ دل [illegible] کچھ ایسی خوشی میں پاتا ہوں — میں جیسے سارے جہاں کی طرف سے گاتا ہوں

کہ میری نظم نے آج ایک ساز پایا ہے — مرے خیال نے اک دلنواز پایا ہے

پئے جسارتِ تسلیم آنے والا ہوں — میں شکریہ میں یہی نظم گانے والا ہوں

حیات دھوپ میں ہے سایہ دے رہا ہوں میں — فضا غریب ہے سرمایہ دے رہا ہوں میں

سلام مچھلی شہری

خواہش نہ کی گر طارق صاحب اسرار و رموز کی منظوم شرح سے کسی طرح باز نہ آئے۔

اقبال کے بعد ہمارے انقلابی شعرا میں جوش کا نام لیا جاتا ہے اقبال بہت بڑے مفکر بھی تھے اور بہت بڑے شاعر بھی جوش کے یہاں فکر کا عنصر بہت کم ہے وہ تو سرتا پا جذبہ اور احساس ہیں ان کی منظر نگاری ان کی تشبیہیں، ان کی طنز، ان کی خمریات سب کامیاب ہیں ان کی انقلابی نظموں میں بھی ایک جوش اور ولولہ ہے گرچہ ان میں وہ بلندی تو اس نہیں جو جذبات کے ساتھ خیال کی دنیا کو بھی بیدار کر سکے وہ تو صرف انقلاب کے نقیب ہیں یہ احساس ان کی نئی کتاب آیات و نغمات کو دیکھ کر اور بھی شدید ہو تا ہے یہی نہیں بلکہ ان کی پرواز اب ایک منزل پر جا کر رک گئی ہے در اصل حرف و حکایت سے آیات و نغمات پست درجہ پر ہے جوش نے اس دور کے بعض احساسات کی ترجمانی ضرور کی ہے مگر اس کے خیالات ایک عجول بھلیاں ہیں وہ خدا سے بیزار ہیں اور شاید اس بیزاری کو 'جدیدیت' کے لیے اسی قدر ضروری سمجھتے ہیں کہ ہر نظم میں اس کی طرف اشارہ کیے بغیر نہیں رہ سکتے مگر ایک کار ساز ذہن کے بھی قائل ہیں اور بد روحنین کی بھی یاد دلاتے رہتے ہیں ان کا ایک شعر ان کی موجودہ حالت کا آئینہ ہے ؎

زباں ساکت ہے لیکن تر زبانی اب بھی ہوتی ہے ۔۔۔ لب خاموش سے جادو بیانی اب بھی ہوتی ہے

جوش کے کلام میں سے خیالات ملتے ہیں ان کا فارم نیا نہیں ہے مسلسل غزلیں لکھنے کی کوشش انھوں نے ضرور کی تھی مگر وہ بظاہر کامیاب نہیں ہوتی اب میں دو ایسے شاعروں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جن کو اپنے اظہار خیال کے لیے نئے سانچے بنانے پڑے ہیں یا کم از کم موجودہ سانچوں میں ترمیم کرنی پڑی ہے دونوں نوجوان شاعر ہیں اور دونوں پنجاب کے اور دونوں کا کلام ادب کے ہر طالب علم کو غور سے اور ہمدردی سے پڑھنا چاہیے اس لیے کہ اگر غور سے اور ہمدردی سے نہ پڑھا گیا تو ممکن ہے کہ اس کی خوبی کا احساس ہی نہ ہو ایک فیضی کا مجموعہ نقش فریادی ہے دوسرا راشد کا ماورا، دونوں مغربی ادب سے بہت متاثر ہوئے ہیں دونوں کے سوچنے کا طریقہ اور اظہار خیال کا طریقہ مغربی ہے دونوں نے محض ایشیائی تشبیہوں کے بجائے کا ساتی یا آفاقی تشبیہیں بھی برتی ہیں۔ دونوں نے ابھی ابتدا کی ہے انھیں اب جا کر شعر کہنا آیا ہے۔ دونوں کا مستقبل بظاہر شاندار معلوم ہوتا ہے دونوں ایک دوراہے پر کھڑے ہیں اگر ان کا جذبہ حقیقی ہے تو آگے بڑھتے چلے جائیں گے

تنقید و تبصرہ

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی ...)

کلیات میر (ترتیب جدید مع مقدمہ و فرہنگ) مطبوعہ نول کشور پریس لکھنؤ، سائز ۲۰×۳۰/۸ تعداد صفحات کلیات ۹۷۶، کاغذ کتابت و طباعت بہت اچھی۔ قیمت ...

نول کشور پریس لکھنؤ نے اردو زبان و ادب کی جتنی خدمت کی ہے وہ محتاج بیان نہیں بلکہ اردو اس سلسلہ میں اس پریس کی جس قدر مرہون منت ہو سکتی ہے کسی ایک ادیب کی نہیں اس عرصہ سے یہ مطبع کچھ ہندی کی طرف زیادہ راغب ہو گیا تھا اور خیال تھا کہ شاید اردو کو نصیب دشمناں بھلا نہ بیٹھے لیکن کلیات میر کو شائع کر کے اس نے اس شبہ کو باطل کر دیا۔

یہ صحیح ہے کہ اس تک جتنے نسخے کلیات میر کے ملتے رہے سب میں اغلاط کی کثرت سخت روحانی تکلیف کا باعث ہوا کرتی تھی لیکن موجودہ نسخہ ایسا ہے جو کتابت و طباعت کے لحاظ سے بہت روشن ہے شروع میں ۵۵ صفحوں کا ایک مقدمہ ہے جو عبدالباری صاحب آسی نے لکھا ہے جس میں میر صاحب کے مجملہ حالات ان کی سیادت و ولادت، تربیت و تعلیم وغیرہ کا حال تحقیق سے لکھا ہے لیکن ان کی شاعری پر تبصرہ مجمل اور مختصر ہے۔ اس ترتیب میں اودھ کے باہر کے دیگر نسخوں سے بھی اگر مدد لیجاتی تو کم از کم اتنی تسکین ضرور رہتی کہ کوئی بات میر کے بیان میں تشنہ نہیں رہ گئی ہے اور ہر ممکن مواد سے فائدہ حاصل کر لیا گیا ہے اغلاط باوجود دعوی کے باقی ہیں لیکن ان کی تعداد زیادہ نہیں ہے جگہ جگہ پر حواشی بھی دے دیے گئے ہیں آخر میں مشکل اور پرانے متروک الفاظ کی ایک مفید فرہنگ دے دی گئی ہے غرضکہ مطبع مذکور لائق ستایش ہے کہ اس نے کلیات میر کا یہ جدید اڈیشن نکال کر اردو کے سب سے بڑے شاعر کے کلام کو دیدہ زیب شکل میں پیش کیا۔

محاسن سجاد :- مرتبہ مسعود عالم ندوی، ناشر الہلال بک ایجنسی بانکی پور پٹنہ، سائز ۲۰×۳۰/۱۶

صفحات ۲۰، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، قیمت عہ

مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ بہار کی وہ ہستی تھی جس نے اپنی زندگی مسلمانوں کی خدمت کے لیے تمام تر وقف کر دی تھی۔ وہ خاموش اور ٹھوس کام کرنے والوں میں سے تھے اس لیے شاید ان کا نام بہت سے لوگوں کے لیے نامانوس ہو یہ وہ ہستی تھی جس نے بہار میں ایک مرکزیت قائم کر کے تمام مسلمانان بہار میں سیاسی، اخلاقی اور مذہبی بیداری پیدا کرنے کا لائحہ عمل بنایا تھا افسوس ہے کہ ایسے وقت میں جب کہ ان کا ذوق عمل معراج پر پہنچ چلا تھا کہ دفعتاً یہ امانت مستعار واپس لے لی گئی مولانا صرف متبحر عالم ہی نہ تھے بلکہ عالم باعمل تھے یوں تو مدرسہ انوار العلوم گیا جمعیۃ العلماء صوبہ بہار اور امارت شرعیہ کا وجود اور قیام ان کے شوق عمل کے نتائج ہیں لیکن اس سے زیادہ ان کا وہ ولولہ اسلامی تھا جو انھیں سیاسی پلیٹ فارم پر لا کر مصروف عمل رکھتا تھا نہرو رپورٹ پر بحث وتنقید سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کی تائید انڈیپنڈنٹ پارٹی کا قیام وغیرہ ان کے ایسے کارنامے ہیں جو مسلمانان ہند کبھی فراموش نہ کر سکیں گے دماغ ایسا رسا اور ذہانت اس قدر خداداد پائی تھی کہ مختلف کمیٹیوں کے اہم اور پیچیدہ مسائل ایسے سلجھاتے کہ [illegible] بڑے بڑے ماہرین دنگ رہ جاتے۔

زیر نظر مختصر کتاب ان ہی کے اوصاف حمیدہ اور حالات کے بارے میں ترتیب دی گئی ہے۔ [illegible] والوں میں مولانا کے تمام دوستوں اور علمائے کرام نے حصہ لیا ہے آخر میں ایک باب بدل کا بھی حسب منشاء ہے یعنی مولانا چونکہ کانگریس کے اندر رہ کر مسلمانوں کے لیے کام کرنا چاہتے تھے اس لیے [illegible]ب احسن صاحب نے مسلم لیگی نقطہ نظر سے روشنی ڈالی ہے ساتھ ہی اس مضمون کا جواب بھی شامل ہے [illegible] میں ہم یہ ایک تجویز ضرور پیش کریں گے کہ ان کے مضامین کی ترتیب کے علاوہ کوئی ایسا کام بھی شروع [illegible] جائے جو مولانا کی یادگار کو مستحکم کر سکے۔

دین اسلام (حصہ اول) مصنفہ مولانا لطف الرحمن صاحب ملنے کا پتہ مکتبہ ترجمان القرآن شہر مدرسہ (بنگال)، سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۷۷، قیمت ۲ ر کاغذ کتابت وطباعت اچھی۔

مولانا نے یہ ایک بڑا مفید رسالہ آسان زبان میں ان لوگوں کے لیے ترتیب دیا ہے جو مغربیت

کی زد میں آکر اسلام کو ٹھیک طرح نہیں سمجھتے۔ رسالہ مفید بھی ہے اور مختصر بھی۔ بے جا طول سے کام نہیں لیا گیا ہے لیکن مولانا سے عرض یہ ہے کہ جن لوگوں کی اصلاح کے لیے یہ کتاب ترتیب دی گئی ہے انھیں ایسی کتابوں کے پڑھنے کی توفیق بھی تو ہو اس لیے آج کل کتابوں سے بڑھ کر عمل کی ضرورت ہے جس سے ان میں اصلاح قبول کرنے کی صلاحیت اور [illegible] پیدا ہو سکے۔

فتح مبین (دوسرا حصہ تیسری جلد) [illegible] علی خاں صاحب رئیس علی گڈھ ملنے کا پتہ از مصنف ڈاک خانہ دتاؤلی ضلع علی گڈھ سائز [illegible] صفحات ۲۹۲ [illegible] درج نہیں کاغذ کتابت و طباعت اچھا [illegible] صاحب کی یہ کتاب ان کے ایک [illegible] اسلامی خلافت کا کارنامہ کا ایک حصہ ہے اس کتاب میں [illegible] سے خلافت [illegible] تاریخی کارناموں کے ساتھ رسول اللہ صلعم و دیگر خلفا کے اخلاقی و اصلاحی کارنامے [illegible] بھی ذکر ہے اصول دین بھی [illegible] گئے ہیں زبان سادہ اور طرز [illegible] ہے خدا کرے حاجی صاحب اس مفید عام کتاب کی تمام جلدیں حسب خواہش اپنی حیات میں پوری کریں۔

رنگین لباس [illegible] معز الزماں صاحبہ [illegible] ملنے کا پتہ مکتبہ ابراہیمیہ عابد روڈ حیدرآباد دکن [illegible] مکر ناشرین حیدرآباد سائز [illegible] صفحات ۸۰ قیمت غیر مجلد عمر

[illegible] عورتوں کے لیے ایک اچھا تحفہ ہے۔ اس میں رنگوں کی حقیقت ان کے اصول [illegible] مدارج اور بیانوں کو اچھی طرح اور آسان زبان میں سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ موسموں اور [illegible] تو کی صورت و مزاج کے مطابق لباس کے رنگ اختیار کرنا ان تمام مسائل پر غالباً یہ پہلی کتاب [illegible] ذرا زیادہ رکھی گئی ہے

سال نمبر [illegible] ہندوستانی ادب کا یہ دوسرا خاص نمبر ہے جو اکتوبر ۱۹۴۲ء میں فصلی سنہ کی آمد کی خوشی سال نو کے موقع پر جو حیدرآباد میں مستقل طور پر منایا جاتا ہے شائع کیا گیا ہے فصلی سنہ سے متعلق متعدد علمائی مضامین اور عمدہ نظموں کے علاوہ اہم عنوانات پر علمی مضامین بھی شریک [illegible] بنگ حیدرآباد کی نباتاتی سیر، سطح قمر، عرب و عجم کے چند نجومیوں کے نام، سکندر [illegible]

[illegible]

[illegible]

اور نوجوانوں سے خطاب۔ اصلاحی اور قابل قدر ہیں ممکن ہے آخرالذکر مضمون کے بعض حصوں سے کچھ لوگوں کو اختلاف ہو مگر اس کی افادیت سے کیسے انکار ہو سکتا ہے۔

اس خاص نمبر میں انجمن ترقی اردو کا کچا چٹھا۔ دیکھ کر تعجب اور افسوس ہوا انجمن ترقی اردو میں خرابیاں ہو سکتی ہیں اور اس کی شکایت بھی کی جا سکتی ہے مگر اس کا بہرحال خیال رکھنا چاہئے کہ ریتنقید ادارہ کو چاہے نقاد کے نزدیک کتنی ہی حقیر خدمات انجام دے رہا ہو نقصان پہنچنے نہ پائے اردو اخبارات و رسائل اس ضروری پہلو کو نظر انداز کر دیتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی تنقید اصلاحی منزل سے گزر کر تخریبی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔

اس خاص نمبر کی قیمت ۸ ہے مگر مستقل خریداروں کو مفت مل سکتا ہے۔

چمنستان (سالنامہ)۔ مدیران آغا سروش قزلباش و گور[illegible] قیمت فی پرچہ سالانہ عہ ملنے کا پتہ قیصر شاعر نکلسن روڈ دہلی

رسالہ چمنستان کے اس سالنامے میں اچھے اچھے اور مشہور لکھنے والوں کے مضامین فراہم کیے گئے ہیں مثلاً آصف علی بیرسٹر، سر رضا علی، حامد حسن قادری، بہزاد لکھنوی، خواجہ عبدالمجید، ایم اسلم، شائستہ اختر بانو، صالحہ عابد حسین، اشرف صبوحی، آتش دہلوی، شیو نرائن آمن لکھنوی وغیرہ وغیرہ نظم کا حصہ بھی [illegible] احسان و آتش ماہر القادری آرزو لکھنوی مرلی دہر شاد انجم تصدق و حامد علی خاں وغیرہ [illegible] ہے شائقین اسے پسند کریں گے۔

بیداری:۔ اڈیٹر دی نقشبندی سکرٹری مسلم اسٹوڈنٹ فیڈریشن علی گڈھ رسائز [illegible] قیمت فی پرچہ [illegible] سرسید نمبر ۲ ر

زیر نظر نمبر بیداری کا سرسید نمبر ہے مدیر نے اپنے پہلے نمبر میں لکھا تھا کہ اس پرچہ کے ذریعہ طلباء میں [illegible] [illegible] عمل پیدا کیا جائے گا اور یہ اُن تمام آمرانہ قوتوں کے خلاف ایک متحدہ محاذ ہوگا جو اقتدار کے نشہ [illegible] طلباء کی خودداری اور واجبی اور جائز مطالبات کو ٹھکرا نا اپنی شان حکومت سمجھ کر ان کی مجبوریوں سے ناجائز [illegible] ٹھاتے ہیں شکر ہے کہ مسلم اسٹوڈنٹ ایسوسی ایشن علی گڈھ کا یہ پرچہ اپنے وعدہ کو قائم رکھ سکا اور غالباً علی گڈھ کے بھی آواز ہے جو وہیں سے وہاں کی قابل اصلاح حالت کے متعلق اٹھی ہے سرسید کی یہ تحریک کامیاب ہے یا [illegible] اچھے صاحب قلم حضرات کے مضامین آپ کو ملیں گے جو لوگ علی گڈھ تحریک سے دلچسپی رکھتے ہوں [illegible]

ایک معلم کی زندگی

شائع ہوگئی

اس کتاب کو ماسٹر عبدالغفار صاحب مدہولی استاد مدرسہ ابتدائی جامعہ نے بڑی محنت سے مرتب فرمایا ہے۔ یہ محض ان کی آپ بیتی ہی نہیں بلکہ ہندوستان کی ہردلعزیز درسگاہ جامعہ کی دلچسپ اور مکمل تاریخ اور اکیس سال کے تعلیمی تجربوں کا نچوڑ ہے۔

یہ کتاب چھوٹے سائز پر دو جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ ہر ایک جلد پانچ سو صفحوں کی مجلد ہے۔ جامعہ کی نئی اور پرانی دو درجن تصویریں ہیں۔ خوب صورت گرد پوش نے کتاب کے ظاہری حسن میں نمایاں اضافہ کر دیا ہے۔ مکمل سٹ کی قیمت (جس کی مجموعی ضخامت ایک ہزار صفحات ہے) کاغذ کی گرانی کے باوجود صرف پانچ روپئے (صہ) ہے۔ گو ترتیب کے وقت بچوں کو پیش نظر رکھا گیا ہے لیکن یقین ہے کہ بڑے بھی پسند کریں گے خصوصاً تعلیمی کام تجربہ کرنے والوں کے لئے بڑی دلچسپی کا باعث ہوگی جو حضرات جامعہ کے تعلیمی تجربوں سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں ان کے لئے اس کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔

مکتبہ جامعہ

دہلی۔ نئی دہلی۔ لکھنؤ۔ بمبئی ۳

قابلِ دید کتابیں

تاریخ سلطنت خداداد۔ میسور کی نامور سلطنت کے بانی حیدر علی اور اس کے جانشین ٹیپو سلطان کی مکمل تاریخ۔ یہ ایک طرف مواد و دلائل اور دوسری طرف جوش و عقیدت کے ساتھ مرتب کی گئی ہے۔ قیمت للعمر

تاریخ جنوبی ہند۔ جنوبی ہند کی تاریخ ہے۔ بڑی چھان بین کی گئی ہے اور داخلی خارجی ہر ممکن سند پیش کی گئی ہے۔ قیمت ئے

[illegible]۔ نواب حیدر علی کے زمانے کی ایک حسین و جمیل داستان ہے جس میں عشق و [illegible] کے حیرت انگیز واقعات ہیں۔ قیمت مر

خلافت و سلطنت۔ از ڈاکٹر امیر حسن بغداد کی خلافت عباسیہ سے [illegible] کے ہاتھوں خوارزم شاہ اور بغداد کی تباہی تک کے مفصل حالات و نتائج۔ قیمت عمر

مطالع اقبال۔ مصنفہ ابوظفر عبدالواحد ایم اے موصوف نے اقبال کی شاعری اور اس کے پس منظر، ان کے ذہنی ارتقا اور شاعرانہ فلسفے پر ایک اجمالی بحث کی ہے۔ قابلِ دید ہے۔ قیمت عہ

مجاہدانِ حریت۔ غازی مدحت پاشا سعد زاغلول اور مہدی سوڈانی کے ولولہ انگیز اور روح پرور کارنامے۔ قیمت ۱۲ار

چند اہم کتابیں

مسلمانوں کا روشن مستقبل یہ مسلمانوں کی تین سو سال کی مذہبی، اقتصادی، تعلیمی اور سیاسی تاریخ ہے۔ مصنف نے مسلمانوں کے ہر شعبۂ زندگی پر اس قدر مواد جمع کر دیا ہے کہ اس کی روشنی میں ہندوستان کے سیاسی و تمدنی مسائل بڑی آسانی سے حل کئے جا سکتے ہیں۔ قیمت مجلد ؎

اقبال کا مطالعہ از سید نذیر نیازی۔ اس مجموعہ میں اقبال کی شاعری، فلسفہ اور آخری ایام زندگی پر چار مضمون شامل ہیں جن سے علامہ کی عظمت کا بخوبی علم ہو جاتا ہے۔ قیمت ؎۔ مجلد ؎

نئے مسائل یورپ کے مشہور مفکرین کے اچھوتے خیالات، انفرادی اور اجتماعی زندگی کی نئی صداقتیں، نوجوانوں، طلبار اور والدین کے لئے فکر و عمل کی نئی راہیں۔ ۱۱۲ صفحے، قیمت صرف ؎

محشر خیال سجاد علی انصاری مرحوم کے مجموعۂ مضامین کا دوسرا ایڈیشن۔ اس مرتبہ مرحوم کا ڈراما "روز جزا" بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ کاغذ طباعت عمدہ قیمت مجلد ؎، ؎، غیر مجلد ؎

مکتبہ جامعہ
دہلی نئی دہلی لکھنؤ۔ بمبئی

جامعہ

ملیہ اسلامیہ

مکتبہ جامعہ دہلی

ٹیگور کی کتابیں

گیتان جلی: رابندرناتھ ٹیگور کی مشہور مجموعہ نظم کا اردو ترجمہ معہ ایک بسیط مقدمہ و تبصرہ۔ از نیاز فتحپوری۔ قیمت ایک روپیہ (عہ/)

مضامین ٹیگور: اس مجموعہ میں مصنف کے حسب ذیل مضامین شامل ہیں قومی کشاکش، مشن اور سنسار کا سمندھ۔ عروج روحانی۔ دکھ اور سکھ کا مسئلہ جنسی کا مسئلہ۔ محبت کا مقصود اعلیٰ، برہم پراپتی۔ زمانہ وید اور عہد شجاعت۔ بدھ مت اور شہنشاہی کا زمانہ۔ ہندو تمدن کا سرچشمہ۔ قیمت مجلد ایک روپیہ (عہ/)

باغباں: اس میں باغباں کے علاوہ چار اور افسانے شامل ہیں۔ قیمت مجلد ایک روپیہ (عہ/)

ٹیگور کے گیت: یہ بھی گیتان جلی کا اردو ترجمہ ہے۔ قیمت مجلد عہ/

جامعہ

زیر ادارت - نورالحسن ہاشمی ایم اے

جلد ۳۶ - نمبر ۵	بابتہ ماہ مئی ۱۹۴۲ء	چندہ سالانہ للعہ فی پرچہ آٹھ آنہ

فہرست مضامین

(پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی۔ اے (آکسن) محبوب المطابع دہلی)

سے جذبات کی دلدل میں گم ہو جائیں گے۔ یہ ان میں فرق بھی ہے بعض کی نظموں میں فارم بالکل نیا نہیں اس میں صرف ادلی بدلی ہے۔ راشد نے آخر آخر میں بے قافیہ نظم لکھنے کی ایک سنجیدہ کوشش کی ہے اس کوشش میں وہ کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ راشد کے یہاں لذتیت زیادہ ہے اور فیض کے یہاں خیال آفرینی زیادہ۔ فیض کی تنہائی، موضوعِ سخن، چند روز اور مری جاں، نقطۂ چند ہی روز، اور راشد کی خودکشی، اتفاقات، بے کراں رات کے سناٹے میں، بہت اچھی نظمیں ہیں۔

ابھی چند شعراء کا ذکر باقی ہے۔ نغمۂ زندگی ایک ایسے شخص کا کلام ہے جس کے ذوقِ سلیم کو آئی سی ایس کی گرانباریاں بھی مجروح نہ کرسکیں۔ اس کے کلام میں حالی کی سادگی ہے۔ ایسی سادگی کہ کہیں کہیں اس میں شعریت معلوم ہی نہیں ہوتی مگر اس کے خلوص، اس کی گہرائی اور اس کی صداقت کی وجہ سے جیسے اچھے اشعار بھی کافی ملتے ہیں۔ آکسفورڈ والی نظم کامیاب ہے۔ نقش کامیاب مجموعہ دراصل اردو وقت معلوم ہوتا ہے مگر اس میں دلچسپی کا کافی سامان ہے۔ ماہر القادری بھی نوجوان شعراء میں کافی شہرت رکھتے ہیں۔ ان کی نظمیں اور غزلیں دونوں اچھی ہوتی ہیں مگر وہ غزلوں میں زیادہ کامیاب ہوتے ہیں۔ انہیں زبان پر قدرت ہے اور ان کی طبیعت میں شوخی اور رنگینی بھی ملتی ہے۔ محسوساتِ ماہر ایک دلکش مجموعہ ہے۔ احسان کی تفسیرِ فطرت کے متعلق یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی۔ اس میں شاعر ایک کامیاب مصور، ایک حساس فن کار اور ایک دردمند انسان کی حیثیت سے نظر آتا ہے۔ احسان نے جو دیکھا ہے اور محسوس کیا ہے وہی بیان کیا ہے۔ اس کی شاعری میں صداقت ہے اور اسی وجہ سے حسن بھی مگر ابھی اسے بلاغت کا مرا معلوم نہیں ہوا۔ اس کی بعض نظموں میں صرف یہ خامی ہے کہ وہ ذرا طویل معلوم ہوتی ہیں۔

غزل اب بھی مقبول ہے اور شاید اس کی مقبولیت قائم رہے کیونکہ اس میں ہمارے ایشیائی مذاق کی کوئی چیز ضرور ملتی ہے۔ غزل کو ہمارے چوٹی کے شعراء نے ہر قسم کے مضامین پر قادر کر دیا ہے مگر نظموں کی مقبولیت بڑھتی جاتی ہے۔ ان نظموں میں بہت سوں کے اعصاب پر ابھی عورت سوار ہے۔ یہ بات ایک خاص عمر میں ایسی بری بھی نہیں ہے۔ مگر ایک نیا لہجہ، ایک نئی زبان، ایک نیا پیرایۂ بیان ضرور آہستہ آہستہ وجود میں آ رہا ہے۔ محبوب کے آغوش میں بھی اب لذت نہیں رہی۔ کسی چیز کی کمی کا احساس ہو چلا ہے۔ یہی اس بات کی پہچان ہے کہ ہماری

مکتبہ جامعہ دہلی

سے

دارالمصنفین اعظم گڈھ، دارالترجمہ حیدرآباد، ہندستانی اکیڈمی
الہ آباد، دائرہ حمیدیہ سرائے میر اعظم گڈھ، ندوۃ المصنفین دہلی،
انڈین پریس الہ آباد اور دیگر تقریباً تمام اداروں کی
مطبوعات اصلی قیمت پر مل سکتی ہیں۔

اگر آپ اردو کی تازہ ترین مطبوعات کا مطالعہ
کرنا چاہتے ہیں تو اردو اکادمی کی ممبری قبول فرمایئے
اور قواعد وضوابط ایک کارڈ لکھ کر مفت طلب فرمایئے۔

"ایران بعہد ساسانیاں"

"ایران بعہد ساسانیاں": یہ ڈاکٹر آرتھر کرسٹن سین پروفیسر السنہ شرقیہ کوپن ہیگن یونیورسٹی (ڈنمارک) کی فرانسیسی تصنیف ہے اس کا ترجمہ ڈاکٹر محمد اقبال پروفیسر فارسی اورنٹیل کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور نے اردو میں کیا ہے۔ جسے انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی نے ۱۹۴۱ء میں شائع کیا ہے۔

ترجمے کا آغاز دیباچہ مترجم سے ہوتا ہے جس میں مصنف کے مختصر حالات زندگی اور کتاب کے موضوع کی نوعیت اور اہمیت کا بیان ہے ترجمہ کی ضخامت ۷۰۰ صفحات ہے۔

ڈاکٹر آرتھر کرسٹن سین ۱۸۷۵ء میں ڈنمارک میں پیدا ہوئے انہوں نے کوپن ہیگن اور گوٹنگن (جرمنی) یونیورسٹی میں تعلیم پائی اور آخر الذکر یونیورسٹی سے ۱۹۰۳ء میں ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کی ۱۹۱۹ء سے کوپن ہیگن یونیورسٹی میں السنہ شرقیہ کے پروفیسر ہیں ایران اور ایرانیات میں اپنے وسیع مطالعہ کی بنا پر متعدد کتابیں تصنیف کر چکے ہیں ان کے علاوہ بے شمار علمی مضامین یورپ کے مختلف موقر جرائد میں شائع کر چکے ہیں۔

یہ کتاب جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے ساسانی عہد (۲۲۶ء تا ۶۵۲ء) کی لڑائیوں کے حالات پر مشتمل نہیں بلکہ یہ اس عہد کے تمدن کی مفصل تاریخ ہے جس میں اس عہد کے اجتماعی اور تمدنی حالات نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں اور اس ضمن میں بہت سی بیش قیمت معلومات علمی دنیا کے سامنے آئی ہیں۔

ڈاکٹر محمد اقبال صاحب نے اس ضخیم کتاب کو اردو میں منتقل کر کے ادب اردو کی ایک بڑی خدمت سرانجام دی ہے ایسی ضخیم اور علمی کتاب کا ترجمہ کوئی آسان کام نہیں اس کی مشکلات کا اندازہ صرف وہی اصحاب کر سکتے ہیں جنہوں نے خود اس دشوار گزار وادی میں قدم رکھا ہو۔

اس سلسلہ میں علمی دنیا کو جناب ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب سیکریٹری انجمن ترقی اردو (ہند) کا بھی شکرگزار ہونا چاہیے جنھوں نے اس کتاب کو انجمن کے سلسلۂ مطبوعات میں شامل کیا ورنہ بقول مترجم اس کی اشاعت ممکن نہ تھی کیونکہ ایسی علمی کتابوں کے خریداروں کی تعداد ملک بھر میں بہت ہی کم اور وصلہ فرسا ہے۔

دیباچۂ مترجم فہرست مضامین اور فہرست تصاویر کے بعد ساسانی خاندان کا شجرۂ نسب جناب مترجم کا ایک مفید اضافہ ہے۔

اصل کتاب کا آغاز مصنف کے مقدمہ سے ہوتا ہے جس میں انھوں نے اس کتاب کی تصنیف کے اسباب بیان کیے ہیں اور ظاہر کیا ہے کہ اس کتاب کی اشاعت سے تیس برس پیشتر وہ ایک اور کتاب موسوم بہ شہنشاہی ساسانیاں شائع کر چکے تھے لیکن چونکہ اس طویل عرصہ میں بہت سا تاریخی مواد فراہم ہوا جو ساسانی عہد کے تمدن کی تاریخ کے لیے مفید ہونے کے علاوہ اس عہد کے فنون و مذاہب پر بھی روشنی ڈالتا تھا اس لیے انھوں نے یہ خیال کیا کہ بجائے اس کے کہ اسی پرانی کتاب کا نیا اڈیشن ترمیم و اضافہ کے بعد شائع کریں بہتر یہ ہے کہ ساسانی عہد کے تمدن کا از سر نو عمیق مطالعہ کرنے کے بعد ایک مستقل کتاب تصنیف کریں مصنف نے صورتِ کتاب کی ایک دلچسپ مثال پیش کی ہے کہ یہ کتاب ساسانی ایران کی ایک عام تاریخ ہے جس میں سیاسی تاریخ بمنزلہ ایک فریم کے ہے جس کے اندر ساسانی تمدن کے مختلف پہلوؤں کی متعدد تصویریں ہیں۔

یہ کتاب تمہید (جس میں دو فصلیں ہیں)، دس ابواب، خاتمہ، دو ضمیمے، اضافات اور چار فہرستوں پر مشتمل ہے

تمہید کی فصل اول میں ساسانی خاندان کے برسر اقتدار آنے سے پہلے تمدن ایران کی کیفیت ہے جسے چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

حصہ اول میں سلطنت اشکانی (۲۵۰ ق م تا ۲۲۶ء) کی سیاسی اور اجتماعی ساخت کا بیان ہے جس میں ایران کے خاندانی اور منصبداری نظام کی وضاحت کی گئی ہے حصۂ دوم میں ان اقوام کے حالات ہیں جنھوں نے سکندر اعظم کے حملۂ ایران (۳۳۰ ق م) کے بعد ایران کے شمال و مشرق میں

اپنی حکومتیں قائم کیں حصۂ سوم میں مذہبی افکار وعقاید کی تفصیل ہے جس میں ایران کے قدیم مذہب کے آغاز کے بعد زرتشتی مذہب پر تبصرے کے ضمن میں عہد اشکانی میں عیسائیت، عرفانیت اور بدھ مذہب کے متعلق چند اہم حقایق پیش کیے گئے ہیں۔ حصۂ چہارم میں اس عہد کے ادبی اور عامیانہ زبانوں کا بیان ہے۔

فصل دوم میں ساسانی عہد کی تمدنی اور سیاسی تاریخ کے ماخذ بیان کیے گئے ہیں۔ یہ فصل چھ حصوں میں منقسم ہے۔

حصہ اول میں معاصر ایرانی ماخذ کے ساتھ ادبیاتِ پہلوی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں ساسانی کتبوں، سکوں اور کتابوں کا ذکر ہے حصہ دوم میں ساسانی روایات کا بیان ہے جو فارسی اور عربی ادبیات میں محفوظ ہیں عربی اور فارسی مورخین نے جن پہلوی کتابوں سے استفادہ کیا ہے ان کے نام حسب ذیل ہیں۔

(۱) خوذای نامک (۲) آئین نامک (۳) تاج نامک (۴) نامۂ تنسر (۵) چیتیگان نامک (۶) مزدک نامک اور (۷) وہرام چوبین نامک۔

حصہ سوم میں یونانی اور لاطینی ماخذ کا بیان ہے یونانی مصنفین کو ایران کے ساتھ صرف وہیں تک دلچسپی ہے جہاں تک کہ اس کے تعلقات سلطنت روم کے ساتھ تھے اور بالخصوص انھوں نے روم اور ایران کی باہمی جنگوں کے حالات و واقعات تفصیل کے ساتھ لکھے ہیں۔

حصہ چہارم میں ارمنی ماخذ بیان کیے گئے ہیں۔ ساسانی عہد میں تاریخ ارمستان کا تاریخ ایران کے ساتھ خاص تعلق تھا اور ارمنی مورخین نے ساسانی بادشاہوں کے بہت سے قیمتی حالات اور ایران کے آئین و آداب، مذہب اور تمدن کے متعلق کافی تفصیلات بہم پہنچائی ہیں۔

حصہ پنجم میں سریانی ماخذ کی تفصیل ہے سریانی زبان میں متعدد تصانیف عیسائی مذہب پر ایسی موجود ہیں جن میں ساسانی عہد کے سیاسی اور تمدنی حالات ملتے ہیں ان میں سے چار اہم کتابیں معاصر مصنفین کی تصنیفات ہیں۔

حصہ ششم میں چینی ماخذ کا ذکر ہے جو بدھ مذہب کے ایک زائر اور چینی سیاح کے سفرنامہ پر

مشتمل ہے جس میں ایران کے متعلق مختصر حالات ہیں نا

باب اوّل میں ساسانی خاندان کی بنیاد کے حالات ہیں جس میں اشکانی خاندان کا خاتمہ ساسانی خاندان کے بانی اردشیر کی تاجپوشی اور اس کی شخصیت کا بیان ہے۔

باب دوم آٹھ حصوں میں منقسم ہے اور مضامین کی نوعیت سے بہت اہم ہے۔

حصہ اول میں ساسانی حکومت کی خصوصیات اور سیاسی اور معاشرتی جماعت بندی کا بیان ہے سوسائٹی کی تقسیم چار طبقوں میں (۱) علماے مذہب (۲) سپاہی (۳) عمال حکومت اور (۴) عوام الناس جس میں زراعت پیشہ اور اہل حرفت و تجارت بھی شامل ہیں ہر طبقہ کے خاص حالات بھی بیان کیے گئے ہیں

حصہ دوم میں مرکزی حکومت کے نظم ونسق کا بیان ہے جس میں وزیر اعظم (جس کا لقب "بزرگ فرمذار" تھا) کا عہدہ اور اس کے فرائض بتائے گئے ہیں۔

حصہ سوم میں نظام مذہب یا زرتشتی کلیسا کا بیان ہے علماے مذہب کا رئیس جس کا تقرر بادشاہ کے اختیار میں ہوتا تھا "موبدان موبد" کہلاتا تھا اور تمام امور کلیسا کا انتظام اسی کے ہاتھ میں تھا آتش کدوں میں مراسم عبادت کے ادا کرانے کا انتظام "ہیربدوں" کے سپرد تھا اور ان کا رئیس "ہیربذان ہیربذ" کہلاتا تھا موبذان موبذ کے بعد اسی کا درجہ تھا زرتشتی کلیسا کے دوسرے عہدہ داروں کے حالات و فرائض بھی اسی حصہ میں بیان کیے گئے ہیں

حصہ چہارم میں مالیات اور ان کے ذرایع کی تفصیلات ہیں مالیات کا اعلیٰ افسر "واستریوشان سالار" کہلاتا تھا مالیات کے علاوہ دست کاری کے ٹیکس کی وصولی بھی اسی کے ذمے تھی۔

حصہ پنجم میں صنعت و حرفت، تجارت اور آمد و رفت کے ذرائع بیان کیے گیے ہیں اس حصہ میں مختلف قسم کی صنعت و حرفت کے علاوہ ساسانی عہد کی تجارت اور ذرایع حمل و نقل کی بھی تفصیل ہے

حصہ ششم میں فوج اور فوجی تنظیمات کا بیان ہے ایران کا سپہ سالار "ایران سپاہبذ" کہلاتا تھا اس کا حلقۂ عمل بہت وسیع تھا سپہ سالار کے علاوہ وزیر جنگ کا عہدہ بھی اسی کے سپرد تھا اور شرائط صلح

کا طوکرا مالمی اسی کے اختیار میں تھا چونکہ ساسانی بادشاہ اکثر خود جنگوں میں حصہ لیتے تھے اس لیے جنگ بادشاہوں کے ماتحت اس کو اپنے اختیارات میں کچھ زیادہ آزادی نہیں ہوتی تھی بادشاہ کی محافظ فوج کا اعلیٰ افسر "پشتیگ بان سالار" کہلاتا تھا۔

حصہ ششم میں سلطنت کے دبیروں (جو "دبیران" کہلاتے تھے) اور مرکزی حکومت کے دوسرے عہدہ داروں کا بیان ہے دبیری کے فرائض کی وضاحت میں مصنف نے "چہار مقالہ" عروضی سمرقندی کی وہ عبارت نقل کی ہے جس میں نظامی عروضی نے دبیروں کے فرائض اور دربار شاہی میں ان کی اہمیت بتائی ہے شاہی دبیروں کا رئیس "ایران دبیربذ" یا "دبیران مہشت" کہلاتا تھا

مرکزی حکومت کے دوسرے عہدہ داروں میں علاوہ ہزاربذ موبدان موبد، ہیربدان ہیربذ، داستریوشان سالار، ایران سپاہبذ، پشتیگ بان سالار، اور ایران دبیربذ کے است بذ (میر تشریفات)، اندرزبد واسپوہرگان (معلم اہل بیوتات)، اندرزبد دربار (منتظم دربار)، مغان اندرزبد (معلم مغان)، سگستان اندرزبد (معلم صوبہ سیستان)، رئیس محکمہ اطلاعات، محافظ دفتر تاریخ بادشاہی تھے۔

حصہ ہفتم میں صوبوں کی حکومت کی تفصیل ہے صوبوں کے حاکموں کا انتخاب اعلیٰ خاندانوں سے ہوتا تھا اور یہ وہ حکومت کے اعلیٰ عہدہ داروں میں شمار کیے جاتے تھے سرحدی صوبوں کے حاکم "مرزبان شہردار" اور اندرون صوبوں کے حاکم "مرزبان" کہلاتے تھے۔ ایام جنگ میں "مرزبان" سپاہبذوں کے ماتحت سالاران لشکر کے فرائض انجام دیتے تھے۔

باب سوم میں دین زرتشتی کی تفصیل ہے جو حکومت کا مذہب تھا ساسانی عہد میں حکومت اور مذہب کے درمیان گہرا تعلق قائم رہا۔ ساسانی خاندان کے بانی اردشیر اول کے حکم سے ہیربدان ہیربذ نے اشکانی اوستا کے پراگندہ اجزا کو جمع کیا اور یہ نئی تالیف مستند قرار دی گئی لیکن بعد میں شاپور دوم (۳۰۹ء تا ۳۷۹ء) کے عہد میں موبدان موبد کے زیر ہدایت اوستا کا متن قطعی طور پر معین کیا گیا اسی سلسلہ میں مصنف نے عہد اسلامی میں ساسانی اوستا کے اکثر حصہ کے تلف ہو جانے کے وجوہ بیان کیے ہیں اور اس کے بعد نظام مذہب کے تحت میں یہ بتایا گیا ہے کہ عناصر طبیعی کی پرستش دین

زرتشتی کی اصولی خصوصیت رہی ہے اور ان مظاہر میں آگ کا مرتبہ سب سے بلند ہے مسئلہ آفرینش عالم کائنات اور مسائل معاد کا بھی مفصل بیان ہے اسی باب میں مشہور ۲۱ نشکدوں کا ذکر ہے جو ساسانی عہد میں ایران کے مختلف مقامات میں تھے ساسانی عہد کی تقویم، مشہور موسمی تہواروں اور علم نجوم کا بیان بھی اسی باب میں ہے۔ زرتشتی سال کے بارہ مہینوں کے نام بڑے بڑے خداؤں کے ناموں پر رکھے گئے ہیں (۱) فروردین (۲) اُردیبہشت (۳) خورداد (۴) تیر (۵) امرداد (۶) شہریور (۷) مہر (۸) آبان (۹) آذر (۱۰) دَی (۱۱) بہمن (۱۲) سپندارمذ۔ ہر مہینہ تیس دن کا ہے اور دنوں کے نام بھی زرتشتی دیوتاؤں کے ناموں پر رکھے گئے ہیں۔ بارہ مہینوں کے تین سو ساٹھ دنوں کے بعد پانچ دن آخری مہینہ کے بعد بڑھا دیے جاتے ہیں۔ ان ماز دیسنی تہوار، جو بڑی شان و شوکت کے ساتھ منائے جاتے تھے تعداد میں چھ ہیں اور ان کی کیفیت بہت دلچسپ ہے۔

باب چہارم میں مانی پیغمبر اور اس کے مذہب کی تفصیل ہے۔ مانی ایرانی النسل اور ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتا تھا اس کی ماں اشکانی خاندان سے تھی اس کا باپ فاتک ہمدان کا رہنے والا تھا مانی سنہ ۲۱۶ء میں پیدا ہوا تحصیلات علمی سے فارغ ہونے کے بعد اپنے زمانے کے مشہور مذاہب (۱) زرتشتیت (۲) عیسائیت اور (۳) عرفانیت کا گہرا مطالعہ کیا جس کے نتیجہ میں ایک نئے مذہب کی بنیاد ڈالی اور "فارقلیط" ہونے کا دعویٰ کیا جس کے آنے کی خبر حضرت عیسیٰؑ نے دی تھی مانی کا یہ دعویٰ تھا کہ وہ سابقہ مذاہب کے اکمال کے لیے آیا ہے اور خاتم النبیین ہے۔ اس باب میں مانی کی تعلیمات، مانویوں کی مذہبی معاشرت اور ان کے کلیسا کے نظام پر مفصل بحث کی گئی ہے مانوی تعلیمات کو شروع میں بڑی کامیابی ہوئی وہ اردشیر اول کے عہد ہی میں اس کے بیٹے شاپور کا مورد عنایت بن گیا تھا اور شاپور کے دو بھائی مہرشاہ اور پیروز بھی اس کے مرید تھے تخت نشینی کے دس سال بعد شاپور اول مانی کا مخالف ہو گیا اور مانی جلاوطن ہو کر کئی سال تک وسط ایشیا میں سرگرداں رہا شاپور اول نے سنہ ۲۷۲ء میں وفات پائی اور اس کا جانشین ہرمزد اول دوسرے سال فوت ہوا ہرمزد اول کے بھائی بہرام اول کے عہد میں مانی ایران آیا سنہ ۲۷۶ء میں مجمع عام میں موبدان موبد اور مانی کے درمیان ایک مباحثہ ہوا۔ مانی

کو شکست ہوئی اور الحاد کے جرم میں قید کی سزا پائی اور قید خانے ہی میں مرگیا۔ مانی کی مشہور کتابیں حسب ذیل ہیں (۱) کتاب الاسرار (۲) کتاب الاّسین (۳) رسالۃ الاصل (۴) انجیل زندہ (۵) کنز الحیواۃ، (۶) کتاب المواعظ باوجود ان اذیتوں کے جو مانویوں کو ایران میں موبدوں کے ہاتھ سے پہنچیں ان کا مذہب مٹ نہ سکا اور مخفی طور پر زندہ رہا۔ اسی باب کے آخر میں مانویوں کی صناعی کا بھی مختصر ذکر ہے۔

باب پنجم میں سلطنت شرق (یعنی شہنشاہی ساسانیاں) اور سلطنت عرب (یعنی رومن امپائر) کے تاریخی واقعات ہیں شہنشاہی ساسانیاں کے سلسلہ میں اس خاندان کے پہلے بارہ بادشاہوں کے مختصر حالات ہیں۔ اس باب کے آغاز میں ساسانی حکومت کی فوجی تنظیم کا بیان ہے جو اگرچہ قدیم هخامنشی ہی کے طریقے پر تھی لیکن نئے حالات اور نئی ضرورتوں کے مطابق اس میں مناسب ترمیمیں کی گئیں فوج کا سب سے اعلیٰ حصہ زرہ پوش سواروں کا دستہ تھا جو اعلیٰ خاندانوں کے شہسواروں پر مشتمل تھا میدان جنگ میں رسالہ فوج سب سے آگے رہتی تھی اور فتح و ظفر اسی کی قوت اور شجاعت پر موقوف ہوتی تھی رسالہ فوج کے پیچھے ہاتھیوں کی صف ہوتی تھی جن کی ڈراؤنی صورتیں چنگھاڑیں اور جسم کی بدبو دشمن کے گھوڑوں کے لیے خوف کا باعث ہوتی تھی ہاتھیوں کے پیچھے پیادہ فوج ہوتی تھی۔ پیادہ سپاہی جاگیرداروں کے خدام ہوتے تھے جو بغیر کسی معاوضے کے فوجی خدمات انجام دیتے تھے ان کے علاوہ امدادی فوجیں بھی ہوتی تھیں جو اطراف سلطنت کی جنگجو قوموں کی طرف سے لڑنے کے لیے آتی تھیں۔ اور ان کو امتیازی درجے حاصل تھے ساسانی عہد میں ایران کا قومی جھنڈا درفش کاویانی تھا اہم لڑائیوں میں جب بادشاہ بذات خود فوج کی کمان کرتا تھا تو اس کے لیے قلب لشکر میں ایک بڑا تخت نصب کیا جاتا تھا جس کے گرد بادشاہ کے خدم و حشم کھڑے ہوتے تھے اور فوج کا ایک خاص دستہ اس کی نگہبانی کے لیے مامور ہوتا تھا جس کا فرض تھا کہ تادم زیست اس کی حفاظت کریں تخت کے چاروں کونوں پر جھنڈے گاڑے جاتے تھے اور ان کے باہر کی طرف تیراندازوں اور پیادہ سپاہیوں کا ایک دستہ ہوتا تھا بادشاہ کی عدم موجودگی میں سپہ سالار ایران اسی تخت پر بیٹھتا تھا ایک خاص خیمہ کے اندر سفری آتشدان رکھے جاتے تھے کیونکہ بادشاہ آتشدانوں اور موبدوں کے بغیر کبھی کسی مہم پر نہیں جاتا تھا

ساسانی عہد میں ایرانیوں نے فنون محاصرہ رومیوں سے سیکھے تھے جیسا کہ محاصروں میں قلعہ شکن گرز، منجنیقیں اور متحرک برج استعمال کرتے تھے قلعہ شکن ہتھیاروں کو کمند سے پکڑتے تھے اور ان پر پگھلا ہوا سیسہ اور آتش گیر مادے پھینکتے تھے۔ ایران پر حملہ ہونے کی صورت میں ایرانی اناج کے کھیتوں کو آگ لگا دیتے تھے تاکہ دشمن کو رسد نہ مل سکے جنگی قیدیوں کو غلاموں کے طور پر بیچتے تھے یا ملک کے غیر آباد علاقوں کو آباد کرنے کے لیے بھیجتے تھے۔

اس کے بعد اس باب میں ایران اور روم کی باہمی جنگوں کے مختصر تاریخی واقعات ہیں جن کا آغاز اردشیر اول کے عہد میں ہوا شاپور اول کے عہد میں سنہ ۲۶۰ء میں قیصر روم ویلرین بذات خود ایران کے خلاف لشکر لے کر آیا اور شکست کھا کر گرفتار ہوا۔ شاپور اول نے ویلرین پر اپنی فتح کو نقش رستم اور اصطخر میں بہت سی پتھر کی یادگاروں کو زندہ جاوید بنایا ہے شاپور اول کے بعد کئی ساسانی بادشاہوں کے عہد حکومت میں ایران اور روم میں لڑائیاں جاری رہی ہیں جن میں زیادہ مشہور وہ لڑائیاں ہیں جو شاپور دوم (سنہ ۳۰۹ء تا سنہ ۳۷۹ء) کے عہد حکومت میں چالیس سال تک جاری رہی ہیں اس سلسلہ میں مصنف نے ایک رومی مورخ امیان کی واقعہ نگاری کی تعریف کرتے ہوئے اس کا ایک طویل بیان نقل کیا ہے اور اسی باب کے آخر میں شاپور دوم کی بلند شخصیت بہت تفصیل سے بیان کی ہے۔

باب ششم میں ایران کے عیسائیوں کے مفصل حالات ہیں اس باب کے آغاز میں زرتشتی علما و امرا کی طاقت اور زرتشتی کلیسا کے عروج کا بیان ہے اور اس کے بعد ایران میں یہودیوں اور عیسائیوں کے عام حالات کے ساتھ ساتھ شاپور دوم (سنہ ۳۰۹ء تا سنہ ۳۷۹ء) اور بہرام پنجم (سنہ ۴۲۰ء تا سنہ ۴۳۸ء) کے عہد حکومت میں جو مظالم عیسائیوں پر روا رکھے گئے ان کی تفصیل ہے۔

جب تک سلطنت روم لامذہب رہی، ایران کے عیسائی امن میں رہے لیکن جوں ہی قیصر قسطنطین نے عیسائی مذہب اختیار کیا صورت حالات بدل گئے اس وقت سے ایران کے عیسائی جن کی تعداد ان سرحدی صوبوں میں زیادہ تھی جو سلطنت روم کے متصل تھے ایک طاقت کے گرویدہ ہو گئے اور رومیوں کی حمایت کے شبہ میں عیسائیوں کے رئیس سائمن کو سنہ ۳۳۹ء میں قتل کیا گیا اور

مذکورہ بالا صوبوں میں بہت ۔ خونریزی اور قتل عام ہوا اور بہت سے لوگ جلا وطن کئے گئے عیسائیوں پرحسن مظالم کا آغاز ۳۳۹ء میں ہوا اس کا خاتمہ شاپور دوم کی وفات پر ۳۷۹ء میں ہوا۔

بہرام پنجم کے عہد حکومت میں عیسائیوں پرت مظالم کا آغاز ہوا جس کی تا ستر ذمہ داری موبذان موبذ مہر شاپور پر تھی اور مغربی سرحدی صوبوں کے عیسائی ایک کثیر تعداد میں بازنطینی علاقوں میں بھاگ گئے بہرام پنجم کے بعد یزدگرد دوم (۴۳۸ء تا ۴۵۷ء) کے عہد حکومت میں بھی عیسائیوں پر بہت سختی کی گئی اور ۴۴۶ء میں مغربی سرحدی صوبوں کے تمام سربرآوردہ عیسائیوں کو قید کرکے ترک مذہب پر مجبور کیا گیا جن میں سے اکثر ترک مذہب سے انکار کی وجہ سے سخت عذاب دے کر مارے گے ان مقتولین میں یوحنا اسقف اعظم بھی تھا۔

اس باب کے آخر میں سلطنت ایران کے نظام عدالت کا مفصل بیان ہو ملکی عہدوں میں حاکم عدالت کا عہدہ بہت ممتاز تھا جیف جج "شہرداور" یا "داذوران داذور" کہلاتا تھا حکام عدالت کے علاوہ موبد اور ہیربد بھی جحوں کی حیثیت سے قانونی فیصلے صادر کیا کرتے تھے صیغۂ عدالت کے انتہائی اختیارات خود بادشاہ کے ہاتھ میں تھے بادشاہ کی زبان سے نکلی ہوی بات ناقابل تنسیخ ہوتی تھی اگر ماتحت عدالتوں میں کسی شخص کی داد رسی نہ ہوتی تو عدالت شاہی کا دروازہ اس کے لیے ہمیشہ کھلا تھا۔ ساسانی خاندان کے ابتدائی بادشاہوں کے ہاں یہ رسم تھی کہ سال میں دو مرتبہ یعنی جشن نوروز اور جشن مہرگان کے موقع پر دربار عام منعقد کرتے تھے جس میں ہر خاص و عام کو حاضر ہونے کی اجازت ہوتی تھی ایسے موقعوں پر منجملہ دیگر شکایات کے ایسی شکایات بھی پیش کی جاتی تھیں جو بادشاہ کے خلاف ہوتی تھیں اور عدل و انصاف کے ساتھ ان کا فیصلہ کیا جاتا تھا اس رسم کو ساسانی خاندان کے تیرھویں بادشاہ یزدگرد اول (۳۹۹ء تا ۴۲۰ء) نے منسوخ کیا۔ اس سبب سے علمائے مذہب کو اس سے بہت نفرت تھی۔

قانون میں تین قسم کے جرم تسلیم کیے جاتے تھے (۱) جو خدا کے خلاف ہوں یعنی جب کوئی شخص مذہب سے برگشتہ ہو جائے یا عقائد میں بدعت پیدا کرے (۲) جو بادشاہ کے خلاف ہوں یعنی جب کوئی شخص

شاعری ہمارے دور کی روح کو پانے کی کوشش کر رہی ہے جو لوگ شاعری کو محض سلانے یا رلانے کے لیے ایک آلہ سمجھتے تھے انہیں ضرور مایوسی ہوگی اب تو غزل میں بھی فانی کی لے یاس و قنوطیت سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور نظم تو اس لحاظ سے اور بھی آگے ہے۔

اس دور کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ماضی کی صحیح تاریخ مرتب کرنے اور اس میں ایک واضح نقطہ نظر مقرر کرنے کی بڑی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے یہاں ہمیں تاریخ کی کتابوں پر تبصرہ نہیں کرنا ہے مگر جن کتابوں کی ادبی اہمیت بھی ہے ان کا ذکر ضروری ہے ہندوستان میں مسلمانوں کے کارناموں پر بار بار روشنی ڈالی جاتی ہے مگر ابھی تک کوئی ایسی کتاب نہیں لکھی گئی تھی جس میں ان کی مذہبی اور علمی تاریخ مرتب کی جائے شیخ محمد اکرام مرتب غالب نامہ نے آب کوثر اور موج کوثر کے نام سے دو جلدوں میں ایک قابل قدر تاریخ لکھی ہے اس میں مشرقی اور مغربی دونوں ذرائع سے مدد لی گئی ہے اور عام طور پر اس کی تنقید منصفانہ اور معتدل ہے پہلی جلد میں مسلمانوں کی آمد سے انیسویں صدی تک تبصرہ ہے یہ حصہ لازمی طور سے تاریخی زیادہ ہے تنقیدی کم، دوسرے حصے میں انیسویں صدی کی ابتدا سے اس وقت تک جو خاص خاص مذہبی، علمی اور ادبی تحریکیں رونما ہوئی ہیں ان کا ذکر ہے اس کتاب میں دو باتیں خاص طور پر اہم ہیں اول تو مصنف نے یہ بالکل صحیح لکھا ہے کہ انیسویں صدی مسلمانوں کی پستی کا دور نہیں کہی جا سکتی سیاسی اعتبار سے مسلمان پستی میں تھے مگر مذہبی نقطہ نظر سے انہوں نے بعض اہم کارنامے انجام دیے تھے دوسرے فاضل مولف نے جامعہ ملیہ کو علی گڑھ تحریک کے مخالف نہیں بلکہ اس کا دست راست اور معاون بتایا ہے ان دونوں باتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف محض سطحی اور اوپری نظر نہیں رکھتا۔ حالات اور واقعات کا غائر مطالعہ کرتا ہے آثار جلال الدین افغانی ایک اور بھی کتاب ہے جو قابل ذکر ہے۔ قاضی عبدالغفار نے اسے بڑی محنت اور تحقیق سے مرتب کیا ہے جمال الدین افغانی کے نام سے لوگوں کو عقیدت تو بہت ہے مگر وہ محض جذباتی طور سے اس سے متاثر ہوتے ہیں کم لوگوں نے قاضی عبدالغفار کی طرح ان کی زندگی کے حالات معلوم کرنے اور ان کے بنیادی نقطہ نظر کو سمجھنے کی کوشش کی ہے ورنہ قاضی صاحب کے اس قول کی صداقت واضح ہو جاتی کہ آج بھی اگر شیخ زندہ ہوتے تو مجھے کوئی شبہ نہیں کہ وہ اسلامی اخوت سے وطنیت کے جدید تخیل کو ہرگز خارج نہ سمجھتے۔

بغاوت یا غداری کرے یا میدان جنگ سے بھاگ جائے (۳) جو آپس میں ایک دوسرے کے خلاف ہوں یعنی جب ایک شخص دوسرے پر ظلم کرے۔ عہد ساسانی کی ابتدائی صدیوں میں پہلی اور دوسری قسم کے جرائم کی سزا فوری موت تھی اور تیسری قسم کے جرائم کی سزا کبھی جسمانی عقوبت اور کبھی موت ہوتی تھی ایسے ذی مرتبہ اشخاص کو جن کا وجود سلطنت اور بادشاہ کے لیے خطرے کا باعث ہوتا تھا خوزستان کے ایک قلعہ میں جس کا نام "گیل گرد" یا "اندمش" تھا قید کیا جاتا تھا ایک بہت عام سزا جو باغی شہزادوں کو دی جاتی تھی یہ تھی کہ ان کی آنکھوں میں گرم سلائی پھرا کر یا کھولتا ہوا تیل ڈلوا کر اندھا کر دیا جاتا تھا سزائے موت کا اجرا عام طور پر بذریعہ شمشیر کیا جاتا تھا مرتدوں اور باغیوں کو سولی پر چڑھایا جاتا تھا بعض حالات میں زندہ کھال کھنچوانے کا بھی دستور تھا عیسائیوں پر مظالم کے زمانے میں تمرد کو کبھی کبھی سنگسار بھی کیا گیا ہے یا زندہ دیوار میں چنوا دیا گیا ہے بعض مجرموں کو ہاتھیوں کے پاؤں تلے بھی روندوایا جاتا تھا منجملہ دیگر جسمانی عذابوں کے جن کی تفصیل اس باب کے آخر میں دی ہوئی ہے سب سے دہشت ناک عذاب تھا جس کا نام "نُہ موتیں"[1] تھا اس کی صورت یہ تھی کہ جلاد سب سے پہلے ہاتھوں کی انگلیاں کاٹتا تھا اس کے بعد پاؤں کی پھر کلائیوں تک ہاتھ کاٹتا تھا اور ٹخنوں تک پاؤں اس کے بعد کہنیوں تک بازو اور گھٹنوں تک ٹانگیں، پھر کان اور ناک کاٹتا تھا اور سب سے آخر میں سر اور مقتولوں کی لاشیں وحشی جانوروں کے آگے ڈال دی جاتی تھیں۔

باب ہفتم میں تحریک مزدکی کا بیان ہے لیکن اس باب کے آغاز میں ساسانی عہد میں ایرانیوں کی معاشرتی حالت، سوسائٹی کے مختلف طبقے اور قانون دیوانی کا بیان ہے ایرانی سوسائٹی کی بنیاد دو چیزوں پر تھی ایک نسب اور دوسرے جائداد امرا، اور عوام الناس کے درمیان نہایت محکم حدیں قائم تھیں دونوں کی سواری لباس، مکان، عورتوں، خدمت گاروں میں خاص امتیاز تھا ساسانی سیاست کا ایک نکتہ اصول یہ تھا کہ کوئی شخص اپنے رتبے سے بلند رتبے کا خواہاں نہ ہو جو اس کو نسب کی رو سے حاصل ہے۔ امرا کے نسب کی پاکی اور غیر منقولہ جائدادوں کی محافظت قانون کے ذمے تھی عوام الناس

---

[1] "نُہ موتوں" کی سزا عہد حاضر میں گزشتہ انقلاب افغانستان کے دوران میں بچہ سقہ کے حکم سے کابل میں ایک شخص کو دی گئی تھی۔

امرا کی جائداد خرید نہیں سکتے تھے اور نہ ہی کوئی ادنیٰ طبقہ کا آدمی حکومت کا کوئی عہدہ پا سکتا تھا لیکن ادنیٰ طبقہ کا کوئی فرد اگر غیر معمولی ذہانت اور قابلیت کا مالک ہوتا تھا تو اسے ترقی دی جاتی تھی سپاہی بھی کسانوں کی طرح جزیہ دیتے تھے لیکن ان کو فوجی خدمت معاف تھی کسانوں کی حالت خراب تھی کاشتکاری کے علاوہ اُن سے ہر طرح کی بیگار اور خدمت لی جاتی تھی گویا ابدی غلامی ان کی تقدیر میں لکھی تھی۔

دیوانی قانون کے مطابق خاندان کی بنیاد تعدد ازدواج پر تھی البتہ بیویوں میں سے ایک بڑی بیوی۔ ایک خدمتگار بیوی ہوتی تھی اور دونوں کے قانونی حقوق مختلف تھے شوہر کو اس بات کا اختیار تھا کہ ایک قانونی وثیقے سے بیوی کو اپنی جائداد میں حصہ دار بنالے زرتشتی سوسائٹی میں متبنیٰ بنانے کی رسم بھی بہت عام تھی، اور اس کی تین قسمیں تھیں (۱) متبنیٰ موجود یعنی بیوی یا اکلوتی کنواری لڑکی (۲) متبنیٰ معہود یعنی جس کو متوفی نے خود نامزد کیا ہو، اور (۳) متبنیٰ مامور یعنی جس کو متوفی کے بعد اس کے رشتہ داروں نے انتخاب کیا ہو وراثت کی تقسیم میں بیوی اور بیٹوں کو برابر برابر حصہ ملتا تھا اور کنواری بیٹی کا حصہ ان کی نسبت نصف ہوتا تھا۔

پانچویں صدی کے آخر میں مزدکیت نے مذکورہ بالا نظام معاشرت کی بنیادوں کو ہلا ڈالا اور سیاسی حادثات نے اس انقلاب انگیز تحریک کے لیے حالات کو بہت موافق بنا دیا

مزدکی فرقہ کے بانی کی شخصیت کے متعلق بہت سا اختلاف ہے لیکن اس فرقہ کا حقیقی بانی زردشت ابن خورگان تھا جو شہر بسا صوبہ فارس کا رہنے والا تھا مزدک زردشت کا خلیفہ تھا جس کی شہرت سے فرقہ کے اصلی بانی کا نام ماند پڑ گیا اور اس فرقہ کا نام فرقہ مزدکیہ مشہور ہوا۔ زردشت اور مزدک کی تعلیم مانوی مذہب کی اصلاح تھی مصنف نے "مانویت" اور "مزدکیت" کا مقابلہ کرنے کے بعد مزدکیوں کے انقلاب انگیز عقائد تفصیل کے ساتھ بیان کیے ہیں کواد اول نے جو ۴۸۸ء میں تخت نشین ہوا مزدکی عقاید سے متاثر ہو کر مزدکی مذہب اختیار کر لیا اور مزدک کے اصولوں پر عمل کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۴۹۶ء میں اس کے خلاف محل میں ایک انقلاب برپا ہوا اور وہ معزول کر کے قید کر دیا گیا۔

لیکن تھوڑے ہی عرصے کے بعد وہ قید سے نکل کر فرار ہو گیا اور ہیتالیوں کے بادشاہ کی مدد سے سنہ ۴۹۹ء میں بغیر جنگ کے اس نے اپنا تخت واپس لے لیا اور اپنی شاہانہ طاقت کو زیادہ استوار کیا کواذ اول کے عہد حکومت کا دوسرا دور بہت کامیاب رہا اور مزدکیوں کی فتنہ پردازیوں کی وجہ سے ان کے ساتھ اس کی مخالفت ہو گئی۔ علاوہ ازیں انھوں نے بادشاہ کی مرضی کے خلاف شہزادہ خسرو کو ولیعہدی سے محروم کر کے اور شہزادہ کاوس مذشوارشاہ (جو مزدکیوں کا طرفدار تھا) تخت ایران کا وارث بنانے کی کوشش کی جس سے بادشاہ کے صبر کا پیالہ لبریز ہو گیا چنانچہ سنہ ۵۲۸ء کے آغاز میں ایک مذہبی کانفرنس منعقد کی گئی۔ فرقہ مزدکیہ کا اندرزگر (رئیس اعلیٰ یعنی خود مزدک) اور باقی پیشوا اور مزدکیوں کی ایک کثیر تعداد مباحثہ میں شریک ہوئی۔ اس کانفرنس کا پورا انتظام بادشاہ اور ولیعہد شہزادہ خسرو کے ہاتھ میں تھا موبذان موبذ کے علاوہ بہت سے قابل موبذ مباحثہ میں شریک ہوئے مزدکیوں کو شکست ہوئی اور ان کو قتل کر دیا گیا مقتولین کی صحیح تعداد غیر معین ہے اس کے بعد ان کو قانون کی حمایت سے محروم کیا گیا اور دوبارہ ان کا قتل عام شروع ہوا۔ ان کی جائدادیں ضبط کر لی گئیں اور ان کی مذہبی کتابیں جلا دی گئیں اور اس طرح اس خطرناک مذہبی تحریک کا خاتمہ ظاہراً طور پر ہوا اگرچہ اس کا وجود ایک خفیہ مذہب کی حیثیت سے باقی رہا اور عہد اسلامی میں دوبارہ ظاہر ہوا۔

باب ہشتم کواذ اول کے جانشین خسرو انوشیرواں (سنہ ۵۳۱ء تا سنہ ۵۷۹ء) کے عہد حکومت پر ہے اور اپنے مطالب کی اہمیت کی بنا پر ایک سو نو صفحات پر پھیلا ہوا ہے خسرو اول تاریخ میں انوشیرواں (انوشگ رُوان یعنی روح جاوید کا مالک) کے نام سے مشہور ہے اس کی تخت نشینی سے ساسانی تاریخ میں درخشاں ترین عہد کا آغاز ہوا مزدکیوں کی خطرناک بدعت کا خاتمہ ہوا اور ملک کے اندر دوبارہ امن و امان قائم ہوا۔ بادشاہ سلطنت کے تمام اختیارات جامع تھا اور امرا کے علاوہ علماء مذہب بھی اس کے تابع فرمان تھے۔ خسرو اول کی اصلاحات کے سلسلہ میں سب سے پہلے اس بدنظمی کا تدارک کیا گیا جو مزدکی فتنہ پردازوں نے پھیلائی تھی بالخصوص ہر قسم کی منقولہ اور غیر منقولہ جائدادیں جو مزدکیوں نے غصب کر لی تھیں اصل مالکوں کو واپس کرائی گئیں تمام مزروعہ اراضی کی پیمائش

کرکے لگان کی نئی شرحیں مقرر کی گئیں جو کاشتکاروں اور زمینداروں کی آسودگی کا باعث ہوئیں اور شاہی خزانہ میں مستقل آمدنی کا اضافہ ہوا۔ شخصی ٹیکس میں بھی اصلاح کی گئی۔

اصلاح مالیات کے محکمہ فوج میں اصلاح کی گئی سرِ سپاہ کا قاعدہ جاری کیا گیا نادار سواروں کو گھوڑے اور ہتھیار مہیا کیے گئے اور ان کی تنخواہیں مقرر کی گئیں متعدد جنگجو قوموں کو مطیع کرکے نئے شہروں میں آباد کیا گیا اور ان کو فوجی خدمت پر مامور کیا گیا "ایران سپاہ بذ" کا عہدہ منسوخ کرکے چار "سپاہ بذ" مقرر کیے گئے جو فوج کے مستقل سردار قرار پائے اور ان میں سے ہر ایک سلطنت کے چوتھے حصے کی فوجوں پر مقرر کیا گیا اس تقسیم سے بادشاہ کا مقصد یہ تھا کہ سلطنت کے ہر حصے میں باقاعدہ فوجیں موجود رہیں جن سے ایام جنگ میں کام لیا جا سکے

۵۴۰ء سے ۵۶۲ء تک ایران اور روم میں مسلسل جنگ رہی اور ۵۶۳ء سے ۵۶۷ء تک خسرو اول نے ہپتالیوں کی سلطنت کا خاتمہ کیا ۵۷۰ء میں یمن فتح ہوا اور ۵۷۲ء سے لے کر خسرو اول کی وفات (۵۷۹ء) تک دوبارہ ایران اور روم میں مسلسل جنگ رہی۔

ان واقعات کے بعد مصنف نے خسرو اول کی شخصیت کو نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا ہے اور اس کے عدل و انصاف کے متعلق متعدد حکایتیں نقل کی ہیں۔

خسرو اول نے ایران کے پایہ تخت "طیسفون" کو بہت وسعت دی اور اس کے نواح میں نئے شہر آباد کیے اور محلات تعمیر کرائے اسی سلسلے میں مصنف نے مشہور طاق کسریٰ یا ایوان کسریٰ کے متعلق تفصیل سے لکھا ہے یہ طاق خسرو کے محل میں دربار کا ہال کمرہ تھا محل کا رقبہ ۳۰۰ × ۴۰۰ میٹر ہے تمام عمارات میں صرف طاق کے بہت سے آثار اب تک باقی ہیں۔ اس کے سامنے کا رُخ ۹۲ گز اونچا ہے اس میں ایک دیوار ہے جس میں کوئی کھڑکی نہیں لیکن وہ برجستہ ستونوں اور محرابوں سے آراستہ ہے اور چھوٹی چھوٹی محرابیں چار منزلوں میں بنی ہوئی ہیں طاق کسریٰ کی ساخت ساسانی تمدن کے ابتدائی مدارج کا نمونہ ہے وہ دیکھنے والوں کو اپنی مجموعی شکل یا جزئیات کی خوبصورتی سے اس قدر حیرت میں نہیں ڈالتی جتنا کہ اپنی جسامت اور طول و عرض سے یہی وہ

محل تھا جس میں شہنشاہ ایران اپنے دربار منعقد کیا کرتا تھا اور سلطنت کے معاملات پر احکام جاری کرتا تھا۔

مصنف نے خسرو اول کے عہد میں مرکزی حکومت کا نظم ونسق بادشاہ کے درباریوں کی فہرست اور ان کے فرائض منصبی بیان کیے ہیں۔ ان کے علاوہ نجومیوں، طبیبوں، شاعروں اور خواجہ سراؤں کی جماعتوں کی تفصیل پیش کی ہو ان کے علاوہ دربار کے آداب، امتیازات، اور خطابات بھی مفصل طور پر بیان کیے ہیں۔

تعلیم و تربیت کے سلسلے میں مصنف نے بیان کیا ہو کہ ابتدائی تعلیم کے متعلق خاص اطلاعات حاصل نہیں عوام اکثر جاہل ہوتے تھے البتہ امرا اور نجبا کے بچوں کو تعلیم کا کچھ حصہ جو ان شہزادوں کے ساتھ دربار میں ملتا تھا اس تعلیم کا اعلیٰ افسر معلم اسواراں" تھا ان کو عام نوشت وخواند کے علاوہ حساب، چوگان بازی، شطرنج بازی، شہسواری اور شکار کی تعلیم دی جاتی تھی۔

طبی نظریہ اگرچہ زرتشتی تھا تاہم طب یونانی کا اثر ہر جگہ ظاہر تھا بالعموم علاج کے پانچ طریقے تھے (۱) کلام مقدس (۲) آتش (۳) نباتات (۴) نشتر (۵) خوشبودار دواؤں کی دھونی طبیبوں کی فیس کے متعلق بھی قواعد مقرر تھے جب چوتھی صدی میں سلطنت روم سے نسطوریوں کا اخراج ہوا تو وہ میسوپوٹیمیا اور ایران میں پھیل گئے جہاں عیسائیوں نے ایسے خاص مدارس قایم کیے جن میں یونانی طب پڑھائی جاتی تھی سب سے مشہور طبیہ مدرسہ گندیشاپور میں تھا جو ساسانیوں کے بعد بھی قایم رہا اور دور اسلامی کی ابتدائی صدیوں میں علم طب کا بڑا اہم مرکز تھا خسرو اول کے عہد کا مشہور طبیب شاہی طبیبوں کا رئیس اور اپنے عہد کا سب سے بڑا مفکر برزویہ ہو جس کی خود نوشت سوانح حیات کو ابن المقفع نے کلیلہ ودمنہ کے عربی ترجمہ کا مقدمہ قرار دیا ہو "کلیلہ ودمنہ" سنسکرت کے ایک مجموعہ حکایات موسوم بہ "پنچ تنتر" کا ترجمہ ہو جو طبیب موصوف نے پہلوی زبان میں کیا تھا۔

اس باب کے آخر میں ایران کی عمومی زندگی اور معاشرتی زندگی کے حالات برزویہ کی زبان سے اس طرح ادا ہوئے ہیں۔

ہمارا زمانہ جو کہن سال اور ازکار رفتہ ہو چکا ہے اگرچہ ایک روشن پہلو رکھتا ہے تاہم حقیقت میں وہ بے حد تاریک ہے اگرچہ خدا نے بادشاہ کو اقبال مندی اور کامیابی بخشی ہے اور بادشاہ خود بھی آں اندیش، توانا، عالی ہمت متجسس، عادل، رحمدل، فیاض، صداقت پسند دانا فہیم، فرض شناس، جفاکش، عاقل، آمادۂ امداد، حلیم الطبع معقول پسند مہرباں، ہمدرد واقف کار، علم دوست، نیکی پسند، ظالم کش، بے خوف اور صاحب عزم صمیم ہے لیکن بایں ہمہ ہمارا زمانہ ہر پہلو سے رو بہ تنزل ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صداقت ختم ہو چکی ہے سعید چیزیں گم ہیں اور مضر موجود اچھی چیزیں مردہ ہیں اور بری سرسبز، دروغ کو فروغ ہے اور صداقت بے رونق، علم کا درجہ پست ہے اور جہالت کا بلند غرض ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا مسرت کے نشہ میں یہ کہہ رہی ہے کہ میں نے نیکی کو مقید اور بدی کو آزاد کر دیا ہے۔"

باب نہم میں ساسانی سلطنت کے آخری شاندار عہد کا بیان ہے خسرو اول کا جانشین ہرمز چہارم جو ۵۷۸ء میں تخت نشین ہوا بعض باتوں میں اپنے باپ کا خلف الصدق تھا بلکہ اس کا عدل اپنے باپ کے عدل سے بڑھ کر تھا۔ اس کے عہد حکومت میں رومیوں کے ساتھ پھر جنگ کا سلسلہ جاری ہو گیا سپہ سالار بہرام چوبین نے بغاوت کی جس کے نتیجہ میں ہرمز معزول ہوا اور خسرو دوم تخت نشین ہوا لیکن بہرام چوبین نے اس کی اطاعت قبول کرنے سے بھی انکار کیا اور شاہی فوج کو شکست دے کر پایہ تخت میں داخل ہوا اور تاج شاہی سر پر رکھا خسرو دوم رومیوں کی مدد سے دوبارہ حملہ آور ہوا اور بہرام چوبین کو شکست دے کر تخت حکومت واپس لیا اس کی پُرمعرکہ زندگی نے ایرانیوں کے دل پر گہرا اثر چھوڑا اسی عہد میں ایک دوسرے سپہ سالار وستہم نے بغاوت کی اور دس سال تک سرکش رہا رومیوں کے ساتھ پھر لڑائی جاری ہو گئی۔

خسرو دوم کا باپ امیروں پر سخت گیری کرتا تھا لیکن غریبوں پر مہربان تھا اس کے خلاف خسرو دوم ایک طرف تو رعایا سے بزور روپیہ وصول کرتا تھا اور دوسری طرف امراء سے سخت بدگمان تھا اور اکثر امراء کو قتل کرا دیا کرتا تھا اس کی طبیعت کی سب سے نمایاں خصوصیت حرص و زرپرستی

حضرت سعد بن ابی وقاص کی سپہ سالاری میں قادسیہ کے میدان میں ایرانیوں کے مقابلہ پر آئی رستم لڑائی میں مارا گیا اور ایرانیوں کو شکست ہوئی دوسرے ہی سال ایران کا پایۂ تخت طیسفون عربوں کے قبضے میں آیا اور یزدگرد سوم وہاں سے بھاگ گیا تمام خزانے اور بے شمار بیش قیمت سامان فاتحین کے ہاتھ آیا ۶۴۲ء میں نہاوند کے مقام پر ایک اور زبردست لڑائی ہوئی جس میں ایرانیوں کو پھر شکست ہوئی۔ اس کے بعد خوزستان، آذربائیجان، ارمنستان، اصفہان اور فارس کے صوبے یکے بعد دیگرے فتح ہوئے یزدگرد نے خراسان میں پناہ لی لیکن اس کے خاتمے کے دن قریب تھے چنانچہ اسی فراری کی حالت میں ۶۵۲ء میں وہ قتل کر دیا گیا اور اس پر ساسانی خاندان کا خاتمہ ہوا۔

خاتمہ میں مصنف نے رومی مورخ امیاں کی زبان سے ایرانی امرا کی حالت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

"ایرانی عموماً چھریرے اور سانولے رنگ کے ہوتے تھے ان کی نگاہیں تند بھنویں گول نیم دائرے کی شکل کی ہوتی تھیں حد درجے کے محتاط اور بدگمان ہوتے تھے۔ دشمن کے ملک میں، زہر اور جادو کے خوف سے باغوں میں کسی پھل کو ہاتھ نہیں لگاتے تھے قیمتی جواہرات، سونے کے کڑے اور طوق پہنتے تھے اور ہر وقت تلوار حمائل کیے رہتے تھے شیخی باز تندخو، دہشت انگیز حیلہ ساز اور بے رحم ہوتے تھے البتہ میدان جنگ میں دلیری اور بہادری سے لڑتے تھے۔ جنگ کے علاوہ اپنے اوقات اسلحۂ جنگ اور شکار کی مشق اور لطیف عیاشی میں صرف کرتے تھے باوجود دیگر عیوب کے بہت مہمان نواز اور عالی حوصلہ ہوتے تھے کئی مرتبہ جلا وطن یونانیوں اور معلوم بادشاہوں نے ایرانیوں کی مہمان نوازی سے فائدہ اٹھایا ہے۔"

عرب مصنفین نے بھی ساسانیوں کی شاندار سلطنت کی دل سے تعریف کی ہے۔

اہل ایران نے صدیوں تک ملل اسلامیہ کی ذہنی رہنمائی کی ہے اگرچہ ان کی اخلاقی اور سیاسی

طاقت ساسانی سلطنت کے خاتمے کے بعد کمزور ہو گئی تھی۔ خلافت عباسیہ کی سیاسی روایات ایرانیوں کی وراثت تھی اور زوال خلافت کے بعد ایران میں جو سب سے پہلے سی سلطنتیں وجود میں آئیں اُن کی تعمیر اُن ہی پرانی روایات کی بنیاد پر ہوئی اور سامانیوں کا شاندار عہد ساسانی عظمت ہی کا انعکاس تھا

ضمیمہ اوّل انتقال اوستا پر ہے جس میں اس خیال کی تردید کی گئی ہے کہ ساسانی عہد کے آخری زمانے سے پہلے زرتشتیوں کے پاس کوئی مذہبی کتاب نہیں تھی۔

ضمیمہ دوم حکومت کے اعلیٰ عہدہ داروں کی فہرست کے متعلق ہے۔

کتاب کے آخر میں اضافات ہیں جن کے بعد جناب مترجم کی طرف سے "اسما، الفاظ، اصطلاحات اور دیگر مطالب کی چار فہرستیں ہیں اور ان کے بعد ساسانی سلطنت کا نقشہ ہے۔

کتاب میں مختلف چالیس تصویریں ہیں جن میں سے بعض کی تفصیل مصنف نے اپنے اپنے مقام پر دی ہے تمام کتاب میں مصنف کے حواشی کے علاوہ جناب مترجم کی طرف سے بھی متعدد مفید حواشی دیے گئے ہیں

یہاں پر یہ بیان کر نا بے جا نہ ہوگا کہ اصل کتاب کی اہمیت کا اندازہ کرتے ہوئے سب سے پہلے طہران یونیورسٹی کے نامور پروفیسر آقائی رشید یاسمی نے اس کا فارسی ترجمہ ۱۹۳۸ء میں شایع کیا ہے جو موجودہ اردو ترجمے کے سلسلے میں مفید ثابت ہوا ہوگا۔

آخر میں تاریخی دنیا کے لیے کتاب کی اہمیت کا پورا لحاظ کرتے ہوئے ترتیب مضامین کے سلسلے میں ہمیں جو اختلافات مصنف سے ہیں ان کا اظہار بھی ضروری ہے اس کتاب میں ساسانی عہد کی سیاسی تاریخ نہ ہونے کے برابر ہے اور پڑھنے والا اس بات پر مجبور ہوتا ہے کہ اس عہد کے تمدنی حالات کو پورے طور پر سمجھنے کے لیے اس کتاب کے مطالعہ سے پہلے وہ اس عہد کی "سیاسی تاریخ" کا مطالعہ کسی دوسری کتاب سے کرے اس لیے ہمارے خیال میں اس کا پہلا باب "ساسانی عہد کی سیاسی تاریخ" پر ہونا چاہیئے تھا کیونکہ کسی عہد کے تمدنی حالات صرف اسی صورت میں آسانی سمجھ میں آسکتے ہیں کہ جب ان کے مطالعہ سے پیشتر اس عہد کی سیاسی تاریخ سے پوری واقفیت ہو جائے اس کمی کی وجہ سے یہ کتاب ساسانی عہد پر ایک مستقل تصنیف نہیں قرار دی جاسکتی۔

دیباچہ میں مصنف نے بیان کیا ہے کہ ہم نے اپنی کتاب کو زیادہ دل پسند بنانے کے لیے یہ کیا ہے کہ تمدنی معلومات پر علیحدہ بحث قایم کرنے کے بجائے ان کو جا بجا ابواب کے اندر ایسی مناسب جگہوں پر رکھ دیا ہے جہاں وہ سیاسی واقعات یا حالات عمومی کی شرح کا کام دیں جو ان ابواب میں بیان کیے گئے ہیں۔ ہمارے خیال میں مضامین کی جو ترتیب مصنف نے کتاب کو دل پسند بنانے کے لیے اختیار کی ہے اسی ترتیب سے کتاب کی دل پسندی میں کمی ہو گئی ہے اور مندرجہ ذیل نقائص پیدا ہو گئے ہیں۔

(۱) "متعلقہ مضامین کے ارتباط باہمی کا انقطاع" جو ان کے مختلف ابواب میں بکھر جانے کی وجہ سے عمل میں آیا ہے بطور مثال نظام عدالت کے سلسلے میں قانون فوجداری کی تفصیل باب ششم میں ہے تو قانون دیوانی کی تفصیل باب ہفتم میں ساسانیوں کی سیاسی اور معاشرتی جماعت بندی کے کچھ حالات باب دوم میں اور کچھ باب ہفتم میں۔

(۲) "غیر معمولی طوالت" اس کی مثالیں بے شمار ہیں۔

(۳) "تکرار بیان" بطور مثال مرکزی حکومت کا نظم و نسق، بادشاہ کے درباریوں کی فہرست اور اُن کے فرائض باب دوم میں تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں اور اس تفصیل کو معمولی اختلاف کے ساتھ باب ہشتم میں دہرایا گیا ہے اسی طرح فوجی تنظیمات کی تفصیل باب دوم میں ہے اور پھر باب پنجم اور باب ہشتم میں۔

(۴) "ناقابل برداشت ضخامت" جو مذکورہ بالا نقائص کا نتیجہ ہے پوری کتاب کا غور سے مطالعہ کرنا ایک صبر آزما کام ہے۔

پس ہمارے خیال میں اگر مذکورہ بالا نقائص کو دور کیا جائے اور ساسانی عہد کی مختصر سیاسی تاریخ کے اضافہ کے بعد اس عہد کی تمدنی معلومات کو علیحدہ مستقل عنوانات قایم کر کے بیان کیا جائے تو پوری کتاب کے تمام اہم مطالب اس سے نصف ضخامت میں آ سکتے ہیں اور کتاب کی دل پسندی اور اہمیت میں حقیقی معنوں میں اضافہ ہو سکتا ہے۔

غلام سرور ایم۔ اے۔ پی ایچ ڈی

دیوان غالب اُردو کا ایک نایاب نسخہ

دیوان غالب اردو کا سب سے پرانا مطبوعہ نسخہ اب کو سا ملتا ہے یہ سوال خاصہ دلچسپ ہے تذکرۃ الشعرائے اردو میں مولوی کریم الدین صاحب کے بقول دیوان غالب اردو پہلی بار غالباً ۱۸۴۱ء میں چھپا تھا مولوی کریم الدین صاحب فرماتے ہیں کہ یہ طبع سید الاخبار میں چھپا تھا شیخ محمد اکرام صاحب نے "غالب نامہ" میں لکھا ہے کہ "سید المطابع میں شایع ہوا" مالک رام صاحب کا "ذکر غالب" میں بیان ہے کہ "فخر المطابع سے شایع ہوا" اس طرح تاریخ طباعت میں بھی اختلاف ہے جناب ساحل ملگرامی (مضمون غالب کی ایک رباعی مطبوعہ نگار دسمبر ۱۹۴۱ء) کے ۱۸۴۱ء سے لے کر تذکرۃ الشعرائے اردو کے ۱۸۴۸ء تک کے عرصے میں کسی وقت یہ نسخہ چھپا تھا اس نسخہ کی کوئی کاپی اگر اب تک کہیں ہوتی تو یہ سب شبہات آسانی سے مٹ سکتے تھے ایک کے سوائے غالب پر سارے تحقیق کرنے والوں کو اس کا اقرار ہے کہ انھوں نے اس طبع اول کا کوئی نسخہ کہیں نہیں دیکھا۔ غالباً دنیا کی کسی لائبریری میں اس کا پتہ چلتا ہے صرف شیخ محمد اکرام صاحب مصنف غالب نامہ نے لکھا ہے کہ ان کو یہ نسخہ بھی ابو محمد صاحب کے کتب خانے سے دستیاب ہو گیا لکھتے ہیں "لیکن مجھے جس چیز کی سب سے زیادہ تلاش تھی وہ دیوان غالب کا پہلا مطبوعہ نسخہ تھا جو ۱۸۴۱ء میں دہلی میں چھپا یہ مجھے انگلستان کی کسی لائبریری میں نہیں ملا اور جب میں ہندوستان آیا تو رامپور اس کی تلاش میں گیا لیکن [illegible] پہلا مطبوعہ متحب دیوان نہ ملا لیکن یہاں سے مجھے یہ اطلاع مل گئی کہ مطبوعہ دیوان کا ایک نسخہ جس میں عام اڈیشن سے نصف اشعار ہیں [illegible] خان بہادر سید ابو محمد صاحب کے پاس ہے" سوال یہ ہے کہ کیا یہ طبع اول ہی کا نسخہ ہے؟ اس کے متعلق اکرام صاحب ہی نے غالب نامہ کے صفحہ ۱۲۰ پر لکھا ہے:۔

"اس پر سے سرورق غائب ہے لیکن کتاب کی ظاہری صورت، اشعار کی تعداد اور دوسری وجوہات کی بنا پر یقیناً کہا جا سکتا ہے کہ یہ نسخہ باختلاف [illegible] اسی قلمی نسخہ کی نقل

حیات محمد قلی قطب شاہ اور حیات مومن دونوں ڈاکٹر زورؔ نے لکھی ہیں۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ کے حالات ادبی نقطۂ نظر سے اہمیت رکھتے ہیں اور حیات مومن کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان کو شعر شاعری کے لیے جو وقت ملتا تھا وہ مومن جیسے وزیر کے حسن انتظام کی وجہ سے۔ غالب کے دوسرے ایڈیشن میں غلام رسول مہرؔ نے بہت سی ضروری باتوں کا اضافہ کیا ہے اور مولانا ابوالکلام آزاد کے حواشی کی وجہ سے کتاب کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے مولانا نے بعض بالکل نئی باتیں لکھی ہیں مثلاً غالب کی قید کے وجہ حالی کا مرزا سے اس قدر ناراض ہو جانا کہ سوانح عمری لکھنے کا ارادہ ترک کر دیا پہلی بات تو قرین قیاس معلوم ہوتی ہے مگر دوسری ابھی ثبوت کی محتاج ہے بہرحال غالب کے حالات کے متعلق مہر کی کتاب اب کافی مستند ہے اور عرشیؔ اکرام اور مالک رام کی تحقیق کو بھی اس میں ملحوظ رکھا گیا ہے۔ نرم اکبر کے نام سے اکبر کے حالات قمرالدین احمد نے لکھے ہیں اس کتاب کے مطالعہ سے اکبر کی ابتدائی زندگی پر جو روشنی پڑتی ہے اور ان کے بعض غیر مطبوعہ اشعار بھی اس میں مل جاتے ہیں۔ اس قسم کی کتابوں میں لکھنے والے کو اپنی شخصیت نمایاں کرنے کی کوشش نہ کرنی چاہیئے اور ساری توجہ ہیرو پر مرکوز کر دینی چاہیے اکبر کے متعلق ابھی ایک اچھی کتاب کی ضرورت باقی ہے اور طالب اور قمرالدین کی کوشش کے بعد اس کی ضرورت اور بھی زیادہ محسوس ہوتی ہے۔

گورکی کی آپ بیتی، یادِ زندگاں کیا خوبؔ رہی تھا اور مولانا محمد علی کے سفر یورپ سے بعض مشہور شخصیتوں کے متعلق مفید معلومات حاصل ہوتی ہیں اس لیے یہ قابل قدر ہیں۔

اقبال کا مطالعہ از نذیر نیازی تعلیمات اقبال از مولانا سلیم چشتی اور اقبال اور قرآن کے نام ہی سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال کے متعلق کتابوں کا سلسلہ ابھی جاری ہے۔ نذیر نیازی اور سلیم چشتی دونوں عرصے تک اقبال کے ساتھ رہے ہیں اس لیے ان کی کتابیں توجہ اور غور سے پڑھے جانے کے قابل ہیں اقبال اور قرآن نام سے جو کتاب لکھی گئی ہے اس میں مصنف یہ ظاہر کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں کہ اقبال کی تعلیمات کا سرچشمہ دراصل قرآن کریم ہے مگر کتاب تنقیدی نقطۂ نظر سے زیادہ مفید نہیں ابھی تک شاعر اقبال پر زیادہ توجہ نہیں کی گئی ہے فلسفی، حکیم اور لیڈر اور مجدد پر زور زیادہ ہے۔ کاش کوئی اقبال کی شاعرانہ عظمت کو بھی

> ہے جو ۱۸۳۳ء میں نواب ضیاء الدین نے مرتب کیا اور جو ۱۸۴۱ء میں سید المطابع دہلی میں چھپا۔ ان دوسری وجوہات کی تشریح بھی اکرام صاحب نے اسی صفحہ پر کر دی ہے فرماتے ہیں:
>
> "اس مطبوعہ نسخہ میں مروجہ دیوان اردو سے بہت کم شعر ہیں۔ دربار ی دور کے اشعار نہیں اور اشعار کی تعداد قریباً اتنی ہے جو اس دیوان اردو میں تھی جس کا خاتمہ ۱۲۵۰ھ یعنی ۱۸۳۳ء میں نواب ضیاء الدین نے لکھا۔ مروجہ دیوان اردو میں فقط غزلیات کے اشعار ۱۸۰۰ ہیں قطعات و قصائد وغیرہ کے اس پر مستزاد۔ جب نواب ضیاء الدین نے ۱۸۳۳ء میں دیوان غالب اشاعت کے لیے مرتب کیا اور خاتمہ لکھا جو آثار الصنادید میں چھپ گیا ہے تو اشعار کی تعداد [illegible] تھی۔ معلوم ہوتا ہے یہ مجموعہ مرتب ہونے کے چار برس بعد تک نہ چھپ سکا اور جب شائع ہوا تو اس میں چند اشعار کی کمی بیشی ہوئی اور جس طرح غالب نے ۱۸۶۱ء میں متداول اردو دیوان سے نواب ضیاء الدین کا خاتمہ حذف کر دیا تھا اولیں مطبوعہ نسخہ میں بھی اسے شائع نہ کیا۔ یہ نسخہ سید المطابع دہلی میں ۱۸۴۱ء میں طبع ہوا اور غدر سے پہلے ایک دفعہ اور کانپور میں چھپا۔"

قارئین ملاحظہ فرمائیں گے کہ ان وجوہ میں سے کوئی ایک بھی ایسی قطعی دلیل نہیں جو خان بہادر ابو محمد صاحب کے نسخہ کو بلاشک و شبہ پہلے اڈیشن کا نسخہ ثابت کرنے کے لیے ہو۔ صرف ایک دلیل ہے کہ اس میں متداول نسخہ سے کم اشعار ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ یہ نہیں بتایا گیا کہ اس نسخہ میں کل کتنے اشعار ہیں گو یہ اقبال کیا ہے کہ اس میں اختلاف خفیف ہے۔ پھر سب سے عجیب بات یہ ہے کہ نواب ضیاء الدین کا لکھا ہوا خاتمہ اس میں شامل نہیں ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ یہ خاتمہ محض اسی طبع اول کے لیے لکھا گیا تھا اسی خاتمہ سے پتہ چلتا ہے کہ طبع اول میں کتنے اشعار دیوان میں تھے۔ خاتمہ ایسا اچھا کہ آثار الصنادید میں جگہ پائے لیکن جس مقصد اور جس جگہ کے لیے لکھا گیا تھا وہیں نہ چھپے۔ نواب ضیاء الدین حیات تھے۔ دیوان غالب انہی کی خواہش، کوشش اور ترتیب سے آرائش طبع سے مرصع ہو رہا تھا یہ کسی طرح سمجھ میں

نہیں آتا کہ طبع اول ہی سے یہ خاتمہ حذف کر دیا گیا ہو جبکہ اور جتنے بھی غدر سے پہلے کے اڈیشنوں اور قلمی نسخوں کا پتہ چلتا ہے ان سب میں یہ تقریظ زینت کتاب ہے اکرام صاحب نے جو توجیہ اس کے حذف کی فرمائی ہے وہ نہایت دور از کار اور غیر قابل یقین ہے سنہ ۱۸۴۱ء میں دیوان کا حجم ڈیوڑھا ہو چکا تھا پہلی طباعت کو جس کے لیے اصل میں خاتمہ لکھا گیا تھا ۲۲،۲ سال گزر چکے تھے اور اب اتنی مدت بعد اس کا اندراج یقیناً غیر مناسب تھا مثلاً خاتمہ میں فقرہ ہے کہ "از دو برگ را ہزاراں سپاس کہ دریں زماں کہ سنہ ۱۲۴۸ مقدسہ ہجری رسیدہ" بھلا یہ مضمون سنہ ۱۲۵۷ھ میں طباعت کے لیے کہاں موزوں رہا تھا پھر یہ کہنا کہ جس وجہ سے سنہ ۱۸۶۱ء میں اس کا طبع کرانا غالب نے مناسب نہیں سمجھا اسی وجہ سے طبع اول کے وقت سنہ ۱۸۴۱ء میں بھی شامل دیوان نہ کیا ہوگا دلیل ناقص نہیں تو اور کیا ہے اصل میں اگر بہ نظر انصاف دیکھا جائے تو کوئی دلیل قوی یا ضعیف ایسی نہیں جس کی بنا پر خاں بہادر راو محمد صاحب کے نسخے کو طبع اول کا نسخہ سمجھا جائے صرف یہ بات کہ اس میں متداولہ دیوان سے اشعار کی تعداد بہت کم ہے کوئی ثبوت نہیں۔ یہ تو اکرام صاحب کو بھی تسلیم ہے کہ متداولہ دیوان کے چھپنے سے پہلے بھی ایک سے زاید بار یہ دیوان چھپ چکا تھا اور ان سب اڈیشنوں میں اشعار کی تعداد بہت کم تھی پھر کیا یہ ممکن نہیں کہ خان بہادر صاحب کا نسخہ کسی بعد کی طباعت (لیکن متداولہ دیوان سے قبل) کا نسخہ ہو ان شکوک کے ساتھ اگر ان حقائق کو بھی پیش نظر رکھا جائے کہ سنہ ۱۸۴۱ء کے مطبوعہ نسخے کا سراغ کسی اور کام کرنے والے کو آج تک نہ مل سکا تو ہمارے نزدیک یہ فیصلہ کرنے میں زیادہ غلطی کا امکان نہیں کہ دیوان غالب اردو طبع ۱۸۴۱ء اب نایاب ہے۔

اب آئیے دیکھیں طبع ثانی کے متعلق اہل علم حضرات کیا فرماتے ہیں۔

پہلے شیخ محمد اکرام صاحب کی تحقیق ہی کو لے لیجیے آپ "غالب نامہ" میں فرماتے ہیں "اولین مطبوعہ نسخہ سید المطابع دہلی میں سنہ ۱۸۴۱ء میں طبع ہوا اور غدر سے پہلے ایک دفعہ اور کانپور میں چھپا" گویا اکرام صاحب کے نزدیک دوسرا اڈیشن وہ ہے جو غدر سے پہلے کانپور میں چھپا اکرام صاحب اس کی تاریخ طباعت اور مطبع کا نام تحریر نہیں فرماتے لیکن جیسا کہ آیندہ ملاحظہ میں آئے گا کانپور میں

دیواں غدر سے قبل نہیں بعد میں چھپا تھا۔

ذکر غالب میں مالک رام صاحب ایم اے پہلے اڈیشن کے متعلق فرماتے ہیں "سنہ ۱۲۵۷ھ (سنہ ۱۸۴۱ء) میں فخر المطابع سے شائع ہوا یہ اڈیشن ہماری نظر سے نہیں گزرا مگر اس کے آخر میں نواب ضیاء الدین احمد خان بہادر کی جو تقریظ تھی وہ آثار الصنادید (سرسید) میں موجود ہے۔" ہمیں اس میں صرف یہ کلام ہے کہ سنہ ۱۲۵۵ھ کسی طرح سنہ ۱۸۴۲-۴۳ء کے مطابق نہیں ہوتا مالک رام صاحب نے وقت کی طنابیں کھینچ دی ہیں بات اصل میں یہ تھی کہ سنہ ۱۲۵۵ھ میں تقریظ لکھی گئی تھی لیکن طباعت و اشاعت چار سال بعد یعنی سنہ ۱۸۴۲-۴۳ء میں عمل ہوئی مالک رام صاحب آگے فرماتے ہیں: "دوسرا اڈیشن سنہ ۱۲۷۱ھ (سنہ ۱۸۵۵ء) میں شائع ہوا اس کے آخر میں بھی تقریظ ہے اس میں لکھا ہے کہ اس نسخہ میں کل ۱۷۹۲ اشعار ہیں اس نسخے کی ترتیب متداول نسخوں سے مختلف ہے۔ غالباً پہلے اڈیشن میں بھی ایسی ہی ہوگی آغاز میں قطعات ہیں پھر ایک مثنوی اور قصیدے ہیں قصیدوں کے بعد غزلیات ہیں اور سب سے آخر میں رباعیاں آخر میں نیر رخشاں کی فارسی کی تقریظ ہے اور شروع میں مرزا کا اپنا فارسی کا دیباچہ ہے۔" گویا مالک رام صاحب کے نزدیک دوسرا اڈیشن سنہ ۱۸۵۵ء یعنی قبل غدر چھپا اس میں ۱۷۹۲ اشعار تھے اور ترتیب خلاف معمول تھی افسوس یہ ہے کہ مالک رام صاحب مقام اشاعت اور مطبع کا کچھ ذکر نہیں کرتے۔

غلام رسول صاحب مہر نے اپنی کتاب "غالب" میں ان تفاصیل کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔ ان کی مجمل معلومات (اردو دیوان سنہ ۱۸۵۹ء سے پیشتر ایک سے زیادہ مرتبہ چھپ چکا تھا۔ صفحہ ۲۹۶) غالب کے ایک خط پر منحصر ہے جو انھوں نے غالباً سنہ ۱۸۶۲ء میں سید بدر الدین صاحب کو لکھا فرماتے ہیں "وہ اس عرصے میں دلی اور کانپور دو جگہ چھاپا گیا اور اب تیسری جگہ آگرہ میں چھپ رہا ہے۔" اس عرصے کا تعین نہیں کیا گیا ہے لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی قریب یعنی بعد از غدر کے زمانے سے مراد ہے جو آئیندہ سطور سے اور ظاہر ہو جائے گا۔ گویا مہر صاحب غدر سے قبل کے مطبوعہ نسخوں سے مطلع نہیں ہیں۔

حضرت ساحل بلگرامی نے اپنے مضمون "غالب کی ایک رباعی" (نگار دسمبر ۱۹۴۱ء) میں ضمناً اس مسئلہ پر کافی روشنی ڈالی ہے فرماتے ہیں "اس وقت میرے پیش نظر تقریباً تمام اہم مطبوعہ نسخوں کے علاوہ چند قلمی نسخے ... موجود ہیں، اس وقت غالب کے دیوان کا قدیم ترین نسخہ میرے سامنے ہے اگرچہ وہ شعبان ۱۲۵۷ھ مطابق اکتوبر ۱۸۴۱ء میں سید المطابع کے چھپے ہوئے نسخے کی قلمی نقل ہے لیکن اپنی قدامت کی وجہ سے کم اہمیت نہیں رکھتا اس نسخے کے بعد کا وہ قلمی نسخہ ہے جو ۱۸۵۵ء میں خود مرزا نے اپنی پوری نگرانی میں کتابت کرا کے نواب یوسف علی خاں بہادر مرحوم والی ریاست رامپور کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ اس کے بعد یہی نسخہ مطبع احمدی میں ۱۲۷۸ھ مطابق ۱۸۶۲ء میں طبع ہوا جس کے خاتمے کی عبارت حسب ذیل ہے۔

"واو کا طالب غالب گذارش کرتا ہے کہ یہ دیوان اردو تیسری بار چھاپا گیا ہے"

آخر میں غالب کے نام کی مہر کے بعد کی عبارت سے پایا جاتا ہے کہ یہ نسخہ ۲ محرم الحرام ۱۲۷۸ھ میں طبع ہوا۔ اسی سال وہ پھر مطبع نظامی کانپور میں چھاپا گیا جس کا خاتمہ اس عبارت پر ہوا "دیوان بلاغت نشان جناب نواب اسد اللہ خاں غالب کا دہلی میں چھپا لیکن بسبب سہو و نسیان کے بعض مقام میں تغیر و تبدل ہوا اس لیے جناب محمد لطف بیگ ان محمد حسین صاحب دہلوی نے بعد نظر ثانی اور تصحیح جناب مصنف کا ایک نسخہ میرے پاس بھیجا میں نے بافضال ایزدی مطابق اس نسخے کے شہر ذی الحجہ ۱۲۷۸ھ ہجری مطبع کانپور میں صحت تمام اور درستی کمال سے چھاپا"۔ گویا ساحل بلگرامی صاحب کے نزدیک مطبوعہ نسخوں کی ترتیب یہ ہے کہ پہلی بار ۱۲۵۷ھ مطابق ۱۸۴۱ء میں سید المطابع دہلی میں چھپا پھر محرم ۱۲۷۸ھ مطابق جولائی ۱۸۶۱ء میں مطبع احمدی دہلی میں چھپا اور پھر اسی سال لیکن گیارہ ماہ بعد مطبع نظامی کانپور میں چھپا بالفاظ دیگر قبل غدر صرف ایک بار چھپا اور پھر غدر کے بعد ایک ہی سال میں دوبارہ دہلی اور کانپور سے شائع ہوا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غلام رسول صاحب مہر جن "ایک سے زائد مرتبہ" کا ذکر فرماتے ہیں وہ اصل میں بعد از غدر مطبع احمدی دہلی اور مطبع نظامی کانپور کی اشاعتوں کی طرف اشارہ ہے۔ مطبع نظامی کانپور کے خاتمے کی عبارت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کانپور میں اس سے قبل اور کبھی

نہیں چھپا تھا بالفاظ دیگر محمد اکرام صاحب جو فرماتے ہیں کہ غدر سے پہلے ایک دفعہ اور کانپور میں چھپا وہ غلط ہے گویا اکرام صاحب کے حساب سے اب غدر سے پہلے صرف دہلی سید المطابع والا اڈیشن رہ جاتا ہے اور یہی بیان ساحل صاحب بلگرامی کا معلوم ہوتا ہے لیکن بلگرامی صاحب ہی نے جو عبارت مطبع احمدی (۱۸۶۱ء) والے دیوان کے خاتمہ سے نقل کی ہے اور جو خود غالب کی لکھی ہوئی ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ دیوان اس سے قبل ایک سے زائد مرتبہ چھپ چکا تھا سوال یہ ہے کہ ۱۸۴۲ء (پہلا اڈیشن) کے بعد اور غدر یا ۱۸۶۱ء (غدر کے بعد پہلا اڈیشن) تک اور کتنی بار غالب کا اردو دیوان چھپا اور کب کب؟

چھپا اوپر عرض کیا جا چکا ہے شیخ محمد اکرام صاحب، ساحل صاحب بلگرامی اور غلام رسول مہر صاحب کی تحقیق کے مطابق تو اس درمیان میں اردو دیوان ایک بار بھی نہیں چھپا ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب نے خیال ظاہر کیا ہے کہ ۱۸۵۵ء کے قریب اردو دیوان منتخب ہوا یہ ۱۸۴۲ء اور ۱۸۶۱ء کے درمیان کا زمانہ بے شک ہے لیکن ڈاکٹر صاحب کو طبع اول (۱۸۴۲ء) کا علم غالباً نہیں ہے اور وہ ۱۸۵۵ء کو پہلا انتخاب کا سال خیال فرماتے ہیں بہرحال اس کی بھی طباعت کے متعلق وہ بالکل خاموش ہیں اور یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ انتخاب ۱۸۶۱ء سے قبل چھپا بھی یا نہیں اس کے برخلاف مالک رام صاحب نے صریحاً بیان فرمایا ہے کہ دوسرا اڈیشن ۱۸۵۵ء میں چھپا اس کی تفصیل بھی دی ہے لیکن بدقسمتی سے مطبع کا نام نہیں لکھا کانپور کی چونکہ کوئی تشریح نہیں ہے اس لیے خیال ہوتا ہے کہ یہ بھی دہلی ہی میں چھپا ہوگا مالک رام صاحب نے اس طرح اس کا بیان فرمایا ہے کہ گویا یہ نسخہ بذات خود انھوں نے خوب دیکھا ہے میں اس میں شک نہیں کرنا چاہتا لیکن ایک بات بے شک عجیب ہے کہ بقول مالک رام صاحب اس میں ۱،۷۹۲ شعر ہیں گویا متداولہ نسخہ سے بھی زیادہ! اور ترتیب بھی اس کی ایسی ہے کہ کسی اور نسخے کی نہیں نہ اس سے قبل کے نسخے کی نہ بعد کے متعدد نسخوں کی۔ بہرحال یہ ہے مالک رام صاحب کا دوسرا اڈیشن مطبوعہ ۱۸۵۵ء محققین کی صف میں صرف مالک رام صاحب ہی یقین اور وثوق کے ساتھ ۱۸۴۲ء کے بعد اور غدر سے پہلے کے کسی مطبوعہ نسخہ کی خبر دیتے ہیں۔

لیکن ان محققین کے علاوہ خود مرزا نے مطبع احمدی دہلی والے نسخے کے خاتمے پر بالتصریح لکھ دیا

ہو کہ، غالب گذارش کرتا ہو کہ یہ دیوان اردو تیسری بار چھاپا گیا ہے گویا اس نسخہ (۱۸۶۱ء) سے قبل دو بار چھپ چکا تھا کانپور میں مطبع احمدی دہلی میں چھپنے کے گیارہ ماہ بعد چھپا اس لیے مرزا غالب یقیناً کانپور کے علاوہ بلکہ اس سے قبل کی دو اشاعتوں کی طرف اشارہ کر رہے ہیں اس طرح تو کچھ ایسا معلوم ہوتا ہو کہ مرزا غالب کا مطلب ۱۸۴۱ء والے اور (مالک رام صاحب کے) ۱۸۵۵ء والے نسخوں سے ہو گویا ۱۸۴۱ء کا پہلا اور اگر ایسا ہو تو ۱۸۵۵ء کا دوسرا اڈیشن ہوا کاش یہ مسئلہ یوں آسانی سے حل ہو جاتا لیکن اس نا قابل انکار حقیقت کا کیا جائے کہ ۱۸۴۷ء میں بھی دیوان غالب اردو دہلی میں یقیناً چھپا تھا۔ اس وقت میرے پاس ۱۸۴۷ء کے مطبوعہ دیوان کا ایک نسخہ بہ تمام وکمال موجود ہو اس کا سرورق اور خاتمہ بالکل محفوظ ہیں سرورق پر صاف چھپا ہوا ہو کہ یہ نسخہ خود مرزا غالب کی تصحیح اور مقابلہ کے بعد "در مطبع دار السلام دہلی واقع حوض قاضی مینہ اقل العباد عنایت حسین در ماہ مئی ۱۸۴۷ء باہتمام نور الدین احمد لکھنوی حلیہ انطباع پوشید" یہ نسخہ ۹½ انچ × ۶ انچ سائز پر ہے کل ۱۰۴ صفحے ہیں شروع میں غالب کا فارسی کا دیباچہ ہو پھر ۱۸۸ غزلیات کا انتخاب ہو جس میں کل ۱۰۵۸ شعر ہیں ان میں ۶۵ غزلیں ایسی ہیں جن میں تین یا تین سے کم اشعار درج دیوان ہیں اس کے بعد تین قصیدے ۶۱ اشعار کے ہیں پھر ۲۱ اشعار کے چار قطعے ہیں اور پھر ۲۰ شعر دس رباعیوں کے ہیں گویا کل ۱۱۶۰ شعر ہوئے خاتمے پر نواب ضیاء الدین صاحب بہادر کی معروف تقریظ ہو تعداد اشعار کے متعلق اس کا یہ فقرہ محلہ نقل کیا جاتا ہو "ہمگی اشعار ستوری شعار غزل و قصیدہ و قطعہ و رباعی یک ہزار و یک صد و اند" یک صد کے بعد واو عطف سے صاف ظاہر ہو کہ تعداد کا آخری لفظ چھپنے سے رہ گیا چونکہ اس نسخے میں اشعار کی کل تعداد ۱۱۶۰ ہو اس لیے غالباً چھوٹا ہوا لفظ "شصت" ہوگا۔

تعجب اور سخت تعجب تو یہ ہو کہ اس ۱۸۴۷ء والے نسخے کی کسی نے آج تک اطلاع نہیں دی بہر حال اب اس علم کے بعد دیوان غالب اردو کی اولین طباعتوں کے متعلق نئے زاویوں سے بحث کرنی ہوگی میں درخواست کروں گا کہ اہل شوق حضرات حسب ذیل امکانات کو مد نظر رکھتے

ہوئے اس مسئلے پر مزید تحقیق فرمائیں:۔

أ۔ غالب کے اردو دیوان کے طبع اول کا پتہ مولوی کریم الدین صاحب کے تذکرۃ الشعرائے اردو سے چلتا ہو جو ۱۸۴۸ء میں دہلی سے شائع ہوا میرے پاس جو دیوان کا نسخہ ہو وہ ۱۸۴۷ء کے وسط میں چھپ چکا تھا یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ مولوی کریم الدین صاحب دہلی میں رہتے ہوئے اس ۱۸۴۷ء کی اشاعت سے بے خبر رہے کیا یہ ممکن نہیں کہ تذکرۃ الشعرائے اردو میں جہاں سن طباعت کا حوالہ دیا ہو وہاں اصل میں ۱۸۴۷ء ہو اور کتابت کی غلطی سے ۱۸۴۳ء معلوم ہوتا ہو، یہ واضح رہے کہ ۱۸۴۳ء بہرحال غلط تاریخ ہو یہ بھی خیال رہے کہ ۱۸۴۲ء کا مطبوعہ نسخہ کہیں ملتا نہیں۔

ب۔ اگر یہ ماننا ضروری ہی ہو کہ ۱۸۴۲ء میں دیوان اردو چھپا تھا اور وہی پہلا اڈیشن ہو (گو اب وہ ناپید ہے) تو یہ ۱۸۴۷ء کا اڈیشن یقیناً اور بلا شک وشبہ دوسرا اڈیشن ہو نہ کہ ۱۸۵۵ء کا وہ عجیب اڈیشن جس کا ذکر مالک رام صاحب نے بطور طبع ثانی کیا ہو۔

ج۔ اگر ۱۸۴۳ء کے مطبوعہ نسخہ کو پہلا اڈیشن اور ۱۸۴۷ء کے مطبوعہ نسخہ کو دوسرا اڈیشن مانا جائے تو پھر مالک رام صاحب کا ۱۸۵۵ء کا اڈیشن کہاں گیا؟ غالب نے خود تصریح کر دی ہو کہ قبل از غدر اردو دیوان دو بار (نہ کہ تین بار) چھپ چکا تھا گویا مالک رام صاحب والے تیسرے اڈیشن سے انکار ہو یا اگر یہ اڈیشن بھی واقعی موجود ہو پھر ۱۸۴۲ء والے اڈیشن سے انکار اس صورت میں ۱۸۴۷ء کا نسخہ پہلا اڈیشن ہوگا اور ۱۸۵۵ء کا نسخہ دوسرا اڈیشن مرزا غالب کو اپنی تصانیف اور خصوصاً دیوان کی طباعت میں غیر معمولی بلکہ ضرورت سے بھی زیادہ انہماک اور دخل رہتا تھا یہ فرض کر لینا نہایت خلاف قیاس ہو کہ مرزا غالب کو اس معاملہ میں سہو ہوا اور وہ تین کے بجائے دو اشاعتوں کا حوالہ دے گئے

بہرحال غالب پر معلومہ لٹریچر کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہو کہ اس وقت دیوان غالب اردو کا قدیم ترین مطبوعہ نسخہ اپنی صحیح مکمل اور غیر مشتبہ حالت میں صرف وہ ہو جو مطبع دار السلام دہلی میں ۱۸۴۷ء میں چھپا اور جس کی ملکیت کا فخر مجھ کو حاصل ہو۔ مجھے تو قوی شبہ ہو کہ یہی پہلا اڈیشن بھی ہو غالب کا فارسی کا دیوان

"میخانۂ آرزو" سب سے پہلے ۱۸۳۵ء میں مرتب ہو چکا تھا۔ غالب کی تمام تصانیف میں سب سے پہلے یہی کتاب مرتب ہوئی اور اسی کو وہ اصل میں مایۂ ناز سمجھتے تھے جس کے چھپنے کے وہ بے انتہا مشتاق تھے لیکن اس کے چھپنے کی نوبت ہی ۱۸۴۵ء میں آسکی جبکہ نواب ضیاء الدین نیر نے اس کی تصحیح کے بعد مطبع دارالسلام دہلی میں چھپوایا اردو کا دیوان فارسی دیوان سے تین سال بعد ۱۸۳۸ء میں مرتب ہوا تھا پھر اس کی ایسی کیا جلدی تھی کہ فارسی دیوان سے بھی پہلے چھاپ دیا گیا یہ خلاف قیاس ہے۔ صحیح یہی معلوم ہوتا ہے کہ فارسی دیوان کے دو سال بعد اسی مطبع دارالسلام دہلی میں ۱۸۴۷ء میں پہلی بار نواب ضیاء الدین نیر ہی نے طبع کرایا جس میں دیباچہ و تقریظ سب شامل ہے۔

مالک رام صاحب ایم اے نے ذکر غالب میں دیوان غالب اردو کی طباعت کے متعلق از صفحہ ۴۰ تا صفحہ ۶۰ مفصل بحث کی ہے اور اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ پہلی بار دیوان ۱۸۴۲-۴۳ء میں سید المطابع میں چھپا۔ دوسری بار ۱۸۵۵ء میں چھپا تیسری بار ۱۸۶۱ء میں مطبع احمدی دہلی میں چھپا چوتھی بار ۱۸۶۱ء میں مطبع نظامی کانپور میں چھپا اور شاید پانچویں بار ۱۸۶۳ء میں مطبع مفید خلائق آگرہ میں چھپا اس کے بعد مالک رام صاحب ایم اے نہایت قطعیت کے ساتھ فرماتے ہیں کہ:-

"غالب کی زندگی میں اردو دیوان کا اور کوئی اڈیشن شائع نہیں ہوا"

پھر ۱۸۴۷ء کے مطبوعہ نسخے کے متعلق کیا حکم ہے؟

سید اسد علی انوری فریدآبادی

شہریت کی تعلیم

(یہ مقالہ انجمن اتحاد جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے اسٹڈی سرکل میں پڑھا گیا)

دوستو! آج ہم سب یہاں اس لیے اکٹھے ہوئے ہیں کہ تعلیم کے ایک بڑے مقصد کی جانچ پڑتال کریں جسے عام طور سے ان لفظوں میں ظاہر کیا جاتا ہے کہ تعلیم کا مقصد فرد کو ایک اچھا شہری بنانا ہے،

اس موضوع پر بحث کرنے میں آسانی ہوگی اگر ہم اسے چند خاص حصوں میں تقسیم کرلیں اور پھر ہر ایک حصے سے الگ الگ بحث کریں یہ حصے حسب ذیل ہیں۔

شہریت کا تصور انسان کے ذہن میں کیسے پیدا ہوا؟ اس کی نشوونما کیونکر ہوئی؟ شہریت کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ اس کے لیے کس قسم کی تعلیم ہونی چاہیے؟ تعلیمی ادارے شہریت کی تعلیم کس طرح دے سکتے ہیں؟

ابتدائی انسان ہر طرح آزاد تھا اس کی نقل و حرکت پر اگر کوئی قوت پابندی عائد کرتی تھی تو وہ تھا اس کا طبعی ماحول وہ اپنی ضرورتوں کو جس طرح چاہتا پورا کرلیتا تھا جب اسے بھوک لگتی وہ کسی جانور کو مار کر یا کسی درخت سے پھل پتیاں توڑ کر اپنا پیٹ بھر لیتا تھا جب وہ تھک جاتا تو جہاں چاہتا لیٹ جاتا اور سو جاتا۔ غرض ساری دنیا اس کی تھی لیکن اس کا یہ حق بہت عرصے تک بلا شرکت غیرے قائم نہیں رہ سکا جوں جوں انسانی نسل میں اضافہ ہوتا گیا انسان کو اس بات کا احساس تیز سے تیز تر ہوتا گیا کہ دنیا کی چیزوں کے استعمال میں دوسروں کو شامل کرنا ناگزیر ہے درا صل یہی وہ احساس ہے جو ابتدا میں اجتماعی زندگی کا سبب بنا۔ اجتماعی زندگی کی نشوونما کے لیے انسان کو اپنے اوپر کچھ پابندیاں لگانے کی ضرورت محسوس ہوئی یہ تھا شہریت کا پہلا تصور جو انسان کے ذہن میں پیدا ہوا انسان نے عمر اور تجربے سے سیکھا کہ اس کے ہر حق کے ساتھ ایک فرض بھی وابستہ ہے گویا کہ شروع میں جن ذمہ داریوں کا بوجھ انسان کے کندھوں پر پڑا وہ کسی بیرونی طاقت یا شخصیت نے اس پر زبردستی عائد نہیں کی تھیں بلکہ اس نے خود انھیں ضروری سمجھ کر اپنے ذمہ لیا تھا لیکن

جماعت کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ شہریت کا رنگ روپ بھی بدلتا گیا۔ رفتہ رفتہ پوری جماعت کی باگ ڈور فرد واحد کے ہاتھ میں آئی جو سب سے طاقتور اور ذہین ہوا بس اس نے ساری جماعت کو اپنے حکم کے مطابق چلنے پر مجبور کیا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ انسان جو آزاد پیدا ہوا تھا اور شروع میں کچھ عرصے تک آزاد رہا بھی رفتہ رفتہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑ گیا۔ اجتماعی زندگی نے نئی نئی شکلیں اختیار کیں کبھی پروہتی نظام قایم ہوا تو کبھی جاگیرداری کبھی امپیریلزم نے زور پکڑا تو کبھی فاشزم نے یہ سارے کے سارے نظام کسی نہ کسی شکل میں آج بھی موجود ہیں اس وقت بھی دنیا کے بعض حصوں میں غلامی کی رسم جاری ہے جہاں آقا کے نزدیک غلام کی قدر و قیمت ایک زر خرید مویشی سے زیادہ نہیں ہے اب بھی کہیں کہیں جاگیرداری اپنی روایتی شان و شوکت کے ساتھ پنجے جمائے ہوئے ہے امپیریلزم مختلف بھیسوں میں دنیا کے بیشتر حصے کو دن رات کھلے بندوں لوٹ رہی ہے اور فاشزم امپیریلزم کی مد مقابل بن کر انسانیت کو تباہ و برباد کرنے میں اپنے حریف سے بازی لے جانے کی جان توڑ کوشش کر رہی ہے۔

ساتھیو! ہر نظام اپنے وجود کو قایم رکھنے کے لیے کچھ نہ کچھ تدبیر ضرور کرتا ہے وہ افراد کے لیے خاص راستے بھی تجویز کرتا ہے اور اپنی قوت کے بل بوتے انھیں ان راستوں پر چلنے کے لیے مجبور کرتا ہے اس کے نزدیک "شہریت" نام ہے ان بتائے ہوئے راستوں پر چلنے کی صفت کا کسی نظام کی نظر میں اچھے شہری کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اس نظام کو سب سے اچھا سمجھے اور اس کی بقا کے لیے ہر قسم کی جد و جہد کرے گویا کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ تمام افراد کو ایک ہی سانچے میں ڈھال کر ایک نمونے کا بنا دیا جائے اور اس طرح بڑی حد تک انفرادیت کو ختم کر دیا جائے غرض شخصی آزادی اور شہریت دو متضاد چیزیں ہیں لیکن ہے یہ بہت مضحکہ خیز اور نامعقول بات وہ ریاستیں جو آج ایک خاص قسم کے انسان ڈھالنے کا کام بہت انہماک سے کر رہی ہیں ان کے بڑے بڑے نامور فرزند جن کے نام آج بھی ان کی قومیں عزت و احترام کے ساتھ لیتی ہیں جن کے یوم پیدایش اور یوم وفات کو قومی تیوہار کا درجہ حاصل ہے اس ٹائپ سے بالکل مختلف تھے جس کے پیدا کرنے کی آج جد وجہد

اچھی طرح اجاگر کرے۔ اقبال چاہے آپ درنگ شاعری سے کتنے ہی بیزار ہوں اُن کے کلام میں تازگی، ادبیت دراصل اسی وجہ سے ہے۔

اقبال پر تنقیدوں کے علاوہ بھی اردو میں تنقید کا کام بڑی تیزی سے ہو رہا ہے ادیبوں اور شاعروں پر اچھے اچھے تنقیدی مضامین رسالوں میں آئے دن نکلتے ہیں یہ تنقید محض مغرب کے اصولوں کی نقل نہیں ہوتی اب اس میں توازن اور سنجیدگی بھی آچلی ہے اب تنقید محض اشعار نقل کر دینے کا نام نہیں رہی۔ اس کے اصول متعین ہو رہے ہیں، اس کے مبادیات تلاش کیے جا رہے ہیں اگرچہ ابھی تنقید کے فن کے متعلق کوئی ایسی کتاب نہیں ہے جس میں محض مغربی تنقید کے اصول آنکھ بند کر کے نقل نہ کر دیے گئے ہوں حالی اور شبلی پر ابھی تک ہم کوئی اضافہ نہیں کر سکے ہیں مگر اس دوران میں جو تحقیق ہوئی ہے اس سے اردو کی ایک مفصل تاریخ مرتب کرنے کا کام آسان ہو گیا ہے چنانچہ پروفیسر حامد حسن قادری نے داستان تاریخ اردو کے نام سے اُردو نثر کی ایک مفصل تاریخ لکھدی ہے اور اس میں ابتدا سے لے کر بیسویں صدی کے آغاز تک نثر کے ارتقاء پر نظر ڈالی ہے۔ اگر نام سے قطع نظر کی جائے جس میں صرف یہ خوبی ہے کہ تاریخی ہے تو یہ بہت اچھی کتاب ہے اور اس وقت تک اردو نثر کے متعلق جتنی کتابیں ہیں ان سب سے مستند، جامع اور مفصل ہے اس کے سامنے سنہا اور عسکری اور احسن کی کتابیں محض طفلانہ کوششیں معلوم ہوتی ہیں اس میں کوشش کی گئی ہے کہ دکن کے ادب کے متعلق تمام معلومات آجائیں اور اردو کی ابتدا کے سلسلہ میں جتنے نظریے ہیں سب کا علم طالب علم کو ہو سکے اس میں بڑی خوبی یہ ہے کہ کتاب محض مشاہیر کا تذکرہ نہیں ہے بلکہ بہت سے دوسرے درجے کے غیر معروف مصنفوں کا بھی ذکر ہے خصوصاً انیسویں صدی کے نثاروں کا تذکرہ بہت مفید ہے اس سے یہ خیال اور بھی واضح ہو جاتا ہے کہ جو لوگ فورٹ ولیم کالج اور سرسید کے درمیان کے زمانہ کو تاریکی کا دور کہتے تھے وہ کس قدر غلطی پر تھے ساڑھے آٹھ سو صفحے کی کتاب میں نمونے بھی بکثرت ہیں اور تنقیدی حصہ بھی کافی ہے اور اگرچہ فاضل مولف کے بعض اشاروں سے اتفاق کرنا مشکل ہے اور بعض باتوں کے بارے میں ان کی معلومات کافی نہیں ہیں مگر پھر بھی انھوں نے یہ کتاب لکھ کر اردو نثر کی ایک نہایت اہم تاریخ مرتب کر دی ہے جو پچھلی تمام کتابوں سے ہر طرح افضل ہے۔

کی جا رہی ہو اگر کسی شہری میں آزادیٔ رائے اور آزادیٔ عمل کی جھلک نظر آتی ہو تو اسے ریاست کچلنے کی کوشش کرتی ہو گو کہ یہ وہ خوبیاں ہیں جو کہ اس ریاست کے گزشتہ نامور فرزندوں کی شخصیت کا بہت نمایاں حصہ تھیں۔ امریکہ والے ابراہم لنکن کا نام بہت عزت و احترام کے ساتھ لیتے ہیں ان کے ہاں لنکن کی شان میں قصیدوں کے دیوان بھرے پڑے ہیں لیکن وہاں آج ان لوگوں کو بلا تکلف جیل میں ٹھونس دیا جاتا ہو جن میں لنکن جیسے خیالات اُبھرتے نظر آتے ہیں تمام مغربی ممالک حضرت عیسیٰؑ کی تعریف کرتے نہیں تھکتے لیکن وہ اگر آج زندہ ہوتے اور اپنے اصول کے مطابق لڑائی میں شریک ہونے کے خلاف آواز بلند کرتے تو ان کی جو گت بنتی اس کا اندازہ آپ خود ہی لگا سکتے ہیں یا تو انہیں کسی کال کوٹھری میں بند کر دیا گیا ہوتا جہاں ان کی آواز سننے والا بجز ان کی ذات اور ان کے خدا کے اور کوئی تیسرا نہ ہوتا یا پھر سرے سے ان کا حساب ہی بے باق کر دیا گیا ہوتا اس سے ظاہر ہو کہ اس قسم کی شہریت بحیثیت ایک آئیڈیل کے بہت ناقص چیز ہو کیونکہ اس سے تخلیق کے سارے سوتے بند ہو جاتے ہیں اور ذہنی طور پر انسان محض غلام بن کر رہ جاتا ہو۔ ذہنی غلامی کبھی بڑے آدمی پیدا نہیں کر سکتی بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ اس کی وجہ سے معمولی انسان بھی اپنی صلاحیتوں کے مطابق ترقی نہیں کر پاتے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہو کہ کیا ہر قسم کی شہریت انسان کی ترقی کو روکتی ہو اور شہریت کی تعلیم لازمی طور پر گھٹیا اور پست قسم کے انسان پیدا کرتی ہو؟ نہیں یہ ٹھیک نہیں ہو اصل میں شہریت کا تعلق جیسا کہ میں نے شروع میں بتایا ہو سماجی نظام سے ہو اگر کسی سماج میں ہمیشہ بڑھنے اور ترقی کرنے کے بیج موجود ہیں اگر وہ سمجھتا ہو کہ عوام کی ترقی اس کے لیے مضر ہونے کے بجائے مفید ہو تو وہ اپنے افراد کی فردیت کو بجائے دبا کر ختم کرنے کے ابھارنے کی کوشش کرے گا۔ اسے اچھی طرح پھلنے پھولنے کے موقعے دے گا وہ ان قوتوں کی سرکوبی کرے گا جو عوام کو ترقی کرنے سے روکتی ہیں جو انہیں آگے نہیں بڑھنے دیتیں وہ ان پابندیوں کی تعداد کم سے کم کرے گا جن کا ماننا اور جن کے مطابق چلنا ہر شہری کے لیے ضروری ہے یہ پابندیاں ایسی ہوں گی جو اس کی نشو و نما میں رکاوٹ

ڈالنے کے بجائے معاونت کریں گی۔ اسے میں دو ایک مثالوں سے واضح کروں گا۔ سڑک کے ایک طرف چلنے کی پابندی نہ صرف دوسروں کے لیے مفید ہے بلکہ اس شخص کے لیے بھی مفید ہے جو اس پابندی کے مطابق عمل کرتا ہے۔ اس طرح نہ صرف موٹر بس اور تانگوں کو پیدل چلنے والوں کی وجہ سے رکاوٹ نہیں ہوتی بلکہ پیدل چلنے والا بھی سڑک کے حادثوں سے محفوظ رہتا ہے۔ اس طرح ہر شخص کو کام کرنے پر مجبور کرنا نہ صرف ریاست کے لیے مفید ہے بلکہ ان لوگوں کے لیے بھی جو دوسروں کی محنت سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں اور خود عیش سے زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں کیونکہ اس طرح ان کو بھی انفرادی خوبیاں اجاگر کرنے کا موقع ہوگا۔ ایسے ترقی پسند سماج میں اجتماعی زندگی کی خاطر انفرادی امتیازات کو فنا کرنے کے بجائے صحیح سمتوں میں ابھارا جائے گا۔ اگر شہریت کی تعلیم اس قسم کے سماج کو پیش نظر رکھتے ہوئے دی جائے تو انفرادی طور کی بہترین چیزوں کو قائم رکھنا ناممکن نہیں ہے۔ لہذا شہریت کی تعلیم کے معاملہ میں بہت سمجھ بوجھ اور ہوشیاری کی ضرورت ہے۔ اگر اس میں دوراندیشی کو جگہ نہ دی جائے تو یہ فرد کو موجودہ نظام حکومت کا محض آلۂ کار بنا دے گی اور بس۔ اس لیے یہ بات بہت اہم ہے کہ ہم شہریت کے تنگ آئیڈیل کے خطرات سے آگاہ رہیں۔

اوپر کی بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شہریت کی تعلیم کے دو مختلف مقصد ہو سکتے ہیں۔ موجودہ نظام کو قائم رکھنا اور اسے تقویت پہنچانا یا اسے برباد کرکے دوسرے نظام کی داغ بیل ڈالنا۔ دوسرے لفظوں میں افراد کو ایک آئیڈیل سماج کی تشکیل کے لیے تیار کرنا۔ جہاں تعلیم قدامت پسند ریاست کے ہاتھ میں ہوتی ہے وہاں تقریباً ہمیشہ اس کا مقصد موجودہ نظام کو تقویت پہنچانا ہوتا ہے اور اس صورت میں تعلیم ایک پیچھے لے جانے والی طاقت کا کام کرتی ہے۔ قدامت پسند ریاستیں شہریت کے نام سے جمہور میں جو باتیں پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہیں، ان میں سے اکثر اچھی نہیں ہوتیں۔ کسی شہری میں حب وطن کی خوبی کو بہت سراہا جاتا ہے لیکن یہ حب وطن افراد میں جب شدت کے ساتھ پیدا کی جاتی ہے وہ اچھی ہونے کے بجائے بہت بری چیز ہے۔ شہری اپنے وطن کے مقابلے میں دوسرے دیسوں کو ذلیل سمجھنے لگتا ہے اور کسی حد تک انھیں حقارت اور نفرت کی نظر سے دیکھنے لگتا ہے۔ اس کا جو خوفناک

نتیجہ ہو سکتا ہے اس کا ایک دل ہلا دینے والا سین آج ہم اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہے ہیں نازی نظام حکومت میں ایک اچھے شہری کی سب سے بڑی خوبی یہ سمجھی جاتی ہے کہ وہ اپنے تمدن اور تہذیب کو سب سے اچھا سمجھے اور یہی بس بلکہ وہ یہ بھی سمجھے کہ دنیا کے اور کسی ملک کو اپنے تمدن اور تہذیب کو قایم رکھنے کا کوئی حق نہیں ہے اور اسی لیے تمام دنیا والوں کو اسی کے رنگ میں رنگ جانا چاہیئے اسی بات کا بیڑا جرمنی اور اس کے ساتھیوں نے اٹھایا ہے کہ وہ گولے اور بارود کے زور سے تمام دنیا کو مہذب بنا کے چھوڑیں گے! ہندوستان کی قومی تحریک میں بھی اس رجحان کی ایک جھلک دکھائی دیتی ہے قومی جھنڈے کے گیت میں تمام دنیا کو جیتنے کی امنگ کا اظہار ہوتا ہے۔ "کل دسو میں یہ لہرا کے تب ہووے پرن پورن ہمارا" یعنی جب ہمارا ترنگا جھنڈا تمام دنیا پر لہرائے گا تب ہی ہمارا عہد پورا ہوگا۔ اس قسم کی شہریت کی تعلیم نہ صرف دوسرے ملکوں کو ظلم و استبداد کا شکار بنانے کی طرف مائل کرتی ہے بلکہ وہ اپنے ملک میں بھی تشدد اور ناانصافی برقرار رکھنے میں مدد دیتی ہے کیا آپ کو معلوم نہیں کہ جب کبھی کسی بڑے کارخانے یا تعلیمی ادارے میں ہڑتال ہوتی ہے تو ہم میں سے اکثریت کی ہمدردیوں کا رخ کس طرف ہوتا ہے ہم میں سے ایسے کتنے لوگ ہیں جن کی ہمدردی صحیح معنوں میں مظلوموں کے ساتھ ہوتی ہے یوں زبانی ہمدردی تو تقریباً سب ہی دکھاتے ہیں لیکن عملی طور پر ان کی مدد کرنے والے بہت ہی کم لوگ ہوتے ہیں آخر اس سنگدلی اور بےحسی کی اصل وجہ کیا ہے؟ دراصل بات یہ ہے کہ ہماری شہریت کی تعلیم ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کرتی ہے کہ ملک کا قانون اور دستور اس قسم کی سماجی ناانصافیوں کو جائز قرار دیتا ہے دستور چاہتا ہے کہ ضبط اور امن بہرصورت قایم رہے کیونکہ اس کے بغیر اقتدار رکھنے والی جماعت کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا روس کو چھوڑ کر باقی تمام ملکوں میں مدرسہ طلبا کو بزدلی کا سبق دیتا ہے وہ سکھاتا ہے کہ موجودہ سماجی نظام کی بنیاد عدل و انصاف پر قایم ہے بھلا ایسے مدرسوں کے طلبا سے آپ کیا توقع کر سکتے ہیں؟

اب تک ہم نے اس بات سے بحث کی ہے کہ موجودہ نظام کو تقویت پہنچانے والی شہریت کی تعلیم کس قسم کی ہوتی ہے اور اس میں کیا خرابیاں ہیں۔ اب ہم شہریت کی تعلیم کے دوسرے مقصد کو لیں گے

یعنی پرانے نظام کو ختم کرکے ایک ایسا نظام قایم کرنا جس کا انحصار انصاف اور انسانی مساوات کے اصول پر ہو۔ یہاں لوگوں کا نظریہ ہے جن میں موجودہ نظام کا سخت ردعمل ہوا ہے اور جنھیں انقلاب کے سوا نجات کی اور کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ یہاں ہمیں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ ایک انقلابی کے نزدیک جمہوریت کا تصور اسی قدر تنگ ہو سکتا ہے جس قدر کہ قانون اور دستور کے حامی کا۔ کسی قایم شدہ نظام سے بغاوت اور دشمنی کے دو مختلف سبب ہو سکتے ہیں مصیبت زدہ لوگوں کے ساتھ ہمدردی یا خوش حال لوگوں کے ساتھ نفرت بعض انقلابیوں کی جو وجہ اتنی عوام کو خوش حال بنانے کے لیے نہیں ہوتی جتنی کہ ان لوگوں سے انتقام لینے کی خواہش سے جو موجودہ صورت حال کے ذمہ دار ہیں یہ اپنی جگہ کوئی پسندیدہ جذبہ نہیں تنگ نظر اور متعصب انقلابی، رجعت پسند کی دقیانوسیت کو رفتہ رفتہ اختیار کر لیتا ہے جو عقل اور اُپج کے سرچشموں کو ہر صورت میں اُبھرنے سے روکتی ہے ہاں یہ بات تو ہمیں تسلیم کرنا پڑے گی کہ نفسیاتی امتیاز سے یہ لازمی بات ہے کہ اگر ہمیں ایک چیز سے محبت ہے تو اس کی متضاد چیز سے نفرت ہوگی لیکن ہم ان میں سے کس کو پہلے رکھیں اور زیادہ زور دیں اس سے ہمارے عمل میں بہت بڑا فرق واقع ہو جاتا ہے تاہم اس میں شک نہیں کہ انقلاب کا حامی قانون اور دستور کے حامی کے مقابلے میں بہتر تعلیم دے سکتا ہے قدامت پسندی میں اعلیٰ قسم کے ذہنی عمل کی گنجایش کم ہے برعکس اس کے انقلاب کے حامی کو کسی حد تک ہر قوت تخیل سے کام لینا پڑتا ہے تاکہ وہ موجودہ چیزوں سے بہتر کوئی دوسری چیز پیش نہ کرسکے۔ اس کے لیے یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ وہ زندگی کی اعلیٰ قدروں سے واقف ہو اور انھیں کسوٹی سمجھ کر موجودہ سماج کو پرکھنے کی صلاحیت رکھتا ہو وہ ان لوگوں کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کرسکتا جو موجودہ نظام کے مظالم کے شکار بنے ہوتے ہیں یا وہ لوگوں کی تکلیف دور نہ کرنے کے لیے بہانے تلاش نہیں کرسکتا بہرحال قدامت پسند تعلیم کے مقابلے میں انقلاب پسند تعلیم میں عقل، اُپج اور ہمدردی کے لیے زیادہ جگہ رہتی ہے۔

باوجود اس کے کہ جمہوریت کی تعلیم میں خطرے ہیں تاہم اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا

جا سکتا کیونکہ سماج کی کڑیوں کو مضبوط رکھنے کے لیے یہ بہت ضروری ہے مہذب زندگی کی آسانیاں اور سہولتیں باہمی اشتراک عمل پر منحصر ہیں اور صنعت و حرفت کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس کی ضرورت اور بھی بڑھتی جائے گی قومی مرکزیت کا احساس اب تقریباً سب ہی ملکوں میں زور پکڑ رہا ہے لیکن دنیا کی موجودہ جنگ کی ہولناک تباہیوں نے شدت کے ساتھ اب اس کا احساس پیدا کر دیا ہے کہ محض قومی مرکزیت سے بھی کام نہیں چلے گا جب تک بین الاقوامی مرکزیت کو قائم نہ کیا جائے اس کے بغیر ہماری سائنٹفک تہذیب زندہ نہیں رہ سکتی بلکہ اس کو خودکشی کرنی پڑے گی جیسا کہ آج ہم دیکھ رہے ہیں اس لیے تمام دنیا کی ایک ریاست یا تمام ملکوں کے ایک قومی وفاق (فیڈریشن) کی ضرورت ہوگی۔

یہ تو ماننا پڑے گا کہ شروع میں کچھ عرصے تک اس قسم کی شہریت کی تعلیم میں بھی کچھ خرابیاں ضرور رہیں گی جو انفرادی زندگی کی راہ میں رکاوٹ ڈالیں گی لیکن اگر اس کے بغیر ساری دنیا کی تہذیب و تمدن کے برباد ہو جانے کا اندیشہ ہے تو ان عارضی خرابیوں کو برداشت کرنا چاہیے آج کل کی قومیں پرانی قوموں کے مقابلہ میں اقتصادی اور سیاسی لحاظ سے زیادہ قریبی رشتہ رکھتی ہیں اور اگر انھیں زندہ رہنا اور پھلنا پھولنا ہے تو ان کے افراد میں قومی شہریت کے احساس کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی شہریت کا احساس تیز سے تیز تر ہونا چاہیے دنیا کی ریاست کی وفاداری قومی وفاداری کے بدترین نتیجے یعنی جنگ کے امکانات کو بالکل ختم کر دے گی اس لیے اب تعلیم کا سب سے بڑا کام افراد میں بین الاقوامی شہریت کا احساس پیدا کرنا اور بڑھانا ہے اب ہمارا کام بحیثیت استاد کے یہ ہونا چاہیے کہ ہم اپنے بچوں اور نوجوانوں کو اس ہونے والی دنیا کی ریاست کا شہری بنائیں یعنی ان میں وہ ذہنی اور عملی خوبیاں پیدا کریں جو اس ریاست کے قیام میں مدد دیں گی ہم اپنے طلبا میں یہ احساس بیدار کریں کہ تمام دنیا کے بسنے والے ایک ہی انسانی نسل سے تعلق رکھتے ہیں ان میں بحیثیت انسان کے کوئی فرق نہیں وہ تمام لوگ جو محنت اور ایمانداری سے روزی کماتے ہیں قابل عزت ہیں۔ ہمیں ان کی سیوا کرنی چاہیے ان کے دکھ درد میں کام آنا چاہیے ان میں ان کی موجودہ پستی اور تباہی کا احساس

پیدا کرنا چاہیے اور اسے دور کرنے کی تدابیر بتانی چاہییں اس قسم کی تعلیم تمام دنیا کی ایک جمہوری ریاست قائم کرنے میں مدد دے گی جبکہ ساری دنیا ایک اور صرف ایک ہی اقتصادی اور سیاسی جماعت ہو جائے گی اس وقت انفرادی نشو و نما کے لیے بھی صحیح معنوں میں مواقع ہوں گے اس وقت تعلیمی میدان میں ریاست اور بچے کے مفاد ایک ہی ہوں گے اس وقت جارحانہ قسم کی قومیت کی تعلیم دینا غیر ضروری ہوگا پھر یونیورسٹی ٹریننگ کور یا غلط تاریخ پڑھانے کی کوئی ضرورت نہ رہے گی پھر ہمارے تعلیمی اداروں میں بچوں کو یہ بتانے اور یقین دلانے کی کوئی وجہ نہ ہوگی کہ انگریزوں کی حکومت یا مغلوں کی سلطنت انصاف اور اخلاق کے اعلیٰ اصولوں پر مبنی تھی یا یہ کہ ہندو راج "رام راج" تھا جہاں گائے اور شیر ایک گھاٹ پانی پیتے تھے ہندوؤں کا قدیم کلچر بہت ہی ترقی یافتہ تھا یہاں تک کہ اُس زمانہ میں ہندوستانیوں نے وہ تمام چیزیں ایجاد کر لی تھیں جنھیں آج جدید سائنس کے کرشموں میں شمار کیا جاتا ہے وغیرہ غرض اس وقت انسانی ذہن ہر قسم کے تعصبات و توہمات سے پاک ہو جائے گا۔

شہریت کی تعلیم کا صحیح مفہوم سمجھ لینے کے بعد اب میں مختصر طور پر یہ بتاؤں گا کہ اچھے شہری کس طرح تیار کئے جائیں شہریت کی تعلیم گھر سے شروع ہوتی ہے جب بچہ بہت چھوٹا ہوتا ہے اس وقت ہی سے والدین اور گھر کے دوسرے لوگ اس میں کچھ ایسی عادتیں پیدا کر دیتے ہیں جو شہریت کے لحاظ سے مفید یا مضر ہوتی ہیں اگر گھر میں بچے کو بہت زیادہ لاڈ پیار کیا جاتا ہے اور اس کی ہر ضد کو پورا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو رفتہ رفتہ بچے میں اپنی ضرورت اور خواہش کو مقدم سمجھنے کا رجحان ترقی کرتا ہے یقینی طور پر شہریت کی تعلیم کی یہ بہت بری ابتدا ہے ایسا بچہ بڑا ہونے پر بھی خود غرضی کی طرف مائل ہوگا اور اُسے دوسروں کو نقصان پہنچا کر خود فایدہ اُٹھانے میں ذرا تامل نہ ہوگا برعکس اس کے اگر گھر میں اس پر بہت بے جا دباؤ ڈالا گیا تو یہ بھی شہریت کی تعلیم کے حق میں برا ہے کیونکہ اس صورت میں اُس میں خود اعتمادی کے بجائے احساس کمتری پیدا ہو جانا ناگزیر ہے جس کا نتیجہ آگے چل کر یہ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی سمجھ بوجھ سے کوئی کام ہی نہ کر سکے اور ہر معاملے میں دوسروں کا دست نگر رہے لہذا شہریت کے لیے وہی گھر اچھا ہے جہاں بچے کو شروع سے عملاً یہ بات سکھائی جاتی ہے کہ ہر حق کے ساتھ ایک فرض بھی وابستہ ہے جہاں اسے

دوسرے بچوں کے ساتھ مل جل کر کھیلنے کا موقع دیا جاتا ہے اور جہاں اسے ہر بات میں دوسروں کا بھی خیال رکھنے کی ضرورت سے آگاہ کیا جاتا ہے

لیکن ہم سب جانتے ہیں کہ ہمارے بہت کم گھر ایسے ہیں جو صحیح تربیت کا فرض انجام دیتے ہیں اس لیے شہریت کی تعلیم کا فرض کلیتہً مدرسہ کے ذمہ آتا ہے صرف یہی نہیں کہ گھر اس بڑے کام میں مدرسہ کا ہاتھ نہیں بٹاتا بلکہ اکثر گھر اس میں رکاوٹ ڈالتا ہے اس صورت میں مدرسہ کا کام بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا مدرسے کو بڑی ہمت اور مستقل مزاجی سے اس بڑے فرض کو انجام دینا چاہیے اسے چاہیے کہ وہ مدرسے کی زندگی میں ایسے زیادہ سے زیادہ موقعے فراہم کرے جن میں بچے ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر کام کر سکیں اپنی بھی ضرورتوں کو باری باری سے پورا کریں مدرسے کے سامان کو ذمہ داری سے استعمال کریں اس قسم کی سماجی خوبیاں بچوں کو چھوٹی چھوٹی ذمہ داریاں دینے سے پیدا کی جا سکتی ہیں مدرسہ اور جماعت کا انتظام کرنے کے لیے بچوں کی خود اختیاری حکومت قائم کی جا سکتی ہے آگے چل کر جب یہی بچے بڑے ہوں گے تو انھیں سماج سیوا کے بڑے کام سونپے جا سکتے ہیں مثلاً دیہات سدھار، تعلیم بالغان، فرسٹ ایڈ، میلوں اور حادثوں میں عوام کی امداد کرنا وغیرہ ان میں سے بعض کام گرمیوں کی بڑی تعطیلات میں منظم طور پر کیے جا سکتے ہیں ہمارے طلبا میں ان کاموں کے ذریعہ یہ احساس ضرور ہو جائے گا کہ دنیا کے کام مل جل کر کرنے سے کو بی چلائے جا سکتے ہیں وہ اس بات کی اہمیت سمجھ جائیں گے کہ جو چیزیں عوام کے استعمال کے لیے ہیں انھیں بہت سلیقے اور ذمہ داری سے برتنا چاہیے اور کسی چیز پر اپنے حق کی خاطر دوسروں کے حقوق نظر انداز نہیں کرنے چاہییں۔

اگر ہم اپنے موجودہ تعلیمی ادارہ کو اس کسوٹی پر جانچیں تو ہمیں بڑی مایوسی اور ندامت ہوتی ہے اچھے شہری ہماری موجودہ تعلیمی فضا میں پیدا نہیں ہو سکتے اسے آپ تعلیمی فضا کہیں گے یا تخریبی فضا جس کی امتیازی خصوصیات یہ ہیں اٹھتی ہوئی امنگوں اور بڑھتے ہوئے حوصلوں کو کچلنے والا نوجی ضبط ذہنیت پست کرنے والی اور اخلاق بگاڑنے والی تعلیمی رعایتیں بلا سمجھے بوجھے رٹنے کے لیے کتابوں کا ایک ڈھیر اور سب سے بڑا امتحان کا ہوا جو مہینوں رات کی نیند حرام کر دیتا ہے۔ اچھے شہری پیدا

کرنے کے لیے تعلیمی فضا کو ان برائیوں سے پاک کرنا پڑے گا۔ ہمارے نئے مدرسے میں جرمانے، بید یا مدرسے سے اخراج کا خوف دلا کر ضبط پیدا نہیں کیا جائے گا بلکہ اس کی بنیاد طلبا اور اساتذہ کے باہمی خوشگوار تعلقات پر قایم کی جائے گی۔ وہاں افراد ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کریں گے اور ایک دوسرے کے ہمدرد ہوں گے۔ وہاں دفعہ ۱۰۹ کے ملزموں کی طرح طلبا کی نگرانی نہیں کی جائے گی بلکہ وہ خود اپنے نگراں ہوں گے۔ وہاں جاسوسی سب سے بڑا گناہ اور اخلاقی گناہ سمجھا جائے گا۔ طلبا خود اپنی بنائی ہوئی انجمنوں اور اپنے چنے ہوئے نمایندوں کے ذریعہ ضبط قایم رکھیں گے۔ مدرسے کا ہر رکن انجمن کے سامنے اپنے کردار کے لیے جواب دہ ہوگا۔ اس طرح رفتہ رفتہ ہر فرد ضبط نفس کا کلی سبق سیکھے گا پھر وہ نہ صرف اپنے مدرسے کی چہار دیواری کے اندر بھلے مانس کی طرح رہے گا بلکہ باہر بھی۔ پھر وہ تکلیف دہ اور شرمناک نظارہ جس سے ہمیں سینما اور ریلوے اسٹیشن کے ٹکٹ گھر پر یا ریل گاڑی کے تھرڈ کلاس ڈبے میں آئے دن دوچار ہونا پڑتا ہے جہاں انسانوں کا مجمع برتاؤ کے اعتبار سے مویشیوں کے گلے سے مشابہ نظر آتا ہے کہیں دکھائی نہ دے گا۔

اگر بدقسمتی سے ہمارے تعلیمی ادارے یہ کام نہ کرنا چاہیں شاید ان کے منتظمین آج کے فرسودہ سماج کو قایم رکھنے کے لیے تعلیمی اصول اور طریقے نہ بدلیں تو پھر ہمارا فرض کیا ہے؟ اگر ہم ان شہری خوبیوں کی قدر کرتے ہیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے تو پھر ہمارا پہلا کام یہ ہونا چاہیے کہ ہم انھیں اپنی شخصیت میں سموئیں اس کے بعد ہمیں چاہیے کہ ہم ان خوبیوں کو عوام تک پہنچانے کی کوشش کریں۔ ایک چراغ سے ہزاروں چراغ روشن کیے جا سکتے ہیں۔ اس لیے ہمیں فرصت کے اوقات میں آرام چھوڑ کر عوام تک پہنچنا ہوگا ان کے ساتھ مل کر ان کے دکھ درد میں شریک ہو کر ان کے دلوں میں گھر کرنا ہوگا۔ ان کے لیے مکتب رات کے مدرسے کتب خانے پڑھائی گھر وغیرہ قایم کرنے ہوں گے۔ اس کے لیے سرمایے سے زیادہ جوش اور نیک نیتی سے کام کرنے والے رضاکاروں کی ضرورت ہے۔ دنیا کے بعض ممالک کے طلبا نے بڑے بڑے کارنامے انجام دیے ہیں۔ کیا ہندوستان کے طلبا جو آج ایک منظم جماعت بنانے کی کوشش کر رہے ہیں ادھر دھیان دیں گے اور اس میدان میں اپنے قدم بڑھائیں گے۔ میرے نزدیک آپ شہری اور سماجی احساس کو پرکھنے کے لیے سب سے بڑی اور صحیح کسوٹی یہی ہے۔ کیا آپ اس امتحان کے لیے تیار ہیں؟

سلامت اللہ

انجمن ترقی اردو ہر سال بہت سی اچھی کتابیں شائع کرتی ہے چنانچہ سنہ ۱۹۴۲ء میں گارساں دتاسی کے تمہیدی خطبات کا ترجمہ اور پروفیسر مجیب کا روسی ادب تاریخ و تنقید ادب کے سلسلہ میں اچھے اضافے ہیں۔ روسی ادب کے علاوہ ایران بعہد ساسانیاں جس کا ترجمہ ڈاکٹر اقبال (لاہور) نے کیا ہے۔ عربوں سے پہلے ایران کی تاریخ پر بہت اچھی روشنی ڈالتی ہے۔ ضرورت ہے کہ جس طرح فارسی عربی اور روسی ادب کے متعلق ہماری معلومات بہت کافی ہیں اسی طرح انگریزی، فرانسیسی، جرمن اور جاپانی ادب کے مستند تذکرے اردو میں مرتب کیے جائیں۔

خالص ادب و انشا میں بھی بعض اضافے ہوئے ہیں اسی سال محشر خیال کا دوسرا اڈیشن شائع ہوا ہے سجاد انصاری اردو کے مضمون نگاروں میں بہت بلند درجہ رکھتے ہیں ان کے خیالات، ان کا انداز بیان سب دلچسپ ہیں سجاد نوجوان مرگئے ورنہ ہم ادب لطیف کے اس فلسفی کو شاید اور بھی بلند درجہ پر دیکھتے اس اڈیشن میں خوبی یہ ہے کہ اس میں ایک ڈرامہ روز جزا بھی شامل ہے۔ رعنائی خیال، شوخی بیان، جرأت فکر زور بیان کے لحاظ سے محشر خیال کے بہت سے مضامین اردو ادب میں یادگار رہیں گے شیطان کا انتقام اشک (عثمانیہ) کے زور قلم کا نتیجہ ہے اگرچہ انھوں نے اس کا اعتراف نہیں کیا، ممکن ہے کہ انھیں خبر ہی نہ ہو کہ شیطان کے کردار کو ایک دلچسپ طریقے سے سب سے پہلے سجاد انصاری نے پیش کیا تھا اس میں اس دور کی بے رنگی اور انتشار کا بہت اچھا نقشہ کھینچا گیا ہے مسرت سے محرومی واقعی دنیا کی بہت بڑی لعنت ہے جو اس دور پر مسلط ہے جزیرہ سخن وراں غلام عباس کی تصنیف ہے اردو میں یہ ایک نئی چیز ہے اگرچہ انگریزی میں اس قسم کے مضامین بہت ملتے ہیں غلام عباس صاحب نے شعرا کی ایک جنت کی بڑی دلکش تصویر کھینچی ہے۔ اور بعض قدیم شعرا کا خاکہ بڑے مزے سے اڑایا ہے۔ آزاد کے بقائے دوام کے دربار کو لوگ بھول رہے تھے جزیرہ سخن وراں نے اس کی یاد تازہ کر دی

غالب کے خطوط کی مقبولیت ابھی کم نہیں ہوئی منشی مہیش پرشاد نے بڑی تلاش اور محنت سے غالب کے تمام خطوط کو جمع کیا ہے اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے اس پر نظر ثانی کی ہے ابھی پہلی جلد شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ طالب علم کو خطوط کے تمام پچھلے مجموعوں سے بے نیاز کر سکتا ہے۔

دوسرے بچوں کے ساتھ مل جل کر کھیلنے کا موقع دیا جاتا ہے اور جہاں اسے ہر بات میں دوسروں کا بھی خیال رکھنے کی ضرورت سے آگاہ کیا جاتا ہے

لیکن ہم سب جانتے ہیں کہ ہمارے بہت کم گھر ایسے ہیں جو صحیح تربیت کا فرض انجام دیتے ہیں اس لیے تربیت کی تعلیم کا فرض کلیتہً مدرسہ کے ذمہ آتا ہے صرف یہی نہیں کہ گھر اس بڑے کام میں مدرسہ کا ہاتھ نہیں بٹاتا بلکہ اکثر گھر اس میں رکاوٹ ڈالتا ہے اس صورت میں مدرسہ کا کام بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ لہذا مدرسے کو بڑی ہمت اور مستقل مزاجی سے اس بڑے فرض کو انجام دینا چاہیے اسے چاہیے کہ وہ مدرسے کی زندگی میں ایسے زیادہ سے زیادہ موقعے فراہم کرے جن میں بچے ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر کام کر سکیں، اپنی ضرورتوں کو باری باری سے پورا کریں مدرسے کے سامان کو ذمہ داری سے استعمال کریں اس قسم کی سماجی خوبیاں بچوں کو چھوٹی چھوٹی ذمہ داریاں دینے سے پیدا کی جا سکتی ہیں مدرسہ اور جماعت کا انتظام کرنے کے لیے بچوں کی خود اختیاری حکومت قائم کی جا سکتی ہے آگے چل کر جب یہی بچے بڑے ہوں گے تو انہیں سماج سیوا کے بڑے کام سونپے جا سکتے ہیں مثلاً دیہات سدھار تعلیم بالغان، فرسٹ ایڈ، میلوں اور حادثوں میں عوام کی امداد کرنا وغیرہ ان میں سے بعض کام گرمیوں کی بڑی تعطیلات میں منظم طور پر کیے جا سکتے ہیں ہمارے طلبا میں ان کاموں کے ذریعہ یہ احساس ضرور ہو جائے گا کہ دنیا کے کام مل جل کر کرنے سے بخوبی چلائے جا سکتے ہیں وہ اس بات کی اہمیت سمجھ جائیں گے کہ جو چیزیں عوام کے استعمال کے لیے ہیں انہیں بہت سلیقے اور ذمہ داری سے برتنا چاہیے اور کسی چیز پر اپنے حق کی خاطر دوسروں کے حقوق نظر انداز نہیں کرنے چاہییں۔

اگر ہم اپنے موجودہ تعلیمی ادارہ کو اس کسوٹی سے جانچیں تو ہمیں بڑی مایوسی اور ندامت ہوتی ہے۔ اچھے شہری ہماری موجودہ تعلیمی فضا میں پیدا نہیں ہو سکتے اسے آپ تعلیمی فضا کہیں گے یا تخریبی فضا جس کی امتیازی خصوصیات یہ ہیں اٹھتی ہوئی امنگوں اور بڑھتے ہوئے حوصلوں کو کچلنے والا اوچھی ضبط ذہنیت پست کرنے والی اور اخلاق بگاڑنے والی تعلیمی رعائتیں بلا سمجھے بوجھے رٹنے کے لیے کتابوں کا ایک ڈھیر اور سب سے بڑا امتحان کا ہوا جو مہینوں رات کی نیند حرام کر دیتا ہے۔ اچھے شہری پیدا

کرنے کے لیے تعلیمی فضا کو ان برائیوں سے پاک کرنا پڑے گا۔ ہمارے نئے مدرسے میں جرمانے، بیت یا مدرسے سے اخراج کا خوف دلا کر ضبط پیدا نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ اس کی بنیاد طلبا اور اساتذہ کے باہمی خوشگوار تعلقات پر قایم کی جائے گی وہاں افراد ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کریں گے اور ایک دوسرے کے ہمدرد ہوں گے۔ وہاں [illegible] کے ملزموں کی طرح طلبا کی نگرانی نہیں کی جائے گی بلکہ وہ خود اپنے نگراں ہوں گے وہاں جاسوسی سب سے بڑا گناہ اور اخلاقی گناہ سمجھا جائے گا طلبا خود اپنی بنائی ہوئی انجمنوں اور اپنے چنے ہوئے نمایندوں کے ذریعہ ضبط قایم رکھیں گے مدرسے کا ہر رکن انجمن کے سامنے اپنے کردار کے لیے جواب دہ ہوگا اس طرح رفتہ رفتہ ہر فرد ضبط نفس کا سبق سیکھے گا پھر وہ نہ صرف اپنے مدرسے کی چہار دیواری کے اندر بھلے مانس کی طرح رہے گا بلکہ باہر بھی پھر وہ تکلیف دہ اور شرمناک نظارہ جس سے ہمیں سینما اور ریلوے اسٹیشن کے ٹکٹ گھر پر یا ریل گاڑی کے تھرڈ کلاس ڈبے میں آئے دن دو چار ہونا پڑتا ہے جہاں انسانوں کا مجمع برتاؤ کے اعتبار سے مویشیوں کے گلے سے مشابہ نظر آتا ہے کبھی دکھائی نہ دے گا

اگر بدقسمتی سے ہمارے تعلیمی ادارے یہ کام نہ کرنا چاہیں شاید ان کے منتظمین آج کے فرسودہ سماج کو قایم رکھنے کے لئے تعلیمی اصول اور طریقے نہ بدلیں تو پھر ہمارا فرض کیا ہے؟ اگر ہم ان شہری خوبیوں کی قدر کرتے ہیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے تو پھر ہمارا پہلا کام یہ ہونا چاہیے کہ ہم انھیں اپنی شخصیت میں سمو لیں اس کے بعد ہمیں چاہیے کہ ہم ان خوبیوں کو عوام تک پہنچانے کی کوشش کریں ایک چراغ سے ہزاروں چراغ روشن کیے جا سکتے ہیں اس لیے ہمیں فرصت کے اوقات میں آرام چھوڑ کر عوام تک پہنچنا ہوگا ان کے ساتھ مل کر ان کے دکھ درد میں شریک ہو کر ان کے دلوں میں گھر کرنا ہوگا۔ ان کے لیے کلب رات کے مدرسے، کتب خانے، پڑھائی گھر وغیرہ قایم کرنے ہوں گے اس کے لیے سرمایے سے زیادہ جوش اور نیک نیتی سے کام کرنے والے رضاکاروں کی ضرورت ہے دنیا کے بعض ممالک کے طلبا نے بڑے بڑے کارنامے انجام دیے ہیں کیا ہندوستان کے طلبا جو آج ایک منظم جماعت بنانے کی کوشش کر رہے ہیں ادھر دھیان دیں گے اور اس میدان میں اپنے قدم بڑھائیں گے، میرے نزدیک آپ شہری اور سماجی احساس کو پرکھنے کے لیے سب سے بڑی اور صحیح کسوٹی یہی ہے کیا آپ اس امتحان کے لیے تیار ہیں؟

سلامت اللہ،

دوسرے بچوں کے ساتھ مل جل کر کھیلنے کا موقع دیا جاتا ہے اور جہاں اسے ہر بات میں دوسروں کا بھی خیال رکھنے کی ضرورت سے آگاہ کیا جاتا ہے

لیکن ہم سب جانتے ہیں کہ ہمارے بہت کم گھر ایسے ہیں جو صحیح تربیت کا فرض انجام دیتے ہیں اس لیے تربیت کی تعلیم کا فرض کلیتہ مدرسہ کے ذمہ آتا ہے صرف یہی نہیں کہ گھر اس بڑے کام میں مدرسہ کا ہاتھ نہیں بٹاتا بلکہ اکثر گھر اس میں رکاوٹ ڈالتا ہے اس صورت میں مدرسہ کا کام بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ لہذا مدرسے کو بڑی ہمت اور مستقل مزاجی سے اس بڑے فرض کو انجام دینا چاہیے اسے چاہیے کہ وہ مدرسے کی زندگی میں ایسے زیادہ سے زیادہ موقعے فراہم کرے جن میں بچے ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر کام کرنا سیکھیں اپنی ضرورتوں کو باری باری سے پورا کریں۔ مدرسے کے سامان کو ذمہ داری سے استعمال کریں اس قسم کی سماجی خوبیاں بچوں کو چھوٹی چھوٹی ذمہ داریاں دینے سے پیدا کی جا سکتی ہیں مدرسہ اور جماعت کا انتظام کرنے کے لیے بچوں کی خود اختیاری حکومت قائم کی جا سکتی ہے آگے چل کر جب یہی بچے بڑے ہوں گے تو انھیں سماج سیوا کے بڑے کام سونپے جا سکتے ہیں مثلاً دیہات سدھار، تعلیم بالغان، فرسٹ ایڈ، میلوں اور حادثوں میں عوام کی امداد کرنا وغیرہ ان میں سے بعض کام گرمیوں کی بڑی تعطیلات میں منظم طور پر کیے جا سکتے ہیں ہمارے طلبا میں ان کاموں کے ذریعہ یہ احساس ضرور ہو جائے گا کہ دنیا کے کام مل جل کر کرنے سے بخوبی چلائے جا سکتے ہیں وہ اس بات کی اہمیت سمجھ جائیں گے کہ جو چیزیں عوام کے استعمال کے لیے ہیں انھیں بہت سلیقے اور ذمہ داری سے برتنا چاہیے اور کسی چیز پر اپنے حق کی خاطر دوسروں کے حقوق نظر انداز نہیں کرنے چاہییں۔

اگر ہم اپنے موجودہ تعلیمی ادارہ کو اس کسوٹی سے جانچیں تو ہمیں بڑی مایوسی اور ندامت ہوتی ہے اچھے شہری ہماری موجودہ تعلیمی فضا میں پیدا نہیں ہو سکتے اسے آپ تعلیمی فضا کہیں گے یا تخریبی فضا جس کی امتیازی خصوصیات یہ ہیں اٹھتی ہوئی امنگوں اور بڑھتے ہوئے حوصلوں کو کچلنے والا اوچھی ضبط ذہنیت پست کرنے والی اور اخلاق بگاڑنے والی تعلیمی رعائتیں بلا سمجھے بوجھے رٹنے کے لیے کتابوں کا ایک ڈھیر اور سب سے بڑا امتحان کا ہوا جو مہینوں رات کی نیند حرام کر دیتا ہے اچھے شہری پیدا

کرنے کے لیے تعلیمی فضا کو ان برائیوں سے پاک کرنا پڑے گا۔ ہمارے نئے مدرسے میں جرمانے، بیت یا مدرسے سے اخراج کا خوف دلا کر ضبط پیدا نہیں کیا جائے گا بلکہ اس کی بنیاد طلبا اور اساتذہ کے باہمی خوشگوار تعلقات پر قایم کی جائے گی وہاں افراد ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کریں گے اور ایک دوسرے کے ہمدرد ہوں گے۔ وہاں دفتر کے ملازموں کی طرح طلبا کی نگرانی نہیں کی جائے گی بلکہ وہ خود اپنے نگراں ہوں گے وہاں جاسوسی سب سے بڑا گناہ اور اخلاقی گناہ سمجھا جائے گا طلبا خود اپنی بنائی ہوئی انجمنوں اور اپنے چنے ہوئے نمائندوں کے ذریعہ ضبط قایم رکھیں گے مدرسے کا ہر رکن انجمن کے سامنے اپنے کردار کے لیے جواب دہ ہوگا اس طرح رفتہ رفتہ ہر فرد ضبط نفس کا کل سبق سیکھے گا پھر وہ نہ صرف اپنے مدرسے کی چہار دیواری کے اندر بھلے مانس کی طرح رہے گا بلکہ باہر بھی پھر وہ تکلیف دہ اور شرمناک نظارہ جس سے ہمیں سنیما اور ریلوے اسٹیشن کے ٹکٹ گھر پر یا ریل گاڑی کے تھرڈ کلاس ڈبے میں آئے دن دو چار ہونا پڑتا ہے جہاں انسانوں کا مجمع برتاؤ کے اعتبار سے مویشیوں کے گلے سے مشابہ نظر آتا ہے کبھی دکھائی نہ دے گا۔

اگر بدقسمتی سے ہمارے تعلیمی ادارے یہ کام نہ کرنا چاہیں شاید ان کے منتظمین آج کے فرسودہ سماج کو قایم رکھنے کے لیے تعلیمی اصول اور طریقے نہ بدلیں تو پھر ہمارا فرض کیا ہے؟ اگر ہم ان شہری خوبیوں کی قدر کرتے ہیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے تو پھر ہمارا پہلا کام یہ ہونا چاہیے کہ ہم انھیں اپنی شخصیت میں سمولیں اس کے بعد ہمیں چاہیے کہ ہم ان خوبیوں کو عوام تک پہنچانے کی کوشش کریں ایک چراغ سے ہزاروں چراغ روشن کیے جا سکتے ہیں اس لیے ہمیں فرصت کے اوقات میں آرام چھوڑ کر عوام تک پہنچنا ہوگا ان کے ساتھ مل کر ان کے دکھ درد میں شریک ہو کر ان کے دلوں میں گھر کرنا ہوگا ان کے لیے کتب رات کے مدرسے، کتب خانے، پڑھائی گھر وغیرہ قایم کرنے ہوں گے اس کے لیے سرمایے سے زیادہ جوش اور نیک نیتی سے کام کرنے والے رضاکاروں کی ضرورت ہے دنیا کے بعض ممالک کے طلبا نے بڑے بڑے کارنامے انجام دیے ہیں کیا ہندوستان کے طلبا جو آج ایک منظم جماعت بنانے کی کوشش کر رہے ہیں ادھر دھیان دیں گے اور اس میدان میں اپنے قدم بڑھائیں گے میرے نزدیک آپ شہری اور سماجی احساس کو پرکھنے کے لیے سب سے بڑی اور صحیح کسوٹی یہی ہے کیا آپ اس امتحان کے لیے تیار ہیں؟

سلامت اللہ

مارکسیت

سیاسی بحثوں میں اکثر ہمارے کان لفظ مارکسیت سے آشنا ہوتے رہتے ہیں خصوصاً نوجوان طبقہ اس نظریہ زندگی کو ہر سیاسی، سماجی، ذہنی اور ارتقائی کش مکش کا واحد حل سمجھتا ہے لیکن اس لفظ کے جتنے نام لیوا ہیں شاید اتنے ہی اس کے معنی بھی تراش لیے گئے ہیں کوئی کہتا ہے کہ مارکسیت ایک اقتصادی نظام ہے تو دوسرا اس کو ہر زاویہ نگاہ سے انقلاب سے تعبیر کرتا ہے عامیانہ تشریح یہ ہے کہ اس نظریہ کا بانی یعنی کارل مارکس اشتراکیت کا باوا آدم تھا اور اس کی پیشین گوئیوں پر عمل پیرا ہو کر لینن نے روس میں انقلاب برپا کیا لیکن شاید ان تمام حضرات کے تعجب کی انتہا نہ رہے جب ان کو یہ معلوم ہو کہ یہ تمام تشریحات محض فروعی ہیں اور خود نظریہ مارکسیت مارکس ایجاد کردہ نہیں ہے مارکسیت کو زمان و مکان میں نہیں گھیرا جا سکتا اس کا قیام مارکس سے بہت پہلے موجود تھا

مارکسیت ایک فلسفہ ہے لیکن وہ دیگر فلسفوں سے مختلف ہے دیگر فلسفے ایک حد پر جا کر ختم ہو جاتے ہیں لیکن مارکسیت آگے قدم بڑھاتا ہے دوسرے فلسفے مزعومات اور اعتقاد کے گورکھ دھندے ہیں جبکہ مارکسیت تاریخ کی مادی تشریح کا نام ہے بعض حضرات اس کو تاریخ کی اقتصادی تشریح سمجھتے ہیں لیکن ایسا کرنے سے مارکسیت محض روٹی اور کپڑے کے مسائل میں محدود ہو جائے گا مارکسیت کا دائرہ بہت وسیع ہے اقتصادی نظریات، سیاسی اصول اور عمل کا پروگرام تو محض اس کی شاخیں ہیں چونکہ مارکسیت زندگی کا فلسفہ ہے اس لیے وہ زندگی کے تمام مسائل کا رازدار ہے۔

مارکسیت ایک مادی فلسفہ ہے لیکن مارکسی مادیت عمومی مادیت سے بہت مختلف ہے نہ تو مارکسیت کارل مارکس کی ایجاد کردہ ہے اور نہ کسی ایک فرد نے اس کو بنایا۔ کارل مارکس کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے پندرہویں صدی سے انیسویں صدی عیسوی تک کے تمام سائنسی خیالات انسانی تجربات، افکار اور خیالات کو اکھٹا کیا،

یورپ میں پندرہویں اور سولہویں صدی میں زبردست ذہنی ہیجان تھا اور خیالات میں سخت انتشار۔ پرانا نظام چولہ بدل رہا تھا بلکہ قدیم سماج کے بطن سے ایک نیا بچہ پیدا ہو رہا تھا۔ انسانی طبیعتوں میں تبدیلی رونما ہو رہی تھی۔ پرانی تہذیب اپنی افادیت کھو چکی تھی۔ تصوف اور مابعدالطبیعات انسانی ذہن کو پسپا رکھنے کی ناکام کوششیں کرتے کرتے تھک چکے تھے چنانچہ ایسے نظام کی ضرورت تھی جو سماجی جمود اور ذہنی سکرات کو ختم کر دے جب ہم اٹھارویں صدی عیسوی کے سیاسی انقلابات پڑھتے ہیں ہمیں کبھی بھی پندرہویں اور سولہویں صدی کا پس منظر نہ بھولنا چاہیے۔

جب ہم کہتے ہیں کہ مارکسیت ایک فلسفہ ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا فلسفہ بذات خود کیا شے ہے؟ اس کے جواب میں اس قدر اختلاف رائے ہے کہ شاید ہی دو فلسفی متفق ہوں لیکن اگر ہم فلسفہ کی تاریخ پر غور کریں تو ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ کائنات کی مادی تشریح کا نام فلسفہ ہے اگر ہم قدیم ترین فلسفہ کا مطالعہ کریں تو کیا مشرق اور کیا مغرب ہم یہی پائیں گے کہ اس کی بنیاد عقلیت پر تھی وہ انسان کے ماحول اور اس کے تعلقات کا تجزیہ کرنا چاہتی تھی لیکن علوم کی کمی اور عقول کی تنگی کے باعث قدیم انسان کی یہ کوشش رائیگاں گئی آج کل یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مذہب انسان میں فطرتاً موجود ہے اور اعتقاد ایک لابدی امر ہے لیکن انسان کی قدیم تاریخ اس کی شاہد ہے کہ انسان کی فطرت میں اعتقاد نہ تھا اس کو اسباب و علل معلوم کرنے کا شوق تھا اور وہ فطرتاً غیر مقلد تھا اعتقاد کا قیام انسانی ذہن میں اس وقت ہوا جب وہ تنگ نظری اور کم علمی کی وجہ سے کائنات کا تجزیہ نہ کر سکا لیکن ناکامی کا اعتراف اس کی غیرت کے خلاف تھا چنانچہ اس نے اپنی اس نام نہاد ناکامی کو مفروضات کے سلسلے سے وابستہ کر دیا۔

سائنسی طریقۂ فکر کے سبب مارکسیت ظہور میں آیا "تخیل" کے یہ معنی نہیں کہ کسی شے کو فرض کر لیا جائے۔ اگر کسی شے کی جستجو کے لیے مفروضات کی ضرورت ہے تو وہ جستجو زیادہ قابل قدر نہیں ہو سکتی اور نہ اس کے نتائج محکم ہوں گے سائنسداں مفروضات اسی وقت مانے گا جب وہ اس کو تجرباتی جستجو

کی کسوٹی پر پرکھ لے زمانہ جدید کے سائنسی خیالات نے کلاسیکی فلسفہ کو ختم کر دیا جو ہزار بارہ سو سال سے یورپ پر چھایا ہوا تھا۔ اس کے باوجود بھی سائنسی خیالات اور عقلیت پر اسی وقت پورا پورا بھروسہ کیا جائے گا جب ان کو تجربہ کی بنا پر آزمالیا جائے بعض سائنسی مفکر بھی مفروضات اور مابعد الطبیعیات کے چکر میں مبتلا ہو جاتے ہیں کیونکہ کائنات کے تجزیہ میں علوم اور سائنسی آلات کی کمی کی وجہ سے انھیں اب تک ناکامی ہو رہی ہے مارکس سے قبل جدید فلسفہ اسی الجھاوے میں پڑا تھا مفکرین پرانے مفروضات ترک کر کے نئے نئے مفروضات کے چکروں میں پھنس جاتے تھے مثال کے طور کانٹ کو لے لیجئے اس کے فلسفہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ حد درجہ کا مسترد کن تھا لیکن لطف یہ کہ پرانے مابعد الطبیعیاتی عقاید مسترد کر کے اس نے نئے ایجاد کر دیے۔

مارکس نے قدیم فلسفہ کو ختم کر دیا اس نے کہا کہ خیالات حقیقت ہیں قدیم فلسفی خیالات کی حقیقت سے انکار کرتے تھے۔ مارکس پہلا مادی تھا جس نے خیالات میں داخلی حقیقت کو دریافت کیا اس نے کہا جب ایک بار بھی خیالات پیدا ہو جائیں اور انسانی ذہن میں ان کا تسلسل قائم ہو جائے تو وہ اتنے ہی اصل ہوں گے جیسے کوئی بھی طبعی شے چنانچہ اس کے مطابق "خیالات" طبعی اور مادی ہوتے ہیں ایک اور سوال تھا جس کا جواب مارکس نے دیا "مادہ یا خیال" پہلے کس کا وجود تھا؟ اس کا تعلق انسانی خیالات اور ارتقا سے ہے ہیگل سے مطابق نوع انسان کی تاریخ فلسفہ کی تاریخ ہے چنانچہ اس کے بموجب خیال ہمیشہ سے قائم تھا اور مادہ ان ہی خیالات کا ایک سلسلہ تھا یا بالفاظ دیگر ایک وسیلہ لیکن مارکس نے اس سے اختلاف کیا اس نے یہ سوال اٹھایا کہ "خیالات وجود ہی میں کیونکر آئے؟ اس نے کہا کہ اگر بقول ہیگل نوع انسانی کی تاریخ فلسفہ کی تاریخ ہے تو اس کا دار خیال میں مضمر ہوگا جو فلسفہ کا ایک ذریعہ ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ جوں ہی "خیال" پیدا ہو جائے گا انسانی کردار اور ارتقا بھی اسی خیال کے زیر اثر رہیں گے جس کے معنی یہ ہوئے کہ انسان ایک خیالی جال میں پھنسا رہے گا اور اس کی تمام حرکات اور عادات، کردار اور ارتقا سب قائم شدہ خیال کے ماتحت ہوں گے پھر انسان کبھی بھی خیال کی جبریت سے باہر نہیں آسکتا لیکن تاریخ میں ایسا نہیں

ہوا۔ ان خیالات کی جبریت سے انسان ہمیشہ جدوجہد کرتا رہا ہے دنیا کا ارتقا ہی اس جبریت سے گریز کے باعث ہوا ہیگل نے تشفی بخش جواب نہیں دیا اور نہ اس نے یہ بتلایا کہ خیال پیدا کیونکر ہوا۔

سائنسی علوم مثلاً بشریات اور علم آثار قدیمہ کے ذریعہ مارکس نے سماج کی ابتدا کی جستجو شروع کی اور وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ انسان کے خیالات اس کے زمانہ کے طریق پیداوار کے مطابق قایم ہوتے ہیں معاش کی جستجو میں انسان جو طریقہ اختیار کرتا ہے وہ اس کے خیالات کی بھی عکس کشی کرتے ہیں یعنی یہ کہ مادہ پہلے اور خیال بعد میں۔ اس نتیجے نے مسایل زندگی کی بہت سی پیچیدہ گتھیوں کو سلجھا دیا یہ صحیح ہے کہ بہت سے موجودہ فلسفی اور سائنسداں مارکس کی اس تشریح کے قائل نہیں ہیں لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ انسان کے خیالات اس کے ماحول کا آئینہ ہیں اس کے ثبوت میں نہ صرف تاریخ پیش کی جا سکتی ہے بلکہ ہر زمانہ کا سماجی ماحول بھی ہم دیکھتے ہیں کہ بیسویں صدی میں بھی بعض قومیں قدیم تہذیب کو سینے سے لگائے ہیں جبکہ ان کی ہمسایہ قومیں تہذیب نو کا گہوارہ ہیں اگر ایک قوم میں جاگیری نظام موجود ہے تو دوسری میں سرمایہ داری اور تیسری میں اشتراکی۔ مارکس کی اس تحقیق کے بعد فلسفہ کے بہت سے مسائل حل ہو گئے اور انسان پہلی بار ایک خیالی عالم کے بجائے تاریخ کے اصلی رنگ روپ میں نظر آیا وہ اپنی ماہیت سے واقف ہوا۔ اس نتیجہ پر پہنچنے کے بعد مارکس نے فلسفہ کی بالکل نئی تعریف کی اس کا قول ہے کہ فلسفہ دنیا کی تشریح ہی نہیں کرتا ہے بلکہ اس کو بدل بھی سکتا ہے۔ مارکس سے قبل ہر فلسفی نے دنیا کو جوں کا توں مان لیا اور یہ سوال نہیں اٹھایا کہ یہ چیزیں کیسے پیدا ہوئیں اور اپنی موجودہ شکل میں کیونکر آئیں جس شکل میں کائنات ان کے سامنے موجود تھی اور جو جو حرکتیں اشیا میں ہوتی رہتی تھیں انھوں نے ان کو تسلیم کر لیا اور ان حرکتوں اور عمل کی تبدیلیوں ہی پر تجربے کرتے رہے کسی نے بھی اس عمل کی وجہ دریافت نہ کی وہ یہی سمجھتے رہے کہ اشیاء کے عقب میں کوئی پوشیدہ قوت موجود ہے جو اپنے اشاروں سے دنیا میں تبدیلیاں کرتی رہتی ہے ہر مشاہدہ کی جڑ کسی خیالی بنیاد پر قایم تھی۔ مارکس نے ان تصورات کو مسترد کر دیا بقول اس کے

انسان کائنات کی تشریح کر سکتا ہے کیونکہ کائنات کے بنانے میں اس کا ہاتھ ہے۔

فلسفہ کا کام دنیا کی تشریح کرنا ہی نہیں بلکہ اس کو تبدیل بھی کر دینا ہے اگر یہ مان لیا جائے کہ انسان دنیا بنا سکتا ہے تو ہم کو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ ہمارے پیشرو اور قدماء نے اس دنیا کو بنایا تھا جس میں ہم رہتے ہیں یہ نظریہ مذہبی خیالات و افکار کی جڑ کاٹ دیتا ہے اور اعتقاد کو کالعدم کر دیتا ہے مارکس سے قبل تصوراتی فلسفہ نے مذہبی خیالات رد کر کے تقدیریت قائم کر رکھی تھی جس کے بموجب انسان اپنے ماحول کا شکار تھا نہ اس کو اپنے ماحول پر قدرت تھی اور نہ وہ اس کو بدل ہی سکتا تھا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ انسان ایک بہت بڑے خیالی جیل خانے میں بند ہے جس میں ہر کام کسی غیر فطری قوت کے اشاروں پر ہوتا ہے اور بے چارہ انسان کٹھ پتلی کی طرح ناچتا رہتا ہے مارکس نے اس کہنہ خیالی کو ختم کرنے کی کوشش کی سائنسی علوم سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ انسان کے خیالات، اعتقادات، کردار اور ارتقا سب زندگی کے ماحول سے تشکیل پاتے ہیں لیکن ان کے ساتھ ساتھ انسان اس ماحول پر ردعمل کرتا ہے اور ان کو اپنے موافق بناتا ہے اس کے حرکات اس کے ماحول سے اس قدر وابستہ ہیں جس قدر اس کا وجود چنانچہ وہ اپنے ماحول ہی کا بنانے والا نہیں ہے بلکہ تاریخ کا بنانے والا بھی ہے۔

تاریخ کی مادی تشریح کے ذریعہ مارکس نے انسانی ارتقا کی تاریخ از سر نو لکھی اس سے پہلے تاریخ چند غیر معتبر واقعات کا مجموعہ تھی لوگوں کو تاریخی واقعات پر اتنا ہی ایمان تھا جیسے خدا پر یا مذہب پر کبھی ان واقعات کی چھان بین نہیں کی گئی اکثر سینہ بہ سینہ صحیح یا غلط واقعات چلے آتے تھے لیکن کوئی ان پر اعتراض نہیں کرتا تھا چونکہ کوئی مورخ ایک واقعہ کو لکھ گیا ہے اس لئے اس پر ایمان رکھنا ان کا فرض ہو جاتا تھا تمام مذہبی رزمیہ نظمیں اس کے ثبوت میں موجود ہیں مارکس نے تاریخ کو سائنس کا رتبہ دیا جس طرح سے کہ طبعی دنیا کا کوئی امر بغیر سبب کے رونما نہیں ہو سکتا اسی طرح تاریخی واقعات بھی گزشتہ واقعات کے مرہون منت ہیں۔ تاریخ کے اس بنیادی اصول پر تہذیب و تمدن کا نشو و نما ہوا اور انسانی ارتقائی منازل پر پہنچا لیکن عمل اور ردعمل کے بغیر انسان ہرگز ارتقائی منازل پر نہیں پہنچ سکتا اس لئے جب ایک نظام قائم کیا تو اس میں یہ بھی اہلیت تھی کہ وہ اس نظام کو تبدیل بھی

کرسکے مثلاً اس نے جب جاگیری نظام کی میا وڈالی تو اسی کو اکھاڑ بھی پھینکا یہ ہے جدلیات کا اصول
جس کو مارکس نے دنیا کے سامنے پیش کیا وہ کہتا ہے کہ ہر شے میں اس کے عمل اور ردعمل کی قوتیں موجود
رہتی ہیں۔

مارکس نے اپنے عہد کے سرمایہ داری نظام کو جدلیاتی کسوٹی پر پرکھا اس نے ثابت کیا کہ
اس عہد کا نظام تمدن، آرٹ اور انسانی کردار سب ہی سرمایہ داری طریقۂ پیداوار کا آئینہ ہیں
اس عہد سے قبل انسانی ذہنیت خیالات، علوم و فنون اور انسانی قدریں سب ہی جاگیری سماج کے
محور پر گھومتی تھیں لیکن جس وقت جاگیری سماج کے نقائص عیاں ہو گئے۔ پوشیدہ جراثیم ابھر آئے
اور کمزور نظام اپنی افادیت کھو چکا تو سرمایہ داری نے اس کو ایک ہی دھکے میں گرا دیا اور روز افزوں
انسانی ضروریات کے مطابق ایک نیا نظام قایم کیا لیکن سرمایہ داری نظام میں بھی اس کے ردعمل کی
قوت پوشیدہ تھی جب تک یہ نظام بنی نوع انسان کی ترقی کی شاہراہ بنا رہا زیادہ سے زیادہ لوگ
اس پر گامزن رہے لیکن جب اس شاہراہ کی ملکیت سمٹ کر صرف پانچ فیصدی لوگوں کے ہاتھوں میں
آگئی تو یہ نظام بھی تاریخ کی چکی میں پیس ڈالا گیا اور اشتراکیت کا قیام ہوا مارکسیت کے بموجب اشتراکیت
بھی انسانی ترقی کی آخری منزل نہیں ہے یہاں ایک غلط فہمی کے ازالہ کی سخت ضرورت ہے بہت سے
اشتراکی اور مارکس کی کتابوں کو طوطے کی طرح رٹنے والے حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ مارکسیت کے معنی
ہیں ایک اشتراکی نظام جس میں اشیا کی ذاتی ملکیت ختم کر کے اجتماعی ملکیت قایم کر دی جائے
لیکن ایسے حضرات کنوئیں کے مینڈک کی طرح مارکسیت کو روٹی اور کپڑے ہی کے سوال پر ختم
کر دینا چاہتے ہیں مارکسیت کا دائرہ بہت وسیع ہے وہ توہم پرستی اور رہبر و پرستی، اعتقاد، تنگ نظری
قومیت، استبدادیت اور ریاست کا قاطع ہے وہ محض ایک اقتصادی یا سیاسی اصول ہی نہیں
ہے اس کی ہمہ گیری میں زندگی کا ہر پہلو اور معاشرت کا ہر شعبہ، کائنات کی تمام اشیا، تاریخ، سائنس
اور علوم و فنون سب ہی داخل ہیں لیکن مارکسیت چند سخت اصولوں کا مجموعہ نہیں ہے نئے نئے انکشافات
کے بعد سائنسی تجربات ہونے پر، تجرباتی آلات کی ترقی سے اور علوم و فنون کی افزایش کے بعد

ان میں خطوط تاریخی ترتیب سے جمع کیے گئے ہیں اور خط کی تاریخ حتی الامکان درج کی گئی ہے کتاب ٹائپ میں چھپی ہے۔ غالب کے نادر خطوط لکھنؤ سے بھی شائع ہوئے ہیں۔

شاعری کے بعد اگر ادب کی صنف میں ترقی ہوئی ہے تو افسانوں میں۔ اگرچہ اب ناول بھی لکھے جاتے ہیں مگر پریم چند کے بعد ابھی تک کوئی اچھا ناولسٹ پیدا نہیں ہوا جو دو چار افسانہ نویس ناول لکھتے ہیں ان کی کوششیں سرسبز نہیں ہو پاتیں مگر حال ہی میں افسانہ نگاری میں اتنا اضافہ ہوا ہے کہ طویل افسانے بھی لکھے جا رہے ہیں۔ افسانہ نگاری نے پریم چند کے بعد بھی کافی ترقی کی ہے اگرچہ پریم چند کے پایہ کا افسانہ نویس کوئی نہیں کہا جا سکتا مگر پریم چند سے اچھے افسانے بہت سے لوگوں نے لکھے ہیں۔ ان افسانوں میں جو رنگ سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ ترقی پسندی ہے کچھ لوگ اس کے نام سے چڑتے ہیں۔ کچھ لوگوں کو اس کا مفہوم پوری طرح معلوم نہیں کچھ اس کا نام سنتے ہی اشتراکیت کا تصور کرنے لگتے ہیں مگر درحقیقت گزشتہ چھ سات سال سے ہمارے افسانوں میں یہ نیا رنگ ملتا ضرور ہے اور خود پریم چند آخر دور میں اس سے ہم آہنگ معلوم ہوتے ہیں۔ ترقی پسندی یا نئے ادب پر تبصرہ کرنے کا یہ موقع نہیں مگر اس کے اثر سے ہمارے افسانوں میں محض مشاہدے کے علاوہ حقیقت پسندی، کائنات کا مطالعہ، نفسیاتی تجزیہ، سماجی اثرات اور مختلف طبقوں خصوصاً نچلے طبقہ کی زندگی کا عکس آگیا ہے چونکہ اس کو پڑھ کر سکون نہیں ہوتا بلکہ طبیعت میں ایک خلش پیدا ہو جاتی ہے۔ اس لیے بعض سمجھتے ہیں کہ یہ افسانے نہیں وعظ ہیں چونکہ اس میں نفسیاتی تجزیہ کی پرخلوص کوشش ملتی ہے اس لیے لوگ اسے عریاں سمجھتے ہیں۔ چونکہ اس میں مزدوروں اور قلیوں کی زندگی کی تصویریں بھی ملتی ہیں اس لیے لوگ اسے اشتراکی پروپیگنڈا کہتے ہیں مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ افسانوں میں یہ چیز یونہی نہیں آئی، حالات کے تقاضے سے آئی ہے اور بعض لوگ چاہے کتنی ہی ناک بھوں چڑھائیں رہنے کے لیے آئی ہے اس میں خامی بھی ہے کہیں کہیں تصویر مکمل نہیں ہے کہیں عریاں نگاری محض حسی جذبات کی تسکین کے لیے ہے مگر بحیثیت مجموعی یہ صحیح نہیں۔ ہمارے افسانے لکھنے والے بیشتر نوجوان ہیں ابھی ان کی ترقی کی بہت امیدیں ہیں ان میں راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، علی عباس حسینی، عصمت چغتائی، حیات اللہ انصاری، اختر انصاری اچھے لکھنے والے ہیں ان کا کام ابھی شروع ہوا ہے نئے زاویے نئے افسانوں نظموں کا ایک

مارکسیت میں ترمیم ہوسکتی ہے مارکس نے نہ تو پیغمبری کا دعوے کیا اور نہ اس نے اپنی پیشین گوئیوں کو اٹل ہی سمجھا تاریخ کے مطالعہ سماج کے حالات اور سائنسی خیالات کی روشنی میں مظاہر قدرت کی تحقیق و تدقیق کرنے کے بعد مارکس اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ تاریخ میں ہم آہنگی ہے اور دنیا میں تبدیلیاں ایک خاص اصول پر ہوتی ہیں چنانچہ اس نے جو پیشین گوئی کی وہ یہ تھی کہ آئندہ زمانے میں سرمایہ داری کے شکست کھانے اور اشتراکیت کے قائم ہونے کا بہت امکان ہے اس نے یہ کبھی نہیں کہا کہ یہ تبدیلی حتماً اسی طرح واقع ہوگی جیسی وہ سمجھتا ہے خاص فاسیزم کے متعلق مارکس کچھ نہ کہہ سکا کیونکہ انیسویں صدی سرمایہ داری میں اس کا امکان نہ تھا۔ بیسویں صدی میں سرمایہ دار نے تاریخ اور سائنس سے بہت کچھ سیکھا اور اپنی ساکھ کچھ دن اور قائم رکھنے کی غرض سے فاسیزم کو عروج دیا۔ ایک دوسری مثال لیجیے۔ مارکس کے زمانہ میں علم طبیعیات ہنوز ابتدائی منازل میں تھا اس وقت یہ خیال کیا جاتا تھا کہ کائنات میں مادہ بہت سے طبعی یا مادی ذروں کی شکل میں موجود ہے مارکس کا بھی یہی خیال تھا لیکن زمانہ حال کی تحقیقات نے اس نظریہ کو مسترد کر دیا ہے جدید سائنس کے مطابق کائنات میں مادہ برقیوں اور پروٹون کی شکل میں موجود ہے چنانچہ اگر ہم مارکس کے کہے پر سختی سے پابند رہیں تو ہم غیر سائنسی ہو جائیں گے جو مارکسیت کے منافی ہے۔

فرض کیا جائے ایک مارکسی خیالات کا انسان ایسے سماج میں منتقل کر دیا جاتا جس میں ہنوز قدیم نظام قائم ہے یہاں مارکسیت کا اطلاق ہو سکتا ہے اور وہ شخص اپنے مارکسی خیالات اور تشریحات رکھ سکتا ہے۔ ایسا شخص غیر فرقہ وارانہ سماج کا نظریہ رکھتے ہوئے اپنا ماحول بنائے گا اور کوشش کریگا کہ سماج جلد سے جلد درمیانی منازل طے کر کے اشتمالیت قبول کرلے خود مارکس نے کمیونسٹ مینفسٹو میں کہا ہے کہ سماج کی نشو و نما بتلاتی ہے کہ سرمایہ داری جلد ختم ہو جائے گی اور دنیا اشتمالیت کی طرف مائل ہوگی لیکن اپنے زمانے کی سیاسی تحریکوں میں مارکس نے ہمیشہ جاگیریت کے خلاف سرمایہ داری کا ساتھ دیا اور کوشش کی کہ جلد سے جلد جاگیریت ختم ہو کر ایک بہتر نظام قائم ہو وہ مانتا تھا کہ سرمایہ داری نظام بھی نوع انسان کے مسائل حل نہیں کر سکتا لیکن جاگیریت کے مقابلہ میں

وہ ضرور انقلابی اور مفید تھا

مارکس نے یورپ کی سرمایہ داری حکومتوں کا مطالعہ کرکے اشتراکیت کی پیشین گوئی کی تھی لیکن مارکس کے زمانہ میں یورپی قومیں ہندوستان اور چین کے متعلق بہت کم جانتی تھیں چنانچہ یہ کہنا کہ جو کچھ مارکس نے جرمنی، فرانس اور انگلستان کے لیے کہا اور جن جن تبدیلیوں کی پیشین گوئی کی وہ محض ہندوستان اور چین پر بھی صادق آتی ہیں اور ان ملکوں میں بھی سیاسی اور اقتصادی تبدیلیاں بالکل مغربی ممالک کے اصولوں پر ہوں گی سخت نادانی ہے مارکس نے کبھی اپنے قول کو آخری فیصلہ نہیں کہا اس نے یہ بھی نہیں کہا کہ انسانی ترقی اشتمالیت اور غیر فرقہ وارانہ ریاست قایم ہو جانے پہ بند ہو جائے گی۔

مارکسیت اعتقاد نہیں ہے مارکس کے بعد دنیا میں سائنس کو کافی ترقی ہو چکی ہے اور ہمیں چاہیئے کہ مارکس کے ہر قول کو جدید سائنسی تجربات کی روشنی میں دیکھ کر اختیار کریں۔

علی امام ایم اے

برما

پانچ سال پہلے تک ہندوستان کا سب سے بڑا صوبہ اور اب بذات خود ایک ملک یعنی برما یا برہما آسام اور بنگال کے مشرق میں چین کے جنوب اور سیام کے مغرب میں واقع ہے اس کا رقبہ ۲،۳۳،۴۹۲ مربع میل ہے بمبئی جو اب رقبہ کے اعتبار سے ہندوستان کا سب سے بڑا صوبہ ہے پہلے دوسرے نمبر پر تھا کیونکہ اس کا رقبہ ۱،۰۷،۱۱۵ مربع میل ہے اس کے شمال سے جنوب کی طرف پہاڑوں کے سلسلے ہیں اور اسی رخ پر دریا بہتے ہیں اس کا ساحل ہندوستان کے مقابلے میں زیادہ دندانے دار ہے اس لیے یہاں بندرگاہیں اچھی بن سکتی ہیں پہاڑیوں کے درمیان میدانی علاقے ہیں جن میں ہو کر یہاں کے دریا بہہ رہے ہیں برما میں مغرب کی طرف پٹکوئی اور ارکان یوما کے سلسلے ہیں بیچ میں پیگو یوما اور مشرق میں شان اور تناسرم کی پہاڑیاں ہیں شمالی حصہ بالکل پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے جنوب میں کافی چوڑا ڈیلٹا دریاؤں کی لائی ہوئی مٹی سے بن گیا ہے یہاں کے بڑے دریا اراودی، ستانگ سالوین اور چندون ہیں ان میں اراودی سب سے بڑا ہے اور اس میں تقریباً نو سو میل تک چھوٹے چھوٹے جہاز اور اسٹیمر چل سکتے ہیں اراودی کا معاون چندون بھی کشتی رانی کے لیے موزوں ہے عام طور پر یہاں کی زمین پتھریلی ہے البتہ دریاؤں کی وادیاں بہت ہی زرخیز ہیں ملک میں بارش کا اوسط چالیس انچ کے قریب ہے مگر اکیاب کے علاقے میں ۲ انچ، ڈیلٹائی حصے میں ۰۰ انچ اور وسطی حصے میں ۳۰ سے ۴۰ انچ تک بارش ہوتی ہے شمالی اور وسطی میدانوں کے علاقے میں بنگال کی طرح سخت گرمی ہوتی ہے جنوبی میدانوں میں گرمی اور بڑھ جاتی ہے البتہ پہاڑوں پر درجہ حرارت کچھ کم رہتا ہے زرخیز زمین، گرم آب و ہوا، اور کثرت بارش کی وجہ سے یہاں جنگلوں کی بہتات ہے اور سوائے ان میدانی علاقوں کے جہاں جنگل کاٹ کر صاف کر لیے گئے ہیں ہر جگہ جنگل ہی جنگل نظر آتے ہیں جن میں ساگون بہت ہوتا ہے ریلوں، جہازوں اور اسی قسم کے دوسرے اعلیٰ کاموں میں

یہی لکڑی مستعمال کی جاتی ہے یہ لکڑی بڑی پائدار اور مضبوط ہوتی ہے نہ اس میں دیمک لگتی ہے اور نہ اس پر پانی کا اثر ہوتا ہے جنگلوں سے بڑے بڑے لٹھے کاٹ کر ہاتھیوں کی مدد سے دریاؤں میں لاکر ڈال دیے جاتے ہیں جو بہتے بہتے رنگون تک آجاتے ہیں جہاں ان کو چیر کر تختے بنائے جاتے ہیں اور بڑی مقدار میں باہر بھیجے جاتے ہیں جنگل کی دوسری پیداوار میں ربڑ بانس اور ساکھو کی لکڑی ہے شمالی کوہستان میں شہتوت کے درخت کافی ہیں جن پر ریشم کے کیڑے پالے جاتے ہیں ۱۹۳۸-۳۹ء میں یہاں سے تقریباً ۴½ لاکھ ٹن ساگوں حاصل کیا گیا اس کے علاوہ دوسری لکڑیوں کی مقدار ۴ لاکھ ٹن رہی اور لکڑی کے کوئلے کی مقدار ۱۱ لاکھ ٹن تھی

یہاں کی خاص فصل دھان ہے برما کا تقریباً ۱۶ لاکھ ایکڑ رقبہ پانی سے سیراب ہو سکتا ہے اور اس میں ۱۲½ لاکھ ایکڑ کے قریب دھان کی کاشت میں ہے کل رقبہ کاشت کے ۶۹ فی صدی حصہ پر دھان کی کاشت ہوتی ہے دھان صاف کرکے چاول کی شکل میں بڑی مقدار میں باہر بھیجا جاتا ہے دھان کے علاوہ دوسری خاص فصلوں میں کپاس، گنا، تمباکو، مٹر، چائے، جوار اور باجرہ شامل ہیں معدنیات میں مٹی کا تیل بہت اہم ہے دریائے اراودی کے کناروں پر مٹی کے تیل کے چشمے ہیں جہاں سے تیل پائپ اور کشتیوں کے ذریعہ رنگون لاکر صاف کیا جاتا ہے اور یہیں صاف مٹی کا تیل، پیٹرول، موم بتیاں اور دوسری چیزیں تیار ہوتی ہیں ۱۹۳۹ء میں یہاں سے ۲۵۷½ ملین گیلن پیٹرول حاصل کیا گیا تھا ٹین اور ولفرم مرگوئی اور ٹوائے کے اضلاع میں پایا جاتا ہے ولفرم بڑی قیمتی اور کارآمد شے ہے موٹروں ہوائی جہازوں اور دوسری مشینوں میں استعمال کیا جاتا ہے ۱۹۳۹ء میں ۴۴۲۴ ٹن ولفرم یہاں سے نکالی گئی تھی۔ ان کے علاوہ سونا چاندی، سیسہ جست اور سرخ پتھر بھی یہاں پایا جاتا ہے۔

رنگون برما کا پایہ تخت ہے اور دریائے اراودی کی ایک شاخ پر واقع ہے یہ بڑا اچھا بندرگاہ ہے یہاں تیل صاف کرنے، لکڑی چیرنے اور سگریٹ بنانے کے متعدد کارخانے ہیں یہاں ایک یونیورسٹی اور ہائی کورٹ ہے یہاں کا سونے کا گوڈا بہت مشہور ہے ۱۹۳۱ء میں چھاؤنی اور شہر کی

آبادی چار لاکھ سے کچھ زیادہ تھی اس میں بندرگاہ کا علاقہ شامل نہیں تھا اب اس پر دشمن کا قبضہ ہوگیا ہے اور فوجوں نے اس کو خالی کرتے وقت تباہ کن پالیسی کے تحت سارے شہر کی کارآمد چیزوں کو تباہ کر دیا ہے برما کے دوسرے ساحلی بندرگاہ مولمین (۶۵،۵۰۶) بسین (۴۵،۶۶۲) آکیاب (۳۸،۰۹۴) ڈاوے (۲۹،۰۱۸) اور مرگوئی (۲۰،۴۰۵) ہیں اندرونی بندرگاہوں میں پروم (۲۰،۲۹۵) ہنرادہ (۲۸،۵۴۲) اور مانڈلے (۱۴۷،۹۳۲) قابل ذکر ہیں رنگون کے بعد مانڈلے ہی برما کا بڑا شہر ہے یہ پہلے برما کا صدر مقام بھی تھا یہاں لکڑی پر خوبصورت نقاشی بڑی اچھی کیجاتی ہے یہاں سونے کا ایک گھوڑا بھی ہے۔ بھامو (۷،۸۲۷) ایک چھوٹا سا قصبہ ہے مگر اس کی اہمیت اس سے زیادہ ہے کہ چین سے ایک راستہ اس شہر سے ہوکر گزرتا ہے اور برما اور چین کی اندرونی تجارت اسی راستہ سے ہوتی تھی مگر چین کے ساحلی علاقے نکل جانے کے بعد اس کا سارا سلسلہ بیرونی دنیا سے منقطع ہوگیا اور برما روڈ کی اہمیت بڑھ گئی اب پھر رنگون پر جاپان کا قبضہ ہو جانے سے برما روڈ بیکار ہوگئی ہے یہ دوسری سڑک مانڈلے اور لاشیو سے ہوتی ہوئی گزرتی ہے اور چنکنگ کو ملاتی ہے اور اسی لیے چین کو آسام کی جانب سے ملانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ مے میو (۱۷،۰۱۲) موسم گرما میں حکومت کا صدر مقام رہتا ہے۔ تیل کے چشموں کے علاقوں میں چاک (۱۲،۸۲۰) اور ینیاں یانگ (۱۱،۰۰۹) اور چاندی اور سیسہ کی کانوں کے قریب نمٹو یا گھمی (۱۲،۷۰۸) مشہور مقامات ہیں رنگون مانڈلے، مے میو اور منگلاڈن میں فوجی چھاؤنیاں ہیں۔ یہاں ۳۱ بڑے شہر اور قصبے ہیں برما میں ۲۰۵۰ میل لانبی ریل کی لائن ہے پہلے یہ ریل ایک کمپنی کی ملکیت تھی مگر ۱۹۲۹ء میں اس کو حکومت ہند نے خرید لیا اور اب یہ حکومت برما کی ملکیت ہے۔ برما میں ۱۰۷۷ کارخانے ہیں جن میں سے آدھے دھان صاف کرنے والے ہیں ½ کے قریب لکڑی چیرنے والے اور بقیہ مختلف قسم کے ہیں ۴۱-۱۹۴۰ء میں مجوزہ بحث کے مطابق یہاں کی آمدنی مجموعی ۸۲ کروڑ ۷۷ لاکھ روپیہ تھی آمدنی کی بڑی مدیں کروڑگیری چنگی، مالگذاری، جنگلات اور محاصل آمدنی ہیں بیکاری کے معاملے میں برما اب تک ہندوستان سے متعلق ہے۔ اور ریزرو بنک آف انڈیا کا ایک مقامی دفتر رنگون میں ہے۔ اس کے علاوہ

اکثر شہروں میں امپیریل بنک کی شاخیں بھی موجود ہیں

برما ایک پرانا ملک ہے اور یہاں وقتاً فوقتاً مختلف قومیں اور خاندان حکومت کرتے رہے ہیں گیارہویں اور تیرہویں صدی کے درمیان برما کی حکومت اپنے پورے عروج پر تھی اور اس کی نشانیاں آج بھی پاگن کے علاقے میں موجود ہیں یہ شہر اور یہ سلطنت قبلی خان کے عہد میں ایک چینی حملے سے ختم ہو گئی اس کے بعد کوئی طاقتور سلطنت نہ قائم ہو سکی اور وسطی برما کا بڑا حصہ شان خاندان کے زیر اقتدار آ گیا سولہویں صدی میں پھر ایک برمی شہزادے نے عروج حاصل کرنا شروع کیا اس کا دارالخلافہ پیگو تھا مگر کچھ عرصے کے بعد ایک نئے خاندان نے آوا میں قوت حاصل کر کے پیگو کو بھی اپنا ماتحت کر لیا اٹھارہویں صدی میں یہاں کی مختلف ریاستوں میں اکثر لڑائیاں ہوتی رہیں جن میں انگریز اور فرانسیسی بھی ان کے ساتھ تھے انگریزوں نے ہمیشہ برمیوں کا ساتھ دیا اور فرانسیسی پیگو والوں کے ساتھ رہے۔

۱۶۱۲ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے برما کے بعض مقامات مثلاً سیرم، پروم اور آوا میں اپنے تجارتی کارخانے قائم کیے اور کمپنی کے گماشتے اور ایجنٹ یہاں رہا کرتے تھے ۱۷۹۵ء میں برمی فوج کے پانچ ہزار سپاہیوں نے چٹاگانگ کے انگریزی علاقے پر حملہ کر دیا اور وجہ یہ بتائی کہ وہ ان ڈاکوؤں کی تلاش میں آئے ہیں جنہوں نے برما سے بھاگ کر یہاں پناہ لی ہے اس وقت تو خیر بات رفع دفع ہو گئی مگر ۱۸۲۲ء میں برمی باشندوں نے آسام کی ایک ریاست پر حملہ کر دیا یہ رئیس انگریزوں کا دوست تھا اس بار ۱۸۲۴ء میں رنگون پر حملہ کیا گیا اور یہ بہت آسانی سے لے لیا گیا اس کے بعد کچھ اور علاقہ فتح کر لیا گیا مگر دو سال تک لڑائیوں کا سلسلہ جاری رہا آخر ۱۸۲۶ء میں صلح ہو گئی اور تناسرم، ارکان، مرگوی اور ٹوائے وغیرہ کا علاقہ انگریزوں کے حوالے کرنا پڑا اور ایک کروڑ روپیہ بطور تاوان ادا کرنے کا وعدہ کیا گیا جس کا ایک چوتھائی حصہ اسی وقت داخل کیا گیا اس کے بعد کچھ عرصہ تک حالات اچھے رہے مگر بعد میں تعلقات خراب ہونے لگے انگریزی سفیر کو بھی برمی پایۂ تخت سے رنگون آنا پڑا اور پھر رنگون بھی چھوڑنا پڑا برمیوں نے انگریزی جہازوں اور ملاحوں پر حملے شروع کیے ۱۸۵۲ء میں برما کی دوسری لڑائی ہوئی اور جنوبی برما کا سارا علاقہ انگریزوں کو مل گیا البتہ شمال میں ایک

آزاد برمی ریاست قایم رہی جس کا حاکم تھی ابا تھا مگر اس کے مظالم سے تنگ آکر ۱۸۸۵ء میں اس کے خلاف جنگ کی گئی اور اس کے دارالسلطنت مانڈلے پر قبضہ کر لیا گیا۔ اب گویا پورا برما انگریزوں کی عملداری میں آگیا۔ دوسرے سال ریاستہائے شان کو بھی برما میں شامل کر لیا گیا۔ یہ ریاستیں کئی چھوٹی بڑی ریاستوں کا مجموعہ ہیں اور ان کے مقامی رئیس ہیں جو اندرونی معاملات میں آزاد ہیں ۱۹۲۲ء میں ان سب کا ایک فیڈریشن قایم کر دیا گیا ہے اور ایک کونسل عام انتظامات کی ذمہ دار ہے جس کے ممبر بڑے رئیس بذات خود اور چھوٹے رئیسوں کے نمایندے ہیں۔ چیف کمشنر ان کا نگراں ہے۔ ان کے جنوب میں کرینی کی ریاستیں ہیں جو پہلے پانچ تھیں مگر اب تین رہ گئی ہیں ان سے بھی ایک متحدہ وفاق بنانے کے لیے کہا گیا مگر یہ اس کے لیے تیار نہیں ہوئے یہاں پر برطانوی برما کا کوئی قانون نافذ نہیں ہے ان کے اپنے قوانین بالکل الگ ہیں البتہ ایک پولیٹیکل ایجنٹ یہاں رہتا ہے۔ ۱۸۶۲ء میں برما کو چیف کمشنری کا درجہ دیا گیا اور ۱۸۹۷ء میں یہاں لفٹنٹ گورنر مقرر ہونے لگا اور ۱۹۲۳ء میں اس کو پورے صوبے داری اختیارات مل گئے۔

۱۹۱۹ء میں جب ہندوستان کو اصلاحات دی گئیں تو اس میں جان بوجھ کر برما کو شامل نہیں کیا گیا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ برما اپنی مقامی خصوصیات کے لحاظ سے ہندوستان سے کچھ زیادہ مشابہت نہیں رکھتا۔ اس لیے یہاں کے مسائل پر خاص طور سے علیحدہ غور کرنے کی ضرورت تھی چنانچہ اس کام کے لیے برما ریفارم کمیٹی قایم ہوئی جس نے ۱۹۲۲ء میں سفارش کی کہ برما کو وہ تمام اختیارات دیے جائیں جو ہندوستانی صوبوں کو ۱۹۱۹ء میں حاصل ہو چکے ہیں چنانچہ ۱۹۲۳ء سے یہ پورے اختیارات والا ایک صوبہ بنا دیا گیا اس کے بعد جب ہندوستان کو مزید اصلاحات دینے کے لیے کانفرنسیں اور کمیٹیاں ہوئیں تو برما کی مقامی خصوصیات کی بنا پر اس کو ہندوستان سے علیحدہ کر دینے کا خیال ظاہر کیا گیا اور برطانیہ نے بھی اس کو تسلیم کر لیا اور ۱۹۳۵ء کے قانون میں برما کو ہندوستان میں شامل نہیں کیا گیا بلکہ اس کو ہندوستان کے مماثل اصلاحات الگ دی گئیں چنانچہ جب یکم اپریل ۱۹۳۷ء کو اس نئے قانون کا نفاذ ہوا تو برما ہندوستان سے الگ ہو گیا۔ اب

یہاں حکومت برطانیہ کا نمائندہ گورنر ہے جس کا تعلق براہ راست سکریٹری آف اسٹیٹ سے ہے یہاں مقننہ (قانون ساز مجلس) ہیں ایک سینٹ کہلاتی ہے جس کے ۳۶ ارکان ہیں جن میں سے آدھے منتخبہ اور آدھے نامزد شدہ ہیں۔ دوسری دارالعوام ہے جس کے ۱۳۲ ممبر ہیں جو سب منتخب ہوتے ہیں ہندستانی مفادات کی دیکھ بھال کے لیے یہاں ایک ہندوستانی ایجنٹ رہتا ہے۔

یوں تو برما دو بڑے حصوں میں منقسم ہے ایک شمالی اور دوسرا جنوبی لیکن خاص برما اس حصے کو کہا جاتا ہے جو پہلے وسط برما کہلاتا تھا یہ تقریباً آٹھ انتظامی اضلاع پر مشتمل ہے مانڈلے، پرُوم، پاگن اور آوا جیسے شہر اسی خطے میں ہیں برما کی اصل تہذیب و تمدن کا گہوارہ یہی خطہ رہا ہے دراصل برمی قوم مختلف قوموں اور قبیلوں کے اتحاد سے بنی ہے مثلاً نسلی اعتبار سے ان کا بڑا حصہ منگولی نسل سے تعلق رکھتا ہے ان کی زبان تبت چینی حلقہ سے متعلق ہے اور خط و خال میں یہ منگولی نسل سے زیادہ قریب ہیں گویا مختلف قومیں اور قبیلے پہاڑوں پہاڑیوں اور تنگ دروں سے ہوتے ہوئے خاص برما میں آکر آباد ہوئے اور متحد ہو کر ایک قوم بن گئے اور یہ قوم عرصے تک ہندوستان اور چین کے درمیان ایک درمیانی طاقتور قوم کی طرح زندگی گزارتی رہی اور اس لیے یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے کہ جب ان میں نسلی اور قومی عصبیت کے جذبات پیدا ہونا شروع ہوئے تو ان کا آغاز بھی یہیں سے ہوا جنھوں نے بڑھتے بڑھتے خطرناک صورت اختیار کر لی جس کا اظہار علانیہ طور پر ۱۹۳۰ء میں ہوا قومی خصوصیات کی وجہ سے دوسری قوموں سے عداوت تو پہلے ہی پیدا ہو چکی تھی مگر ابتدا میں یہ تعمیری کاموں تک محدود رہی مثلاً دیسی مال خریدنے کا شوق اور دیسی مصنوعات کی سرپرستی کی گئی گر بعد میں ہندستانیوں اور چینیوں کے خلاف ایک عام جذبۂ نفرت پیدا ہونے لگا اور اس خاص زمانے میں ان جذبات کے پیدا ہونے کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ اس وقت برما میں بڑی کساد بازاری پھیلی ہوئی تھی اور معاشی ابتری نے حالات بہت نازک کر دیے تھے چاول جو یہاں کی عام پیداوار ہے اس کی قیمت برابر گر رہی تھی مثلاً ۱۹۲۴ء میں دھان کی ایک کشتی کی قیمت ۱۹۳ روپیہ تھی تو ۱۹۳۰ء میں ۱۲۸ روپیہ ہو گئی اور ۱۹۳۱ء میں صرف ۷۷ روپیہ رہ گئی۔ اس کی وجہ سے بہت سے کاشتکار تباہ ہو گئے

۱۹۳۰ء میں جملہ تعلیمی اداروں اور ان کے طلبا کی تعداد حسب ذیل تھی۔

ادارے	تعداد	طالب علم	طالبات
اعلیٰ ادارے	۳	۱۰،۴۱۴	۱۶۸
دوسرے درجے کے ادارے	۱،۳۶۴	۱،۴۶،۰۴۷	۷۴،۸۴۹
پرائمری مدرسے	۴،۹۹۵	۱،۶۵،۲۴۹	۱،۳۶،۵۵۰
کل سرکاری مدرسے	۷،۵۶۷	۳،۲۱،۹۶۳	۲،۱۳،۴۳۸
غیر سرکاری مدرسے	۱۷،۹۵۷	۱،۸۶،۵۷۷	۶،۲۸۹
کل مدرسے	۲۵،۵۲۴	۵،۱۸،۵۴۰	۲،۱۹،۷۲۷

۱۹۳۱ء کی مردم شماری کے لحاظ سے کل خواندہ اشخاص کی تعداد ۴۶½ لاکھ تھی جس میں ۱۰ لاکھ عورتیں شامل تھیں خواندگی کے لحاظ سے اس وقت برما ہندوستان کی تمام ریاستوں اور صوبوں سے آگے بڑھا ہوا تھا ذیل کے اعداد سے یہ فرق بخوبی واضح ہوجائے گا یہ کسی ریاں میں خواندہ اشخاص کی تعداد کا اوسطی ہزار ہے

مقام	خواندہ اشخاص	مرد	عورت
برما	۳۶۸	۵۶۰	۱۶۵
برما (علاوہ ریاستہائے برما)	۳۹۷	۶۰۰	۱۸۲
کوچین	۳۳۷	۴۶۰	۲۲۰
ٹراونکور	۲۸۹	۴۰۸	۱۶۸
بڑودہ	۲۰۹	۳۳۰	۷۹
بنگال	۱۱۰	۱۸۰	۳۲
مدراس	۱۰۸	۱۸۸	۳۰
میسور	۱۰۶	۱۷۴	۳۳

مقام	خواندہ اشخاص	مرد	عورت
بمبئی	۱۰۲	۱۷۶	۲۹
آسام	۹۱	۱۵۲	۲۳
بنگال	۵۹	۹۵	۱۵
یو۔پی	۵۵	۹۴	۱۱

بظاہر یہ ایک عجیب بات معلوم ہوتی ہے کہ برما جیسا وسیع صوبہ کیونکہ اس وقت وہ صوبہ جہاں بہت سے وحشی قبیلے آباد ہوں جس کے اکثر حصے پہاڑی ہوں جہاں ریل اور سڑکیں بہ ہوں جہاں کے اکثر حصوں میں تہذیب و تمدن کی شعاعیں تک نہ پہنچی ہوں وہ خواندگی میں حیثیت رکھتا ہو دراصل اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ یہاں غیر سرکاری مدرسوں کی تعداد بہت ہے اور یہ ان ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ یہاں خواندگی کا اوسط اتنا بڑھا ہوا ہے یہ مدرسے اصل بدھ مت کی چھوٹی چھوٹی خانقاہیں ہیں جن کو "پھونگی گیانگ" کہا جاتا ہے تقریباً ہر گاؤں میں مدرسہ موجود ہے۔ جہاں سر منڈا کر اور پیلا لباس پہن کر ہر بدھی لڑکے کو جانا پڑتا ہے۔ ان مدرسوں میں طریقہ پر لکھنا پڑھنا اور تھوڑی سی ریاضی سکھائی جاتی ہے۔ مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ بدھ مذہب ایسے لڑکے بہت کم ملتے ہیں جو معمولی نوشت و خواند سے واقف نہ ہوں۔

برمیوں کا لباس سادہ ہوتا ہے سر پر ایک ریشمی پگڑی، ایک ڈھیلی سی صدری اور کمر سے لنگی بندھی رہتی ہے جو ٹخنوں تک آتی ہے ان کی عورتوں کا لباس بھی مردوں کی طرح ہوتا ہے البتہ پگڑی نہیں ہوتی اور لنگی کا سرا مرد سامنے کی طرف کرتے ہیں اور یہ ایک جانب لٹکا لیتی ہیں عورتیں ہنس مکھ اور خوش مزاج ہوتی ہیں اور ایک خوش وضع اور خوش قطع برمی خاتون دنیا کی دوسری عورتوں سے کسی طرح پیچھے نہیں ہے برمی عورتیں بڑی حد تک آزادانہ اور کھلی ہوا میں بسر کرتی ہیں۔ وہ اپنے گھر کے معاملات میں تو بالکل خود مختار ہوتی ہیں مگر اپنے شوہروں کے کاروبار میں بھی بڑی حد تک دخیل ہوتی ہیں برما میں روئی اور ریشم کا کاتنا اور بننا اور حرث

جو ہے۔ یہ کرشن چندر نے مرتب کیا ہے یہ انگلستان کے NEW WRITING کے طرز پر نکالا گیا ہے۔ اس سے غالباً نام ہی اٹھتا تو سمجھ میں نہیں آتا مگر نئے ادب کا ایک حیات بخش تصور ضرور ہو جاتا ہے۔ اس میں بہت سے نئے نام ہیں اور یہ نام اچھے بھی ہیں۔ ضرورت ہے کہ ایسے مجموعے تھوڑے تھوڑے وقفے سے برابر نکالے جائیں۔ اس میں مہدی، حیات اللہ انصاری، ورنشو کے افسانے خاص طور پر کامیاب کہے جا سکتے ہیں۔

مغربی افسانوں سے دلچسپی تو جنگ کے بعد سے شروع ہو گئی تھی مگر حال میں ایشیائی افسانوں سے بھی کچھ انس پیدا ہوا ہے ان میں چین کے ادب، وہاں کے ادبی نقطۂ نظر وہاں کی شاعری اور افسانوں پر رسالوں میں مضمون نکلنے لگے ہیں۔ زندہ چین کے نام سے تنا ہی سنے وہاں کے کچھ افسانوں کا ترجمہ کیا ہے اور چین کے خاص ادیبوں کے متعلق نوٹ بھی لکھے ہیں۔ یہ کتاب دراصل بعض چینی ادیبوں کا تعارف ہے۔ اس سے کم از کم یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کو ابھی بہت کچھ چین سے بھی سیکھنا ہے۔

منٹو کے قلم سے امسال دو کتابیں نکلی ہیں منٹو کے افسانے اور آمد ـــ۔ دوسری کتاب چنداں اہم نہیں مگر منٹو کے افسانے میں بعض بہت اچھے افسانے ملتے ہیں ان میں آپ کو بعض جگہ عریانی نظر آئے گی مگر یہاں وہ عریانی نہیں جو جنسی میلان کی غماز ہے بلکہ اس میں فن کار کی باریک بین نظر کا عکس ملتا ہے۔ اسلم کی کتاب خار و گل، صالحہ عابد حسین کا نقش اول، مرزا ادیب کی دنیائے آرزو بھی قابل ذکر کتابیں ہیں۔

اس سال عظیم بیگ چغتائی کا انتقال ہوا ان کی آخری کتاب جو امسال نکلی پھریری ہے۔ چغتائی ادھر کئی سال سے دق کے موذی مرض میں گرفتار تھے مگر ان کے اندر کوئی نامعلوم قوت ان سے برابر کچھ نہ کچھ لکھواتی رہتی تھی پھریری میں کچھ تاریخی اور کچھ مزاحیہ افسانے ہیں ان میں چغتائی کی قوتوں کا شباب نہیں ملتا بلکہ مریض ناتواں کا سنبھالا ہے۔ چغتائی نے بہت کچھ لکھا اور بہت جلد لکھا اس جلدی کی وجہ سے وہ فن کی بلندیاں طے نہ کر سکے۔ مگر ان کا ہنسنا ہنسانا محض تفریحاً نہیں تھا اس کی تہہ میں ایک گہرا اور سنجیدہ مقصد بھی تھا چغتائی بھی ہمارے تمدنی نقادوں میں سے تھے کچھ لوگوں کو چغتائی کی سی عورتیں کہیں ملتی نہیں اس کا جواب صرف یہ ہے کہ انھوں نے عورتیں نہیں دیکھیں۔

مغربی ناولوں اور افسانوں کے ترجمے برابر شائع ہو رہے ہیں دھرتی ماتا کے علاوہ بیٹے بھی [illegible]

گھریلو صنعتوں میں داخل ہیں اور ان میں زیادہ تر عورتیں نمایاں ہیں چھوٹی موٹی تجارت اور بالخصوص اشیائے خوردنی کا لین دین ان کے ہی ہاتھ میں ہے۔ چنانچہ یہاں تجارت میں ایک ہزار مردوں کے مقابلے میں کمانے والی عورتوں کا اوسط ۱۰۹۴ ہے کچھ عورتیں کشتیاں بھی چلاتی ہیں۔

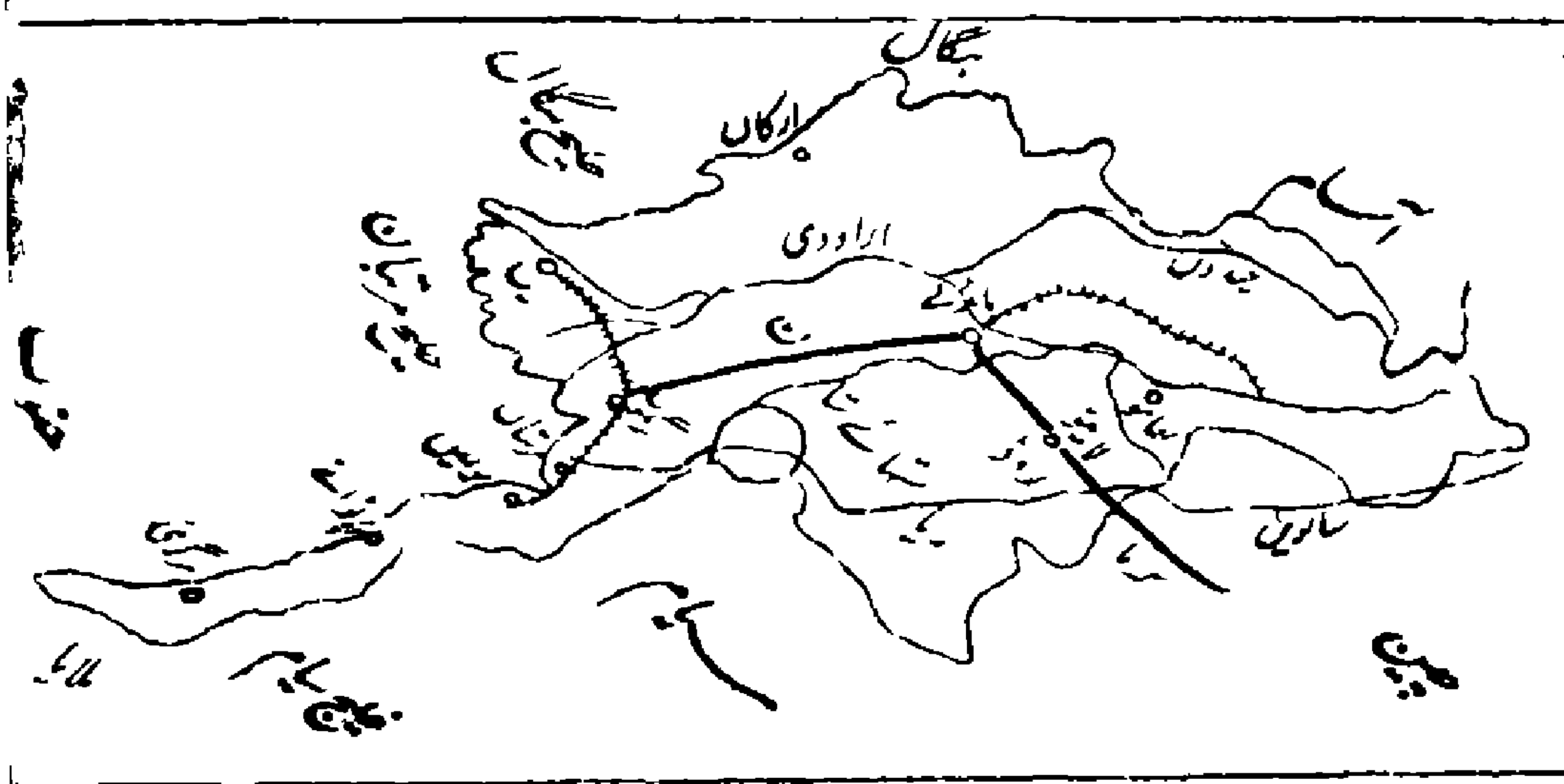
برمی، شان اور مون لوگوں میں شادی کی تقریبات عام طور پر ملتی جلتی ہیں ان کے یہاں شادی کی کوئی خاص رسم نہیں ہوتی اور صرف لڑکے اور لڑکی کی رضامندی سے شادی ہو جاتی ہے۔ بسا اوقات بڑے بوڑھوں کی رضامندی تک حاصل نہیں کی جاتی اور نہ ان کو شادی میں شریک کیا جاتا ہے امرا کے طبقہ میں البتہ شادی کے موقعوں پر لوگوں کو جمع کیا جاتا ہے پنیا دھی یورکے نجومی قاضی یا پنڈت کے فرائض انجام دیتا ہے اور متبرک پانی چھڑک کرنے جوڑے کو آشیرباد دیتا ہے جیسے شادی میں آسانی ہے ویسے ہی طلاق کے معاملے میں بھی بڑی آسانی ہے اس میں صرف دیہات کے پنچ کی منظوری ضروری ہوتی ہے اور اس کے بعد فریقین علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ طلاق سے عورت کے رتبے پر کوئی اثر نہیں پڑتا شادی پر اس کا نام نہیں بدلا جاتا اس لیے طلاق کے بعد ایسا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا وہ نہ شادی کی انگوٹھی یا کوئی اور خاص نشانی ایسی استعمال کرتی ہے جو طلاق کے بعد اس کو ترک کرنا پڑے۔ برما میں زیادہ تر ایک ہی شادی کا رواج ہے اور اس کی بڑی وجہ غالباً یہاں کی عورتوں کی معاشی آزادی ہے امرا میں البتہ ایک عورت بطور چھوٹی بیوی کے رکھ لی جاتی ہے مگر ایسی عورتوں کی تعداد کبھی دو سے متجاوز نہیں ہوتی برمی حکومت کے عہد کی یادگار ہے جب بادشاہوں کے یہاں حرموں اور لونڈیوں کا عام رواج تھا اور بڑے بڑے امرا بھی ان کی نقل کیا کرتے تھے کاچن لوگوں میں دو سے زیادہ شادیاں ایک ساتھ نہیں کی جاتیں چونکہ متوفی بھائیوں کی بیواؤں سے شادی کرنے کو اچھا سمجھا جاتا ہے اس لیے یہ لوگ ان کی عورتوں سے شادیاں کر لیتے ہیں بعض قوموں میں بے اولادی کی صورت میں دوسری شادی کی اجازت ہے۔

برما کے پہاڑی علاقوں میں طرح طرح کے قبیلے آباد ہیں جن کے رسوم و رواج، عادات و اطوار ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں ان قبیلوں کی اکثریت کے یہاں "ملاڈیپ" یا کنواریوں

پہلے مکان ہوتے ہیں جو اکثر والدین کے گھر کے سامنے ہی ہوتے ہیں یہاں لڑکیاں رات کو کنواروں سے ملتی ہیں اور اس کو کوئی معیوب بات خیال نہیں کرتے اکثر قبیلوں میں شادی سے پہلے جنسی تعلقات قائم کرنے کی اجازت ہے اور اولاد پیدا ہونے کے بعد یا تو فریقین آپس میں شادی کر لیتے ہیں یا عورت کو اس کا تاوان جو عموماً ایک بھینس یا گائے ہوتی ہے ادا کر دیا جاتا ہے، پہاڑی علاقوں میں اکثر یہ دستور سا ہو گیا ہے کہ شام کو بازار یا ہاٹ سے لوٹتے وقت لڑکیاں اپنی رضامندی سے لڑکے کے گاؤں چلی جاتی ہیں اور لڑکے کے گاؤں والے اس امر کی اطلاع لڑکی والوں تک پہنچاتے ہیں اگر ان کو یہ بات پسند آگئی تو وہ خاموش رہتے ہیں ورنہ اسی وقت لڑکے کے گاؤں پہنچنے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن اگر اس اثنا میں لڑکی نے اپنے شوہر کے گھر انڈا پکا کر دونوں نے مل کر ساتھ کھا لیا ہے تو پھر یہ تعلقات ٹوٹ نہیں سکتے بہرحال برما میں ایسے قبیلے آباد ہیں جن کی عادتیں طور طریق، معاشرت، وضع قطع لباس اور عقائد ہمارے یہاں کی جنگلی اقوام سے ملتے جلتے ہیں، اور جن کو ابھی تک موجودہ تہذیب و تمدن کی ہوا نہیں لگی ہے۔

محمد احمد سبزواری ایم۔اے

نقشہ برما



غافل لکھنوی

(نام منور خاں تخلص غافل، تلمیذ مصحفی لکھنؤ میں نقیر محمد خاں گویا کے احاطہ میں رہتے تھے ان کی تمام زندگی گمنامی میں بسر ہوئی اتفاق کی بات ہے کہ ان کے فرزند میاں جھمو خاں نے جو نول کشور پریس میں ملازم تھے ایک بار مالک مطبع سے اپنے والد مرحوم (غافل) کی شاعری کا ذکر کیا مالک مطبع کو افسوس ہوا کہ ایسے باکمال شاعر کا کلام ضائع ہو رہا ہے چنانچہ ان کے شوق اور تلاش سے جھمو نے غافل کے کلام کا بہت سا حصہ ڈھونڈ نکالا جو ۱۸۷۴ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوا۔

غافل کے کلام پر قدامت کا رنگ غالب ہے متروک الفاظ کی کثرت ہے تمام دیوان کی ورق گردانی کے بعد یہ چند اشعار اس قابل نظر آئے کہ انہیں اہل ذوق کے سامنے پیش کیا جائے)

نکلا نہ داغ دل سے ہمارا تو کوئی کام
نہ وہ چراغ دیر نہ شمع حرم ہوا

بندے کو اپنے سب کچھ دیتا ہے بے طلب وہ
درگاہ کبریا میں مانگے کوئی دعا کیا

کیا کیا یہاں یہ شکلیں بنیں اور بگڑ گئیں
ہستی بھی اک نمونہ ہے موج حباب کا

ہر ایک گل کو تمنا ہوئی کہ جام بنے
چمن میں لے کے جو وہ شیشۂ شراب آیا

دل کی دل ہی میں رہی ہی تمنا کیا کیا
وقفۂ عمر دم چند تھا کرتا کیا کیا

ہر طرح بندگی عشق میں مجبوری ہے
نہ کیا میں نے گنہ تو بھی گنہگار ہوا

بزم میں وا جو نقاب رخ جاناں ہوگا
کوئی بیخود کوئی ششدر کوئی حیراں ہوگا

کیا احتیاج خانہ بدوشوں کو قصر کی
جا بیٹھے جس جگہ وہی اپنا مکاں ہوا

لے چل اے وحشت فلک سے بھی پرے
اس قفس میں اب تو گھبراتے ہیں ہم

جلوۂ برق کم نما ہیں ہم
ہے جو ہستی یہی تو کیا ہیں ہم

مثال آئینہ بے جا نہیں یہ حیرانی
کوئی تو سامنے میرے ہے جو دوچار ہوں میں

مبتلا رنج مکافات میں فرزانے ہیں
پرسش حشر سے فارغ ہیں جو دیوانے ہیں

داور و سے بھی رکھا بزم میں ہم کو محروم
کیا یہی یا دوٗ انصاف سے بیگانے ہیں؟

مہر و مہ حسن کی ہیں حیرات کے ساغر غافل
ان دنوں اپنے تصرف میں وہ پیمانے ہیں

ہو بہتر کہ دو دفعہ یک دم ہمیں یہ بھی نہیں
کس قدر رہے لقا ہیں کتنے بے میادہ ہیں

غرق بحر بلا کی ہو کیا خبر ان کو
جو لوگ بیٹھے ہیں آرام سے سفینوں میں

افشاں نہیں ہے سنبل مشکین یار میں
تارے چٹک رہے ہیں یہ صبح بہار میں

گلگشت چمن میں کب ہیں یہ نرگس حرامیاں
تو جس چمن میں پاؤں دھرے لالہ زار ہو

خاک بدن میں اپنی تو کر اس کی جستجو
شاید اسی غبار سے پیدا سوار ہو

کچھ قید نہیں کعبہ ہو یا دیر مغاں ہو
عاشق ترے پوجیں گے اسی کو تو جہاں ہو

ہرگز نہیں سودائے محبت میں خسارا
ہے اس میں بھی اک نفع اگر جی کا زیاں ہو

دیر میں ہر چند سو نقصان تھے
فائدہ اک یہ ہوا دیکھا تجھے

نگاہ یار ہم سے آج بے تقصیر پھرتی ہے
کسی کی کچھ نہیں چلتی ہے جب تقدیر پھرتی ہے

کم گلستاں سے نہیں اس کا سراپا نکال
یار کیا آتا ہے گویا کہ بہار آتی ہے

گو کہ ہر جا تجھے اے جان جہاں دیکھا ہے
کیا بتاؤں جو کہے کوئی! کہاں دیکھا ہے

ہر خاک کے ذرہ میں ہے خورشید کا جلوہ
محروم نہیں یار کے دیدار سے کوئی

بحر دنیا میں نہیں کوئی مصیبت کا شریک
ڈوبتے کو آشنا بھی دیکھتے ہیں دور سے

غم نہیں اس کا کوئی شے گر بنے اور ٹوٹ جائے
پر غضب ہے اشک یوں گوہر بنے اور ٹوٹ جائے

اس گلستاں میں نہیں مجھ سا کوئی سوختہ بخت
ہاتھ جس گل کو لگاؤں میں وہ اخگر ہو جائے

چلتے ہیں راستے میں جو بچ کر غبار سے
واقف نہیں ہیں اپنے وہ انجام کار سے

یہ عشق ہے وہ آتش سوزاں کہ جس نے آہ
دونوں جہاں کو پھونک دیا اک شرار سے

مرسلہ حبیب کیفوی

جامِ صہبائی

کچھ لہو و لعب میں ڈھونڈتے ہیں اس کو (۱) کچھ عیش و طرب میں ڈھونڈتے ہیں اس کو
ملتا ہے مگر کبھی کبھی وہ اُن سے جو پردۂ شب میں ڈھونڈتے ہیں اس کو

روپوش جب آفتاب ہو جاتا ہے (۲) جب طاری جہاں پہ خواب ہو جاتا ہے
آتا ہے وہ میرے پاس چپکے چپکے ہنس دیتا ہے بے نقاب ہو جاتا ہے

جب عشق کی آگ نور ہو جاتی ہے (۳) سب کلفتِ زیست دور ہو جاتی ہے
ہو جاتا ہے اضطراب پُر کیف اثر جاں غرقِ مے طہور ہو جاتی ہے

مردانِ خدا ہیں پیکرانِ تسلیم (۴) منزل کو رواں دواں ہیں بیگانۂ بیم
بجھ جائے گی آگ اور پھٹ جائیگا نیل اے پیروِ سنتِ براہیم و کلیم!

رہ تیغ بدست زندگانی ہے یہی (۵) باطل کو پچھاڑ کامرانی ہے یہی
حق، تجھ کو اگر گلے لگا لے ہنس کر کونین سے بڑھ کے شادمانی ہے یہی

پہنچا ہے کس اوج پہ ستارا میرا (۶) ہے حکمِ قضا و قدر اشارا میرا
میں خوش ہوں کہ تو بھی مجھ کو پاکر خوش ہے میں تیرا ہوں اور تو سہارا میرا

دنیا میں بلند حق کی آواز کریں، (۷) پیدا ہر دل میں ذوقِ پرواز کریں،
انساں نالاں ہے اہرمن کے ہاتھوں آ! پرچمِ حق کو پھر سرافراز کریں!

ہوں گے کوئی اور آہ بھرنے والے (۸) ڈر کر سگِ اہرمن سے مرنے والے
ہم ڈر کے یہاں نہیں رہیں گے یارب، ڈرتے ہیں کسی سے؟ تجھ سے ڈرنے والے!!

اثر صہبائی

دل کا مرثیہ

وہ دل، وہ بحرِ غم کا شناور کدھر گیا
وہ کارواں شوق کا رہبر کدھر گیا

جا کر کے مجھ پہ بارِ حیاتِ گسستہ پا
میرا رسول، میرا پیمبر کدھر گیا

تاریکیاں ہیں وسعتِ عالم پہ خیمہ زن
وہ ماہ و آفتاب کا ہمسر کدھر گیا

افسردہ ہے خیال تو جذبات مردہ ہیں
احساس کی جبیں کا وہ زیور کدھر گیا

بخشا تھا جس نے سوزِ براہیم روح کو
بت خانۂ جنوں کا وہ آذر کدھر گیا

میں جن کی وسعتوں میں بھٹکتا پھرا کبھی
وہ دشت کیا ہوا، وہ سمندر کدھر گیا

جس کی نوا سے کون و مکاں تک سلگ گئے
وہ انگبیں فروش سخنور کدھر گیا

اوہام کی سپاہ نے سجدے کیے جسے
وہ صف شکن یقیں کا خنجر کدھر گیا

کس آس پہ اٹھائے پھروں جامِ زندگی
اس جام سے وہ بادۂ احمر کدھر گیا

سونا پڑا ہوا ہے جہانِ طلب ندیم
وہ خضر کیا ہوا وہ سکندر کدھر گیا

احمد ندیم قاسمی

"بانگِ سحر"

شعر میں قیمتی اوقات کو کھو لیتا ہوں ۱ بادۂ عشق میں جذبات بھگو لیتا ہوں
راہ چلتے ہوئے ظلمات میں کھا کر ٹھوکر دو گھڑی کے لیے تقدیر کو رو لیتا ہوں

غنچہ ہوں تند ہواؤں سے چٹک جاتا ہوں ۲ چلتے چلتے رہِ توحید میں رُک جاتا ہوں
زندگی بگڑے ماحول سے چیخ اٹھتی ہے جب دل و جاں سے تری درگاہ میں جھک جاتا ہوں

چاک در چاک گریباں کو سینے نہ دیا ۳ ساغرِ عیش کا اک گھونٹ بھی پینے نہ دیا
شاید انجام کو کھل جاتے طلسماتِ حیات لیکن اس وقت تک احساس نے جینے نہ دیا

شورشِ عشق نے موجوں سے ابھارا مجھ کو ۴ دورِ ساحل سے محبت نے پکارا مجھ کو
میرے جذبات کی پیکار کا انجام نہ پوچھ سو گیا لے کے سمندر کا کنارا مجھ کو

کیا کہوں! تلخیٔ احساس نے جینے نہ دیا ۵ چاکِ دل شدتِ آماس نے سینے نہ دیا
بادۂ حسن کا تشنہ تھا جو تو نے ساغر زندگی بھر غمِ افلاس نے پینے نہ دیا

فکرِ فردا میں دل و جان کو کھو لوں اے دوست! ۶ کشتِ نغمۂ غمِ ہستی میں ڈبو لوں اے دوست!
چھوڑ کر نالۂ تازہ کو ٹھہر کر اک بار کیوں نہ بگڑی ہوئی تقدیر کو رو لوں اے دوست!

تری درگاہ میں آتا ہوں میں گانے کے لیے ۷ قصۂ درد و الم تجھ کو سنانے کے لیے
قلزمِ زیست کے ساحل پہ کھڑا روتا ہوں اپنی روٹھی ہوئی تقدیر منانے کے لیے

زندگی ہو مری سوتوں کو جگانے کے لیے ۸ اک نئے عہد کی تعمیر اٹھانے کے لیے
ہمنوا ہو مرے گیتوں سے اگر ساز ترا جادواں ہوں مرے نغمات زمانے کے لیے

فضل حسین کیفؔ اسرائیلی

تنقید و تبصرہ

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

اقبال کا مطالعہ:۔ از سید نذیر نیازی صاحب حجم ۱۶۲ صفحات تقطیع ۲۲×۱۸، لکھائی چھپائی اچھی، کاغذ سفید قیمت ۱۲؍ شائع کردہ کتاب خانہ پنجاب ۲۶ بیرون لوہاری گیٹ لاہور۔

ڈاکٹر اقبال مرحوم کی زندگی اور شاعری پر پچھلے چند سال میں متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور ادبی رسالوں کے خاص نمبر بھی نکل چکے ہیں لیکن ہم کہہ نہیں سکتے کہ اس موضوع پر جو کچھ لکھا جا سکتا ہے لکھا جا چکا اس لیے کہ اقبال کی جامع شخصیت کے بہت سے گوشے اور ان کی ہمہ گیر شاعری کے بہت سے پہلو ایسے ہیں جن کو اب تک کسی نے ہاتھ بھی نہیں لگایا اور جن پہلوؤں پر اب تک تبصرہ کیا گیا ہے ان میں بھی بہت کچھ گنجایش باقی ہے سید نذیر نیازی صاحب کی یہ کتاب اقبالیات میں ایک قابل قدر اضافہ ہے مصنف اقبال کے ہم وطن ہیں ان کے تعلقات مرحوم سے عزیزانہ تھے اور انھیں برسوں مرحوم کی صحبت میں رہنے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ اس کے علاوہ نیازی صاحب تاریخ اسلام اور علوم فلسفہ میں اچھی نظر رکھتے ہیں۔ غرض ان میں وہ سب صفات موجود ہیں جو اقبال کی شاعری کے گہرے مطالب کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے درکار ہیں۔

یہ کتاب چار مضامین پر مشتمل ہے پہلے کا عنوان وہی ہے جو پوری کتاب کا ہے یعنی "اقبال کا مطالعہ" اس میں شاعری کے مفہوم سے بڑی خوبی سے بحث کی گئی ہے اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اعلیٰ درجے کی شاعری محض اظہار جذبات کا ذریعہ نہیں بلکہ زندگی کی تفسیر ہے اس میں اور فلسفہ میں جو فرق ہے وہ موضوع کے لحاظ سے نہیں بلکہ طرز ادا کے لحاظ سے ہے پھر یہ دکھایا گیا ہے کہ اقبال کی شاعری اس معیار پر پوری اترتی ہے اور زندگی کی ایک مکمل تفسیر اسلام کے نقطۂ نظر سے پیش کرتی ہے دوسرے مضمون کا عنوان ہے "اقبال اور علمائے فرنگ" اور اس میں اس عام غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اقبال کے خیالات

نیٹشے، برگساں اور دوسرے مغربی فلاسفہ سے ماخوذ ہیں تیسرا مضمون "اقبال کی عظمتِ فکر" سب سے زیادہ دقیق اور جامع ہے اور اس میں اقبال کے مابعد الطبیعی اور عمرانی نظریات کی تحلیل کرکے ان کے پورے نظامِ فکر کا ایک خاکہ پیش کیا گیا ہے جو مصنف کے نزدیک سراسر اسلامی تعلیمات پر مبنی ہے چوتھے مضمون "اقبال کی آخری علالت" میں پڑھنے والے کو جو محرد تصورات اور مسائل پر غور کرتے کرتے تھک گیا ہو مشرق کی آخرِ عمر کی جیتی جاگتی تصویر دکھائی جاتی ہے۔ مصنف کے قلم نے اس تصویر میں اصلیت کا رنگ بھرنے میں کمال کر دیا ہے جو محبت اور عقیدت انھیں اقبال سے ہے وہ سادگی اور اثر میں ڈوبے ہوئے الفاظ کے ذریعے پڑھنے والے کے دل میں منتقل ہو جاتی ہے اور اسے یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ وہ خود اس آخری علالت میں اقبال کی تیمارداری اور خدمت کر رہا ہے جب اس کی طبیعت سنبھلتی ہے تو امیدِ موہوم سے خوش ہو جاتا ہے جب ذرا گرتی ہے تو وقتِ موعود کے ڈر سے گھبرا جاتا ہے اور آخر ایک روز قضائے الٰہی کے آگے سر جھکا کر دل پر پتھر رکھ کر ملتِ اسلامی کی اس بے بہا دولت کو سپردِ خاک کر دیتا ہے۔

خدا کرے زمانہ نیازی صاحب کو اس کا موقع دے کہ اقبال کی ایک مکمل سیرت، ان کے کلام اور ان کی تعلیمات پر ایک مفصل تبصرہ لکھ سکیں اس وقت اقبال کے قدر دانوں کے لیے یہ مختصر کتاب "اقبال کا مطالعہ" بہت غنیمت ہے۔ (ع ح)

قابیل :۔ مترجمہ مجنون گورکھپوری، ملنے کا پتہ ایوان اشاعت گورکھپور قیمت مجلد عہ ر صفحات ۱۹۸، سائز ۲۰×۲۶/۱۶، کاغذ، کتابت و طباعت متوسط

تخلیقِ آدم کے ساتھ ساتھ خدا ایک ایسی ہستی کو بھی وجود میں لایا اور اس کو نسلِ آدم پر مسلط کرکے دونوں کو جنگ کرنے کے لیے دنیا میں بھیج دیا جس میں اگر انسان غالب آ جائے تو اس کا درجہ قدوسیوں سے بھی بلند ہو جاتا ہے اور اگر بدقسمتی سے انسان مغلوب ہو جائے تو وہ دائرۂ زندگی سے خارج ہو کر انسانیت کے درجہ سے بھی گر جاتا ہے۔ اور ساتھ ہی انسان کے اندر ایک ایسا جذبہ بھی رکھا (اس جذبہ کو اس کے حریف ہستی کا آلہ کار کہا جائے خواہ کچھ) جو اسے کسی ایک حالت میں

سکون نہیں لینے دیتا اور غالباً یہی اس کے ارتقائی مدارج کا باعث بھی ہے۔

زیرنظر کتاب انگریزی کے مشہور شاعر لارڈ بائرن کی ایک تمثیل کا ترجمہ ہے جسے مجنوں گورکھپوری نے اردو کا جامہ پہنایا ہے جس میں مصنف نے اسی حقیقت کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے اور بعض ان حقایق پر بھی روشنی ڈالی ہے جو انسان کے لیے کش مکش کا باعث ہوئے ہیں تمثیل کا تعلق آدم کی اولین اولاد سے ہے۔ قابیل اپنی زندگی کو ایک بار سمجھتا ہے اور اس کے ذہن میں موت کا ڈراؤنا تخیل جاگزیں ہے اور اس کی حقیقت معلوم کرنے کا مشتاق ہے۔ اسی وجہ سے اس کی روح آسودگی و سکون کی متلاشی ہے۔ عزازیل قابیل کو فوق الارض کائنات کے حقایق کے علم کا شوق دلا کر فضائے بسیط کی سیر کراتا ہے جہاں وہ لاتعداد اجرام سماوی دیکھتا ہے جو کرۂ ارض سے کہیں زیادہ بڑے اور حیرت انگیز ہیں۔ قابیل عزازیل سے ان کے متعلق سوالات کرتا ہے وہ مبہم اشارات میں جوابات دیتا ہے ان جوابات سے قابیل کو جو علم حاصل ہوتا اس سے اپنی فنا اور بے مائگی کا احساس ہوتا ہے اور یہ علم اس کی بے چینی میں اضافہ کا باعث ہوتا ہے جس کا نتیجہ آخر میں ہابیل کے قتل کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔

مصنف نے علم ہیئت کے جدید نظریات، تحقیقات اور انکشافات بھی بیان کیے ہیں۔

ترجمہ اچھا ہے اور اس پر ترجمہ کا گمان نہیں ہوتا۔

تعلیم جدید: مقالہ جناب محمد صدیق میمن صاحب صدیقی ملنے کا پتہ انجمن اسلامی تاریخ و تمدن مسلم یونیورسٹی علی گڈھ۔ قیمت ۴ر صفحات ۴۰، سائز $\frac{20\times30}{16}$، کاغذ، کتابت و طباعت معمولی۔

زیرنظر رسالہ ایک مقالہ ہے جو بمبئی کی ایک مجلس میں محمد صدیق میمن صاحب صدیقی نے پڑھا تھا اس میں فاضل مقرر نے یورپین مورخین و محققین کی شہادتوں کی روشنی میں اسلامی علوم و فنون کے شاندار ادوار اور تعلیمی مراکز کے اعداد پیش کرنے کے بعد علم کی تعریف، اہمیت اور عظمت کی آیات قرآنی کی روشنی میں وضاحت کی ہے اور تعلیم جدید کے نقصانات پر نقادانہ نظر ڈال کر بیان کیا ہے کہ اس سے دینی حالت اور وقار کو جو صدمہ پہنچا سو پہنچا لیکن اس سے دنیا میں خوشحالی بھی میسر نہ آسکی۔ آخر میں ثابت کیا ہے کہ تمام علوم و فنون کا سرچشمہ قرآن حکیم ہے کوئی مادی، اجتماعی اور روحانی مسئلہ ایسا نہیں جس کا

۹۔ آیات و نغمات — جوش ملیح آبادی
۱۰۔ ساز و آہنگ — سیماب اکبرآبادی
۱۱۔ آبگینے — اختر انصاری
۱۲۔ ماورا — ن م راشد
۱۳۔ نقش فریادی — فیض احمد فیض
۱۴۔ گل و نغمہ (نیا اڈیشن) — عظیم الدین احمد
۱۵۔ تفسیر فطرت — احسان دانش
۱۶۔ انوار — علی اختر
۱۷۔ موج طور — بہزاد لکھنوی
۱۸۔ نغمۂ زندگی — فضل
۱۹۔ فردوس تخیل — ز خ ش
۲۰۔ محسوسات ماہر — ماہر القادری
۲۱۔ میرے نغمے — سلام مچھلی شہری
۲۲۔ گل دل — علی عباس
۲۳۔ شعرستان — (انتخاب)
۲۴۔ پریت کے گیت — (انتخاب) الطاف مشہدی
۲۵۔ پھولوں کی ڈالی۔ — (انتخاب) مجذوب
۲۶۔ بال جبریل (نیا اڈیشن) — علامہ اقبال
۲۷۔ حیات محمد قلی قطب شاہ — ڈاکٹر زور
۲۸۔ حیات محمد مومن — ڈاکٹر زور
۲۹۔ غالب (دوسرا اڈیشن) — غلام رسول مہر
۳۰۔ بزم اکبر — قمرالدین احمد
۳۱۔ آثار جمال الدین افغانی۔ — قاضی عبدالغفار
گورکی کی آپ بیتی — ترجمہ اختر حسین
۳۳۔ آب کوثر — شیخ محمد اکرام
۳۴۔ موج کوثر — شیخ محمد اکرام
۳۵۔ مولانا محمد علی کے سفر یورپ — محمد سرور
۳۶۔ کیا خوب آدمی تھا — ناشر حالی پبلشنگ ہاؤس
۳۷۔ یادرفتگاں — خواجہ عبدالمجید
۳۸۔ داستان تاریخ اردو — حامد حسن قادری
۳۹۔ تمہیدی خطبات — گارساں دی تاسی
۴۰۔ ہماری زبان — ڈاکٹر مولوی عبدالحق
۴۱۔ افادی ادب — اختر انصاری
یاد حکمت — انڈین پریس
۴۳۔ مطالعہ اقبال — نذیر نیازی
۴۴۔ تعلیمات اقبال — سلیم چشتی
۴۵۔ روسی ادب — محمد مجیب
۴۶۔ ایران بعہد ساسانیاں — ڈاکٹر اقبال
۴۷۔ ادبی تاثرات — ڈاکٹر زور
۴۸۔ شرح درد — خواجہ محمد شفیع
۴۹۔ شرح اسرار خودی — یوسف سلیم چشتی
۵۰۔ کاروان ادب — فیروز اینڈ سنز

حل قرآن نے پیش نہ کیا ہو استدلال میں آیات قرآنی پیش کی ہیں اسلوب بیان مولویانہ ہے۔

نورس:- مسعود اختر جمال، ناشر مکتبہ ادبستان پانڈے حویلی بنارس، قیمت قسم اول ۳؍ قسم دوم مجلد ۳؍ غیر مجلد ۲؍ صفحات ۱۷۴، سائز $\frac{20 \times 2}{16}$، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ۔

موجودہ سماجی جابرانہ نظام کی فرسودگی کے خلاف بغاوت اور امیری وغریبی کی کش مکش نے ادب کا رُخ بدل کر رکھدیا ہے اور یہ مسلم ہے کہ ادب ماحول سے اور ماحول ادب سے لازمی طور پر متاثر ہوتے ہیں اس انقلابی کش مکش نے شاعروں اور ادیبوں کا ایک ایسا طبقہ پیدا کیا ہے جو انقلاب کو اپنا نصب العین بناکر اپنے قلم کی طاقت سے موجودہ سماجی نظام کو بدل کر اس کی تعمیر نئے نظام پر کرنا چاہتے ہیں۔ زیر نظر کتاب مسعود اختر صاحب جمال کی نظموں کا مجموعہ ہے جو انقلابی نصب العین کے علمبردار ہیں اور ان کی نظمیں اس نصب العین کی آئینہ دار۔ ساتھ ہی مجموعہ میں رومانی نظمیں، مناظرِ فطرت کی نقاشی اور غزلیں بھی شامل ہیں جو الگ الگ عنوانات کے تحت دی گئی ہیں جذب ناتمام، آسمان، نئی دنیا، ایک خواب اور صبح بنارس اچھی نظمیں ہیں۔ غزلیں بھی دلی تاثرات کی حامل ہیں اشعار میں معنی آفرینی کے باوجود روانی کافی ہے۔ امید ہے کہ یہ نوجوان شاعر آئندہ اور ترقی کرے گا

مرقع شہادت:- از مولانا ضیاء القادری صاحب بدایونی، ملنے کا پتہ نظامی پریس بدایوں قیمت ۱۲؍ صفحات ۲۶۴، سائز $\frac{27 \times 17}{8}$، کاغذ، کتابت وطباعت اچھی۔

عالم اسلام کے لیے خصوصاً اور انسانیت کیلیے عموماً واقعۂ کربلا ایک دردناک حادثہ اور درس عبرت ہے اور حضرت حسینؑ کی صداقت، استقلال اور پامردی انسانیت کے لیے فخر کا باعث ہے اس کے برعکس آپ کے دشمنوں کی شقاوت قلبی اور سفاکی باعث ننگ، جسے دنیا فراموش نہیں کر سکتی۔

مرقع شہادت اسی دردناک واقعہ کی ایک تصویر ہے جس کو مولانا ضیاء القادری نے شاہنامہ اسلام کے طرز میں پیش کیا ہے ابتدا میں پس منظر کے طور پر حضرت علیؓ اور حضرت خاتونِ جنت کی شادی، حضرت حسنؑ کی پیدائش، اُن کے محاسن اخلاق اور شہادت کا مجملاً خاکہ کھینچا ہے جو مرقع کے ابتدائی نقوش کا کام دیتا ہے اس کے بعد اصل موضوع پر قلم اُٹھایا ہے اور واقعات شہادت کی مکمل نقاشی کی ہے۔

ہر مصنف اپنے طبع اور موضوع میں آزاد ہوتا ہے لیکن جب موضوع تاریخی اہمیت رکھتا ہو اور اس میں عقیدت مندانہ عنصر بھی شامل ہو تو مصنف مقید ہو جاتا ہے اور گوناگوں مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ ضیا صاحب اس حیثیت سے قابل ستایش ہیں کہ تاریخی واقعات کی صحت میں شاعرانہ مبالغہ آمیزی سے فرق نہیں آنے دیا اور افراط و تفریط سے حتی الامکان دامن بچا گئے اور غالباً اسی وجہ سے اکثر اشعار میں آمد کے بجائے آورد پائی جاتی ہے کہیں کہیں شاعرانہ رنگ آمیزی بھی ہے۔ باوجود اس کے اشعار اثر سے خالی نہیں۔ ضرورت بھی اسی کی تھی کہ واقعات شہادت تاریخی صحت کے ساتھ سادہ اشعار میں بیان کر دیے جاتے کیونکہ مرثیہ گو حضرات نے مراثی میں شاعرانہ حیثیت سے کسی پہلو کو تشنہ نہیں چھوڑا اور اس میں مزید اضافہ سے حاصل بھی کیا ہوتا۔

کربلا:۔ از منشی پریم چند صاحب آنجہانی، ناشر لاجپت رائے اینڈ سنز تاجران کتب لاہور۔ قیمت عمر سائز ۲۰×۳۰/۱۶، صفحات ۲۰۴، کاغذ کتابت و طباعت خاصی۔

منشی پریم چند صاحب کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں اور نہ ہی اردو ادب میں ان کا پایہ محتاجِ بیان ہے زیر نظر کتاب منشی صاحب کا ایک ڈرامہ ہے جو اسلامی تاریخ کے سب سے اہم اور دردناک حادثہ، واقعہ کربلا سے تعلق رکھتا ہے جیسا کہ نام سے ظاہر ہے جس میں منشی صاحب نے واقعہ کربلا کے تاریخی واقعات پیش کیے ہیں اور مسلمانوں کی زندگی اور اسلامی تعلیمات و معاشرت کی جھلک دکھانے کی کوشش بھی کی ہے ایک بات خاص طور پر قابل ذکر ہے اس ڈرامہ میں ہندو مسلم اتحاد اور حق و انصاف کی حمایت کا بلا تفریق مذہب و ملت سبق دیا ہے یہ کوشش اپنی جگہ پر کتنی ہی مستحسن ہو لیکن ایک ایسے تاریخی واقعہ میں اس قسم کا پیوند جس کی صحت میں تردد ہو کہاں تک زیب دیتا ہے اور اس کو کس حد تک جائز قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اس ڈرامے میں کئی تاریخی و تمدنی غلطیاں ہیں بعض جگہ ایسے واقعات بیان کیے گئے ہیں جو تعلیمات اسلامی کے قطعاً خلاف ہیں اور جن کی توقع حضرت حسینؑ اور ان کے رفقا سے ہرگز نہیں کی جا سکتی دوسرے یہ کہ کردار نگاری میں بھی توازن قایم نہیں رہا ہے اسی قسم کی متعدد خامیاں ڈرامہ میں پائی جاتی ہیں جس سے پتہ چلتا

ہے کہ یہ ڈرامہ ان کی ابتدائی تصنیف ہے اور غالباً منشی صاحب کو بھی ان خامیوں کا احساس تھا اس لیے انھوں نے اس کو شائع کرنا مناسب نہیں سمجھا اور ان کے انتقال کے بعد شائع ہوا بہتر تھا کہ اب بھی شائع نہ کیا جاتا کیونکہ یہ تصنیف منشی صاحب کی شخصیت کے شایانِ شان نہیں۔

ٹالسٹائی کی کہانیاں:۔ مترجمہ یزداں جالندھری پبلشرز براؤن دت سہگل اینڈ سنز تاجران کتب لاہور، قیمت عہ، سائز ۲۰×۳۰/۱۶، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی۔

یزداں جالندھری صاحب اس سے پہلے بھی ٹالسٹائی کے افسانوں کا ایک انتخاب [illegible] کے نام سے شائع کر چکے ہیں زیرِ نظر کتاب اسی سلسلہ کی دوسری کڑی ہے مترجم نے ٹالسٹائی کا خیال لے لیا ہے اور ماحول ہندوستانی ہی رکھا ہے اور چونکہ یہاں کے روسی اور ہندوستان کے سماجی نظام میں کم فرق ہے اس لیے اس میں انھیں خاطر خواہ آسانی اور کامیابی بھی ہوئی ہے۔ افسانے تمام تر کسی نہ کسی مذہبی اصول یا اخلاقی نکتے کے حامل ہیں زبان کی پاکیزگی اور سلاست نے ترجمہ کو بالکل اپنا دیا ہے بہتر ہو اگر مترجم ٹالسٹائی کی دیگر تصانیف بھی اسی طرح اردو میں پیش کر دیں۔

حکومتِ الٰہی:۔ مولفہ ابو المحاسن محمد سجاد مرحوم، ملنے کا پتہ مکتبہ سیفیہ مونگیر (بہار)، سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۱۴۳، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، قیمت درج نہیں۔

مولانا سجاد مرحوم ایک بڑی اعلیٰ سیاسی دماغ رکھنے والی شخصیت تھی زمانہ کے سیاسی اختلال نے جیسا کہ ہر صاحب تدبر ہستی کو ایک ایسے سیاسی نظام پر تفکر کرنے کی دعوت دی ہے جس سے انتشار تمدن عالم دور ہو کر امن و امان، فلاح و بہبودی کی صورت اختیار کر سکے اسی طرح حضرت علامہ ابو المحاسن نے بھی اس میدان سیاست میں ایک سیاسی نظام مرتب کرنا چاہا تھا مولانا کے نزدیک تمام دنیاوی دستور نظام قابل پذیرائی نہیں کیونکہ وہ انسانوں کے بنائے ہوئے ہیں اور اس لیے نامکمل، کمزور اور ناقابل عمل ہوتے ہیں ایسی حالت میں صرف نظام الٰہی ہی تمام انسانوں کے لیے قابل قبول اور قابل عمل ہو سکتا ہے وہ نظام الٰہی کیا ہے، یہ مولانا صفحۂ قرطاس پر نہ لا سکے اور داعی اجل کو انھوں نے لبیک کہا زیر نظر کتاب میں صرف تمہید ہی ہے جس میں مندرجہ بالا امور سے بحث کی گئی ہے مولانا نے جو نوٹس چھوڑے ہیں شاید اس سے اس نظام الٰہی کا دستور مرتب ہو سکے جو انھوں نے اخذ کیا تھا اس وقت ہی اس پر تنقید کی جا سکتی ہے۔ (م ع ح)

اقبال پر کتابیں

سیرت اقبال:۔ مصنفہ پروفیسر محمد طاہر صاحب فاروقی۔ اس کتاب سے آپ کو یہ اندازہ ہو سکے گا کہ علامہ کا تخیل جس فضاؤں میں پرواز کرتا تھا وہ کیا تھا علامہ کی سیرت، شاعری اور پیام [illegible] انداز سے پیش کیا گیا ہے، اس سے بہت سے شکوک اور غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جائیگا۔

قیمت مجلد تین روپے آٹھ آنے (سے)

روح اقبال:۔ از ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب۔ یہ کتاب تین مقالوں "اقبال اور آرٹ" "اقبال کا فلسفۂ تمدن" اور "اقبال کے مذہبی اور مابعد الطبیعی تصورات" کا مجموعہ۔

قیمت غیر مجلد تین روپے چار آنے (سے)

اقبال کا مطالعہ:۔ اس مجموعہ میں اقبال کی شاعری، فلسفہ اور آخری ایام زندگی پر چار مضمون شامل ہیں جن سے علامہ کی عظمت کا بخوبی علم ہو جاتا ہے۔ قیمت غیر مجلد عہ/ مجلد عاً

جوہر اقبال:۔ اقبال کے فلسفہ، پیام اور شاعری کے مختلف پہلوؤں پر ہندوستان کے مشہور ارباب قلم سید سلیمان ندوی، ڈاکٹر عابد حسین، خواجہ غلام السیدین وغیرہ صاحبان کے مضامین۔

قیمت مجلد ایک روپیہ آٹھ آنے (عہ/)

متاع اقبال:۔ از ابو ظفر عبدالواحد۔ اقبال کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر ایک اجمالی بحث۔

قیمت مجلد ایک روپیہ (عہ/)

اقبال کی شاعری:۔ مرتبہ عبدالمالک آروی۔ قیمت دس آنے (۱۰/)

مکتبہ جامعہ

دہلی۔ نئی دہلی۔ لکھنؤ۔ بمبئی ۳

پنڈت جواہرلال نہرو کی شہرۂ آفاق کتاب

جگ بیتی

دنیا کی تاریخ سنین وسلاطین کی فہرست کا نام نہیں ہے، نہ مختلف حکمراں خاندانوں کے عروج وزوال اور تاج وتخت کے لئے زور آزمائی کرنے والوں کی باہمی کش مکش کو تاریخ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ دراصل تاریخ نام ہے افراد کی ذہنی اور سماجی ارتقاء کا، جماعتی نظام کی تنظیم کا، تہذیب وتمدن کے اصولوں کی تدوین کا اور علوم وفنون کی ترویج کا۔ پھر تاریخ کا دائرہ کسی ایک ملک یا ایک قوم کے حالات تک محدود نہیں ہوتا اسکے پیش نظر تمام ممالک اور تمام اقوام ایک سلسلے میں منسلک ہوتے ہیں اور ایک دوسرے سے متاثر ہوتے اور متاثر کرتے ہیں۔

جگ بیتی میں پنڈت جواہرلال نہرو نے خاص طور پر انھی اصولوں کو پیش نظر رکھا ہے۔ اور مختلف زمانوں میں تمام ممالک اور تمام اقوام کے خاکے پیش کرکے دنیا کی ایک یکجائی تصویر کھینچی ہے اس لئے ان کی یہ کتاب ہندوستان کے تاریخی ادب میں ایک جدت ہے۔ ایک تنوع ہے جس کی مثال مشکل سے مل سکے گی۔

سیاسی مصروفیتوں کے باوجود پنڈت جی کا وسیع مطالعہ اور غیر معمولی غور وفکر کی عادت اس کی متقاضی تھی کہ جگ بیتی جیسی تصنیف منظر عام پر آئے۔ چنانچہ ان خطوط کی شکل میں جو پنڈت جی نے جیل سے اپنی لڑکی کے نام لکھے یہ کتاب اہل ذوق کے ہاتھوں میں پہنچے گی اب مکتبہ جامعہ نے محمود علی خاں جامعی سے سلیس اردو میں ترجمہ کراکے پیش کرنے کا فخر حاصل کیا ہے۔ قیمت جلد اول ۔/۳

مکتبہ جامعہ

دہلی۔ نئی دہلی۔ لکھنؤ۔ بمبئی

جامعہ

مکتبہ جامعہ دہلی

ذکرِ حسینؑ

یادگارِ حسینی کے جلسے میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب نے ایک تقریر یادگارِ حسین کے نام سے ۲۲ مارچ ۱۹۴۲ء کو آل انڈیا ریڈیو سے براڈکاسٹ کی تھی۔ یہ کتابچہ اسی کا مجموعہ ہے۔ یہ تقریر آپ کو یاد دلائے گی کہ رسول کے نواسے حسینؑ نے جن کے دل میں حق کا خون اور حق کا عشق تھا حکم باطل (ملوکیت) کو حکم حق (خلافت) کہنے سے کیوں انکار کر دیا اور انکار ہی نہیں بلکہ ترک وطن اور آخری قربانی آخری امتحان کا سامنا کیا اور اس میں پورے اترے اور دنیا کو یہ بتاتے گئے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، حکم صرف اللہ ہی کے

نی (۳ر)

سرِ کائنات

مشہور سائنس داں سر جیمس جینس کی لکھی ہوئی ہے۔ موصوف نے رائل انسٹی ٹیوٹ آف لندن میں زمین، ہوا، آسمان، ماہتاب، سیارے، آفتاب، ستارے اور سدیم (نیولا) پر آٹھ تقریریں کی تھیں، بعد میں ان تقریروں کو ترمیم و اضافے کے بعد کتابی صورت میں شائع کر دیا گیا۔ ریاضیات اور فلکیات کے مسائل کیسے خشک ہوتے ہیں مگر اس ماہر سائنس داں نے انھیں سلیس عبارت میں اس طرح سلجھا کر لکھا ہے کہ افسانے کا سا مزا آتا ہے۔ مترجم جناب حفیظ احمد خاں صاحب ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ، عثمان آباد۔ نے اس بات کی خاص طور پر کوشش کی ہے کہ ترجمے میں بھی اصل کی تمام خوبیاں باقی رہیں۔ طلبا اور عام معلومات حاصل کرنے والوں کے لیے یہ کتاب بہت مفید ہے۔ قیمت مجلد مع گرد پوش ۱۲ر

مکتبہ جامعہ

دہلی نئی دہلی لکھنؤ بمبئی ۳

جامعہ

زیر ادارت: نور الحسن ہاشمی ایم۔ اے

جلد ۴۳ نمبر ۶ | بابتہ ماہ جون سنہ ۱۹۴۲ء | چندہ سالانہ ۔ فی پرچہ ۔

فہرست مضامین

اعتذار

جنگ کی وجہ سے ، طباعت میں جو دقتیں پیدا ہوگئی ہیں ان سے ناظرین جامعہ بخوبی واقف ہیں ، لیکن اس کے باوجود جامعہ برابر وقت پر شائع ہوتا رہا مگر اِدھر کچھ عرصے سے ، بازار میں سرے سے کاغذ ملتا ہی نہیں ، جس کی وجہ سے مئی کا رسالہ تاخیر سے شائع ہوا ، ہمارا خیال تھا کہ جون کا پرچہ وقت پر شائع ہو جائے گا ، مگر ہمیں دلی افسوس ہے کہ انتہائی کوشش کے باوجود ہم اپنے ارادے میں کامیاب نہ ہو سکے ہم حالات پر جلد سے جلد قابو حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں ۔

"منیجر رسالہ"

مسلمانوں کا تاریک مستقبل

ہم مسلمانوں میں خوش فہمی، رجائیت اور خوش عقیدگی اس قدر وافر رہی ہے کہ ہم نے بہت عرصے سے صحیح صحیح واقعات کا انطباق اپنے اوپر کرنا اور ان سے نتیجہ نکالنا چھوڑ دیا ہے کبھی کوئی ناخوشگوار نتیجہ نکالنے کے لیے ہماری روحیں، دل و دماغ و تیار نہیں رہے ہیں۔ ہمارے شاعر، ہمارے مفکر، ہمارے لیڈر اور رہنما بھی اس خوش عقیدگی سے اس قدر مانوس رہے ہیں کہ کبھی ہم نے حالات کا صحیح صحیح اندازہ کر کے صحیح نتیجہ نکالنے کی کوشش اور ہمت ہی نہیں کی۔ حالی نے مسدس لکھا اور اس میں مسلمانوں کی ابتری اور زوال حالی کا جو صحیح صحیح نقشہ کھینچا اس سے [illegible] چیخ اٹھے کہ اس سے مسلمان ناامید اور مایوس ہو جائیں گے اس لیے کوئی امید افزا چیز بھی ہونی چاہیے چنانچہ بیچارے حالی کو ایک ضمیمہ لکھ کر اور شامل کرنا پڑا جس میں آئندہ کو روشن دکھایا گیا اسی طرح شبلی، اقبال وغیرہ جتنے مسلمان ادیب و شعرا ہوئے انھوں نے بھی اس خوش فہمی کو برقرار رکھا خوش فہمی بھی حقیقت سے گریز کا ایک طریقہ ہوا کرتی ہے جب انسان اپنی موجودہ حالت کو سدھار نہیں سکتا تو آئندہ کے خود ساختہ خوشگوار خواب ہی دیکھ کر جی کو کسی نہ کسی طرح بہلا لیا کرتا ہے موجودہ باتوں میں ذرا سی بھی کوئی اچھی اور مفید مطلب چیز ہو تو بھی ان کو بے انتہا وسعت دیتا ہے یہی حال قوم کا بھی ہے جس قوم میں جمود، تعطل، بے حسی اور بے عملی ہو وہ اپنی بے بسی کو آئندہ ہی کے خواب دیکھ کر بہلاتی رہتی ہے اپنے معمولی افراد کو بطل اعظم قرار دیتی ہے اپنی معمولی تحریکوں کو آئندہ کی تعمیر کی بنیادیں قرار دیتی ہے اور تلاش میں رہتی ہے کہ کون سی ایسی معمولی اور حقیر چیز نظر آ جائے جسے بڑھا کر اپنے تعطل کو چھپانے کی خاطر اسے معراج پر چڑھا دیا جائے یہ حالت قوم کے افراد اور تحریکوں کی قدر کرنا نہیں بلکہ اپنی بے عملی پر پردہ ڈھانکنا ہے یہ خوشگوار و شیریں خواب جس طرح ایک فرد کو تباہ کر کے رکھ دیتے ہیں اسی طرح آخر کار ایک قوم کو بھی زوال کی انتہائی حدود تک پہنچا دیتے ہیں تاریخ سے اس قسم کی لاتعداد مثالیں مل سکتی ہیں یونان، روما، مصر، بابل سب معراج پر پہنچ کر اسی خوش فہمی

ـہ خودی (منظوم) طارق — ۵۲۔ فلسفہ خودی (منظوم) طارق

ـشر خیال — سجاد انصاری — ۵۴۔ شیطان کا انتقام — اشک (عتابیہ)

[illegible] — ۵۶۔ خطوط غالب — مہیش پرشاد

ـت شاد — ڈاکٹر زور — ۵۸۔ نئے زاویے (افسانوں کا مجموعہ) مرتبہ کرشن چندر

ـموئے افسانے — سعادت حسن منٹو — ۶۰۔ آمد — سعادت حسن منٹو

ـپاپی ڈرامے — اپندر ناتھ اشک — ۶۲۔ زندہ جین (افسانے) تمنائی

ـتارہ گل (افسانے) ایم اسلم — ۶۴۔ شرم گناہ (افسانے) ایم اسلم

ـسلا (ناول) — مترجمہ مہدی علی خاں — ۶۶۔ پھریری (افسانے) عظیم بیگ چغتائی

ـ (ناول) — احسان علی شاہ — ۶۸۔ ٹالسٹائی کے افسانے — مترجمہ اکرام قمر

دنیائے آرزو (افسانے) مرزا ادیب — ۷۰۔ نقش اول (افسانے) صالحہ عابد حسین

ـڈرامے — مترجمہ خلیل احمد — ۷۲۔ تقدیر و تدبیر (افسانے) سیکش

ساز شکستہ (ناول) رشید اختر ندوی — ۷۴۔ کتاب العلم — لاہور

ڈرامائی — فضل الٰہی عارف — ۷۶۔ دستور الاصلاح — سیماب اکبرآبادی

مضامین نہرو — مترجمہ لالہ آسد نرائن لالہ — ۷۸۔ فلسفہ برگسان

ـول زرتشت — مترجمہ ڈاکٹر مسطور احمد — ۸۰۔ الف لیلہ و لیلہ — مترجمہ ڈاکٹر مسطور احمد

نظام کتب خانہ — سید بشیر الدین — ۸۲۔ شمع حرم — مرتبہ مہدی علی خاں

1- GHALIB — A ANWAR BEG

2- URDU FOR ADULTS — DR SAEEDUZZAFER

3- THE PROBLEM OF A NATIONAL LANGUAGE FOR INDIA — Z.A AHMED

آل احمد سرور ایم۔ اے

میں مبتلا ہوکر آخر کار انقلاب و زوال کا شکار ہوتے گئے۔

مسلمانوں میں یہ خوش فہمی کہاں سے آئی اور اس کے کیا اسباب و نتائج ہوے اس کا تلاش کرنا کچھ زیادہ دقت طلب امر نہیں ہے۔ یہ خوش فہمی یا غلط فہمی دراصل ان عالموں کی پیدا کردہ ہے جنھوں نے قرآن و حدیث کی آیتیں اور حدیثیں تلاش کرکے مسلمانوں کو قرب قیامت اور ان کی سب سے برتری و بہتری کا خوف دلالچ دلاتے رہے اور اس طرح اپنی بے عملی اور عدم صلاحیت کا جواز پیش کرتے رہے۔ قرآن و حدیث کی ان آیتوں پر بھی زر د ڈھکیل دیا جن سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ خدا کبھی اس قوم کی حالت نہیں بدلتا جس میں خود اپنی حالت بدلنے کی صلاحیت نہ ہو، بلکہ اس کے بجائے قوم کو خدا کے وعدے یاد دلا... اور اس طرح ان کو بے عمل رکھے رکھا اور بے حرکت رہنے پر قانع رکھا۔ مسلمانوں کو کرپا ابتدا ہی سے یہ باور کرایا گیا کہ ان کی تقدیر ہی میں افضل ترین قوم ہونا مقسوم ہے اس لیے اگر ... بھی تب بھی خدا ان کو اس حالت میں کبھی نہ رکھے گا بلکہ چونکہ یہ قوم خدا کی پسندیدہ ترین قوم ہے اس کے دن ضرور پھیر دے گا انھیں کسی قسم کا خوف، ہراس اور افسوس نہ کرنا ... ہونا کبھی ... قسم کی تلقین ... قسم کی ہدایت نے عام مسلمانوں کو بظاہر مطمئن یعنی بے خبر اور قانع کر دیا انھیں اپنا زوال زوال نہ نظر آیا انھیں اپنی پستی محض چند روزہ نظر آئی انھیں یہ قوی امید بندھ گئی کہ ... خدا ... کا ان ظہور میں لائے گا جس سے مسلمانوں کی حالت سدھر جائے گی اور دنیا کی اقوام میں وہ پھر سربلند ہو سکیں گے جہاں علما نے انھیں یہ تعلیم ان کی زبوں حالی کو چھپانے کے لیے دی تھی وہاں انھیں یہ بھی چاہیے تھا کہ وہ ناامیدی کو مٹانے کے ساتھ ساتھ دوسری طرف عمل کی بھی تعلیم دیتے علما خطیب اور شاعروں کو چاہیے تھا کہ اس امید اور وعدہ فردا سے جس کا وہ ہنگامہ برپا کیے تھے اس کو عملی شکل میں لانے کی بھی تدبیریں بتاتے لیکن یہ کام چونکہ مشکل تھا اس لیے ان سے نہ ہوسکا اور یوں بھی تھا کہ انھیں معلوم بھی نہ تھا کہ یہ دوسرا حصہ کس طرح عمل میں لایا جاسکتا ہے بے عملی کا سب سے آسان جواز یہ ہے کہ بغیر کسی قسم کی سعی کیے کسی کام کو خدا کے حوالے کر دیا جائے۔ ہمارے دینی اور دنیوی رہنما عرصے سے یہی کرتے رہے ہیں اور خدا کی آڑ لے کر خدا کی اس برگزیدہ اور پسندیدہ قوم

گو دھوکے دیتے رہے ہیں چنانچہ اس قسم کی تلقین کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ہم اس جگہ ہیں کہ ہمیں معلوم بھی نہیں کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ ہمارا نصب العین کیا ہے دنیا میں ہماری کیا پوزیشن ہونا چاہیے اور خدا نے ہمیں کس لیے بنایا تھا۔ ہماری حالت ایسی گومگو کی ہے کہ ہر رہنما کی طرف آنکھ اٹھاتے ہیں لیکن اسے [illegible] سے دور پاتے ہیں اور پھر چاروں طرف حالی نظر ڈال کر متوحش ہو جاتے ہیں۔

اس زوال و نکبت کی وجہ محض یہ غلط راہبری ہی نہیں بلکہ چند نقائص اور بھی ہیں علما نے کبھی جبر و اختیار کے مسئلہ کو حل نہیں کیا یہ مسئلہ ہمیشہ مبہم اور غیر واضح ہی رہا کہ انسان اپنے اعمال میں مختار ہے یا نہیں تعلقات دنیوی میں خدا اور بندے کے حدود کیا ہیں [illegible] اعمال کا مالک ہے یا ہمیں بھی کچھ اپنے ماحول کو درست کرنے کا اختیار ہے اس مسئلہ کے حل نہ ہونے کی وجہ سے ہماری قومیں کبھی یکسو اور یک طرفہ نہیں ہوتے پائیں [illegible] کے زمانے سے لیکر [illegible] ہے قرآن شریف میں کہیں اختیار کی تلقین معلوم ہوتی ہے اور کہیں محض صبر و شکر کی اور بظاہر اس متضاد و ناقابل عمل متضاد آرا کے گروہ پیدا کر دیے زوال و بدبختی کے زمانے میں تعرمن تشاء و تذل من تشاء کا ورد حالانکہ محض صبر کی تلقین کے لیے تھا لیکن اسے جمود و تعطل پیدا کرنے کے لیے استعمال کیا اور کرایا گیا۔ ہمارے دینی رہنماؤں نے کبھی لیس للانسان الا ما سعی کی طرف زور دیا اور زیادہ تر وعدہ خداوندی اور نزول مہدی کی طرف اشارہ اور ہدایت کرتے رہے دوسرا بنیادی نقص تاریخی ہے خلفائے عباسیہ کا دور اسلامی تاریخ کا اعلیٰ ترین دور ہے جس زمانہ میں اسلام گویا اپنے معراج پر تھا۔ تمام اسلامی شعائر اپنے انتہائے کمال پر تھے یہ سمجھا جاتا تھا کہ اسلامی تاریخ اپنے نقطہ عروج پر پہنچی ہوئی کہی جا سکتی ہے اس عروج پر پہنچ کر اسلامی مفکرین و مدبرین یہ نہ سمجھ سکے کہ اب ہم کس طرح اپنی ترقی کو بڑھا سکتے ہیں ان کی افواج زمانے کی بہترین تھیں اس لیے مزید عسکری ترقیوں کا خیال ان کے نزدیک بے سود ہو گیا ان کی تہذیب اعلیٰ ترین تھی [illegible] اصلاح ان کے لیے محض ایک اصطلاح بے مفہوم تھی ان کا اخلاق زمانہ میں سب سے برتر تھا اس لیے مزید اخلاقی جلا ان کے فہم سے دور تھی۔ ان کا علم دینی و دنیوی

اپنے دور کی معراج پر پہنچ چکا تھا اس لیے مزید وسعت کی گنجایش اس میں ان کو نظر نہ آئی۔ علمی فضا میں یہ حد بندی بہت کچھ مذہب کی وجہ سے بھی ہوئی۔ علمائے مذہب نے مزید علم کی موشگافیاں شیطانی کارفرمائیاں گردان کر اس سمت میں علم کو ایک حد سے زیادہ بڑھنے نہ دیا گویا وہی مذہب جو اسلام کی ترقی کا سبب بنا تھا۔ علوم میں ترقیاں ہوئی تھیں ابھی ایک حد پر پہنچ کر اس کے لیے زنجیر پا بن گیا۔ مختصر یہ کہ اسلام اپنی اس انتہا کو پہنچ کر سیاسی و اقتصادی طور پر ایک ایسی منزل پر پہنچ گیا جہاں اس کے لیے مزید ترقی ناممکن تھی چنانچہ زوال و نکبت کے آثار شروع ہو گئے آخرکار تاتاریوں نے اس شمع کو گل کر دیا اس عہد زریں کے بعد جتنے مسلمانوں نے سیاسی حکومتیں قایم کیں انھیں ہم تمامتر اسلامی نہیں کہہ سکتے بلکہ وہ زیادہ تر ذاتی کارنامے تھے جو شہنشاہیت قایم کرنے کیلیے سامراجی حوصلوں کی بنا پر کیے گئے اور یہ سامراجی ذاتی کارنامے بھی محض چند مخصوص ہستیوں کی ذات سے قایم رہ کر انھیں کی وجہ سے معدوم ہو گئے جن کی وجہ سے دیگر اسلامی حکومتیں برباد ہو گئیں تھیں عسکری و ذہنی قوتیں محدود ہو کر رہ گئی تھیں۔ آپس کے مذہبی مناقشات، بحری کارناموں کی طرف کم توجہی اور اقتصادی قوت کا محض چند افراد میں محصور ہو کر رہ جانا یہ ایسی بنیادی کمزوریاں تھیں جن کے باعث آخرکار یہ شاندار عمارت روز بروز کمزور اور کھوکھلی ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ جب ہم بیسویں صدی کی ابتدا میں آ کر آنکھیں کھولتے ہیں اور اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیتے ہیں تو پاتے ہیں کہ ہندوستان جو ایک دو صدی پیشتر مغلیہ خاندان کی عظمتوں کا مرکز بنا ہوا تھا ١٨٥٧ء میں اپنی آخری چمک دکھانے کے بعد اب پدرم سلطان بود کے تفکرات میں نعرہ زن ہے دنیاوی ترقیوں سے بدگمان ہے اور صرف قرآن کو اپنی دنیوی اور دینی ترقیوں کا حامل سمجھتے ہوئے بھی اسے جزدان میں بند رکھتا ہے یا بغیر سمجھے پڑھتا ہے دنیائے اسلام کی آخری خلافت یعنی خلافت عثمانیہ ترکی ایک مرد بیمار سمجھی جا رہی ہے اور اس میں ایسا گھن لگ گیا ہے جس کی وجہ سے تمام گرگان یورپ اسے نوچ لینے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں ہندوستان کا مسلمان ترکی کو ایک ایسی طاقت سمجھے ہوئے ہے جو اٹل اور بے پناہ ہے ایران روس و فرنگ کی نظروں میں ایک لقمہ تر نظر آ رہا ہے افغانستان فرنگ کی سیاست کا شکار ہو چکا اور مصر میں فرنگی ریشہ دوانیاں یہودیوں کی

طرح سے خون پینے پر تل گئی ہیں بلکہ انھوں نے اپنے چنگل میں خدیو مصر کو جکڑ لیا ہے

بیسویں صدی کی ابتدا سے لے کر اب تک کے حالات کا جائزہ لیجئے تمام واقعات کے اثرات اسلامی ممالک پر جو کچھ مترتب ہوئے ہیں تو حالت اور بھی افسوسناک نظر آئے گی ۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم ہوتی ہو کر گسان یورپ نے اپنے مفادات کا ایک دوسرے سے ٹکر لیتے ہیں ترکی کی سلطنت جو اس وقت تک غنیمت کہی جا سکتی تھی ٹکڑے ٹکڑے کر دی گئی مصر، عرب، فلسطین، ایران اور افریقہ کے اسلامی ممالک ہاتھ سے چلی گئیں وہ تمام تمنا و اتحاد جو کافی حد تک مسلمانوں کے دلوں کو جوڑے ہوئے تھا وطنیت کے نظریے خود غرضی کی چالوں اور فریب کی ترکیبوں سے ختم کر دیا گیا مصر ترکی کا دشمن ہو گیا عرب ترکی کے خلاف ہو گئے ایران ترکی سے پہلے ہی بد ظن تھا عراق کو بھی اس اتحاد سے الگ کر دیا گیا مغربی مدبرین کی سیاسی چالیں کامیاب ہوئیں اور اسلامی اتحاد فنا کی منزلوں میں پہنچ گیا جمال الدین افغانی نے اگر کچھ بیداری پیدا کرنی چاہی تو وہ سختی سے دبا دی گئی کیونکہ سیاست محض ایک شخص کا کام نہیں ہوا کرتا جب تک تمام قوم کے افراد میں اس کی صلاحیت پیدا نہ ہو جائے۔ اسلامی ممالک کے سلاطین اپنی اپنی خود غرضی کے طلسمی پھندوں میں گرفتار عقل کے دشمن ہو رہے تھے چنانچہ جنگ کے اختتام پر جب ہم اسلامی ممالک پر نظر ڈالتے ہیں تو ہر ملک خستہ بے روح اور اپنی حیات کے لئے غیروں کا محتاج نظر آتا ہے ترکی محض ایشیائے کوچک میں محدود کر دیا گیا اس کی مغربی، مشرقی اور جنوبی وسعتیں تمام تر ختم کر دی گئیں ایران تو ہمیشہ سے ایک ناکارہ سیاسی ملک رہا ہے اس کی حالت جیسے پہلے تھی اب بھی تقریباً ویسی ہی باقی رہی تمام نام نہاد ترقیاں محض دل خوش کن باتیں تھیں جس طرح وہ پہلے روس و برطانیہ کے رحم و کرم پر تھا ویسے ہی وہ بعد کو بھی رہا۔ عرب و عراق بظاہر آزاد ہو گئے لیکن مندوب کا طوق گلے میں پڑا رہا فلسطین سے جو معاہدے کیے گئے تھے ان کا پورا کرنا تو درکنار یہودیوں کو داخل کر کے ان کی آزادی اور زندگی بھی ختم کر دینے کی کوشش کی گئی مصر اسمٰعیل کے زمانہ سے جیسا پابند غیر چلا آ رہا تھا ویسا اب بھی رہا اسی طرح افریقہ کے دیگر اسلامی ممالک بھی غیروں کے چنگل میں گرفتار رہے

زمانہ ایک کروٹ اور لیتا ہے جرمنی میں ہٹلر اور اٹلی میں مسولینی دو آمر پیدا ہوتے ہیں پہلی جنگ عظیم

میں جرمنی بے حد کچل دیا گیا تھا چنانچہ وہاں غم و غصہ کے شعلے بھڑکتے رہے اور آخرکار تاریخی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ایک ہٹلر وہاں پیدا ہو گیا اٹلی کو جنگ عظیم میں بطور حلیف کے لوٹ کھسوٹ میں مال کم ملا تھا اس لیے وہاں بھی بے چینی تھی جس سے مسولینی نے فائدہ اُٹھایا اور اطالویوں کو اس قدر مضبوط کر دیا کہ وہ [illegible] کرنے کر دوسرے ملکوں پر ڈورے ڈالنے لگیں جرمنی اگر اپنی پست حالی کو دور کر کے اپنی حالت [illegible] پر مطمئن ہو جاتا تو کوئی ایسا شکایت کا موقع نہ تھا لیکن اس نے حوصلہ مندی کا حریصانہ ثبوت دیا یعنی اپنی طاقت کے زعم میں دوسرے ممالک کی آزادی و زندگی چھین کر ان پر ستم شروع کر دیے یہ [illegible] کر اسے کوئی برداشت نہ کر سکے گا۔ جاپان الگ دہن آز پھیلائے ہیں اور جزائر ہند و ہندوستان ہڑپ کر جانے کی فکر میں ہے غرضکہ ظلم، خود غرضی [illegible] مظاہرے ہیں جس کے پاس ذرا سی طاقت ہے وہ کمزور کو ختم کر دینا چاہتا ہے اور کر رہا ہے ہر طرف بربریت اور بہیمیت آشکارا ہے ابھی تک بھیڑیے [illegible] ہیں اس لیے بعض بھیڑیں بچ گئی ہیں جب بھیڑیوں کی جنگ ختم ہو گی تو پھر ایک بھی بھیڑ سلامت نہ رہے گی۔

شیطانیت کے اس فتنہ و فساد کے پُر آشوب دور میں ذرا اسلامی ممالک کی حالتوں پر نظر ڈالیے مسلمان ترکوں کی طرف سے بڑے خوش عقیدہ رہے ہیں اور ترکی ان کے نزدیک [illegible] ملک ہے جو آہنی اور ناقابل تسخیر قوت رکھتا ہے یہ بھی ایک ایمانی غلط فہمی ہے ترک دول یورپ کے مقابلہ میں محض ایک تیسرے درجہ کی طاقت ہے یا معمولی دوسرے درجہ کی یہ تو ہر ایک کو معلوم ہے کہ [illegible] اب نہیں رہا ہے جبکہ ذاتی شجاعت اور فطری بہادری جنگ کے نتائج طے کیا کرتی تھی فتح و شکست اب بموں، ہوائی جہازوں اور ٹینکوں سے طے ہوتی ہے بم، ہوائی جہاز اور ٹینک بنانے کے لیے ظاہر ہے کہ لوہا کوئلہ اور تیل کی ضرورت ہے جن ممالک میں یہ معدنیات زیادہ ہوں گی وہی ملک اب طاقتور کہا جائے گا ترکی میں معدنیات بے حد کم ہیں ساتھ ہی اس کا مالیہ بھی کمزور ہے [illegible] اپنے آپ کو اتنا مسلح نہیں کر سکتا جتنا کہ وہ ممالک جن کے پاس کہ یہ ذخائر موجود ہیں۔ عرصے سے ترکی نے بیرونی قرضہ بھی لینا ترک کر دیا ہے غرضکہ ترک اپنی خیالی شجاعت پر جس قدر چاہیں مغرور ہو کر [illegible]

اور ایک ایک فرد اپنے وطن پر قربان ہو جائے لیکن اس کے پاس نہ سرمایہ زیادہ ہے نہ معدنیات کے ذخائر اس لیے اگر اس کی کسی مضبوط طاقت سے جنگ چھڑ گئی تو نتیجہ زیادہ عرصہ تک ملتوی نہ رہے گا آج کل ترکی اپنی غیر جانبداری جو کچھ قایم رکھ سکا ہے وہ اس کی اپنی جائے وقوع کی بدولت ہے جو بحر اسود کا دربان ہونے کی حیثیت سے روس، برطانیہ اور جرمنی سب اس کی دوستی کے عرصہ سے متمنی رہے ہیں ترکی کی سیاست اس معنی میں دانشمندانہ ہے کہ تینوں کا توازن قایم رکھے ہوئے ہے اور اسی میں اس کی سلامتی مضمر ہے غرضیکہ ترکی کی حالت کو بحیثیت مجموعی ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ موجودہ خلفشار میں اس کی ہستی اس کے اپنے اختیار میں ہوا [illegible] نہیں کہ سکتے کہ انسان تو ثانی [illegible] کو [illegible] ہے

ایران کی حالت جیسا کہ میں پیشتر تحریر کر چکا ہوں زیادہ ناگفتہ بہ رہی ہے شاہانِ قاچار کی فضول خرچیاں اور بدانتظامیاں تو سب کو معلوم ہیں خیال تھا کہ رضا شاہ پہلوی ایران کی حالت بالکل درست کر دیں گے لیکن تھوڑی بہت جو کچھ اصلاحات انھوں نے کیں وہ زمانے کے حالات دیکھتے ہوئے بہت ناکافی تھیں۔ عمال کی تقرری کا وہی طریقہ رہا کہ رشوت لے کر آسامی دی جاتی تعلیم کی طرف بہت دیر میں توجہ کی گئی۔ فوجی قوت کو مستحکم اور جدید بنانے کی بہت کم کوشش کی گئی خارجی پالیسی اندرونی خرابی کی وجہ سے دوسروں کے رحم و کرم پر رہی چنانچہ آخر کار نتیجہ یہ ہوا کہ فرنگی اور روسی سیاست کا شکار ہو گیا اور جب کسی زبردست طاقت کو فرصت ملے گی اس کی ہستی تمام تر ختم کر دی جائے گی۔

مصر کی حالت بھی نہر سوئز کی وجہ سے بہت سقیم رہی ہے خدیو اسمٰعیل نے جو فضول خرچیاں کی تھیں اور قرضہ لیا تھا اس کی وجہ سے مصر جس مصیبت میں پھنسا اس سے ابھی تک نہیں نکل سکا زغلول پاشا کی عمر فرنگی طاقتوں کو دور رکھنے میں ختم ہو گئی سنہ ۱۹۳۶ء میں سولینی کی فسطائیت کے ڈر سے نام نہاد آزادی جو دی گئی اس کی شرایط کسی سے پوشیدہ نہیں نہر سوئز کی وجہ سے برطانوی فوجیں اب بھی وہاں موجود رہیں گی اور مصری آزادی محض نام کی جا سکتی ہے۔

عراق، شام، فلسطین، عرب اور شمالی افریقہ کے ساحلی ممالک یعنی طرابلس، الجزائر اور مراکش

وغیرہ غلام زیادہ اور آزاد کم ہیں۔ عراق نیم آزاد ہے اور اپنی خارجی پالیسی میں دوسروں کا پابند۔ شام کو بھی خوش کرنے اور رکھنے کے لیے اسے نیم آزادی کا درجہ دیدیا گیا ہے۔ فلسطین میں بھی گو مگو کا عالم ہے۔ ابن سعود عرب میں بباطن تو انگریزوں کے مخالف ہیں لیکن کمزوری کے باعث بظاہر ان کے حلیف بنے ہوئے ہیں اور آج کل سیاست ظاہری میں بہت کچھ کام کرتی ہے۔ شمالی افریقہ کے ممالک بھی دوسروں کے پابند ہیں اور باوجود اسلامی اور قومی جوش ہونے کے بھی بے زری اور بے اسلحہ ہونے کی وجہ سے تقریباً غلام سے ہوئے ہیں۔ افغانستان بھی ایک چھوٹا آزاد ملک ہے لیکن اس کی خارجی پالیسی اس کی اپنی تنگی، بے سامانی اور ذخائر کی کمی اسے بھی دوسروں کا ممنون و پابند بنائے ہوئے ہے۔ چین، جاوا، چینی ترکستان اور جنوبی افریقہ کے مسلمان کوئی اپنی سیاسی اہمیت نہیں رکھتے ان کی زندگی تاجرانہ یا محکومانہ ہے۔

یہ ہے ایک مختصر سا خاکہ تمام ممالک اسلامیہ کی حالت کا جس سے ہم اخذ کر سکتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کی حیثیت دنیا کے دیگر ممالک کے مقابلہ میں کیا رہ گئی ہے۔ گزشتہ زمانہ میں ان کی حالت چاہے جیسی رہی لیکن موجودہ حیثیت بالکل ان بھیڑوں کی طرح ہے جو کسی درندے کے دہن میں جانے کے لیے وقف ہو چکی ہوں اور فی الحال خود درندوں کی آپس کی جنگ اور عدیم الفرصتی کے باعث اپنی زندگی کے دن کسی نہ کسی طرح پورے کر رہی ہوں۔

ذرا اس تباہ حالی اس بدبختی پر پھر سے غور کر لیجیے کہ وہ کیا اسباب تھے جن کی بدولت دنیا کی اقوام کے مقابلہ میں عالم اسلام کی یوں مٹی پلید ہو رہی ہے؟ اسباب زیادہ غور طلب نہیں ہیں۔ اصل بات یہی ہے کہ مسلمان دنیا کے بجائے باوجود لاتغلو فی الدین کے حکم کے، دین میں زیادہ غلو کرتے رہے۔ دین کے حاملین نے دنیاوی اور خصوصاً دنیاوی علوم کے حصول میں پابندیاں لگا دیں یہ کہہ کر کہ سب کچھ قرآن میں موجود ہے اس سے زیادہ جاننے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے بجائے وہ داخلی علوم کو اہمیت دیتے رہے۔ تصوف، فلسفہ، منطق اور علم الکلام وغیرہ۔ علوم دنیوی ہیئت و کیمیا وغیرہ کی طرف جو کچھ توجہ ہوئی وہ بہت کم تھی اور اس میں زیادہ انہماک مذہبی پابندیوں کی وجہ سے نہیں دیا گیا نیز ان کی

زیادہ ہمت افزائی بھی نہیں کی گئی غذائی رموز جاننے کا طریقہ کچھ اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اس کے برخلاف
دوسری قومیں باوجود کم مہذب ہونے کے دنیاوی علوم میں ترقی کر گئیں کانوں سے کوئلہ نکالا گیا
انجن ایجاد کیا گیا بجلی دریافت کی گئی پٹرول نکالا گیا وغیرہ وغیرہ چنانچہ دنیاوی امور میں دیگر قومیں
ترقی کر گئیں اور مسلمان تصوف عشق اور جنت و دوزخ کی بحثوں میں الجھے رہ گئے۔ دوسری وجہ مسلمانوں
میں اختلال اور زوال آنے کی آپس کی خانہ جنگی ہے جس کی [illegible] بھی ہو یعنی شیعہ سنی کی جنگ [illegible]
کے جھگڑے اور اُس وقت سے دنیاوی حکومت کے لیے آپس میں ان دونوں کے جھگڑے جس کے
اکسانے میں منافقین اور دیگر عقیدے کے لوگوں کا کم حصہ نہیں [illegible] جاری ہیں سب سے آپس کے
اس تفرقہ نے مسلمانوں کو کھوکھلا اگر نہیں تو کم از کم بے حد کمزور کر دیا۔ شیعہ سنی کے علاوہ دوسرے
فرقے بھی اسلام میں پیدا ہوتے گئے جیسے [illegible] کر دیا [illegible]
[illegible] کی بدترین مثال ہے۔ اس آپس کے تفرقہ کی وجہ سے انہیں اس امر کا خیال ہی نہیں رہا کہ ابھی
اسلام کے دیگر مخالفین سے بھی سروکار ہونا ہے چنانچہ وہ دست بگریبان ہو گئے جو مسلمانوں کو آپس میں
[illegible] کمزور ہوتی گئی تنظیم و انتظام میں رخنہ آیا اور آخر کار رفتہ رفتہ ان کے اپنے فتح کیے
ہوئے ممالک بھی ان کے ہاتھوں سے نکل گئے اسپین، سسلی وغیرہ کو کون یاد نہیں کرتا؟ آپس کا اختلاف
جہاں اخلاقی امور میں اختلال پیدا کر دیتا ہے وہاں وہ تمام خرابیاں بھی پیدا کر دیتا ہے جو کسی ایک
[illegible] وابستہ ہوتی ہیں خلفائے راشدین کے بعد سے جمہوریت باوجود اسلامی تعلیم ہونے کے نہیں
[illegible] نہیں دیتی۔ اُمیہ، عباسیہ، فاطمی، عثمانی جتنے خلفا ہوئے سب میں خلافت پدر
سے پسر کو تفویض ہوتی رہی کبھی عام مسلمانوں کو دعوت نہیں دی گئی کہ وہ اپنے خلیفہ کا انتخاب کریں۔
خلافت کیا وہ گئی تھی بادشاہت تھی جو تمام [illegible] کے ساتھ جلوہ آرا ہو گئی تھی شہنشاہیت میں
یہ ضروری نہیں ہوتا کہ ہر جانشین صاحب فہم و ادراک بھی ہو چنانچہ جب تک ایسے خلفا سمجھدار اور
[illegible] قائم رہی لیکن جو خلیفہ نا سمجھ ہوا اور بدقسمتی سے اسے وزیر بھی
بے تدبیر میسر ہوئے آیا وہ عیش و عشرت میں پڑ کر تباہ ہوا اور اپنی قوم کو برباد کیا تاتاریوں نے

جب بغداد تباہ کیا تو وہ خلفائے بنو عباسیہ کی عیش پرستیوں کی صحیح سزا تھی جو انھیں ملی تیسری بہت بڑی وجہ مسلمانوں کی کمزوری کی تصوف کا تباہ کن فلسفہ تھا کسی قوم کی تعلیم سے اس کا حال و مستقبل [illegible] کی وجہ ابھی صحیح نہیں معلوم ہو سکی کہ تصوف کہاں سے اور کیونکر مسلمانوں میں در آیا لیکن جب سے اسلام ایران میں پہنچا ہمیں تصوف ہر دو [illegible] نمایاں دکھائی دیتا ہے اخلاقی تعلیم کی [illegible] پر رہی تھی تصوف ایک طرف تو علم کی خاطر فنا فی اللہ ہونا سکھاتا ہے دوسری طرف عشق یعنی محبت۔ اول تو مسلمان کے لیے فنا فی اللہ ہونے کی ضرورت ہی نہیں حقیقت کی [illegible] کی ضرورت پیغمبر کے بعد باقی نہیں رہتی جو کچھ حقیقت تھی اسے پیغمبر نے معلوم کر کے [illegible] لیے اخلاقی اصول بنا دیے خود قرآن اسی لیے اترا کہ اخلاقی تربیت و داخلی علمی کاوشیں جو کچھ [illegible] پیدا ہوتی ہیں سکون پذیر ہو جائیں پھر بھی صوفیا حضرات نے فنا فی اللہ کا درس قناعت و توکل کی صورت میں دینا شروع کیا۔ حقیقت مصنوعی باتوں میں ڈھونڈی جانے لگی اس سے [illegible] و مسلمان متوکل ہو کر دوسروں کا محکوم ہو گیا دوسری طرف عشق کی مدعت مسلمانوں میں ایسی پھیلی کہ جس نے اخلاق اور ایمان دونوں کو تباہ و برباد کر دیا عشرت اور فحاشی دونوں کے لیے عشق مجازی کے پردہ میں ایک جواز قایم ہو گیا جس نے صدیوں مسلمانوں کو صراط مستقیم سے دور گم کردہ راہ رکھا اور بعض جگہ اب بھی اس مصنوعی حقیقت سے مسلمانوں کو چھٹکارا نصیب نہیں ہوا جب قوم ان نیم حقیقی باتوں یا متخیلانہ حقیقتوں میں پڑی ہو تو نہ فرد مضبوط رہتا ہے نہ قوم۔ ایک جھوٹا [illegible] پیدا ہو جاتا ہے جو شعلہ حیات کو مشتعل رکھتا ہے چنانچہ مسلمان اپنے زعم میں دنیا کی دیگر اقوام کو اپنے سے کمتر ذلیل، کمزور اور بزدل سمجھتے رہے انھوں نے فن حرب کو ایک محدود ترقی سے [illegible] کچھ وسعت نہیں دی تیر و تلوار، توڑے دار بندوق سے لڑنے اور میمنہ و میسرہ اور قلب قایم کرنے کے علاوہ فن حرب میں انھوں نے کوئی جدت نہیں کی۔ انسان جب اپنے کو گرد و پیش سے محفوظ پاتا ہے تو وہ مطمئن ہو کر آرام یعنی عشرت کرنے لگتا ہے اور وہیں سے اس کی کمزوری شروع ہو جاتی ہے [illegible] زیب کا یہ اصول کس قدر صحیح تھا کہ وہ ملک کو مستعد رکھنے کے لیے مصروف ہو کر [illegible]

مشغول رکھا جائے، حکومت فوج سے قائم رہتی ہے اور فوج کو مضبوط رکھنے کے لیے صرف یہ ضروری نہیں ہے کہ انھیں تنخواہیں وقت پر ملتی رہیں بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی مشق اصلی یا مصنوعی جنگوں میں کرتی رہیں ساتھ ہی فن حرب کے متعلق ماہرین حرب نئے نئے ایجادات کے ساتھ ساتھ نئی نئی چالیں بھی سوچتے رہیں مسلمانوں نے عشرت و اطمینان میں یہی چیز باقاعدہ نہیں کی چنانچہ دوسری قوموں نے فن حرب کو ایک منظم علم و فن کی طرح ترقی دے کر دنیا کو اسی طریقے سے لڑنے والوں پر فتح حاصل کی۔ ہندوستان میں فرنگی فتوحات بہت کچھ اسی فن کی برتری کا نتیجہ تھیں۔

یہ ایک مختصر سی فہرست ان اسباب کی جن کی بدولت دولت اسلام میں گھن لگتا گیا۔ بنیادیں کمزور ہوتی گئیں اور آخر کار ساری عمارت منہدم ہو گئی اور اب یہ حالت ہو گئی ہے کہ اسلامی ممالک تو باقی ہیں لیکن ان کی سیاست، ان کی آزادی اور ان کی زندگی ان کے اپنے بس کی نہیں ہے مسلمان زندہ اور باقی ہیں اور غالباً ان کی آبادی پچھلے قرنوں سے کہیں زیادہ ہے لیکن وہ شعلۂ گرم جو ان کے سینوں کو ہمیشہ روشن اور گرم کیے ہوئے تھا اب افسردہ ہو گیا ہے خیال و عمل کی وہ وحدت جو گزشتہ جنگ عظیم تک نام نہاد خلافت کے سلسلے سے باقی تھی وہ ختم ہو گئی یا کر دی گئی مسلمان اب بھی زندہ ہیں لیکن سب سے بڑی کمزوری ان میں اب یہ ہے کہ وہ افسردہ شعلہ جو ان کے سینوں میں بجھتا سا معلوم ہوتا ہے اسے صحیح طور پر سلگانے اور اس سے کام لینے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ ہمارا وجود اب بھی سرگرم عمل ہو سکتا ہے لیکن صحیح راستہ نظر نہیں آتا ہمارا سیاسی، معاشی، ملی یا تعلیمی کسی قسم کا صحیح نصب العین بھی نہیں ہے جسے سامنے رکھ کر ہم کسی طرف گامزن ہو سکیں صحیح نصب العین کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ محض خیالی نہ ہو لائق عمل ہو بعید ہو اور اتنا بعید کہ افراد اسے ضروری سمجھ کر اس کی طرف خود بخود کھنچ کر کسی پروپیگنڈے کے مائل ہو جائیں۔ مشرق سے لے کر مغرب تک سارے اسلامی ممالک پر نظر دوڑائیے بیشتر ممالک میں کوئی سیاسی بیداری یا سیاسی نصب العین ہی نہیں ہے بعض جگہ نصب العین ہے تو صحیح نہیں اور اس لیے وہ مقبول نہیں جب تک جمیع مسلمانوں کا ایک متحدہ اور صحیح نصب العین نہ ہوگا اسلامی سیاست اور مسلمان کہیں بھی لائق اہمیت نہ ہو سکیں گے صحیح نصب العین اور صحیح ہدایت خود

ہندوستان کی آبادی ۱۹۴۱ء

ہندوستان میں آبادی اور اس کے متعلق دوسری معلومات مردم شماری کے موقع پر جمع کی جاتی ہیں اس مرتبہ مردم شماری تو ہوگئی اور معلومات بھی فراہم کرلی گئیں لیکن حکومت ہند اور صوبجاتی حکومتوں نے جنگ کے مصارف کی زیادتی کی وجہ سے اس کام میں بڑی تخفیف کردی اس لیے اس مرتبہ تفصیلی جدولیں نقشے اور مفصل رپورٹیں شائع نہیں ہوں گی ان مجبوریوں کی وجہ سے ہندوستان کی آبادی کے متعلق کوئی جامع اور تنقیدی مضمون لکھنا بہت دشوار ہے البتہ حکومت نے چند مختصر اعداد شائع کر دیے ہیں اور چونکہ ان سے زیادہ اشاعت کی امید نہیں لہذا انہی کو بحث و مباحثہ اور تنقید کی بنیاد قرار دینا پڑتا ہے۔

ہر سوسائٹی میں دولت کی فراوانی کا انحصار تین عاملوں پر ہے ان میں سے ایک خود حضرت انسان ہیں، کیونکہ انہی کی مدد سے وسائل قدرت سے پورا پورا استفادہ کرکے ملک کی دولت میں اضافہ کیا جاتا ہے لیکن واضح رہنا چاہیے کہ محض انسانوں کی زیادتی کسی ملک کے معاشی معیار کو بلند کرنے کی تنہا ذمہ دار نہیں ہے چنانچہ ایک طرف اگر ایسے ملک نظر آتے ہیں جہاں وسائل قدرت کی افراط ہے مگر انسانوں کی کمی کی وجہ سے ان سے فائدہ نہیں اٹھایا جا رہا تو دوسری طرف ایسے ملک بھی ہیں جہاں آبادی کی کثرت کے باوجود خوشحالی اور مرفہ الحالی کا معیار پست ہے بہرحال اس استثنا کو چھوڑ کر یہی کہا جا سکتا ہے کہ پیدائش دولت کے نقطہ نظر سے آبادی میں اضافہ مفید ہے لیکن جو دولت پیدا کی جاتی ہے وہ انسانوں ہی میں تقسیم ہوتی ہے اور آبادی جتنی زیادہ ہوگی اسی قدر دولت زیادہ درکار ہوگی یا پیدا شدہ دولت کی مقدار اگر کم ہے تو ہر شخص کے حصے میں دولت کی مقدار کم آئے گی گویا تقسیم دولت کے لحاظ سے آبادی کا کم رہنا ہی مفید ہے بظاہر یہ دو متضاد باتیں معلوم ہوتی ہیں لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی صورت بھی ممکن ہے جہاں آبادی نہ اتنی زیادہ ہو کہ دولت کا تناسب فی کس بہت کم ہو جائے اور نہ آبادی اتنی کم ہو کہ قلت کی وجہ سے وسائل قدرت سے پورا پورا استفادہ نہ کیا جا سکے یہی وہ نقطہ ہے جہاں سے آبادی کا بڑھنا یا گھٹنا دونوں مضر ہیں اور اسی کو کسی

[illegible] بجز قلوب کو کھینچتی ہے۔ افسوس کہ ہمارے یہاں نہ وہ ہے نہ یہ [illegible]

[illegible] بڑی کمزوری جو موجودہ [illegible] اور اسلامی [illegible] میں رخنہ انداز ہو رہی ہے وہ مالی کمزوری ہے یہ صحیح ہے کہ اسلام نے دنیاوی مال و اسباب کو زیادہ وقعت نہیں دی لیکن اس کے [illegible] سرا سر نظر انداز کر دیا جائے۔ دنیا دنیاوی اشیا سے زیر ہو سکتی ہے البتہ یہ صحیح ہے کہ دنیا ہی مقصود حیات نہ ہو جائے۔ ایمان کی برتری اور اولیت قائم رہے لیکن مسلمانوں نے درویشی [illegible] استغنا اور فقر کی تعلیمات کی بدولت معاشی بہتری کی طرف بہت کم توجہ کی نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان قوم دیگر اقوام کے مقابلہ میں بہت بے مایہ اور غریب ہو گئی ہے جیسا کہ میں نے عرض کیا دنیا کا کام دنیا سے چلتا ہے کوئی سیاسی یا معاشی نصب العین کیسا ہی مفید، کتنا اہم اور کتنا ہی شدید ضروری کیوں نہیں چلایا جا سکتا جب تک کہ اس کی مالی حالت مضبوط نہ ہو اس میں حسب منشا کامیابی اس وقت ہو سکتی ہے جبکہ سیاسی نصب العین کی تنظیم اور نشر و اشاعت منظم طور پر ہو سکے اور یہ آج کل اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ معاشی حالت اس ادارہ یا انجمن کی مستحکم ہو یہ صحیح کہ "مشک خود بو ید" لیکن مشک کی خوشبو دور تک نہیں پہنچ سکتی پرانے زمانے میں یہی کام ایلچیوں، پیغامبروں اور واعظین کے ذریعہ ہوا کرتا تھا لیکن آج کل جبکہ زمان و مکان پر کافی حد تک عبور حاصل ہو چکا ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ کسی سیاسی نصب العین کو جلد تر، تمام تر اور بخوب تر عوام الناس تک پہنچایا جائے ساتھ ہی اس ادارہ کا مالیہ مستحکم بنیادوں پر قائم ہو اور ادارہ کا مالیہ اسی وقت مستحکم ہو سکتا ہے جب قوم کے پاس کافی سے زیادہ زر ہو غربت [illegible] صرف یہ کہ سیاسی عمل خوب نہیں ہو سکتا بلکہ اس کا اثر فرد کے اخلاق پر بھی پڑتا ہے بے حیائی بے لبسی اور کمتری کا احساس، ایمان کا متزلزل ہونا، جرائم کا اختیار کر لینا اور صحت کا تباہ کر لینا یہ سب غربت کے مصائب ہیں جو ہر غریب قوم میں پیدا ہو جاتے ہیں مسلمان ہمیشہ سے غریب رہے ہیں اور اتنے غریب رہے ہیں کہ غربت کو انھوں نے اپنی زندگی کا ایک جزو سمجھ لیا ہے اور اس سے یہ قوم اتنی مانوس ہو گئی ہے کہ انہیں اپنی غربت کا احساس بھی نہیں رہا ہے یہ وہی صوفیانہ قناعت کی تعلیم ہے جس نے ایمان و اخلاق کو کسوٹی پر رکھنے کے لیے اس قسم کی تلقین کو جائز رکھا اور اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں

اپنے نفس کا تزکیہ بہت کچھ اس سے کیا لیکن تزکیۂ نفس ہر عام شخص کے بس کی بات نہیں ایک عامی کا اخلاق غربت میں ضرور بگڑ جاتا ہے موجودہ زمانہ اس امر کا مقتضی ہے کہ اب ضمیر کا مزید تزکیہ نہ کیا جائے بلکہ بقدر ضرورت ضرور معاش حاصل کی جائے اور اس کے بعد قوم کی خاطر وافر سرمایہ حاصل کیا جائے مسلمان اپنے اندر اتنی استطاعت ضرور پیدا کرے کہ کسی غیر قوم کا پابند دست نگر نہ رہے لیکن یہ امر مدِ نظر رہے کہ دنیا مقصد حیات نہ بنائی جائے بلکہ اگر صدیق اکبر کی طرح کل نہیں تو عمر کی طرح ضرور [illegible] قوم کے لیے اپنے تمام اثاثے کا نصف [illegible] تیار رہے۔

تیسری اور آخری اہم کمزوری موجودہ دور کے مسلمانوں میں ان کی اخلاقی کمزوری ہے آپس کا نفاق اور منافقت حد سے زیادہ ہے۔ یہ نفاق و منافقت کچھ تو اقتصادی وجوہ سے ہوتی ہے اور کچھ ذاتی بغض و عناد، حسد و رشک کی وجہ سے وجوہ کچھ ہوں نتیجہ بے عملی اور بدعملی ہے کوئی تحریک کوئی پروگرام اور کوئی نصب العین عمل پذیر نہیں ہو سکتا جب تک کہ آپس میں یکجہتی، یکدلی اور اتحاد نہ ہو یگانگت کا احساس ہی رسی کو مضبوط کر دیتا ہے برادرانہ اخوت اور بھائی چارہ اگر پیدا ہو جائے تو کوئی عمل ایسا نہیں جو انجام پذیر نہ ہو سکے اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب حسد و خود غرضی کا بیج دل سے نکال دیا جائے قوم کی خاطر جب کوئی کام کیا جائے اس میں جہاں خودی اور خود غرضی شامل ہو گئی وہیں سے وہ کام ناکامیاب ہونا شروع ہو جائے گا آج مغربی تعلیم کے زیر اثر مذہب کو ایک ذاتی اور نجی چیز سمجھا جانے لگا ہے یہ اسلام کے خلاف ایک زبردست اور سخت پروپیگنڈہ ہے ممکن ہے دوسرے مذہب ذاتی اور نجی ہوں لیکن اسلام تمام تر ملی اور جماعتی مذہب ہے یہ وضع ہی اس لیے کیا گیا ہے کہ جماعتوں میں یکدلی یکجہتی اور اخوت پیدا ہو اور وہ کسی کام کو متفقہ طور پر انجام دے سکیں لیکن مغربی تعلیم ہمیں تفرق کا پیغام دے رہی ہے یہ سمجھا کر کہ مذہب تو محض ایک انفرادی اور شخصی عقیدہ ہے اس انفرادیت نے جہاں مذہب کی رسیاں ڈھیلی کر دی ہیں وہاں افراد میں ایک انانیت پیدا کر کے جماعتی اور ملی بھائی چارہ کو سرے سے نیست و نابود کر رکھا ہے کوئی مخالف اسلام زہر اس سے زیادہ کڑوا نہیں ہو سکتا اسلام تو جماعت، قوم اور پوری سوسائٹی کو متحد و منظم کرنے والا مذہب ہے

لیکن اب اسے بالکل اس کی اسپرٹ کے خلاف ذاتی، انفرادی اور نجی عقیدہ کے طور پر نامزد کیا
ہے مسلمانوں کو تمام اقوام سے زیادہ اس غلط تعلیم سے نقصان پہنچے گا کیونکہ مسلمانوں میں ہمیشہ
اسلام ہی ایک جوڑنے اور متحد کرنے کی چیز رہا ہے یہی مذہب ہے [illegible] میں مشترک محاذ پر لاکر
کھڑا کیا ہے اس عقیدہ کے علاوہ دوسری قوموں کی طرح وطن، نسل، رنگ یا تہذیب وغیرہ انھیں کسی امر میں
متحد کرنے والی نہیں رہی ہے اسی کی بدولت چین و مراکش کے مسلمان ایک دوسرے کو اپنا
بھائی سمجھتے رہے ہیں لیکن اب مغربی تعلیم کے زیر اثر انفرادیت کی روح پھونکی جا رہی ہے جو یقیناً اسلام
کے لیے نہایت کاری حربہ ثابت ہوگی۔ نہ صرف یہ کہ اس سے مسلمان غیر متحد ہو کر علیحدہ
علیحدہ دوسروں کا شکار ہو جائیں گے بلکہ ان میں ایک من حیثیت قوم احساس کمتری پیدا ہو جائے گا
جو انھیں اپنے آپ کو ایک برگزیدہ قوم سمجھنے کے بجائے دوسروں کی طرح ایک معمولی قوم سمجھنے پر مجبور
کر دے گا اس کے اثرات ابھی سے شروع ہو چلے ہیں اور احتمال ہے کہ دس بیس سال کے اندر ہی مسلمانوں
میں وہ احساس کمتری پیدا ہو جائے گا جس کی کوئی مثال نہ دیکھا ہی اچھا ہو۔

آخر میں لامحالہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا کوئی ایسی صورت یا صورتیں ہیں جن سے مسلمان قوم
کا دوبارہ احیاء ہو سکے وہ پھر اپنی خرابیاں دور کر کے اپنی حالت سدھار سکیں اور پھر اقوام عالم کے مقابلہ
میں وہ سربلند و ممتاز ہو سکیں؟ جواب یہ ہے کہ اگر قوم میں اپنی حالت سدھارنے کا احساس ہو تو کیا کچھ
نہیں ہو سکتا لیکن اگر اس میں احساس نہیں تو سوالات و جوابات دونوں عبث ہیں۔

سید مزمل حسین

موجودہ جنگ کا ایک رخ

(اس مضمون اور اگلے مضمون میں بحث طلب مسئلے ہیں اور ہر ایک نے اپنا اپنا خیال پیش کیا ہے اگر کوئی صاحب ان کا جواب لکھنا چاہیں تو رسالے کے صفحات ان کے لیے حاضر ہیں۔ مدیر)

موجودہ جنگ کی بابت بہت سی باتیں الجھن میں پڑی ہیں۔ سادہ لوح انسان یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ جنگ کیوں شروع ہوئی؟ جرمنی کو اس درجہ مسلح ہونے کا موقع کیوں دیا گیا کہ اس کو تمام دنیا کے خلاف برسر پیکار ہونے کی ہمت ہو گئی؟ انگلستان اور فرانس کیوں مسلح نہ ہوئے؟ چیکوسلاواکیا جرمنی کے نذر کیوں کر دیا گیا۔ پولینڈ پر حملہ ہوا تو دول متحدہ نے صرف ریڈیو کے ذریعہ سے لفظی جنگ کرنے پر کیوں اکتفا کیا؟ انگلستان نے فرانس کو خاطر خواہ [illegible] مدد کیوں نہ دی؟ روس جرمنی میں اتحاد ہو کر کیوں ٹوٹ گیا؟ ہندوستان میں دو سال قبل وہ سب کچھ کیوں نہ ہوا جس کیلئے سر اسٹیفورڈ کرپس تشریف لائے؟

اگر یہ عرض کیا جائے کہ یہ تمام امور جو واقع ہوئے ان کی صرف ایک وجہ ہے تو ناظرین باور نہ کریں گے لیکن متفکر طبیعتیں سمجھتی ہیں کہ عظیم الشان واقعات جو ضخیم جلدوں میں نہیں سما سکتے اخلاقی اعتبار سے ان کی وجہ چند لفظوں میں بیان کی جا سکتی ہے مثلاً اخلاقی نقطۂ نظر سے دور حاضر کی کشمکش کی یہ وجہ ہے کہ دنیا نے دوامی اور حقیقی قدروں کو پس پشت ڈال کر انفرادی اور فوری مفاد کو اپنے ہر عمل کا محرک بنا لیا ہے اس زمانہ میں خواہ فرد ہو یا جماعت یا قوم سب ذاتی مفاد کو سامنے رکھ کر عمل کرتے ہیں کسی کو اس سے بحث نہیں کہ کسی خاص عمل کا اجتماعی طور پر کیا اثر ہوگا جب محض انفرادی مفاد ہی دنیا کا مطمح نظر ہوگا تو مزید مختلف مفاد آپس میں ٹکرائیں گے۔ [illegible] مفاد کا تصادم بہت سے گھروں میں طلاق وبچوں کی بربادی کی صورت میں نمودار ہوتا ہے جماعتوں میں پہنچ کر اکثر ہڑتال اور لاٹھی چارج کا باعث بن جاتا ہے اور اس کے [illegible]

قوموں میں سرایت کرکے اس کے مفاد کو ٹکراتے ہیں تو جنگ کی صورت اختیار کرلیتا ہے

یہاں ہمارا مقصد موجودہ کش مکش کا بنیادی مفاد کی روشنی میں نظر ڈالنا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ دنیا میں سینکڑوں ملک ہیں جن میں مختلف قومیں آباد ہیں لیکن یہ حقیقت اکثر نظر انداز کردی جاتی ہے کہ ہر ملک کی پالیسی اور پوزیشن میں ذرا سی تبدیلی [illegible] ممالک پر اثر انداز ہوکر رہتی ہے [illegible] اگر جرمنی اور اٹلی کوئی معاہدہ کرتے ہیں تو روس اور فرانس کے لیے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ آپس میں فوراً اتحاد عمل کریں۔ ہمیں چونکہ مختلف ممالک کے سیاسی عمل سے کما حقہ واقفیت نہیں ہوتی [illegible] دوستیاں اور دشمنیاں الجھن میں ڈال دیتی ہیں۔

اس سلسلہ میں پہلے روس اور جرمنی کی سیاست پر نظر ڈالی جاتی ہے لینن کی موت [illegible] کرلی یعنی لینن کو پیغمبر بلکہ خدا کا رتبہ دیا گیا کامریڈ اسٹالین ان کے دنیاوی خلیفہ مقرر ہوئے اور کمیونسٹ انٹرنیشنل نے کلیسا کی جگہ لی۔ کلیسا [illegible] حکومت دنیا کے ہر اس شخص پر ہوگئی جو اشتراکیت میں ایمان رکھتا تھا ایسا تعلق کوئی عجیب امر نہیں تھا ہر نئے مذہبی دور میں یہی ہوتا ہے کہ پیروان مذہب دنیا کے کسی گوشہ میں کیوں نہ ہوں خلیفہ کو مدد دیتے اور انسان کی بہبودی پر نظر رکھتے ہیں لیکن بعض خلیفہ اپنی کوتاہ نظری سے اپنے مذہبی اصولوں کو پس پشت ڈال کر کسی خاص ملک، قوم، فرقہ یا اپنے ذاتی اور ہنگامی مفاد کو اپنا مطمح نظر بنا لیتے ہیں جس کی وجہ سے خلیفہ اور پیروان کے زاویہ نظر میں اختلاف پیدا ہو جاتا ہے جو کسی نئی اخوت کے لیے بہت مضر ثابت ہوتا ہے اشتراکی خلیفہ کامریڈ اسٹالن نے بھی یہی کیا کہ اشتراکیت کے ہمہ گیر اصولوں کو ترک کر دیا اور وقتی ضرورت کے ماتحت ہنگامی فواید کو مدنظر رکھتے ہوئے غلط اصول وضع کر لیے جن کے ذریعہ مخالف عناصر سے اشتراک عمل شروع کر دیا مثلاً سوویٹ روس کی سیاسی ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے کامریڈ اسٹالین نے چینی [illegible] کوشن کیائی شک کے سپرد کر دیا جنھوں نے اپنے مفاد کی خاطر لاکھوں بہادر چینی اشتراکیوں کو قتل کرا دیا یہی نہیں بلکہ روسی مفاد کی خاطر کامریڈ اسٹالین نے جرمنی کی جمہوری

پارٹی کے خلاف ہر ہٹلر کو مدد دی ۔ ۱۹۲۹ء میں جرمن کمیونسٹ پارٹی کو ماسکو کا یہ حکم تھا کہ جرمن
اسمبلی میں ہر ہٹلر کی پارٹی سے تعاون کرے اور جب ٹراٹسکی نے اس تحریک کے خلاف آواز اٹھائی
تو کامریڈ اسٹالین نے کہا، ہٹلر تو سوڈے کے اُبال کی طرح جلد ہی بیٹھ جائے گا پھر میدان ہمارا ہی ہو
کامریڈ ریمل نے ۱۴ اکتوبر ۱۹۳۱ء کو جرمن اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے کہا، ایک مرتبہ نازی طاقت
میں آ جائیں پھر ہم کمیونسٹ ان سب نازیوں کا [illegible] طرح کر دیں گے ہم فسطائیوں سے
ہراساں نہیں ہیں یہ کسی دوسری پارٹی کی بہ نسبت جلد ہی ختم ہو جائیں گے۔" ماسکو ظاہر تو یہ کرتا تھا
کہ وہ ہر ہٹلر کو برسر اقتدار لا کر جرمنی میں پرولتاری انقلاب کی رفتار تیز کرنا چاہتا ہے لیکن دراصل
واقعہ یہ تھا کہ اس زمانہ میں جرمن جمہوری پارٹی فرانس کے دوستانے میں پوری طرح آ چکی تھی اور
[illegible] کرنے کے امکانات پیدا [illegible] ماسکو یہ چاہتا تھا کہ ہر ہٹلر برسر اقتدار
آ جائے پھر اتحادی اسٹالین سے صلح کر لیں گے کیونکہ یہ بھی مجلس اقوام کے خلاف ہے یہ بھی معاہدہ
ورسیلز کے ٹکڑے ٹکڑے کرنا چاہتا ہے یہ بھی جرمن کی جمہوری پارٹی کو فنا کرنا چاہتا ہے چنانچہ جرمن
جمہوری پارٹی کو کچلنے میں ماسکو نے ہٹلر کی خوب مدد کی اس احسان کا جواب اس نے یہ دیا
کہ ۲۳ مارچ ۱۹۳۳ء کو دوران تقریر میں کہا "ہم روس سے دوستانہ تعلقات بڑھانے کے لیے
تیار ہیں" اور اس خیال کے بموجب مئی ۱۹۳۳ء میں روس سے ایک دوستانہ معاہدہ کر لیا جس
کی ایک دفعہ یہ تھی کہ ایک دوسرے سے آپس میں تعاون کریں گے اور اگر کسی تیسری طاقت
نے حملہ کیا تو وہ غیر جانبدار رہیں گے نہ صرف یہی بلکہ کچھ عرصہ بعد جرمنی نے روس کے ساتھ
ایک تجارتی معاہدہ کر لیا جس کی رو سے روس کو قرضہ دیا گیا مثل مشہور ہے کہ منہ کھائے اور آنکھ
شرمائے ماسکو نے اس احسان کا یہ جواب دیا کہ جب نازی پارٹی نے برسر اقتدار آنے کے بعد
نسلی تفریق کی بنا پر یہودیوں کو قتل اور جلا وطن کرنا شروع کیا اور دنیا نے فسطائیت کے خلاف
صدائے احتجاج بلند کی تو سوویٹ پریس نہ صرف خاموش رہا بلکہ کامریڈ اسٹالین نے ماسکو میں
تقریر کرتے ہوئے کہا "ہم جرمنی میں فسطائی پارٹی کے برسر اقتدار آ جانے سے مسرور تو نہیں ہیں

لین بیان کہ فاشیت زیرِ بحث نہیں ہے کیونکہ دیکھیے اٹلی فسطائی سلطنت ہے لیکن اس سے ہمارے خوشگوار تعلقات ہیں" یہ سیاست ۱۹۳۴ء تک برابر جاری رہی۔ اپریل ۱۹۳۴ء میں کمیونسٹ انٹرنیشنل کمیٹی نے اعلان کیا، نازی ڈکٹیٹر شپ سے یہ فائدہ ہوگا کہ عوام کا جمہوریت پر سے اعتبار جاتا رہے گا اور ان پر سوشل ڈیموکریٹ کا اثر بھی کم ہو جائے گا ایسا ہونے سے جرمنی میں پرولتاری انقلاب پیدا کرنے والے حالات بڑی تیزی سے پیدا ہو جائیں گے۔

جب انگلستان اور فرانس نے لفظی پردوں کی آڑ میں جرمنی اور روس کو ہم آغوش ہوتے دیکھا تو خوف زدہ ہو گئے۔ انھوں نے سوچا کہ اگر روسی خام اجناس اور مزدور اور جرمنی کی فنی قابلیت اور آلات سب ایک لڑی میں منسلک ہو گئے تو مصیبت کا سامنا ہو جائیگا یہ سوچ کر انگلستان اور فرانس نے ایک نئی پالیسی کی طرح ڈالی اب دول متحدہ نے جرمنی کو سونا دینا شروع کیا اور اس کو اسلحہ بنانے اور مسلح ہونے کی اجازت دیدی۔ اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ رائن لینڈ آسٹریا اور ریل ہضم کرنے کی بھی اجازت مل گئی اس رشوت کا یہ اثر ہوا کہ ہٹلر دول متحدہ کے ساتھ ہو گیا اور کل کا دوست (سویٹ روس) مورد عتاب بن گیا۔

اب پھر روس کے لیے خطرہ پیدا ہو گیا اس خطرے کو دور کرنے کی یہ تدبیر سوچی گئی کہ بین الاقوامی لیگ میں داخل ہو کر نئی دوستیاں پیدا کی جائیں اور نئی دشمنیاں کرائی جائیں اس خیال کے ماتحت بہت سے سیاسی داؤ پیچ کھیل کر روس بین الاقوامی لیگ میں شامل ہو گیا جس کو کل تک روسی سیاستداں بستیاں ڈاکوؤں کی انجمن کہتی تھیں اور کامریڈ اسٹالین فرماتے تھے کہ لیگ تو پیروں کی طرف سے سڑنی شروع ہو گئی ہے۔ روس کی خوش قسمتی کہ اس دوران میں جرمنی کی طاقت کافی بڑھ گئی اور ظاہر ہے کہ جب کسی کی طاقت زیادہ ہو جاتی ہے تو اس کی خواہشات اور مطالبات وسیع ہو جاتے ہیں چنانچہ طاقت بڑھ جانے پر جرمنی کے مطالبات اتنے بڑھے کہ انگلستان اور فرانس خوف زدہ ہو گئے اور کامریڈ لٹوینوف فرانس کو جرمنی سے توڑ لینے میں کامیاب ہو گئے نہ صرف یہی بلکہ روسی مدبرین کی کوششیں بارآور

کامیاب ہوئیں کہ روس، فرانس اور چیکوسلواکیہ میں ایک دوستانہ معاہدہ ہو گیا تاکہ اگر جرمنی ذرا بھی سر اٹھائے تو تین طرف سے زد و کوب کیا جا سکے ملکی مفاد کا جادو دیکھیے کہ اس زمانہ میں سرمایہ دار فرانس اور اشتراکی روس اپنے اقدار کے فرق کو بھول گئے بلکہ ماسکو نے اپنے قومی اور ملکی مفاد کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ سیاسی نظریہ پیش کیا "کمیونسٹ پارٹیوں کا فرض ہے کہ سرمایہ دار ملکوں کی جمہوری پارٹیوں سے اشتراک عمل کریں اور فسطائی طاقتوں کے خلاف جمہوری حکومتوں کی طاقت بڑھائیں" اسی سلسلے میں بیک وقت پیرس اور ماسکو سے یہ اعلان ہوا "موسیو اسٹالین فرانس کے ملکی تحفظ کی اہمیت کو سمجھتے ہیں اور انہیں اس کا بھی خیال ہے کہ فرانس کو سامان حرب میں بھی اضافہ کرنا چاہیے تاکہ اپنی حفاظت کر سکے" ماسکو کے اس اعلان کے یہ معنی تھے کہ فرانس میں حالات جدوجہد شدہ کی جائے اور وہاں کمیونسٹ اور سوشلسٹ پارٹیوں کو چاہیے کہ موسیو لاوال کی بورژوا جمہوری حکومت سے تعاون کریں سرمایہ دار حکومت کا فوجی بجٹ پاس کرائیں سامان حرب بنانے کے کارخانوں میں ہڑتال نہ ہونے دیں اور مزدور جماعت اجرت بڑھانے کا مطالبہ نہ کرے اسی زمانہ میں فرانس کے نوجوان کمیونسٹ سبھا کے روسی نمائندے نے ماسکو کے اشارہ پر یہ اعلان جاری کیا "اگر اس زمانہ میں کمیونسٹ نوجوانوں نے فرانس میں انقلاب کرنے کی کوشش کی تو غدار ٹھہرائے جائیں گے" یعنی روس نے بھی اور شفاف اشتراکی سیاست کے برعکس ایک نئی سیاست کی طرح ڈالی اس اشتراکیت سوز سیاست کو باوقار بنانے کے لیے سات سال کے التوا کے بعد ۱۹۳۵ء میں کمیونسٹ انٹرنیشنل کا اجلاس بلایا گیا لیکن اس امر کا پہلے انتظام کر لیا گیا کہ نمائندے جی حضور قسم کے ہوں جو کامریڈ اسٹالین کی ہر تجویز پر ہاتھ اٹھا دیں چنانچہ جب اس اجلاس میں کامریڈ اسٹالین کی نئی سیاست کی تائید میں تجویز پیش کی گئی تو بدل و جان منظور کر لی گئی۔ اگر کسی ملک کے زیادہ باشندے حق پرست، بااصول اور مجاہد نہ ہوں تو وہاں جمہوریت بالکل ایک دھوکا ہو کر رہ جاتی ہے چنانچہ جو سیاست چند لیڈروں کی کوتاہ نظری کا نتیجہ تھی اس کو کمیونسٹ انٹرنیشنل کی طرف سے اشتراکی جمہوریت

کا فیصلہ بنا کر پیش کیا گیا اور تمام دنیا کے کمیونسٹوں کو اس نئی پالیسی پر کاربند ہونے کی ہدایت کی گئی
یہی وہ زمانہ تھا جبکہ ماسکو کے اشارے پر ایک مشہور اخباری نمایندے مسٹر ہوورڈ کامریڈ اسٹالین
ملاقات کرنے پہنچے [illegible] ملاقات میں کامریڈ اسٹالین سے یہ سوال کیا "کیا
روس انقلاب عالم کی تکمیل اور انقلابی جدوجہد سے دست بردار ہو رہا ہے؟" جس کے جواب
[illegible] نے فرمایا "ہمارا منشا کبھی انقلاب پیدا کرنے کا نہ تھا اور نہ ہم کسی ملک میں انقلاب
[illegible] کرتے ہیں یہ دنیا کو عجیب مضحکہ خیز مغالطہ ہو گیا ہے کہ ہم اشتراکی انقلاب کرنے کے لیے ملک
ملک جدوجہد کرتے پھرتے ہیں" مسٹر ہوورڈ کی اس ملاقات کا حال دنیا کے تمام اخبارات میں [illegible]
[illegible] بورژوازی جمہوریتوں کے ساتھ تعاون کی پالیسی کا اعلان زیادہ واضح ہو جائے۔ چنانچہ جب
اسپین میں جنرل فرانکو نے بغاوت کی تو کامریڈ اسٹالین نے اسپین کی اشتراکی حکومت کی ذرا بھی
مدد نہ کی روس کی اس محرمانہ غیر جانبداری کی تہ میں یہ راز تھا کہ سوویٹ روس سرمایہ دار حکومتوں کو یقین
دلا دے کہ وہ کہیں بھی اشتراکی انقلاب پیدا کرنا نہیں چاہتا بلکہ دل و جان سے بورژوازی جمہوری روایات
کے ساتھ ہے لیکن جب یہ خطرہ بہت نمایاں ہو گیا کہ فرانکو کی فتح فسطائیت کو زیادہ طاقتور بنا دے گی
تو اس آخری وقت یہ روس مدد کرنے نکلا لیکن اس وقت بھی ماسکو کی نیاز مندی کا یہ عالم تھا کہ
[illegible] کارروائی کرنے سے پہلے کامریڈ اسٹالین نے سرمایہ دار جمہوریتوں کو یقین دلایا کہ اگر روس
کو اسپین میں فتح ہوئی تو وہاں جمہوری قسم کی حکومت قائم کی جائے گی جو انفرادی ملکیت کو تسلیم
کرے گی جب اسپین کے پرولتاری طبقہ کو یہ معلوم ہوا کہ انفرادی ملکیت کو برقرار رکھا جائے گا تو وہ
بددل ہو کر کنارہ کش ہو گیا اشتراکی جدوجہد موم کی طرح پگھل گئی اور ہٹلر اور مسولینی کے ایک ادنیٰ
جنرل فرانکو برسراقتدار آ گئے اس سیاسی تبدیلی نے فسطائیت کا زور اور زیادہ کر دیا جس کا یہ نتیجہ ہوا
کہ فرانس اور روس قریب تر آ گئے لیکن سادہ لوح انسان کو یہ معلوم کر کے حیرت ہو گی کہ باوجود فسطائیت
سے برگشتہ ہونے کے روس اطالوی بحری اور ہوائی بیڑے کو حبشہ کے خلاف تیل دے رہا تھا
اور اسپین میں اطالوی ہوائی جہازوں کے لیے باکو سے تیل آ رہا تھا نہ صرف یہی بلکہ جب روم میں [illegible]

[illegible]

کا قتل ہوا اور تمام دنیا نے مسولینی کو اس کا ذمہ وار ٹھہرایا اور روسی سفیر نے علانیہ طور پر مسولینی کے سا

کھانا کھایا جس سے یہ اظہار مقصود تھا کہ ساری دنیا تمہاری نو راسی خانگی کارروائی پر چراغ پا ہو رہی

ہے لیکن ساری محبت [illegible] پر بھی تمہارا دامن [illegible] نہیں چھوڑتے اس زمانہ میں نہ صرف

اٹلی سے تعلقات بڑھے ہوئے تھے بلکہ روس کی کئی سربرآوردہ ہستیاں جرمن حکومت سے ربط پیدا

[illegible] روس میں بھی فسطائیت طاقتور ہو رہی تھی اور فرانسیسی جمہوری حکومت

تھوڑی پر جل تمک۔ لاتی تھی یہ منافقت موجودہ زمانہ کی سیاست کا جزو لاینفک ہے اس منافقت

[illegible] کبھی ضرورت سیاسی قلابازی کھائی جاتی ہے جیسا کہ فرانس میں آج کل ہو رہا ہے

اگرچہ بظاہر روس اور فرانس میں دوستی ہو گئی تھی لیکن اپنا اپنا انفرادی مفاد مدنظر رکھتے ہوئے

انگلستان اور فرانس یہ چاہتے تھے کہ سیاسی گتھی کچھ اس طرح الجھے کہ [illegible] روس میں چھڑ جائے اور یہ

دونوں لڑ کر کمزور ہو جائیں تاکہ فرانس اور انگلستان نسبتاً زیادہ طاقتور ہو جائیں اور روس کی دلی

تمنا یہ تھی کہ کسی سیاسی الجھن کی وجہ سے جرمنی اور فرانس برسرپیکار ہو جائیں تاکہ جنگ کے بعد روس

یورپ میں نسبتاً سب سے زیادہ طاقتور ہو جائے چنانچہ جب چیکو کا معاملہ پیش آیا تو انگلستان،

فرانس اور روس نے اپنا اپنا پہلو بچایا اور چیکو سے معاہدہ ہونے کے باوجود اس کی مدد کو نہ پہنچے وجہ

یہ تھا کہ اگر روس اس معاملہ میں جرمنی سے لڑائی مول لیتا تو وہ تنہا چھوڑ دیا جاتا یا اگر انگلستان اور

فرانس چیکو سے اپنا وعدہ ایفا کرنے پر آتے تو روس کوئی توجیہہ نکال کر خاموش رہتا یہ تینوں ملک

تھے اور ایک دوسرے کے پوشیدہ ارادوں کو خوب پہچانتے تھے

آپس کی یہ بے اعتمادی اور رقابت جرمنی کے لیے بہت مفید ثابت ہو رہی تھی یہ آپس

کا رقیبانہ اور انفرادی مفاد کا جذبہ تھا کہ جرمنی کو ایک چھوٹا سا جرمنی مفت ہاتھ لگ گیا اب ہر ہٹلر

بہت دلیر ہو گئے تھے انھوں نے نہ صرف اپنے مقبوضات واپس مانگے بلکہ یورپ میں ہاتھ پیر

پھیلانے شروع کر دیے اب جرمنی کی طاقت اتنی بڑھ گئی کہ برطانیہ کے وزیر اعظم مسٹر چیمبرلین ان سے

ملنے برلن گئے جس سے ہر ہٹلر کو یہ یقین ہو گیا کہ اتحادی کمزور ہیں۔ جب کسی ایک فریق کو دوسرے

ملک کی حقیقی آبادی کہا جا سکتا ہے۔

جب کسی خاص ملک کے اعداد و شمار کو دیکھ کر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ آبادی زیادہ ہے یا کم بلکہ اس کے بہت سی دوسری چیزوں پر نظر ڈالنی پڑتی ہے مثلاً سب سے پہلے یہ کہ اس ملک کا رقبہ کیا ہے اس کی آب و ہوا کی خصوصیات کیسی ہیں وہاں کی زمین کا کیا حال ہے، وہاں کی پیداواریں، معدنیات آبشار، دریا، پہاڑ میدان اور دوسرے جغرافی حالات کا کیا حال ہے اس کے علاوہ یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ وہاں کی آبادی کن حصوں میں پھیلی ہے ملک کی عام صحت کا معیار کیا ہے، لوگوں کا معیار زندگی بلند ہے یا نہیں، عمروں کا اوسط کیا ہے شرح پیدائش زیادہ ہے یا شرح اموات، مردوں کی تعداد زیادہ ہے یا عورتوں کی آبادی کن پیشوں میں مصروف ہے مختلف پیشوں میں ترقیاں کیا ہیں ان کی تعلیمی حالت کیسی ہے۔ کارکردگی کا حال کیا ہے آبادی دیہات میں زیادہ رہتی ہے یا شہروں میں۔ آبادی میں برابر اضافہ ہو رہا ہے یا تخفیف اگر اضافہ ہو رہا ہے تو ملک کے اندرونی ذرائع معاش میں اضافہ ہو رہا ہے یا نہیں اور کیا آبادی کو نقل وطن کی سہولتیں حاصل ہیں اور کیا دوسرے ملکوں سے لوگ وہاں آسکتے ہیں ان مختلف اسباب پر نظر ڈالنے کے بعد قطعی طور پر یہ بتایا جا سکتا ہے کہ کسی ملک کی آبادی ضرورت سے زیادہ ہے یا کم اگر آبادی کم ہے تو مختلف طریقوں سے اس میں اضافہ کیا جا سکتا ہے اور اگر زیادہ ہے تو چند طریقوں سے اس میں کمی کی جا سکتی ہے۔

عہد قدیم اور قرون وسطیٰ میں علمائے یورپ و یونان کو اس کا احساس ہو چکا تھا کہ جس رفتار سے آبادی میں اضافہ ہوتا ہے اسی رفتار سے اشیائے خوردونوش میں اضافہ نہیں ہوتا سب سے پہلے اس خیال کو رابرٹ مالتس نے مسلم شکل میں پیش کر کے ساری دنیا میں ایک کھلبلی ڈال دی مگر یہ کوئی نیا خیال نہ تھا اور ہر ملک کے مفکروں نے اپنی اپنی استعداد اور لیاقت کے مطابق اس سلسلہ میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے چنانچہ ہندوستان کے مشہور شاعر استاد ذوق نے جو معاشیات کے اصولوں سے بالکل ناواقف تھے اس خیال کو یوں ادا کیا ہے ؎

توڑا کمرِ شاخ کو کثرت نے ثمر کی　　　دنیا میں گرانباری اولاد غضب ہے

آبادی اور ضروریات زندگی میں عدم تناسب کی وجہ سے گوناگوں دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے

کی کمزوری کا یقین ہو جاتا ہے تو اس کے مطالبات اتنے بڑھ جاتے ہیں کہ دوسرے فریق کو سوائے لڑائی کے کوئی چارہ نہیں۔ یہی شکل یورپ میں پیدا ہو گئی تھی۔ ہٹلر کو دول متحدہ کی کمزوری کا یقین ہو گیا اس لیے جرمنی کے مطالبات اس قدر بڑھ گئے کہ اگر دول متحدہ ان کو مان لیتے تو وہ شکست ماننے کے برابر ہوتا۔ ان حالات میں صاف دکھائی دینے لگا کہ یورپ میدان جنگ بن کر ہی رہے گا۔

جنگ کے امکانات نے ہر سلطنت کو نئی دوستیاں پیدا کرنے پر آمادہ کر دیا تھا۔ چنانچہ انگلستان اور جرمنی دونوں نے روس کی طرف توجہ کی اور اس کی دوستی کے خواہشمند ہوئے انگلستان نے محکمہ خارجہ کے ایک غیر معروف شخص کو ماسکو گفت و شنید کے لیے روانہ کیا لیکن بیکار روس کا خواب کہ سرمایہ دار حکومتیں لڑ لڑ کر فنا ہوں وہاں اشتراکی انقلاب ہوں، اور روس خود نسبتاً طاقتور ہو جائے تیس سال میں پہلی مرتبہ پورا ہوتا معلوم ہو رہا تھا ظاہر ہے کہ اس خواہش کے باوجود روس کوئی ایسا سیاسی اقدام کیوں کرتا جس سے سرمایہ دار ملکوں کی جنگ رک جاتی دوسری بات یہ تھی کہ آخر وہ اپنے طاقتور ہمسایہ جرمنی سے کیوں بگاڑتا اور کیوں جنگ کی آگ میں کودتا تیسرے یہ کہ جغرافی حالات بھی کچھ ایسے ہیں کہ انگلستان روس کو فوراً ہی کوئی فوجی مدد نہیں پہنچا سکتا تھا۔ چوتھے یہ کہ ابھی تک انگلستان کو شاید یہ خیال کہ جرمنی بجائے مغرب کا رخ کرنے کے مشرق کی سمت بڑھے گا چنانچہ انگریزی وفد ابھی انگلستان کے عوام کا منھ بند کرنے کے لیے ماسکو میں خانہ پری کر ہی رہا تھا کہ جرمنی کے وزیر خارجہ ہوائی جہاز میں ماسکو پہنچے اور پولینڈ و رومانیہ کا نصف نصف اور بالٹک کی ریاستوں اور فنلینڈ کی قربانی چڑھا کر برلن واپس چلے آئے۔ روس اور جرمنی کے اس معاہدے میں یہ صاف طور پر درج تھا کہ دونوں ملک مشترکہ مسائل پر باہم مشورہ سے کام کریں گے ظاہر ہے کہ پولینڈ سے بڑھ کر روس اور جرمنی کے درمیان کونسا مشترکہ مسئلہ ہو سکتا تھا پولینڈ پر حملہ ہونے سے ۴۸ گھنٹے پہلے جرمنی حکومت کی پریس ایجنسی نے اعلان کیا "روس اور جرمنی میں جو معاہدہ ہوا ہے اس پر عمل شروع ہو گیا ہے خاص طور پر معاہدہ کے اس حصہ پر جو پولینڈ

سے متعلق ہو جرمنی اور روس معاہدہ کے نتائج کی پوری ذمہ داری لینے کے لیے تیار رہیں ۶ اکتوبر سنہ ۱۹۳۹ء کو تقریر کرتے ہوئے کہا کہ پولینڈ کا مسئلہ دونوں ملکوں میں پہلے ہی طے ہو گیا تھا روسی پریس میں ہٹلر کی یہ تقریر شائع ہوئی لیکن حکومت کی طرف سے اس کی کوئی تردید نہیں ہوئی ان سب واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ پولینڈ اور دیگر معاملات میں روس معصوم نہ تھا۔

جب پولینڈ کی مدد کو کوئی نہ آیا اور انگلستان اور فرانس نے مغرب میں کوئی محاذ قائم نہیں کیا تو ہٹلر اور کامریڈ اسٹالین کے دل اور بھی بڑھ گئے ادھر کامریڈ اسٹالین نے اسٹونیہ، لٹویہ، لتھونیا پر امن طریقہ سے قبضہ جمایا ادھر جرمنی نے بلجیم، ہالینڈ اور فرانس کو ختم کر دیا فرانس کیوں یک لخت گر پڑا اس کی سیاسی، اخلاقی اور فوجی وجوہات سب کو معلوم ہیں یہاں اس کے بیان کی [illegible] ضرورت نہیں۔

فرانس کی شکست کے بعد سے موجودہ جنگ کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے فرانس کی شکست اور وہاں فسطائی رجحانات کے مدبروں کے برسر اقتدار آ جانے سے یورپ کا فوجی توازن بالکل مختلف ہو گیا اس شکست سے نہ صرف جرمنی کا مغربی محاذ محفوظ ہو گیا اس کا دشمن فرانس ختم ہو گیا بلکہ میجنو لائن کا تمام سامان جنگ اور غلہ کا ذخیرہ بھی جرمنی کے ہاتھ آیا یہی نہیں بلکہ فرانس کی تمام صنعت و حرفت فسطائی طاقتوں کی مدد کرنے لگی انگلستان کو بھی بلجیم میں ایسا زخم لگا کہ جرمنی کو اس جزیرہ سے کچھ عرصے کے لیے کوئی خوف نہ رہا مختصر یہ کہ فرانس کی شکست سے وہ حالات بدل گئے جن کی وجہ سے جرمنی نے روس سے معاہدہ کیا تھا جب جرمنی کو اپنے مغربی محاذ سے کوئی خطرہ نہیں رہا تو ہٹلر نے روس کی دوستی سے بھی بے نیازی حاصل کر لی۔ روس کی توقع تھی کہ ایک طرف فرانس جرمنی کے زیر اثر آ گیا دوسری طرف فنلینڈ نے دیگر بالٹک ریاستوں کی طرح اطاعت قبول نہیں کی بلکہ انگلستان اور امریکہ کی شہ پا کر روس کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ فنلینڈ کی جنگ نے روس کے فوجی وقار کو خاک میں ملا دیا اور جب روس کو فتح ہوئی بھی تو جرمن ماہرین آلات اور فوجی ماہرین کی مدد سے روس کی اس درجہ محتاجی نے ہٹلر کو اس پر بالکل

[illegible] مطالبات کیے جائیں۔ چنانچہ ۱۲ رنومبر سنہ ۱۹۴۰ء کو روسی وزیر خارجہ مسٹر مولوٹوف کو برلن بلایا گیا اور وہاں اس سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ روس کو چاہیے کہ نئے فسطائی نظام میں داخل ہو جائے اور ترکی ایران و ہندوستان پر حملہ کرنے کی تجویز [illegible] کہ آزاد و خود مختار طاقت ہونے کی حیثیت سے روس اس مطالبہ کو نہیں مان سکتا تھا چنانچہ وزیر خارجہ نے انکار کر [illegible] اقتصادی معاملات تک محدود رہی لیکن چونکہ ہر ہٹلر اب کافی طاقتور ہو چکا تھا اس لیے جرمن کے اقتصادی مطالبات بھی اس قسم کے تھے کہ ان کا تسلیم کرنا اقتصادی آزادی کو خیرباد کہنا تھا [illegible] اقتصادی مطالبات کا بھی امید افزا جواب نہ دے سکے۔ اس ملاقات [illegible] روسی وزیر خارجہ کو یہ محسوس ہو گیا کہ فاتح فرانس کا نیا وار روس پر ہوگا چنانچہ کامریڈ مولوٹوف کے ماسکو واپس پہنچتے ہی ادھر روس میں باقاعدہ جنگ کی تیاری شروع ہوئی ادھر ہٹلر نے روس کی [illegible] کے طور پر بلقان کی ریاستوں سے غیر فسطائی اور اشتراکیت پسند اثرات کو ختم کرنے کی ٹھانی تاکہ روس کو یورپ میں کسی سمت سے مدد نہ پہنچ سکے۔

فسطائی طاقتوں کے بلقان میں اقدام سے روس کو یقین ہو گیا کہ حملہ ہونے والا ہے چنانچہ اپنا محاذ مستحکم کرنے کے لیے روس نے رومانیہ کے علاقہ بسرابیا پر قبضہ کر لیا۔ شاہ کیرول [illegible] چونکہ کوئی مدافعت نہیں کی اس لیے رومانیہ کی رعایا نے بغاوت کر دی اور اپنے غصہ کا اظہار اس طرح کیا کہ شاہ کیرول کو تخت سے اتار کر ان کے کمسن لڑکے کو تخت پر بٹھا دیا جس نے روس کے خلاف جرمن مدد حاصل کرنے کی خاطر اپنا تمام ملک ہر ہٹلر کے سپرد کر دیا۔ ہر ہٹلر کی اس فتح نے جرمنی کو بلغاریہ اور یوگوسلاویہ سے قریب تر کر دیا ان دونوں ریاستوں میں حکومتی طبقہ فسطائی تھا لیکن رعایا کی بڑی تعداد کمیونسٹ تھی۔ ہر ہٹلر نے حسب دستور سیر و سیاحت کے بہانے بلغاریہ میں جرمن داخل کرنے شروع کر دیے اور وہ اس قدر زیادہ تعداد میں پہنچے کہ شاہ بورس کو فسطائی نظام میں داخل ہوتے ہی بن پڑی۔ بلغاریہ کی اس نئی دوستی پر روس بہت سیخ پا ہوا اور ماسکو نے شاہ بورس کو غم و غصہ کا ایک نوٹ روانہ کیا۔ بلغاریا کے بعد یوگو کا نمبر آیا جرمنی نے

اس حکومت [illegible] کیا کہ یوگو اقتصادی نظام میں جرمنی کے زیر اثر ہونا چاہیے۔ اور ریاست کو فوراً نئے نظامی نظام میں داخل ہو جانا چاہیے ہٹلر کے دباؤ سے یوگو کے حکومتی طبقہ نے یہ مطالبات مان [illegible] بادشاہ پال کو برطرف کرنے کے بعد اس کے لڑکے شہزادہ پیٹر کو تخت پر بٹھا دیا روس نے فوراً اس نئی حکومت سے دوستانہ معاہدہ کرنے کا ارادہ کیا اور برطانیہ نے بھی فوجی امداد دینے کا وعدہ کیا لیکن جب تک معاہدہ ہو اور مدد پہنچے یوگو ختم ہو چکا تھا ہٹلر روس پر یہ بھی الزام لگاتے ہیں کہ ماسکو کی سازشوں سے یوگو میں بغاوت ہوئی ہے ممکن ہو کہ یہ درست ہو۔ یوگو کے بعد ہٹلر نے یونان کی طرف توجہ کی جہاں ان کے دوست مسولینی کو شکست پر شکست ہو رہی تھی۔ یونانی اگرچہ جان توڑ کر لڑے لیکن جرمن دباؤ کو نہ روک سکے اور حکومت کو جزیرہ کریٹ بھاگ جانا پڑا بلقان کی فتح کے یہ معنی تھے کہ مئی ۱۹۴۱ء کے پہلے ہفتہ میں روس کو چھوڑ کر تمام یورپ نظامی چنگل میں آ چکا تھا

بلقان کی فتح کے بعد سے موجودہ جنگ کا تیسرا دور شروع ہوتا ہے۔ یہاں واقعات کا تسلسل قابل غور ہے ۲ مئی ۱۹۴۱ء کو بلقان کی ریاستیں ہٹلر کے زیر نگیں آتی ہیں ۶ مئی ۱۹۴۱ء کو کامریڈ اسٹالین سوویٹ روس کے وزیر اعظم کا عہدہ سنبھالتے ہیں۔ ۱۲ مئی ۱۹۴۱ء کو ہر ہس صلح کی شرطیں لے کر انگلستان پہنچتے ہیں ۲ جون ۱۹۴۱ء کو ہٹلر او مسولینی میں ملاقات ہوتی ہے اور ۲۲ جون کو جرمن فوجیں روسی سرحد میں گھس جاتی ہیں۔

ہٹلر کا یہ کہنا کہ روس اس پر حملہ کرنا چاہتا تھا غلط ہے بلکہ دراصل واقعہ یہ ہے کہ جرمنی نے روس کے سامنے نظامی نظام میں شرکت کا مطالبہ رکھ کر اسے مجبور کر دیا کہ وہ مدافعانہ جنگ کی تیاری شروع کر دے ماسکو کا یہ کہنا کہ ان پر اچانک حملہ ہوا، بعید از قیاس ہے نومبر ۱۹۴۰ء میں جب کامریڈ مولوتوف برلن سے واپس ہوئے اسی وقت سے ماسکو کو اس کا علم تھا کہ جرمنی حملہ کرے گا ۶ مئی کو کامریڈ اسٹالین کے قلمدان وزارت سنبھالنے کے صاف یہ معنی تھے کہ ان کو ہونے والے حملہ کا پورا پورا علم اور یقین تھا [illegible] سے روس میں گھسیں اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ انہوں نے اچانک حملہ کر دیا تھا بلکہ

اس کی [illegible] کی مدت میں سویٹ روس میں بجائے فوج کو طاقتور بنانے کے روسی خفیہ کو طاقتور بنایا جا رہا تھا اور بجائے مضبوط [illegible] ہتھیار ایجاد کرنے کے روسی حکومتی [illegible] اور فوجی کارکنوں کو قتل اور جلا وطن کرنے کے نئے طریقے سوچتا رہتا تھا ۱۱ مئی ۱۹۴۱ء کو ہرس جو شرائط صلح لے کر انگلستان پہنچے اس کی بابت سیاسی نظر رکھنے والے رائے رکھتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ ہرس کا مشن اتنا ناکامیاب نہیں رہا جتنا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے۔ ۲ جون ۱۹۴۱ء کو ہٹلر اور اس کے دوست مسولینی میں ملاقات ہوئی جس میں شاید فاتح فرانس نے شکست خوردہ حبش کو روس پر حملے کے فیصلے سے آگاہ کیا اس ملاقات کے بیس دن کے بعد یعنی ۲۲ جون ۱۹۴۱ء کو جرمن فوجیں نئی روسی سرحد میں اس طرح گھستی چلی گئیں کہ جیسے مکھن میں چھری۔ روس پر حملے کے بعد انگلستان اسی پوزیشن میں آگیا جس میں کہ پہلے روس تھا یعنی کہ انگلستان کے دو دشمن جرمنی اور روس آپس میں لڑ کر ختم ہونے لگے اور انگلستان امریکہ کی مدد سے اسی نسبت سے زیادہ تیزی سے طاقتور ہونے لگا روس اور جرمنی کی جنگ کی وجہ سے سویٹ روس میں جو تباہی ہوئی اس سے سب واقف ہیں اور یہ بھی کسی سے چھپا ہوا نہیں کہ کامریڈ لٹوینوف امریکہ میں، اور کامریڈ مسکی انگلستان میں گڑگڑا گڑگڑا کر جمہوریتوں سے التجا کرتے ہیں کہ نیا محاذ قائم کرو ورنہ ہم ختم ہوئے لیکن اس وقت تک جمہوریتوں کو ایسا کرنا اس میں مصلحت معلوم نہیں ہو رہا ہے شاید ابھی تک روس میں دم باقی ہے اور سرمایہ دار جمہوریتوں کو یہ خیال ہے کہ ابھی کمیونسٹ روس اتنا کمزور نہیں ہوا کہ وہ جنگ کے بعد بلا چون و چرا امریکہ اور انگلستان کا تجویز کردہ نیا بورژوازی نظام قبول کرلے گا گمان ہے کہ جہاں تک کمیونزم کا تعلق ہے یہ جنگ ختم ہوگی فسطائی فتح جس کے امکانات روز بروز کم ہوتے جارہے ہیں، کی شکل میں تو کمیونزم ایک طویل مدت کے لئے ختم ہو ہی جائے گا لیکن جیسا کہ خیال ہے کہ جمہوریتوں کو فتح ہوگی اس شکل میں بھی کمیونزم ایک عرصہ دراز کیلئے خاموش ہو جائے گا جنگ کے بعد امریکہ اور انگلستان تباہ حال سویٹ روس کو اقتصادی دباؤ ڈال کر اس پر مجبور کریں گے کہ وہ موجودہ اشتراکی نظام کو ختم کردے اور جمہوریتوں کے سے اقتصادی نظام میں شامل ہوجائے اور جس قسم کے مدبر روس میں آج کل برسر اقتدار ہیں ان سے یہ امید رکھنا کہ وہ کسی اصول کی خاطر قربانی پیش کریں گے لاحاصل ہے شاید آئندہ واقعات اس امر کی تائید کریں کہ جہاں تک کمیونزم کا تعلق ہے جنگ ختم ہوگئی۔

ایم۔ ایم جوہر میرٹھی

سوویٹ روس کی خارجی پالیسی

جرمنی و سوویٹ جنگ سے پہلے | بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سوویٹ روس کی خارجی پالیسی دیگر سرمایہ داری سامراجی ریاستوں سے مختلف نہیں ہے لہذا دنیا کے آزادمنشوں کو اس سے ہمدردی ظاہر نہ کرنا چاہیے۔ خاص کر فن لینڈ پر حملہ کے وقت دنیا کے تمام سرمایہ دار اخبارات اور سیاستداں حضرات روس کو بیرحم، ظالم اور خونخوار بھیڑیا کہہ کر پکارتے تھے۔ اگر یہ ثابت کر دیا جائے کہ سوویٹ روس کا ایک بھی عمل سوویٹ جمہوریت کے منافی تھا تو یہ اعتراضات تسلیم کیے جاسکتے ہیں کسی چیز کے تجزیہ کیلیے بہک بہک کر مبہم اصولوں میں غوطہ زنی کرنا ٹھیک نہیں ہوتا چنانچہ ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ آیا سوویٹ روس سامراجی ریاست ہوسکتی ہے؟

کسی ریاست کی پالیسی خواہ وہ سیاسی، اقتصادی یا فوجی ہو اس ریاست کے چند بڑے افراد کے خلوص یا بدنیتی پرمبنی نہیں ہوتی۔ بلکہ ان کی بنیاد سماجی کیفیت اور داخلی ضروریات پر قایم ہوتی ہے خارجی ضروریات ہی ایک ریاست کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ دوسرے ملکوں پر اقتدار حاصل کرے اس کو ملوکیت کہتے ہیں۔ گزشتہ جنگ عظیم کے بعد ملوکیت پرستی اور ملوکی ارادوں کے لیے ملک گیری بھی لازمی نہ رہی ہماری آنکھوں کے سامنے دنیا کی ایک بہت بڑی ملوکیت پرست ریاست موجود ہے یعنی امریکہ لیکن اس نے کسی دوسرے ملک پر قبضہ نہیں کیا۔ جدید ملوکیت کی بنیاد اب بجائے سیاست کے اقتصادیات پر قایم ہے۔ توپ بندوق یا زمانہ متوسط کی آہنی تلوار کی جگہ سونے کی زنجیروں نے لے لی ہے جن میں دوسرے ممالک کو جکڑا جاتا ہے۔ اس نظام میں ایک ڈکٹیٹر اپنی من مانی بھی نہیں کر سکتا وہ اس سرمایہ دار طبقہ کا نمایندہ ہے جو سونے کی زنجیروں کا مالک ہے اس کو اسی طبقہ کے اشاروں پر چلنا پڑتا ہے اندرون طبقہ چاہے اختلاف رائے ہو۔ مثلاً ہٹلر وغیرہ کے ڈر سے تھائیسن جرمنی چھوڑ کر بھاگ جائے لیکن بیرونی پالیسی سرمایہ دارانہ رہتی ہے۔ اگر ایک فورڈ،

کمپنی کا مالک ہو تو دوسرا بینک آف لندن کا حصہ دار، تیسرا اسکوڈا فیکٹری کا مالک ہے [illegible] ناتا ہے کا۔ خاروں کا ساجھے دار جب ملک کا اقتصادی ارتقا نقطۂ کمال تک پہنچ جاتا ہو اور اپنے [illegible] میں اس کے فروغ کی تمام گنجائشیں ختم ہو جاتی ہیں تو وہ ملک دوسروں کی آزادی میں رخنہ اندازیاں شروع کرتا ہو یہ عمل بھی اس ملک کی اقتصادی اور سماجی نوعیت پر مبنی ہو جس ملک میں [illegible] استعمال کے لیے نہیں بلکہ فائدہ کے لیے بنایا جائے گا وہ ضرور ایک نہ ایک [illegible] ملکوں پر اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کرے گا خواہ فوج سے خواہ روپیہ سے

جدید ملوکیت کی بنیاد روپے کی برآمد یا نکاسی پر ہو جب ملک کا سرمایہ دار طبقہ اپنے ملک میں زیادہ فائدہ نہیں اٹھا سکتا تو دوسرے ممالک میں روپیہ لگاتا ہو روپیہ لگانے کا یہ مطلب نہیں کہ بست سا روپیہ یا سونا جہازوں میں بھر کر دوسرے ملک میں بھیجا جاتا بلکہ اس کے مختلف طریقے ہیں مثلاً قدرزاید کی برآمد جنگی اسکیمیں اور قرضہ وغیرہ چونکہ جدید ملوکیت سرمایہ داری ہی کا نتیجہ ہو اس لیے [illegible] پذیر سرمایہ داری ریاستیں ہی ملوکی پالیسی اختیار کر سکتی ہیں۔

سویٹ اقتصادیات سرمایہ دارانہ نہیں ہیں اس کی اقتصادیات کا ضروری اور اہم اصول پیداوار کے ذرائع (مثلاً فیکٹری، کانیں، زمین اور سرمایہ) کی ذاتی اور انفرادی ملکیت کا فقدان ہے یہ اشتراکیت کا سنگ بنیاد ہو پیداوار کی انفرادی ملکیت ختم ہو جانے پر پیداوار اور اس کی تقسیم کی نوعیت ہی بدل جاتی ہو نفع گیری کے بجائے استعمال اس کا اولین خیال کیا جاتا ہو۔ یہ صحیح ہو کہ اشتراکی نظام میں بھی سرمایہ جمع ہوتا ہو اور اس کے جمع ہوئے بغیر صنعت و حرفت کی ترقی ہی ممکن [illegible] ہو لیکن یہ جمع شدہ سرمایہ اجتماعی محنت کا نتیجہ ہوتا ہو نفع گیری اور لوٹ کھسوٹ کا نہیں۔

کیا سویٹ روس کے لیے وسعت ملکی کی ضرورت ہو؟ یہ صحیح ہو کہ وہاں کی آبادی بہت ہو لیکن اس کے پاس زمین بھی کافی ہو روس دنیا کا چھٹاں حصہ ہو اگر وہاں کی آبادی دس گنا بڑھ جائے تب بھی روس گنجان نہیں کہا جا سکتا اس کے علاوہ اور کوئی بھی سبب نہیں جو سویٹ کو ملک گیری کی پالیسی اختیار کرنے پر مجبور کرے۔ اس کے پاس اتنا فالتو سرمایہ بھی نہیں جو دوسرے ملکوں میں لگائے۔ کسی

پہلو سے بھی وہ قدیم یا جدید ملوکیت پرست نہیں کہا جا سکتا۔

اب آئیے دورِ حاضرہ کے چند واقعات پر نظر ڈالیں اگر سوویٹ روس ملوکیت پسند نہیں ہو تو کیا وجہ ہے جو اس نے پولینڈ، فن لینڈ اور بسارابیہ پر حملہ کیا اگر بین الاقوامی حالت سے ہٹ کر اس کی وجہ معلوم کی جائے تو ہم ناکامیاب رہیں گے اس لیے ہمیں تاریخ دہرانا پڑے گی گزشتہ پندرہ سال سوویٹ روس امن قائم رکھنے کے لیے چلا رہا تھا مجلس اقوام میں کئی سال تک مسٹر لٹویانف [illegible] کوشش کرتے رہے بار بار فاشی طاقتوں کی عیارانہ چالوں اور جارحانہ منصوبوں سے جمہوری ریاستوں کو متنبہ کرتے رہے متحدہ محاذ کے لیے سعی بلیغ کرتے رہے فرانس سے جرمنی کے خلاف معاہدہ کیا عالمگیر ہتھیار بندی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی لیکن جمہوریتوں کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی تمام نام نہاد جمہوریں اور فاشی طاقتوں نے عالمگیر اسلحہ بندی میں تخفیف کے بجائے اضافہ کیا مجلس اقوام کی کمیٹیاں بنیں اور ٹوٹ گئیں کیونکہ اسکوڈا فیکٹری کے جنگی اسلحہ جات میں انگریزی امریکی اور فرانسیسی سرمایہ داروں کا ساجھا تھا زیکوسلاویہ کے جرمنوں کے ہاتھ میں آجانے کے بعد بھی انگریزی بمباروں نے اسکوڈا پر بمباری نہیں کی کیونکہ ہٹلر نے انگریز سرمایہ داروں کو یقین دلایا تھا کہ ان کے حصوں کا نرخ بڑھا دیا جائے گا۔

اپنی قومی شان کو خطرہ میں ڈال کر بھی سوویٹ روس نے جنگ ٹالنے اور امن و امان قائم رکھنے کی کوشش کی اس نے جرمنی سے دب کر برسٹ لٹوسک کی صلح منظور کر لی تھی جاپانی عسکری حوصلوں کے آگے جھک کر جنگ رفع دفع کی تھی یہ سب آخر کیوں؟ محض دنیا میں امن قائم رکھنے کے لیے اور ہر طرف گھرے ہوئے فاشی اور نیم فاشی ریاستوں سے اپنے ملک کو بچانے کی خاطر انقلاب دشمن ملکوں کی توپوں کے دہانوں کے سامنے اس نے عالمگیر انقلاب کا خواب دیکھنا بھی چھوڑ دیا تھا اور اپنے اس ملک کو بچانے کی ٹھان لی جہاں خون کی ندیاں بہہ کر ابھی ابھی دنیا کا ایک بہترین نظام قائم ہوا تھا۔

۱۹۳۹ء شروع ہوتے ہی اسے جنگ کا زبردست خطرہ محسوس ہوا وہ جانتا تھا کہ اگر یہ

جنگ چھڑ گئی تو دنیا کی تمام سرمایہ دار اور فاشسٹ طاقتیں مل کر سوویٹ یونین کو تباہ کرنے کی فکریں کریں گی۔ اسے معلوم تھا کہ ۲ ستمبر ۱۹۳۹ء سے ایک ہفتہ قبل انگلستان کے وزیر داخلہ مسٹر ہڈسن نے جرمنی کو ایک کروڑ پونڈ قرض دینے کا وعدہ کیا تھا تاکہ وہ اپنی صنعتیں بڑھا سکے دوسرے الفاظ میں یہ کثیر رقم سوویٹ روس پر حملہ کی تیاری کے لیے دی جا رہی تھی۔ سوویٹ کے لیڈر نہ تو پاگل تھے اور نہ جذباتی جبکہ دنیا کی تمام طاقتیں مل کر بین الاقوامی اخلاق کو پاش پاش کر رہی تھیں۔ سوویٹ یونین کا محض جذباتی یا اصولی طور پر اس کا قائم رکھنا ایک بے معنی تھی۔

اعتراض کیا جاتا ہے کہ روس و جرمن معاہدہ موجودہ جنگ کا پیش خیمہ تھا۔ اس نے جرمنی کی ہمت دوبالا کر دی جرمنی کو روس کی طرف سے اطمینان ہو گیا کہ اسے دو محاذوں پر جنگ نہیں کرنا پڑے گی چنانچہ اس نے پولینڈ پر حملہ کر دیا اور مجبوراً فرانس و انگلستان کو اعلان جنگ کرنا پڑا روس و جرمن معاہدہ کے تدبر کا اگر ذکر کیا جائے تو ایک الگ مضمون کی ضرورت ہوگی اس سے روس کو جو کچھ فائدہ ہوا وہ مختصر یہ تھا اوّل روس کو اطمینان ہو گیا کہ سرمایہ داری طاقتیں اب متحد نہیں ہو سکتیں دوم ہٹلر کی کتاب "میری جدوجہد" کا وہ خواب کہ وہ یوکرین پر حملہ کرے گا اور دنیا کا کل سرمایہ دار طبقہ اس کی پشت پناہی پر موجود ہوگا شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا سوم متوسط یورپ کی ریاستیں ایک زمانہ کے لیے ہٹلر کی زد سے بچ گئیں۔ چہارم انگلستان اور فرانس سے لڑ کر جرمنی کافی کمزور ہو جائے گا اور روس کو آسانی سے شکست نہ دے سکے گا پنجم روس کو موقعہ مل جائے گا کہ وہ جنگی تیاری کر کے جرمنی کا ڈٹ کر مقابلہ کر سکے ششم۔ روس اور اشتراکیت کے خلاف جرمنی کا آٹھ سال کا پروپیگنڈا ختم ہو جائے گا تھوڑی دیر کے لیے اسٹالن کی اس بصیرت افروز پالیسی پر دھیان نہ بھی دیں اور روس و جرمن معاہدہ ہی کو موجودہ جنگ کی جڑ سمجھیں پھر بھی سوویٹ روس حق بجانب نظر آئے گا یہ پولینڈ کے قصیہ سے ثابت ہوگا۔

جب ہٹلر اور فاشی طاقتوں کی دھمکیاں محض دھمکیاں نہ رہیں بلکہ ان پر عمل بھی شروع ہو گیا اور دنیا کے سامنے حبش، آسٹریا، اسپین اور زیکوسلاواکیہ کی بربادی کا نقشہ پھر گیا تو ۱۹۳۹ء کے

شروع ہوتے ہی روسیوں کے سامنے جرمنوں کے جارحانہ منصوبے سوالیہ جلد ن کر کھڑے ہو گئے
جمہوری طاقتوں کا اس قدر دشمن نہ تھا جس قدر سوویٹ روس کا وہ آپ کو اشتراکیت کا دشمن کہکر
فخر کرتا تھا بقول اس کے کیونسٹ تہذیب و تمدن کی ذلیل ٹھیٹ ہیں جرمنی میں اس نے اشتراکیوں
کی طاقت توڑ دی انہیں ہزاروں کی تعداد میں موت کے گھاٹ اتارا مزدوروں کی انجمنیں اپنے
سیاہ وردی والے غنڈوں سے برباد کرائیں فرانکو کی حمایت میں اسپین میں جمہوریت پسند عوام پر
گولے برسائے رائشاغ کی آتش زدگی پر ہزاروں کیمونسٹوں کو گولی سے اڑادیا بعد میں معلوم ہوا کہ
رائشاغ میں خود ہٹلر نے آگ لگوائی تھی تاکہ وہ اس بہانے سے کیمونسٹوں کا صفایا بول دے۔ دنیا
جانتی ہو کہ اشتراکیت کا سب سے بڑا دشمن فاشی نظام ہے روس خاموش نہ تھا دنیا کی الٹ پلٹ
دیکھکر اسے خوشی نہ ہوتی تھی وہ جانتا تھا کہ ہٹلر کے کیا منصوبے ہیں اور جمہوری ریاستیں کس طرح اسکے
چاروں طرف جال پھیلا رہی ہیں اسپین میں انگلستان فرانس اور امریکہ کی عدم مداخلت اور میونک
معاہدہ اس کا بین ثبوت تھا کہ سرمایہ داری طاقتوں میں ملی بھگت تھی ادھر ہٹلر نے پولینڈ سے
مطالبات شروع کر دیے انگلستان اور فرانس کی جمہوری ریاستیں اس کے لیے بھی تیار تھیں فرانس
کی حکومت نے ایک "یلو" کتاب شائع کی ہو جس میں جنگ سے قبل فرانس و جرمنی کی سرکاری
خط و کتابت اور دیگر اہم مسودات شائع کر دیے ہیں اس کے پڑھنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ
فرانسیسی حکومت پولینڈ کے معاملہ میں دب کر سمجھوتہ کرنے پر تیار تھی۔

انگلستان کی حکومت کا رویہ ظاہر تھا۔ پولینڈ کو اس کے تحفظ کی ضمانت دے چکنے کے بعد
بھی پس پردہ جرمنی سے سمجھوتہ کی سانٹھ گانٹھ ہو رہی تھی یہ روس اور انگلستان کی گفت و شنید سے ظاہر
ہو جاتا ہے جب انگلستان کے جمہوری اور فاشی دشمن عوام نے دیکھ لیا کہ ان کی حکومت فاشی طاقتوں
سے میل جول رکھنا چاہتی ہے تو انھوں نے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور کھلے بندوں
حکومت کو برا کہنا شروع کیا مزدوروں کے جلسے اور لیبر پارٹی کی کانفرنسیں ہوئیں اور گورنمنٹ
کو متنبہ کیا گیا کہ اگر اس نے پولینڈ کے معاملہ میں غفلت سے کام لیا اور جرمنی کے ارادوں کے آگے

مثلاً اس کی وجہ سے معیارِ زندگی پست ہو جاتا ہے اور بہت سی ضرورتوں سے انسان کو دست بردار ہونا پڑتا ہے قومی صحت برباد ہو جاتی ہے۔ توانائی اور جانداری کم ہو جاتی ہے جس سے ایک جانب اس کی کارکردگی کی صلاحیت کم ہو جاتی ہے اور دوسری جانب امراض اور بیماریوں کی قوت مدافعت کمزور ہو جاتی ہے اس کی وجہ سے نہ صرف امراض کی کثرت میں اضافہ ہو جاتا ہے بلکہ معمولی معمولی بیماریاں بھی وباؤں کی طرح پھیلتی ہیں جو ایک بڑی تعداد کو اپنا لقمہ بناتی ہیں اور اس سے بڑی تعداد کو ایڑیاں رگڑنے کے لیے دنیا میں چھوڑ جاتی ہیں اس کی وجہ سے جرائم میں اضافہ ہوتا ہے، فرقہ واری مناقشات اور طبقہ واری فسادات پیدا ہونے لگتے ہیں زرخیز اور شاداب زمینوں کی قلت ہی اقوام کو مجبور کرتی ہے کہ وہ دوسرے ملکوں پر حملہ کریں۔ ان کو مسئلہ افلاس کے بنیادی اسباب کہا جاتا ہے۔ اور یہی خوفناک پیشین گوئیوں سے تعبیر کی جاتی ہیں۔ مگر موجودہ زمانے میں حالات میں بڑی تبدیلی ہو گئی ہے سیاسی امن و امان نسبتاً اور مقابلتاً بڑھ گیا ہے راستے کے خطرے اب تجارتِ خارجہ میں رخنہ انداز نہیں ہوتے مشینوں اور کارخانوں کی وجہ سے مال بڑی مقدار میں اور بہت کم وقت میں تیار ہونے لگا ہے آمد و رفت اور نقل و حمل کے ذرایعوں میں جو انقلاب ہوا تو ساری دنیا ایک بازار بن گئی ان باتوں سے مسئلہ آبادی میں بعض تبدیلیاں ہو گئی ہیں مثلاً آج کسی ملک کے لیے عام حالات میں یہ ضروری نہیں کہ وہ اپنی ضرورت کی تمام خوردنی اشیا اپنے ہاں پیدا کرے بلکہ وہ یہ چیزیں دوسرے ملکوں سے بھی حاصل کر سکتا ہے بشرطیکہ اس کے پاس معاوضہ میں دوسرے قسم کی دولت یا خدمات ہوں جن کو فریقِ ثانی قبول کرنے کے لیے تیار ہو چنانچہ اسی اصول کے تحت یورپ کے اکثر ملک بالکل صنعتی ملکوں میں تبدیل ہو گئے اور وہ اپنی کثیر آبادی کے لیے دوسرے ملکوں سے زرعی پیداواریں منگوا کر اپنی آبادی کو زندہ رکھتے ہیں یا بعض ملک معاشی اور سیاسی خدمات انجام دے کر دوسرے ملکوں سے پیداواریں حاصل کرتے ہیں لیکن جس کے پاس نہ تو درآمد کرنے کے لیے مال ہو اور نہ معاوضہ میں پیش کرنے کیلیے خدمات تو وہاں بدترین افلاس کا پایا جانا ضروری ہے۔

جیسا کہ کہا گیا کسی ملک کی آبادی میں اضافہ بذاتِ خود نہ اچھا ہے اور نہ برا بلکہ یہ واقعات اور حالات پر منحصر ہے لہٰذا ان مبادیات کو بیان کرنے کے بعد ہم ہندوستان کی آبادی پر نظر ڈالیں گے اور

سر جھکا دیا تو بین الاقوامی جمہوریت خاک میں مل جائے گی۔ پارلیمان کا چناؤ بھی ہونے والا تھا۔ حکومتی حلقوں میں سنسنی پھیل گئی اور انہوں نے فوراً اعلان کر دیا کہ پولینڈ کے تحفظ کا ضامن انگلستان بنتا ہے۔ [illegible] نے اس پر خوشی کا اظہار کیا لیکن انگلستان نے آئندہ عمل پر [illegible] بہت زیادہ سمجھتا تھا کہ عوام [illegible] سے مجبور ہو کر حکومت نے پولینڈ کو ضمانت دے دی ہے لیکن اس ضمانت میں اخلاص نظر نہیں [illegible] انگریزی حکومت کے ارادوں کو جانچنے کی غرض سے گفت و شنید شروع کی اور یہ تجویز پیش کی کہ پولینڈ کے تحفظ کے لیے روس کی امداد طلب کی جائے۔ نہ صرف روس بلکہ ہر شخص جانتا ہے کہ پولینڈ میں اگر کوئی جنگی کمک پہنچا سکتا تھا تو وہ روس تھا کیونکہ اس کی سرحد پولینڈ سے ملی ہوئی ہے۔ انگریزی فوجیں کس طرح آ سکتی تھیں۔ اس سلسلے میں پارلیمان میں ایک دلچسپ قصہ پیش آیا۔ جس وقت وزیر اعظم مسٹر چیمبرلین نے اپنے عام [illegible] بیٹھ کر یہ اعلان کیا کہ انگریزی حکومت پولینڈ کو اس کے تحفظ کی ضمانت دیتی ہے تو مسٹر لائڈ جارج نے کھڑے ہو کر پوچھا ضمانت دیتے وقت کیا جنگی کمانڈروں سے پوچھ لیا گیا تھا؟ کیا انگلستان پولینڈ میں کمک پہنچا سکتا ہے؟ اگر اس سوال کا جواب اثبات میں ہے اور کمانڈروں نے بھی حامی بھری ہے تو ایسے کمانڈروں کو فوراً نکال دینا چاہیے۔ پولینڈ انگلستان سے قریب قریب ایک ہزار میل دور ہے۔ بیچ میں سمندر اور کئی ریاستیں ہیں خاص کر جرمنی اس کا دروازہ روکے کھڑا ہے۔ بالٹک سمندر سے کمک نہیں پہنچ سکتی کیونکہ جرمنی آبدوز کشتیوں کے ذریعہ تمام جہاز ڈبو سکتا ہے۔ سوویٹ روس پولینڈ کا ہمسایہ ہے۔ اس کے جہاز بھی بالٹک سمندر میں موجود تھے۔ اس کی فوج بھی چند گھنٹوں کی اطلاع پر پولینڈ میں داخل ہو سکتی ہے۔ اس کے ہوائی جہاز وارسا کے اڈوں سے اڑ کر برلن پر بمباری کر سکتے تھے۔ چنانچہ روس کی امداد کے بغیر پولینڈ کو ضمانت دے دینا حماقت تھی۔ پھر بھی روس نے دوستی کا ہاتھ آگے بڑھایا۔ اس نے انگلستان اور فرانس سے کہا کہ وہ پولینڈ کے تحفظ [illegible] کو بھی ضمانت [illegible] دیکھنا چاہتا تھا اس پر عمل ہونا چاہیے۔ انگریزی مشن ماسکو بھیجنے اور گفت و شنید کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا لیکن یہ مشن کئی ماہ کے بعد سمندر کے راستہ سست رفتار [illegible] کی سرگردانی میں پہنچا۔ انگریزی حکومت اب بھی پس و پیش کر رہی تھی اور کمیونسٹ حکومت کے ساتھ معاہدہ کرتے ہوئے گھبرا رہی تھی۔ چنانچہ

فوج کے ایک معمولی افسر مسٹر اسٹرینگ بھیجے گئے جو نہ تو عوام کے نمائندے تھے اور نہ ان کو اتنے اختیارات تھے کہ وہ معاہدہ کرسکتے۔ تین ماہ تک ماسکو میں گفت و شنید ہوتی رہی لیکن کوئی معاہدہ نہ ہوسکا تمام دنیا کی آنکھیں اس کانفرنس کی طرف لگی ہوئی تھیں ان کے استعجاب اور افسوس کی کوئی انتہا نہ رہی جب انہیں معلوم ہوا کہ انگلستان معاہدہ کی راہ میں روڑے اٹکا رہا ہے ماسکو کی کانفرنس برخاست ہوگئی۔ اس کا اصل سبب یہ تھا کہ سوویٹ روس کا کہنا یہ تھا کہ پولینڈ پر حملہ ہونے کی صورت میں صرف روسی کمک پہنچا سکتی ہے چنانچہ روسی فوجوں کو پولینڈ میں داخل ہونے کی اجازت ملنی چاہیے انگلستان اور اس کے حلیف نیز پولینڈ کہتا تھا کہ روسی فوجیں پولینڈ میں نہ داخل ہوں۔ معمولی عقل کا انسان بھی سمجھ سکتا ہے کہ اگر کسی ملک پر حملہ ہو تو ہمسایہ جب تک اپنی فوجیں اس ملک میں نہ لائے وہ کیونکر مدد کرسکتا ہے "ہوائی ذریعہ" برقی یا فاصلے سے تو نہیں اڑائی جاتی۔ دوسرے یہ کہ سوویٹ روس کا مطالبہ تھا کہ پولینڈ کے ساتھ ہی ساتھ تمام بالٹک ریاستوں کی ضمانت دے دی جائے کیونکہ اسے خطرہ تھا ممکن ہے کہ جرمنی لٹویا، اسٹونیا یا لتھوانیا سے ہو کر روس پر حملہ کرے ایسی حالت میں اپنی سرحد مضبوط کرلینا سیاسی عقلمندی ہے روس یہ تمام مطالبات جرمنی کے خلاف طلب کر رہا تھا پھر بھی انگریزی حکومت نے انہیں ٹھکرا دیا۔ لندن ٹائمز کے فوجی نامہ نگار نے بھی ٹائمز میں لکھا کہ اگر پولینڈ کو بچانا ہے تو روس کی تمام شرطیں منظور کرلینی چاہییں لیکن انگریزی سیاستداں پھر بھی نہیں مانتے تھے ماسکو کی کانفرنس ختم کردی گئی۔ روس کو اب زبردست خطرہ محسوس ہونے لگا پولینڈ کے ذریعہ کسی وقت بھی اس پر حملہ ہوسکتا تھا ہٹلر کے منصوبے ظاہر تھے۔ کیا سوویٹ اس وقت بھی خاموش رہتا یہاں تک کہ جرمنی اس پر حملہ کردیتا اور تمام جمہوری ریاستیں بالواسطہ یا بلاواسطہ اس کا ساتھ دیتیں۔ چنانچہ سوویٹ روس نے اس وقت جو کچھ کیا اپنے بچاؤ کے لیے کیا۔ اس روشنی میں دیکھنے کے بعد روس جرمن معاہدہ ایک سیاسی تدبر نظر آئے گا۔ کچھ دن کے لیے جرمنی کا حملہ رک گیا۔ اس دوران میں روس نے جنگی تیاری شروع کر دی۔

یکم ستمبر ۱۹۳۹ء کو ہٹلر نے پولینڈ پر حملہ کردیا دو ہفتے کے اندر پولی حکومت کے پیر اکھڑ گئے حکومت

[illegible] سیاست دانوں کے لیے بھاگ گئے ہر طرف ابتری اور بے سروسامانی پھیل گئی۔ اس کے شہر بری طرح برباد کیے گئے کہ ان کا نشان تک باقی نہ رہا صرف نام رہ گیا۔ دنیا پوچھ رہی تھی کہ انگلستان کی [illegible] کہاں گئی۔ لوگوں کو اب معلوم ہوا کہ سوویٹ روس کی امداد کس قدر ضروری تھی۔ پولینڈ کی حکومت کے بھاگتے ہی تمام ملک درہم برہم ہو گیا۔ سوویٹ روس کب برداشت کر سکتا تھا کہ کل کا کل ملک [illegible] وہاں کے کارخانے جرمنی کے لیے اسلحہ بنائیں اور اس کا غلہ جرمن فوج [illegible] بنایا جائے چنانچہ بدلتے ہوئے زمانے اور فاشی طاقتوں کے خطرناک عروج سے [illegible] فوجیں پولینڈ میں بھیج دیں۔ جرمنی سوویٹ سے قبل از وقت نہیں بگاڑنا چاہتا تھا چنانچہ دونوں نے مل کر آدھا آدھا پولینڈ تقسیم کر لیا۔ پولینڈ کی تقسیم پر دنیا کے نام نہاد بلند، علاقوں کے حلقہ میں کھلبلی [illegible] روس کو گالیاں دی جانے لگیں روس کو بھی جرمنی کا ساجھے دار اور ایشیائی بھیڑیا پکارا جانے لگا رفتہ رفتہ پولینڈ کی خبریں تمام دنیا میں پہنچیں لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ جس حصہ پر روسیوں نے قبضہ کر لیا ہے وہاں سوائے ملبہ اور تباہی کے کچھ باقی نہیں لیکن روسی فوج کا پولینڈ کے مزدوروں اور کسانوں نے استقبال کیا روسی نظام اس حصہ میں بھی قائم کر دیا گیا۔ ہر کسان کو ایک گائے اور چند ایکڑ زمین مل گئی۔

پولینڈ کے واقعات پر بھی نظر ڈال لیجئے بدقسمتی سے وہ جرمن خطرہ کو محسوس نہیں کرتا تھا اور روس سے دوستانہ تعلقات رکھنے کا روادار نہ تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ عالمگیر سرمایہ داری روس کے خلاف تھی سنہ ۱۹۳۴ء سے ایک سرمایہ دار حکومت برسوں کوشش کر رہی تھی کہ وہ روس پر حملہ کریں لوکارنو کا معاہدہ روس کے خلاف کیا گیا تھا وارسائی کی صلح کے تمام دفعات ایک ایک کر کے جرمنی نے نہیں بلکہ انگلستان فرانس اور امریکہ نے پاش پاش کیے تھے اس صلح کی ایک دفعہ کے بموجب جرمنی جنگی جہاز نہیں بنا سکتا تھا سنہ ۱۹۳۵ء میں مسٹر بالڈون نے جرمنی سے ایک بحری معاہدہ کیا اور اسے اجازت دے دی کہ وہ انگریزی بحری طاقت کا ۳۵ فیصدی بنا سکتا ہے فاشی جرمنی میں صنعت و حرفت بڑھانے کے لیے امریکہ اور دوسری طاقتوں نے اسے قرض دیا جنگی قرض جرمنی

پہلے معاف کر دیا گیا ہٹلر سے پہلے نہیں بلکہ اس کے اقتدار میں آنے کے بعد کوششیں ہو رہی تھیں
کہ جرمنی کو انقلاب سے بچایا جائے اور فاشزم کو فروغ دے کر سوویٹ روس کے مدمقابل کھڑا کر دیا
جائے میونک کے معاہدہ میں زیکوسلاواکیہ کو ذبح کر دیا گیا روس سب کچھ دیکھ رہا تھا وہ جانتا تھا کہ پولینڈ
کے تحفظ کی ضمانت بیکار ہے پولینڈ پر حملہ اور اس کی شکست کے بعد ایک نئے میونک کی تیاری ہو رہی
تھی پولینڈ پہنچ کر فاشسٹ فوراً سوویٹ روس پر حملہ کر دیتے ہٹلر وعدہ توڑنے میں آمر ہی روس جرمن معاہدہ
بھی بیمار کر پھینک دیا جاتا اگر مغربی جمہوری حکومتیں آسٹریا، زیکوسلاواکیہ اور پولینڈ کی تباہی کے بعد
خاموش رہ سکتی تھیں تو سوویٹ پر حملہ کے وقت اس کا رویہ ظاہر تھا

لیکن کیا پولینڈ پر روسی حملہ فی الواقع کوئی حملہ تھا؟ کہا جاتا ہے کہ پولینڈ ایک جمہوری ریاست تھی
لیکن یہ غلط ہے پولینڈ میں نہ جمہوریت تھی اور نہ قومی حکومت۔ ۳۳ فی صدی باشندے غیر پولینڈ کے تھے
یعنی یوکرینی اور سفید روسی بیس سال سے پولینڈ کی اقلیتوں کے ساتھ حکومت کا جو سلوک تھا وہ
ہندوستان میں اچھوتوں کے ساتھ ہوتا ہے پولینڈ کا ملک وارسائی کی صلح کے بعد بنا ہے اس کو ایک
علیحدہ ملک بنانے کا راز قدیم آسٹرین ملوکیت کو توڑنا مقصود تھا اور بالشویزم اور مغربی حکومتوں کے
درمیان ایک حد فاصل قائم کرنا مطلوب تھی علیحدہ ملک بنتے ہی غیر پولی باشندوں میں ایک زبردست
قومی تحریک شروع ہو گئی جس کا منشا پولینڈ سے علیحدگی اختیار کرنا اور سوویٹ روس میں ضم ہو جانا تھا۔ ان کی
یہ تمنا تھی بھی فطری کیونکہ نسلی اور تاریخی لحاظ سے یوکرین اور سفید روس سوویٹ کی اولاد تھے سوویٹ
روس میں رہنے والے ہم قوم یوکرینی وغیرہ کی خوش حالی نے اور بھی تازیانہ کا کام کیا اور وہ سوویٹ
میں ضم ہو جانے کے لیے بے چین ہو گئے۔ اس کے باوجود سوویٹ حکومت نے پولش حکومت سے کوئی
مطالبہ نہیں کیا اور نہ یوکرینیوں اور سفید روسیوں کے علاقے واپس کرنے کو کہا

جس وقت نازی فوج پولینڈ میں داخل ہونے لگی اور سوویٹ کو خطرہ محسوس ہوا کہ پولینڈ فتح
کر لینے کے بعد جرمنی اس پر بھی حملہ کر بیٹھے گا تو اس نے جنگی اور سرحدی تحفظات کی غرض سے سوویٹ فوج
پولینڈ میں بھیج دی جس نے نہ صرف سفید روسیوں اور یوکرینیوں کو آزاد کرایا بلکہ جرمنی کے بڑھتے ہوئے

[illegible] دوبارہ روس کو دے دیا جائے چنانچہ پولینڈ پر روس کا حملہ صرف اپنے بچاؤ اور سفید روسیوں اور یوکرینیوں کو آزاد کرانے کے لیے کیا گیا تھا۔

[illegible] اب ذرا فن لینڈ کے قضیہ پر نگاہ ڈالیں۔ لٹویا، اسٹونیا اور لتھوانیا نے [illegible] معاہدہ کرلیا اور روس نے انھیں تحفظ کی ضمانت بھی دیدی تھی لیکن فن لینڈ کسی سمجھوتہ کے لیے تیار نہ تھا۔ [illegible] کی جنگ شروع ہوئے کئی ماہ ہو چکے تھے لیکن کہیں بھی کوئی لڑائی اور نبرد آزمائی شروع نہ ہوئی تھی۔ سوویت [illegible] نہ صرف جرمنی سے خطرہ تھا بلکہ مغربی جمہوری ریاستیں بھی اس کے خلاف تھیں۔ سرمایہ داروں میں مصالحت کی گفت و شنید ہو رہی تھی مغربی محاذ پر جنگ بند کرکے ایک دوسرا محاذ قائم کرنے کی تجویزیں ہو رہی تھیں۔ فن لینڈ کے ذریعہ روس پر حملہ ہو سکتا تھا۔ مغربی ممالک بآسانی سوئیڈن کے راستے فن لینڈ اپنی فوجیں بھیج سکتے [illegible] انگریزی جہازی اڈا بھی پٹسامو میں بن چکا تھا۔ بین الاقوامی سیاست کا عجیب حال تھا۔ جنگ تو انگلستان، فرانس اور جرمنی کے درمیان تھی لیکن سوویت کے خلاف دوسری طرف جال پھیلایا جا رہا تھا۔ انگلستان کا دشمن تو جرمنی تھا پھر کیا وجہ تھی کہ مغربی محاذ پر دشمن سے نبرد آزمائی کے بجائے پٹسامو میں انگریزی جہازی اڈا بنایا گیا؟

فن لینڈ ایک غیر زرخیز اور غریب ملک ہے وہاں کی پیداوار وہاں کے باشندوں کے لیے بھی کافی نہیں لیکن ایک سال سے فن لینڈ کی حکومت قلعہ بندی کر رہی تھی قلعے بنائے جا رہے تھے فوجیں تیار ہو رہی تھیں اور جدید ہتھیاروں کی مشق ہو رہی تھی۔ آخر یہ تیاری کس کے خلاف تھی؟ سوویت روس ہی فن لینڈ پر حملہ کر سکتا تھا لیکن وہ اپنی نیک نیتی کا ثبوت دے چکا تھا فوجی تیاریوں کی نوعیت بھی بچاؤ کی سی نہیں بلکہ حملہ کی سی تھی چنانچہ جب سوویت روس نے فن لینڈ سے معاہدہ کے لیے گفت و شنید شروع کی تو اس نے صاف انکار کر دیا کہا جاتا ہے کہ اگر فن لینڈ سوویت کی تجاویز منظور کر لیتا تو اسے اپنی آزادی سے دست بردار ہونا پڑتا لیکن یہ غلط ہے سوویت روس کا مطالبہ تھا کہ فن لینڈ پٹسامو کے اردگرد کا بنجر علاقہ اسے دیدے جس کے معاوضہ میں وہ اس قطعہ زمین کا تین گنا حصہ دینے کو تیار تھا۔ کیا اسی کو آزادی پر ڈاکہ ڈالنا کہتے ہیں؟ پٹسامو کا محل وقوع نہایت مناسب تھا۔ وہاں سے روس پر بآسانی حملہ ہو سکتا ہے اور

دوسرے ممالک کی فوجیں بغیر خطرے کے وہاں آسکتی ہیں اور ہوا بھی ایسا ہی۔ روس اور فنلینڈ کی جنگ میں [illegible] ریاستوں نے یہیں اپنی فوجیں اتاری تھیں۔ ۱۹۲۰ء میں بھی روس کے خلاف اتحادیوں کی مداخلت یہیں سے شروع ہوئی تھی۔ جرمنی کا جنرل لوڈنڈراف کہتا تھا: "فنلینڈ روس کا قفل ہے مجھے اس کی [illegible] گئے تو میں روس کا دروازہ کھول سکتا ہوں۔" سوویٹ حکومت کا فرض تھا کہ وہ اس کنجی کو دشمن کے پاس نہ جانے دے لیکن فنلینڈ یہ کنجی فاشی طاقتوں کے ہاتھ بیچنے کو تیار تھا جب تمام کوششیں بیکار [illegible] ہیں تو سوویٹ نے فنلینڈ پر حملہ کیا۔

سوویٹ نے مطالبات کیا تھے؟ پٹسامو کے بندرگاہ کے علاوہ وہ لینن گراڈ کے قریب کا علاقہ تقریباً ساڑھے پانچ ہزار مربع میل طلب کر رہا تھا اور اس کے معاوضہ میں وہ اس کا بیس گنا زرخیز علاقہ جھیل لڈوگا کے پاس دینے کو تیار تھا۔ اس کے علاوہ روس چاہتا تھا کہ فنلینڈ تیس سال کے لیے جزیرہ ہینگو اس کے ہاتھ میں دیدے اور جزیرہ آلینڈ سے اپنی فوجیں ہٹا لے۔ نقشہ کے دیکھنے سے معلوم ہو جائے گا کہ یہ علاقے فنلینڈ کے لیے بالکل بیکار ہیں لیکن اگر یہاں دشمن کا قبضہ ہو گیا اور جس کی امید بھی تھی، اور کرونشاٹ کے بندرگاہ پر آبدوز جہاز رانی اڈا بن گیا تو روس کے جنگی اور تجارتی جہاز بالٹک میں نہیں آسکتے ان کو بہت آسانی سے ختم کیا جا سکتا ہے۔ جزیرہ آلینڈ آبنائے فنلینڈ کا دروازہ ہے اور لینن گراڈ سے بہت نزدیک۔ آج کل کی بڑی توپیں کرونشاٹ سے لینن گراڈ پر بمباری کر سکتی ہیں۔ [illegible] میں جب یہ جزیرہ فنلینڈ کے ہاتھ آیا تو مجلس اقوام نے یہاں فوج رکھنا اور جنگی قلعے بنانا ممنوع قرار دیدیا تھا۔ ۱۹۳۷ء میں فنلینڈ نے یہاں قلعہ بندی شروع کر دی سوویٹ نے اس کی مخالفت کی لیکن بے سود فنلینڈ مجلس اقوام کے فیصلہ کو کالعدم کرنے پر تلا ہوا تھا اور مجلس اقوام خاموش تھی مغربی جمہوری ریاستیں بھی چشم پوشی کر رہی تھیں سوویٹ اس کو حملہ کا پیش خیمہ سمجھتا تھا وہ کب تک خاموش رہتا اس پر حملہ کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں چنانچہ اسے مجبوراً اپنے تحفظ کے لیے اس حملہ کا تدارک کرنا پڑا۔

روس و فنلینڈ گفت و شنید کی داستان بھی لطف سے خالی نہیں فنلینڈ ایک آزاد ریاست تھی اور اسے پورا پورا اختیار تھا کہ وہ جس سے چاہے معاہدہ کرے لیکن گفت و شنید کی لمبی داستان اس کا

یہ ثبوت ہو کہ فنلینڈ کے ارادوں اور خواہشات پر دوسروں کا قبضہ تھا بہت کچھ لیت و لعل کے بعد فنلینڈ [illegible] وفد ماسکو پہنچا سویٹ حکومت نے بعض تجاویز پیش کیں لیکن بجائے ماسکو میں غور کرنے کے وفد فنلینڈ کے دارالخلافہ ہلسنکی واپس گیا تاکہ وہاں معتمدین ریاست سے مشورہ کرے۔ ماسکو اور ہلسنکی کے درمیان زیادہ فاصلہ بھی نہیں پھر لاسلکی اور تار کی رسل و رسائل بھی موجود تھی۔ ہوائی جہاز ۴ ۲ گھنٹے میں ہلسنکی [illegible] پہنچ سکتا تھا لیکن فنلینڈ کا وفد ریل سے سفر کرتا اور اپنے دارالخلافہ سے کئی کئی روز [illegible] تاکم از کم چھ بار اس وفد نے ہلسنکی کا چکر لگایا اور کئی مہینے روس کو گفت و شنید میں اٹکائے رکھا وفد کے اس قدر دیر میں آنے کا ایک ہی سبب معلوم ہوتا ہے کہ فنلینڈ کی حکومت روسی تجاویز سننے کے بعد کسی اور حکومت کو مطلع کرتی ہوگی اور جب تک وہاں سے مشورہ نہ مل جاتے اپنے وفد کو روکے رکھتی ہوگی۔ یہ تیسری طاقت کون تھی؟ جب یہ وفد آخری جوابات کا وعدہ کرکے آخری بار ہلسنکی پہنچا تو حکومت بدل چکی تھی اور گفت و شنید کرنے کے لیے تیار نہ تھی۔

اس نئی حکومت کا وزیراعظم مسٹر رانگی تھا جو اخبار لنڈن ٹائمز کے قول کے بموجب لندن کے بینک کا ایک ڈائرکٹر تھا اور جس کی خدمات کے صلہ میں انگریزی حکومت نے اسے کے سی وی او کا خطاب عطا فرمایا تھا۔ یہ چھوٹے چھوٹے واقعات ایک طویل قصہ کی کڑی ہیں ان کو ملایا جائے تو کل راز عیاں ہو جاتا ہے۔ اخبارات کی سرخیوں کو پڑھنے والے پروپیگنڈے کے دھوکے میں آجاتے ہیں اور راز کی باتوں پر دھیان نہیں دیتے مسٹر رانگی کا حکومت میں آنا اس بات کا ثبوت تھا کہ روس و فنلینڈ کی گفت و شنید منقطع کرانے میں ایک تیسری طاقت کا ہاتھ تھا اس تیسری طاقت نے غریب فنی عوام کو ایک ایسے مضبوط ہمسایہ سے لڑا دیا جس کا دل غریب کی آہ و زاری پر بھر آتا تھا اور جو غریب کسانوں اور مزدوروں سے لڑنا نہیں چاہتا تھا۔

یہ ہے روس فنلینڈ کا سیاسی پس منظر چونکہ فنلینڈ کے لوگ دوسرے کے بہکانے میں آگئے اور حماقت کر بیٹھے اس لیے دنیا کے تمام سویٹ دشمنوں نے فنی سپاہیوں کی شجاعت کے گیت گانا شروع کر دیے۔ روسی فوجوں کو ناکارہ اور غیر تربیت یافتہ بتلایا جاتا تھا لیکن اصل واقعات اس کے بالکل خلاف ہیں۔ جو لوگ فنی فوج کے کارناموں پر سر دھنتے تھے یہ نہیں غور کرتے کہ فنلینڈ نے روس کا مقابلہ کس طرح کیا؟ موجودہ جنگ میں

روپیہ پانی کی طرح بہتا ہو۔ اخبارات کے ذریعہ بھی خبریں مشہور کی جاتی تھیں کہ فنی فوج جدید ترین اسلحات سے مسلح ہے اور اس کی سرحد پر زبردست قلعے بنائے گئے ہیں مینرہیم لائن کا مقابلہ میژنو لائن سے کیا جاتا تھا دنیا جانتی ہے کہ جب فرانس کے میژنو لائن بنائی تھی تو فرانس کا دیوالہ نکل گیا تھا فنلینڈ جیسے غریب، و مفلوک حال ملک کے پاس اتنا روپیہ کہاں سے آیا کہ اس نے مینرہیم لائن بنائی، فوجوں کو جدید ترین اسلحہ سے مسلح کیا اور ہوائی طاقت بھی قائم کر لی اس نے کسی ملک سے قرض بھی نہیں لیا معلوم تو یہی ہوتا ہے کہ کسی تیسری طاقت نے خفیہ طور پر مدد پہنچائی فنلینڈ غریب تھا لیکن بین الاقوامی سرمایہ داری تو اس کی پشت پناہی کر رہی تھی روس فنلینڈ کے اتنے دن تک نبرد آزمائی کی دوسری وجہ یہ تھی کہ روس غریب فنی عوام کو کسی طرح کا نقصان بھی نہ چاہتا تھا اس کا خیال تھا کہ چند چوٹیں کھانے کے بعد فنلینڈ صلح کرے گا لیکن اس کا خیال غلط نکلا فنلینڈ دوسروں کے لیے لڑ رہا تھا اس کی سرزمین پر انقلاب اور ضد انقلاب کی طاقتوں کا فیصلہ کیا جا رہا تھا روس نے محض چند دستے ہی محاذ پر بھیجے جو جدید ترین اسلحات سے مسلح بھی نہ تھے وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ فنلینڈ جدید ہتھیاروں سے مسلح تھا اور نئے قلعے بنا رہا تھا کئی ماہ تک لڑائی ہوتی رہی لیکن جب روس کو معلوم ہو گیا کہ بین الاقوامی سرمایہ فنلینڈ کو جنگی محاذ بنانا چاہتا ہے جب سے معلوم ہوا کہ انگریزی بحری بیڑہ پٹسامو پہنچ گیا فرانس کی پچاس ہزار فوج فنلینڈ کی امداد کے لیے روانہ ہو گئی اور امریکہ سے رسد پہنچنے لگی تو اس نے اپنی اصلی مسلح فوج بھیجی جس نے ایک ہفتہ کے اندر آدھے سے زیادہ فنلینڈ پر قبضہ کر لیا فنلینڈ اب خواب سے چونکا اور سویٹ سے صلح کر لی سویٹ نے یہاں بھی اپنی نیک نیتی کا ثبوت دیا۔ اول اسے اختیار تھا کہ صلح منظور ہی نہ کرتا اور تمام ملک فتح کر لیتا اور دوم یہ کہ صلح کی شرائط سخت ترین رکھتا لیکن سویٹ نے ایسا نہیں کیا اس نے جس قدر ملک جنگ کے دوران میں حاصل کر لیا تھا سب کا سب واپس کر دیا اور صرف پٹسامو، جزیرہ ہینگو اور آلینڈ اور کرونسٹاٹ کے قریب تھوڑے سے علاقہ ہی پر اکتفا کی اس سے صاف ظاہر ہے کہ روس کے ارادے قطعاً ملوکی نہ تھے وہ صرف اپنا تحفظ چاہتا تھا

(باقی آئندہ)

علی امام ایم اے

اشتراکیت اور خود مختاریت

اس میں شک نہیں کہ اس[2] جنگ نے بنی نوع انسان میں ایک عجیب اور خطرناک صورت پیدا کی ہے اور جمہور کی تکالیف اور مصائب میں خاص اضافہ کیا ہے اس لڑائی کا جبعت پسندانہ اثر دنیا کے تمام برتر طبقہ (سرمایہ داروں) پر یہ ہوا ہے کہ ان کے غارت گری اور سفاکی کے بالکل صحیح نمونے ہیں جو تمام بہادر قومیت و [illegible] کے ڈھونگ میں چھپا ہوا تھا بے پردہ ہوا ہمیں معلوم ہے کہ یہ تمام انقلاب ذہنی و [illegible] طور پر جمہور کے خیالات میں عام بیداری اور عام بے چینی پیدا ہونے سے نمایاں ہوا ہے اس انقلاب[1] کی اساس خیالات کی وجہ عام بیداری ہے ہمارا فرض ہے کہ ہم ان خیالات میں وسعت اور گہرائی پیدا کریں اور ان خیالات کو ایک شکل دیں۔ اس فرض کا صحیح اظہار اسی طرح ہو سکتا ہے کہ ہم نعروں اور شدید مظاہروں سے عام دلوں میں جوش [illegible] اور جوش انقلاب پیدا کریں اس لیے ہمیں چاہیے کہ اس [illegible] جنگ کو عام جمہوری لڑائی میں تبدیل کر دیں اور اپنے اصولی جد و جہد کو جو دوران جنگ میں انجام دیں اور ہمارے تمام جمہوری مظاہرے ہماری رہبری اسی خاص سمت میں کریں جہاں سے ہم ایک انقلاب پیدا کر سکیں ہمیں نہیں معلوم کہ اس عالمگیر جنگ میں جو دنیا کی بڑی اور عظیم قوموں کے درمیان جاری ہے وہ کون سی انقلابی تحریک ہے جو دبی ہوئی آگ کی مانند بھڑک اٹھے گی اس انقلاب کا حشر خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو لیکن ہم کو چاہیے کہ ہم اپنے مقصد کے حصول کے لیے بغیر کسی گھبراہٹ اور جھجک کے اولوالعزمی اور بلند ہمتی کے ساتھ جد و جہد میں مصروف

---

[1] انقلاب روس کی سب سے بڑی شخصیت اور روس کے معمار اعظم لینن کی ایک مشہور تصنیف Socialism and War ہے یہ کتاب ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی یہ مضمون اسی کتاب سے ماخوذ ہے اس کا انگریزی نام Socialism & Self Determination ہے اور یہ اس کا اردو ترجمہ ہے

[2] یعنی گزشتہ جنگ عظیم ۱۹۱۴ء-۱۸ء۔

ہو جائیں جو ایک خاص نظام کے ماتحت انجام دی جاتی ہے۔

باسل کے نظریے کا اعلان ہمارے ذہن کو فوراً انقلاب پیرس کی طرف منتقل کرتا ہے یعنی حکومتی جنگ کو عام جمہوری جنگ میں تبدیل کرنا۔ بعث صدی پہلے پرولتاری طبقے (مزدور طبقہ) کی حالت عام طور پر نہایت پست اور زبوں تھی۔ اور اس وقت تک اشتراکی انقلاب کو کامیاب اور برقرار رکھنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا اور نہ ہی اتحاد اور ابھی یگانگت بھی پیدا نہیں ہوئی تھی جو انقلابی قوت کو فروغ بخشتی اور یہ ایک مسلّمہ امر ہے کہ پیرس میں کام کرنے والے مزدوروں کے ذہن و دماغ میں قومیت کے جذبے کو خود کرکے ان کے خیالات و جذبات کو اس طرح قومیت کے فکری روایات سنہ ۱۸۷۱ء کے حسین جال میں اس جماعت کو محصور کر لیا گیا تھا اور یہی وہ قابل نفرین اور حقارت آمیز جذبہ ہے جس سے کم ظرف اور رجال یا بورژوا طبقے نے مزدوروں کی جماعت کو مسخر کر لیا تھا۔ اس کمزوری یا حقیقت کا انکشاف مارکس کے زمانے میں ہوا پیرس کے انقلابیوں نے ان لوگوں کو جنھوں نے خود ان کی سرگرمیوں اور کوششوں کو ختم کر دیا تھا انقلاب کے رفع ہونے پر معاف کر دیا تھا لیکن موجودہ دور کے ایک اشتراکی کے لیے یہ ناممکنات میں سے ہے کہ وہ ان شخصیتوں کو زندہ چھوڑ دے جو انقلابی سرگرمیوں کی خفیہ یا علانیہ کاٹ کرنا چاہیں ہم انھیں ہرگز معاف نہیں کر سکتے ہیں۔

خندقوں میں بھائی چارے کی مثال ہر محارب ملک کے بورژوا طبقے (سرمایہ دار طبقہ) کے اخبارات سے مختلف مثالیں بطور اقتباس و استشہاد دوسرے محاربی ملکوں کے سپاہیوں کے بھائی چارہ کے متعلق پیش کی ہیں کہ وہ خندقوں میں کام کرتے وقت بھی بھائی چارے کی عمدہ مثالیں قائم کرتے ہیں انگلستان اور جرمنی کے محاربی اور عسکری عہدیداروں نے اس بھائی چارے کے خلاف سخت اور شدید احکامات صادر کیے ہیں اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ حکومت اور بورژوا طبقہ اس اتحاد ہی کو کس قدر اہمیت دیتا ہے۔ اس وقت جبکہ مصلحت پرستی اور موقع شناسی مغربی یورپ میں عمرانی جمہوریت پسند پارٹی کے لیڈروں میں سرایت کر چکی ہے اور جبکہ معاشرتی وطن پرستی کی تائید و حمایت تمام معاشرتی اور جمہوری پریس کر رہے ہیں اور پرولتاریوں (مزدوروں) کے دوسری بین الاقوامی

کیوں کر ہندوستان کثیر الآباد ہو یا نہیں۔

گذشتہ ۶۰ سال میں ہندوستان کی جو آبادی رہی اور جو اضافہ ہوا وہ حسب ذیل ہے۔

سنہ	آبادی (کروروں میں)	اضافہ آبادی فیصدی
سنہ ۱۸۸۱ء	۲۵ ½ کرور	۲۳٫۲
سنہ ۱۸۹۱ء	۲۸ ¾ "	۱۳٫۲
سنہ ۱۹۰۱ء	۲۹ ½ "	۲٫۵
سنہ ۱۹۱۱ء	۳۱ ½ "	۷٫۱
سنہ ۱۹۲۱ء	۳۱ ¾ "	۱٫۲
سنہ ۱۹۳۱ء (مع برما)	۳۵ ¼ "	۱۰٫۶
سنہ ۱۹۳۱ء (علاوہ برما)	۳۳ ¾ "	•
سنہ ۱۹۴۱ء	۳۸ ¾ "	۱۵٫۰

اس نقشہ پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ سب سے زیادہ اضافہ سنہ ۱۸۸۱ء میں ہوا لیکن دراصل اس کو حقیقی اضافہ سمجھنا اس لیے صحیح نہیں کہ اس سے پہلے یعنی سنہ ۱۸۷۲ء میں جو اعداد فراہم کیے گئے تھے ان میں کسی خاص اصول یا ضابطہ کو پیش نظر نہیں رکھا گیا تھا گویا سنہ ۱۸۸۱ء کے اعداد صحت سے زیادہ قریب ہیں سنہ ۱۹۱۱ء سے کے اعداد کے متعلق بھی کوئی صحیح رائے قائم نہیں کی جا سکتی البتہ سنہ ۱۹۳۱ء اور سنہ ۱۹۴۱ء کے اضافے قابل لحاظ ہیں کیونکہ یہاں رقبہ میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوا مگر آبادی میں ۱۰ اور ۱۵ فیصدی اضافہ ہو گیا جو ایک ... سے کسی طرح بھی لائق تعریف و تحسین نہیں۔

سنہ ۱۹۴۱ء میں ہندوستان میں مجموعی حیثیت سے ۱۵ فی صدی کا اضافہ ہوا برطانوی صوبوں میں مجموعی اضافہ کی رفتار ۲٫۵ فی صدی اور ریاستوں اور ایجنسیوں میں اضافہ ۲٫۴ فیصد رہا بڑے صوبوں میں ... اور بنگال میں علی الترتیب ۴ ۲ اور ۲ ۲۰ اضافہ ہوا بنگال کا یہ اضافہ اس لیے بھی قابل لحاظ ہے کہ ہندوستان کا سب سے زیادہ گنجان صوبہ ہے گزشتہ مردم شماری میں اس کی گنجانی ۶۱۶ افراد

مجلس کی ظاہری ہیئت اس سے متاثر معلوم ہو رہی ہے اس [illegible] جارہے اور اتحاد باہمی کا امکان ہے اگر اس سلسلے میں منظم طور پر کام کیا گیا اور خصوصاً ان تمام انتہا پسند اشتراکیوں کی طرف سے جو دوسرے [illegible] مغربی ملکوں میں بستے ہیں تو ہم کس قدر جلد اس ریاکارانہ رجعت پسندانہ اور غلامانہ لڑائی کو ختم کرکے ایک بین الاقوامی انقلابی تحریک کو جنم دے سکیں گے۔

غیر آئینی جماعتوں کی اہمیت

دوسرے مصلحت پرستوں کی طرح تقریباً دنیا کے تمام ممتاز اور نمایاں نراجیوں نے عمرانی وطن پرستی کے جذبہ کے ماتحت پلیخنوف اور کاٹسکی کی طرح اس لڑائی میں شرکت کی۔ اس لڑائی کا ایک مفید نتیجہ یہ ہوگا کہ مصلحت پرستی اور حکومت شکنی ختم ہو جائے گی۔ معاشرتی جمہوری جماعتوں کو اگر ذرا سا بھی قانونی امکان ملا تو وہ جمہور یا عوام کی تنظیم کرنے میں اور اشتراکیت کی تبلیغ و اشاعت میں ہرگز نہ چوکیں گی اور انہیں چاہیے کہ ضابطہ پرستی سے میکانکی طریقہ کار برتیں اور مسٹر بورژوا یعنی سرمایہ دار طبقہ کو سب سے پہلے اپنی گولیوں کا نشانہ بنائیں۔ انجل نے عام جمہوری جنگ کے متعلق بطور حوالہ کہا ہے اور اس ضرورت پر زور دیا ہے کہ جب بورژوا طبقہ اپنا معاہدہ توڑ دے تو ہمیں بھی چاہیے کہ ہم قانونی طور پر اپنے معاہدے کو ختم کر دیں اس تنازع نے اس چیز کو آشکارا کر دیا ہے کہ سرمایہ دار ہر ملک میں خواہ وہ جمہوری اور آزاد ملک ہی کیوں نہ ہو اپنے قانونی معاہدے توڑ رہے ہیں۔ ہمارے لیے یہ ناممکن ہے کہ ہم جمہور کی رہبری ایک انقلاب کی جانب کر سکیں جب تک کہ ہم ایک غیر آئینی جماعت نہ بنا لیں جو تبلیغ و اشاعت، بحث و مباحثہ اور تحلیل و تجزیہ کا اہم کام انجام دے اور اس طرح مختلف انقلابی ذرائع سے جدوجہد پیدا کر دے مثال کے طور پر جرمنی کو لے لیجیے جہاں اشتراکیوں کی ہر ایماندارانہ سرگرمی کا استیصال میکانکی مصلحت پرستی اور ریاکارانہ "کاٹسکی ازم" کے مقابلے میں قانونی اعتبار سے کیا گیا۔ انگلستان میں ان لوگوں کو با مشقت قید کی سزا دی گئی جنہوں نے جنگ سے دور رہنے کی اپیل شائع کی تھی۔

ایک معاشرتی جمہوری جماعت کے رکن ہونے کا خیال نہایت موزوں اور مناسب ہے اور اس کے ساتھ غیر آئینی طریقوں کی نشر و اشاعت کی تردید کرنا اور قانونی پریس میں اس کا مضحکہ

الغا اشتراکیت سے دشمنی ہے اور اسے گمراہ کرنا ہے۔

بورژوا نہ یا قیصر دانہ جنگ میں اپنی خود کی حکومت کی شکست | حامیان فتح اس لڑائی کا انجام شخصی حکومت کا قیام چاہتے ہیں اور نعرے لگانے والے اور چیخ پکار مچانے والے نہ کسی کی جیت چاہتے ہیں اور نہ کسی کی ہار در اصل یہ لوگ ایک ہی نظریے کے ماتحت اور اسی نظریے کی روشنی میں آگے بڑھتے ہیں اور وہ عمرانی وطن پرستی کا نظریہ ہے رجعت پسندانہ جنگ میں ایک انقلابی جماعت اپنی حکومت کی شکست کے لیے کوئی مدد نہیں کر سکتی ہے لیکن وہ اس تعلق کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتی جو حکومت کی طاقت اور اس سنہرے موقع کے درمیان ہوتا ہے جو طاقت کو آسانی سے منقلب کر سکتی ہے صرف ایک سرمایہ دار جو سمجھتا ہے کہ یہ جنگ حکومتوں کی پیدا کردہ ہے اور اس کا اختتام بھی حکومتوں اور اقوام کے درمیان طے پائے گا اور جس کی یہ تمنا ہوتی ہے کہ انجام ایسا ہی ہو تو وہ تمام خارجی حکومتوں کے اشتراکیوں کے ان خیالات کو جو وہ اپنی حکومت کی شکست کے سلسلے میں ظاہر کرتے ہیں مضحکہ انگیز اور نامعقول سمجھتا ہے برخلاف اس کے یہ خیالات کا اظہار ان مزدوروں کی دلی تمناؤں کے مطابق ہوتا ہے جو واقف کار جماعت کے رکن ہوتے ہیں اور وہ دل لگا کر ہمارے مقصد کے حصول کی خاطر ہماری سرگرمیوں میں ہمارا ہاتھ بٹائیں گے اور ان کی یہ مخلصانہ مدد بورژوانہ یا قیصر دانہ جنگ کو عام جمہوری جنگ میں تبدیل کرنے کا باعث ہوگی

انگلستان، جرمنی اور روس کے اشتراکیوں کی جماعت کی طرف سے اگر لڑائی کے خلاف آواز بلند کی جائے اور لڑائی کی سخت مخالفت کی جائے تو بلا شبہہ علی الترتیب ان حکومتوں کی فوجی طاقت پر اثر پڑے گا اور اس کی طاقت کمزور ہو جائے گی لیکن اس مخالفت کا سہرا اشتراکیوں کے ہی سر ہونا چاہیے اشتراکیوں کو چاہیے کہ وہ عام جمہور کے سامنے اس مسئلہ کی نشر و اشاعت کریں اور جمہور کو واضح طور پر سمجھائیں کہ انہیں اس جابرانہ حکومت سے انقلاب ہی کے توسل سے نجات مل سکتی ہے ان حکومتوں کی مشکلات و مصائب کا اندازہ خاص طور سے اس جنگ سے کرنا چاہیے اور اپنا اصل مقصد حاصل کرنا چاہیے۔

امن پسندی اور امن کے نعرے | جمہور کا عام امن پسندی کا رجحان دراصل ایک ہنگامے کا پیش خیمہ ہوتا ہے اور یہی عام جمہوری رجعت پسندانہ جنگ کے خلاف عام احساس بیداری تمام عمرانی جمہور پسندوں کا اہم فرض ہے کہ وہ ایسے موقع سے فائدہ اُٹھائیں۔ وہ لوگ ہمیشہ اس قسم کی ہر تحریک کے [illegible] انگیز حصے میں شرکت کریں گے اور ہر اُن عام مظاہروں میں شامل ہوں گے جن کی اساس خیالات کی انھیں عام بنیادوں پر قایم ہوگی۔ وہ ایسا کر کے دوسروں کو دھوکہ ہرگز نہ دیں گے یعنی یہ کہ ایک انقلابی تحریک کے عدم وجود پر بلا کسی الحاق و اضافے کے یا بغیر کسی قوم کے ملک پر حملہ کیے اور بلا کسی قتل و غارت اور لوٹ مار کے یا موجودہ حکومتوں یا حکمران جماعتوں کے درمیان بغیر نفاق و افتراق کے بیج بوتے ہوئے وہ امن و سکون قایم رکھ سکیں گے۔ اس قسم کی ریاکارانہ چال کی حیثیت محاربی ملکوں اور ان کی خفیہ حکمتِ عملی کے ہاتھوں میں اور انقلاب کی مخالف کوششوں کے درمیان ایک کھلونے کی سی ہوگی کہ وہ رازدارانہ طور پر ان کی خفیہ چالوں اور کوششوں میں معاون ثابت ہوں گی۔ وہ شخص جو ایک مستقل، مستحکم اور دیرپا عام جمہوری امن کا خواہاں ہو اسے چاہیے کہ حکومت اور سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف کھڑا ہو اور انقلاب میں مدد اور شرکت کرے۔

اقوام کا حق خود مختاریت | موجودہ جنگ میں بورژوا طبقہ کا سب سے بڑا فریب یہ ہے کہ اس نے اپنے قہرمانہ اور سفاکانہ مقصد کو ایک حسین نظریے کی آڑ میں چھپا رکھا ہے اور وہ قومی آزادی یا نیشنل لبریشن کا نظریہ ہے۔ انگریزوں کا آزادی کا وعدہ بلجیم سے اور جرمنی کا وعدۂ آزادی پولینڈ سے ہمارے سامنے مثالی حیثیت رکھتا ہے۔ دراصل یہ لڑائی اکثریت پسند اقوام کے زور آوروں کے درمیان ہے اور اس کا مقصد ظلم و ستم کی گھاٹی کو زیادہ گہرا اور وسیع بنانا ہے۔

حامیانِ اشتراکیت اپنے اہم اور بلند ترین مقصد کو اس وقت تک حاصل نہیں کر سکتے ہیں جب تک کہ وہ ہر قومی مصیبت و ہلاکت کا مدافعانہ مقابلہ نہ کریں گے خواہ اس شکل یا مصیبت کی شکل یا نوعیت کچھ ہی کیوں نہ ہو اس لیے ان کو چاہیے کہ جائز طور پر وہ اس چیز کا مطالبہ کریں کہ تمام کمزور اور انحطاط پذیر ملکوں کے تمام عمرانی جمہور پسندوں (جو انفرادی حیثیت سے "اقوام عظیم"

کے لقب سے یاد کی جاتی ہیں) کی طاقت اور حیثیت کا اعتراف کریں اور تمام کمزور و مغلوب قوموں کے حق مختاریت کا صحیح سیاسی معنوں میں تحفظ کریں یعنی انھیں سیاسی تقسیم کا حق تفویض کیا جائے کسی بڑی اور ممتاز قوم کا اشتراکی یا ایک بڑی قوم جو کسی نوآبادیات کی مالک ہو کر اگر اس حق یا اصول کی حمایت اور حفاظت نہیں کرتی تو دراصل وہ جنگجو وطن پرست ہے۔

[illegible] یا اصول کو سراہنے سے چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے قیام کی حمایت کرنا ہرگز مقصود نہیں ہے بلکہ برخلاف اس کے یہ اصول زیادہ بڑے دھڑے یعنی زیادہ وسیع اور عالمگیر اور عظیم حکومتوں اور حکومتی انجمنوں کے قیام و تشکیل میں ہماری مدد اور رہبری کرتا ہے یہ ایک مظہر یا ارتقائی شکل ہے [illegible] معیشت کے ارتقا یا نشوونما میں زیادہ مفید اور معین ثابت ہوگی۔

دوسری مغلوب اقوام کے اشتراکیوں کا فرض ہے کہ وہ مغلوب اور غالب دونوں اقوام کے مزدوروں کے (جس سے اتحاد تنظیمی مراد ہے) اتحاد کامل کے لیے جائز اور تنظیمی طور پر جدوجہد کریں اور کسی بہیم کو دخل دیں دو اقوام کے درمیان قانونی تقسیم کا تصور (بآور اور تدبیر کا قومی ثقافتی سوراج نام نہاد لفظ ہے) ایک رجعت پسندانہ خیال ہے۔

شہنشاہیت یا امپیریل ازم کے خلاف ایک بین الاقوامی اشتراکی انقلاب کی تحریک کو بروئے کار لانا اور اس کو کامیاب بنانا اس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ ہم دوسری اقوام کے حق خود مختاریت کا باضابطہ اعتراف نہ کریں بقول مارکس و انجلز "وہ فرد جو کسی دوسرے فرد پر ظلم و جبر روا رکھے گا آزاد نہ چھوڑا جائے گا" اس طرح کوئی پرولتاری جو دوسری قوم کے حقوق کے پامال کرنے کی سازش میں اپنی قوم کا ساتھ دے گا وہ سوشلسٹ یا اشتراکی کہلانے کا ہرگز مستحق نہ ہوگا۔ (ترجمہ)

احسان رشید صدیقی

سیاسی نصب العین اور ان کا اثر عملی سیاسیات پر

[illegible] حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے یعنی اصول سیاسیات اور عملی سیاسیات یہ ایک دوسرے [illegible] کا تعلق رکھتی ہیں اصولی غور و فکر میں صرف ہوا میں محل نہیں بنائے جاتے۔ انسان ہمیشہ اپنے [illegible] متاثر ہو کر نظریے قایم کرتا ہے اور سیاسی نظریے اس ماحول کا نتیجہ ہوتے ہیں جس میں کہ سیاسی مفکر نے اپنی زندگی بسر کی ہو زمانہ قدیم سے آج تک ہم دیکھتے آئے ہیں کہ مفکرین نے بڑی بڑی شخصیتوں کے جذبات کو حرکت دی اور ان سے عظیم الشان کام انجام دلوائے۔

بعض وقت خیال کیا جاتا ہے کہ اصول سیاسیات بلحاظ سیاسی نتائج بے مقصد ہوتے ہیں۔ برک کہتا ہے کہ مملکت کی فرسودگی کی حقیقی علامت یہ ہے کہ اس کے ارکان اصولی بحث میں پڑ جائیں مگر حقیقت میں حالات ایسے نہیں اکثر انقلابات جن کو سیاسی مفکرین کے قائم کردہ نصب العین کی بدولت فروغ ہوا آخرکار انسانیت کے لیے مفید ثابت ہوئے سیاسی مفکرین ہی کے سوچ بچار کا نتیجہ تھا کہ جمہوریت نے اس قدر ترقی کی شخصی آزادی کا خیال لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوا اور بین الاقوامی انصاف کا زرین نقطہ نظر وجود میں آیا۔

سیاسی نظریے اس لیے بھی بہت بڑی اہمیت رکھتے ہیں کہ وہ گزشتہ واقعات کے سمجھنے میں مدد دیتے ہیں اور آیندہ کے لیے رہنمائی کرتے ہیں کیونکہ مستقبل اب ویسا ہی ہے جیسا کہ حال گزشتہ میں تھا یعنی ایک مطمح یا امید مگر کوئی نظریہ بھی پوری طرح عملی جامہ نہیں پہن سکا جس طرح کہ کسی مفکر کے دماغ میں قایم کیا گیا تھا

تاریخ عالم پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کے مختلف دور کسی نہ کسی سیاسی نظریے سے متاثر ہوتے رہے۔ آزادی ایتھنز اور اس کا نظم و ضبط روما کی یاد تازہ کرتے ہیں زمانہ وسطیٰ میں وحدت انسانیت کو نصب العین قرار دیا گیا تھا مگر جب نشاۃ ثانیہ کا دور شروع ہوا تو علیحدہ خودمختار

حکومت ہر ایک ملک و قوم کی سیاسی خواہش ہوگئی۔ ایتھنز میں آزادی کا مفہوم کچھ اور ہی تھا اور شہریوں کے ایک خاص حصہ تک محدود کر دیا گیا تھا۔ یہ امر تسلیم کر لیا گیا تھا کہ انسان کی ذہنی اور جسمانی ترقی بغیر حکومت کی مداخلت کے ہونی چاہیے یہی نظریہ آج کل کے انفرادیت پسندوں کی رہنمائی کر رہا ہے۔ عہد وسطیٰ میں وحدت انسانیت کے نظریے کو مذہب کے ذریعہ عملی صورت نصیب ہوئی۔ متعدد [illegible] ثروما اسی کا نتیجہ تھی۔ نشاۃ ثانیہ اور اصلاح دین کی ہوا نے اس وحدت کو باقی نہ رکھا۔ [illegible] تعداد خود مختار مملکتیں اٹھ کھڑی ہوئیں اور جدید تخیل قومیت نے جنم لیا۔ مکیاولی اور بودن جیسے مفکرین نے اپنے سیاسی نظریوں کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی۔ مکیاولی کی خواہش تھی کہ وہ اطالیہ کو ایک طاقتور، مرفہ حال، متفق اور خود مختار سلطنت دیکھے اس کے خیالات نے ہم عصر زمانہ سے زیادہ [illegible] [illegible] کی رہنمائی کی وہ ایک بہت بڑا حقیقت پسند تھا اسی لیے اس کے بتائے ہوئے طریقے بہت مقبول ہوئے جب سے اس کی کتاب "پرنس" چھپی ہے تب ہی سے اس کی پرستش کی جا رہی ہے۔ مکیاولی نے سیاست اور اخلاق میں تفریق کی اور حصول مطلب کے لیے ہر قسم کی کارروائی اختیار کرنے کو جائز قرار دیا تاریخ شاہد ہے کہ اس کا فلسفہ مدبروں میں بہت عام ہوا اور انھوں نے اس پر حرف بہ حرف عمل بھی کیا سولھویں صدی میں باوجود مذہب کی مخالفت کے "پرنس" بادشاہوں کی درسی کتاب بنی رہی۔ سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں مکیاولی ہی کے عقاید یورپی سیاست پر چھائے ہوئے تھے نپولین، لوئی فلپ، بسمارک اور کوربجیسی ہستیوں نے اس کی پیروی کی۔ آج کل بھی اسی کے مقرر کردہ قواعد کا دور دورہ ہے ہٹلر اور مسولینی اس کے دل سے پیرو ہیں۔

جب خود مختار مملکتیں بڑھتی گئیں اور ان میں ربط پیدا ہوا تو بین الاقوامی قانون کی ضرورت محسوس کی گئی۔ اس خیال کو ولندیزی مفکر گروشس نے پیش کیا وہ خوب سمجھتا تھا کہ جنگ ایک فطری چیز ہے جس کو روکنا ناممکن ہے لڑائی ہو مگر اصول انسانیت کے مطابق گروشس کے بعد سے آج تک یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ زور و زبردستی کے دور کو امن اور ضوابط کی پابندی سے بدل دیا جائے معاہدہ ورسائی کے بعد بین الاقوامی عدالت کو تشکیل دے کر اس مقصد کی طرف

ایک قدم اٹھایا گیا تھا مگر عالمی جنگ نے ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔

افلاطون نے اپنی کتاب جمہوریہ میں ایک عینی مملکت کا نمونہ پیش کیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ مملکت تین جماعتوں پر مشتمل ہونی چاہیے فلسفی بادشاہ نظم ونسق کے ماہر اور عوام جن میں حکومت کے پیچیدہ معاملات سمجھنے کی اہلیت نہیں۔ حاکم جماعت کو بچپن ہی سے خاص تعلیم دی جانی چاہیے افلاطون کا کہنا ہے کہ فلسفہ حاکموں اور پروپیگنڈا عوام کے لیے ضروری ہے اسی کی بدولت خونریزی سے گریز کیا جا سکتا ہے اور بہترین اشخاص کی آمریت قایم رہ سکتی ہے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ افلاطون کے خیالات غیر عملی ہیں۔ وہ وطنیت پر بہت زور دیتا ہے اور اجتماعی خوش حالی کو انفرادی مفاد پر ترجیح دیتا ہے مزید براں وہ اس مسئلہ کی اہمیت سے منہ نہیں موڑتا کہ حکومت کی باگ ماہرین کے ہاتھوں میں ہونی چاہیے اور یہی وہ حقیقت ہے جس کو جمہوریت اکثر نظر انداز کر جاتی ہے۔ افلاطون کا اثر کسی قدر جدید ہمہ گیر مملکتوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ چیدہ اشخاص کی حکومت معاشی خود کفالتی اور شہریوں کی زندگی حکومت کے زیر اثر دونوں کے ملتے جلتے نظریے ہیں۔

قومیت کا نظریہ جب سے پیدا ہوا تب ہی سے عملی سیاسیات پر اثر کرتا رہا ہے [illegible] سے زیادہ اس نے عمل میں نشوونما پائی زمانہ وسطیٰ میں اس کا وجود نہ تھا میکیاولی ہی پہلا قوم پرست سمجھا جاتا ہے اس نے قومیت کے جذبہ کو ابھارنے کی اولین کوشش کی انگلستان نے سب سے پہلے اس کو قبول کیا اور جب انگریز فرانس پر اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہاں جون آف آرک کی قیادت میں قوم پرستی کا محاذ قایم ہوا اس کے بعد پولستان کی تقسیم نے اور تقویت بخشی انقلاب فرانس اور نپولین کی فتوحات نے یورپ کی ہر قوم کو قوم پرست بنا دیا سیاسی قاید، شعرا، اور مقررین نے اس شعلہ کو اور بھڑکایا اب قومیت نے سیاسی اصول کی صورت اختیار کی اور اس اصول کی بنیاد پڑی جس کے بموجب ہر ایک نیشنلٹی کے افراد ایک علیحدہ خود مختار مملکت کی خواہش کرتے ہیں۔ اس تحریک کو دبایا نہ جا سکا اور جرمنی اور اطالیہ کا اتحاد اسی کا نتیجہ تھا۔ بعض وقت قومیت کی پرستش مضرت رساں ہو جاتی ہے۔ جب ایک قوم اپنی بڑائی کرنے لگے اور اپنے مفاد کی خاطر

...ہ کارروائی اختیار کرے تو اس کا لازمی نتیجہ جنگ ہوگا اور یہی بے جا قوم پرستی موجودہ جنگ کا باعث ہوئی۔

مملکت کا تصوری نظریہ بھی عملی سیاسیات پر اثر کرتا رہا ہے اس کے بموجب مملکت کی پرستش کی جانا چاہیئے مملکت آلۂ کار نہیں بلکہ نصب العین ہے وہ کوئی غلطی نہیں کر سکتی۔ اس کے احکام کی بلا چون و چرا تعمیل ہونی چاہیئے کانٹ نے اس نصب العین کو قایم کیا اور اس کے پیرو ہیگل نے بسمارک کے تحت جرمنی میں آہنی ارغوانی دور کیلئے زمین تیار کی۔ جدید نازی جرمنی اور فاسسٹ اٹلی بھی مملکت کے اقتدار کو اسی حد تک سراہتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ مملکت کی بہتری کے لیے شخصی آزادی، زندگی اور ملک کو قربان کر دینا چاہیے ان کا خیال ہے کہ افراد مملکت کے لیے ہیں نہ کہ مملکت افراد کے لیے۔

انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے شروع سے مختلف اقوام نے جمہوریت کو اپنا سیاسی نصب العین قرار دیا مگر ابھی تک اس کو پوری طرح حاصل نہیں کیا گیا ہے کسی بھی معاشرہ اس طرح تشکیل نہیں دیا گیا کہ اس کے ہر فرد کو ترقی کا برابر موقع ملے زمانہ جنگ کے عارضی حالات کو چھوڑتے ہوئے ہم صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ برطانیہ فرانس اور امریکہ میں عوام کا اقتدار پایا جاتا ہے جمہوریت نہ صرف ایک طریقۂ حکومت ہے بلکہ اس کا تعلق ایک ایسے معاشرہ سے ہے جس کی بنیادیں مساوات، اخوت اور حریت پر رکھی گئی ہوں کیا انگلستان میں اس قسم کے حالات پائے جاتے ہیں؟ نہیں ہرگز نہیں انگریزی طریقۂ حکومت کو سیاسی جمہوریت کہا جا سکتا ہے اور وہ بھی ایسی جمہوریت جس کی باگ سرمایہ داروں کے ہاتھ میں ہے جو یہ نہیں چاہتے کہ ہر فرد کو برابر ترقی کا موقع ملے۔

سچی جمہوریت کسی حد تک سوئٹزرلینڈ میں پائی جاتی ہے وہاں جمہوریت کو واقعی میدان عمل میں پاتے ہیں جس کی مختلف وجوہات ہیں مثلاً بے حد جذبۂ وطنیت، اعلیٰ تعلیم، سیاسی اتحاد اور سوئس قوم کی رواداری اور مصالحت پسندی شہریوں کا حق ابتداء اور استصواب رائے جمہور رائے عامہ کو حکومت میں نمایاں حصہ دیتے ہیں سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ وہاں غریبوں اور امیروں میں زیادہ گہری تفریق نہیں پائی جاتی جس کی وجہ سے معاشرہ کی بنیادیں متزلزل نہیں ہیں پس وہاں سیاسی

اور معاشی جمہوریت دونوں کا دور دورہ ہے جو ہر قوم کا نصب العین ہونا چاہئے۔

دنیا کے بڑے بڑے انقلاب بھی کسی نہ کسی سیاسی یا اقتصادی نصب العین کو حاصل کرنے کی کوشش کا نتیجہ تھے انگریزی انقلاب کی یہ خصوصیت تھی کہ ان کو عملی صورت بعد میں دی گئی پہلے عمل اور قیاس آرائی " کے اصول پر عمل کیا گیا۔ اسٹوارٹس بادشاہوں کی مطلق العنان ... حکومت تفشی انقلاب کی باعث ہوئی۔ ایک ایسی حکومت کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی جو علاوہ مستحکم ہونے کے مذاہب اور ساری جماعتوں سے بالاتر ہو۔ کرامول نے موقع پاکر اپنی آمریت قائم کی۔ ہابس نے اپنی کتاب "لیویتھیان" لکھ کر اس کے دور کو جائز قرار دینے کی کوشش کی اسی طرح ۱۶۶۰ء کے انقلاب کو لاک نے بعد میں عملی صورت دی اور دستوری بادشاہت کے لیے اپیل کی

امریکی اور فرانسیسی انقلابات بھی سیاسی نصب العین کے زیر اثر ہوئے ہیں۔ ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سیاسی مفکرین تاریخ انسانیت کو کہاں تک بدل سکتے ہیں نظری حقوق کے نظریے اور مانٹسکیو نے امریکی سیاسی زندگی کو بہت کچھ متاثر کیا۔ انقلابیوں نے نظری حقوق کے نظریے کی بنا پر برطانوی پارلیمان کے محصول عائد کرنے کے حق کی مخالفت کی اور بادشاہ پر معاہدہ توڑنے کا الزام لگایا یا دستور تیار کرتے وقت امریکی مدبر اور سیاست دانوں نے مانٹسکیو کے تفریق اختیارات کے اصول کو ہمیشہ پیش نظر رکھا۔

فرانسیسی مفکرین والٹیر اور ڈائڈیرو فینیلان اور ان کے سرتاج روسو نے اپنی تحریروں کے ذریعہ دنیا کا سب سے بڑا انقلاب پیدا کیا روسو چیخ اٹھا کہ انسان آزاد پیدا ہوا مگر اب ہر جگہ جکڑا ہوا ہے۔ حریت مساوات اور اخوت انسان کے پیدائشی حقوق ہیں۔ روسو کو آج کل بھی اہمیت حاصل ہے اس کا مشیت عمومی کا نظریہ پھر تازہ ہو گیا ہے۔ جب سے انتخاب کرنے والوں سے اپیل کرنے کا طریقہ شروع ہوا ہے۔

نپولین کا عظیم الشان دور بھی انقلاب ہی کا نتیجہ تھا وہی انقلاب جو سیاسی مفکرین کی

تحریروں کی بدولت پروان چڑھا بیان کیا جاتا ہے کہ نپولین ایک بار روسو کی قبر پر گیا اور کہنے لگا بہتر ہوتا اگر یہ شخص پیدا ہی نہ ہوا ہوتا تو اچھا تھا۔ "یہ کیوں؟" اس کے کسی ساتھی نے دریافت کیا "اس لیے کہ روسو ہی فرانسیسی انقلاب کا باعث ہوا۔" نپولین نے جواب دیا۔ یہ الفاظ سیاسی نصب العین اور سیاست کے تعلق کو صاف ظاہر کرتے ہیں۔"

دور جدید میں بھی سیاسی نصب العین جو اہمیت رکھتے ہیں اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا عالمی سب سے بڑا نظریہ مجلس بین الاقوام کا تھا عالمگیر مملکت کے زمانہ وسطیٰ کے خیال کو ولسن نے گزشتہ جنگ عظیم کے بعد عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی یہ اسکیم معاشی اور معاشرتی معاملات میں مفید ثابت ہوئی اور اس کو اپنے اصل مقصد یعنی اقوام کو آپس میں جنگ کرنے سے باز رکھنے میں ناکامی ہوئی بین الاقوامیت کا تخیل پنپ نہ سکا اور قومیت کے جذبے نے سیاسی مدبروں کا آلہ کار بن کر دنیا کو موجودہ ہولناک جنگ میں جھونک دیا اور مجلس بین الاقوام کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

عہد حاضر میں ہم یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ اشتمالیت، فاشیت اور نازیت نے دنیا میں کھلبلی مچا رکھی ہے یہ بھی مفکرین کے غور و فکر کا نتیجہ ہے روسو کے بعد مارکس نے انقلاب کے جدید کو بہت سراہا اس کے خیالات پر روس میں عمل کیا گیا ملکیت کوئی چیز نہ رہی سرمایہ داری کا خاتمہ کر دیا گیا زمین اور قدرتی ذرائع تمام قوم کی ملک قرار دیے گئے اور یہ قبول کر لیا گیا کہ ہر شخص دولت عامہ کا مساوی حصہ دار ہو سکتا ہے۔ اسی طرح مذہب کو بھی خیر باد کہہ دیا گیا۔ اب روس میں چاروں طرف مارکس کا بول بالا ہے۔ ایک مارکسی سیاح سے ایک کارخانے کے مزدور سے دریافت کیا کہ اگر مشین خراب ہو جائے تو وہ کیا کرتا ہے جواب ملا، انتظامی مجلس کو اس کی اطلاع دیدی جاتی ہے اور جب تک مشین چالو نہ ہو جائے ہم (اس نے دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جہاں مارکس کی کتاب کیپیٹل لٹکی ہوئی تھی) وہ کتاب پڑھتے رہتے ہیں" اشتمالیت کا ایک اور نصب العین یہ ہے کہ وہ بین الاقوامی حیثیت حاصل کرے لیکن اس کی کوشش کرتا اگرچہ جب سے اسٹالین نے اقتدار حاصل کیا ہے اس پہلو کو نظر انداز کیا جا رہا ہے ممکن ہے لیکن جس کام میں گزشتہ جنگ عظیم کے بعد ناکام رہا اسٹالین اس جنگ کے بعد کامیاب ہو جائے۔

فی مربع میل تھی اس مرتبہ یہ ۵۳۲ تک پہنچ گئی چھوٹے صوبوں میں سب سے زیادہ اضافہ دہلی میں ہوا جہاں اضافہ کی رفتار ۱،۴۴ فی صدی رہی مگر یہ اضافہ اس لیے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا کیونکہ اس مقام کی زیادہ تر آبادی شہری ہے دہلی ہندوستان کا دارالخلافہ ہے تجارت کی بڑی منڈی ہے کئی ریلوں کا جنکشن ہے اس لیے یہ اضافہ کچھ زیادہ خطرناک نہیں ریاستوں میں سب سے زیادہ اضافہ ٹراونکور میں ہوا ہے یہ ریاست بھی پہلے ہی سے گنجان ہے گزشتہ مردم شماری میں اس کی گنجانی ۶۶۰ اشخاص تھی اور اس مرتبہ ۸۹۷ ہو گئی اس مرتبہ سارے ہندوستان میں صرف بلوچستان کی ریاستوں میں آبادی میں کمی واقع ہوئی ہے

ہندوستان کی آبادی بہت زیادہ گنجان ہے اس کا اندازہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ ہم دوسرے ملکوں سے جب اپنے ملک کا مقابلہ کرتے ہیں تو بڑا فرق نظر آتا ہے عام طور پر ہندوستان کا مقابلہ یورپ کے چھوٹے چھوٹے ملکوں سے کیا جاتا ہے جو وسعت اور رقبہ میں ہمارے صوبوں کے برابر ہیں لہذا یہ متقابلی اعداد صحیح نہیں ہو سکتے ہندوستان ایک نیم براعظم ہے اس لیے اس کا مقابلہ ایسے ہی دوسرے نیم براعظموں سے کرنا چاہیے ذیل میں اسی طرح گنجانی کا مقابلہ کیا گیا ہے۔

نام ملک یا براعظم	رقبہ	آبادی کی گنجانی فی مربع میل
چین	۴۰ لاکھ مربع میل	۸۰
یورپ	۳۷ ″	۱۲۷
برازیل	۳۲ ″	۱۲
ریاستہائے متحدہ امریکہ	۳۰ ″	۴۱
ہندوستان	۱۹ ″	۲۴۲

اس جدول پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کس قدر گنجان ہے اسی طرح ہندوستانی صوبوں اور ریاستوں کا مقابلہ دنیا کے چھوٹے چھوٹے ملکوں سے کیا جائے تو ہندوستان کی کثیر آبادی اور واضح ہو جاتی ہے

نام ملک یا صوبہ	تعداد افراد فی مربع میل	نام ملک یا صوبہ	تعداد افراد فی مربع میل
انگلستان و ویلز	۵۰۵	جاپان	۴۳۷

فاشیت اور نازیت نے کانٹ اور ہیگل کے یہی نظریے کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی ہے جرمن اور اطالوی اپنے نصب العین کے نشہ میں چور ہیں۔ نازیت جرمن قوم کا مذہب ہے ہٹلر اس کا پیغمبر اور گوئرنگ اور گوئبلس اس کے بڑے پادری۔ بچپن ہی سے لڑکوں کو قومیت اور نسل کی فوقیت کا سبق دیا جاتا ہے سوچنے اور سمجھنے کا مادہ مفقود کر دیا گیا ہے اور تلقین کی جاتی ہے کہ قائد کے کہنے پر اعتقاد اور عمل کرو اور [illegible] حکام کی خاموشی سے تعمیل کرو۔ اس طرح قوم پر پورا قابو حاصل کر کے اس کی توجہ دوسری طرف منعطف کرا دی جاتی ہے اور اکثر بین الاقوامی قضیے کھڑے کر دیے جاتے ہیں موجودہ جنگ بھی اسی کا نتیجہ ہے۔

مختصراً نصب العین کی جنگ ہی اقوام کے مابین بہت شد و مد سے ہو رہی ہے ہر ایک اپنے خیالات کو دوسروں پر مسلط کرنا چاہتا ہے یہ کوئی نئی چیز نہیں سولھویں اور سترہویں صدی میں بھی مخالفت مذہب کے بھیس میں نمایاں ہوئی تھی یہ جنگ عیسائی فرقوں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کے درمیان ہوئی تھی موجودہ جنگ سے قطع نظر ہم دیکھتے ہیں کہ یہ نصب العین کی جنگ اشتمالیت اور اس کے مخالفین کے درمیان ہو رہی ہے یہ جنگ معاشی اور معاشرتی بنیادوں پر لڑی جا رہی ہے اور اس میں فوجی اور غیر فوجی سب شامل ہیں بارکر کے الفاظ میں "ایک اجتماعی فلسفہ دوسرے اجتماعی فلسفہ سے دست و گریباں ہے۔"

دوسری طرف عمومیت اور فاشیت کے نصب العین آپس میں ٹکرا رہے ہیں طریقۂ حکومت سے متعلق ان کا تصور جدا ہے عمومیت حکومت کے نصب العین سے زیادہ اس کے طریقۂ حکومت کو اہمیت دیتی ہے اور جہاں تک یہ سوال درپیش ہے وہ فاشیت اور اشتمالیت دونوں کی مخالف ہے کیونکہ یہ بحث و مباحثہ کو ممنوع قرار دیتے ہیں اور صرف ایک پارٹی کو جائز سمجھتے ہیں مگر حکومت کے مقصد کے متعلق فاشیت اور اشتمالیت متضاد خیالات رکھتے ہیں۔

عمومیت اور ہمہ گیر مملکت کے نصب العین کی ٹکر کی وجہ سے دنیا ایک اور جنونی دور سے گزر رہی ہے یہ جنگ گزشتہ جنگ سے زیادہ ہولناک اور پریشان کن ہے کیونکہ بمباری کے ذریعہ شہریوں کو بے [illegible] نقصان پہنچایا جا رہا ہے۔ بارکر کہتا ہے "نصب العین کی جنگ بہت بڑی جنگ ہے اس لیے نہیں کہ اس کا تو جسمانی جنگ ہوتا ہے بلکہ اس لیے کہ وہ دماغی توازن بگاڑ دیتی ہے پھر لڑائی معقولیت اور غیر معقولیت کے درمیان ہونے لگتی ہے۔

اور پھر عقل کو اپنے سارے حربے استعمال کرنے پڑتے ہیں آج کل جو تباہی اور بربادی ہو رہی ہے اس سے مارکس کی پیشین گوئی کی تصدیق ہوتی ہے۔

ایک اور اصولوں کی جنگ زردار اور بے زر اقوام کے درمیان ہو رہی ہے مفلس اقوام مزید ترقی کے خواہاں ہیں جہاں ان کی آبادی نقل مکانی کر سکے، جہاں ان کو خام اشیا حاصل ہو سکیں اور تیار شدہ مال کے لیے منڈیاں ہوں اس نصب العین کو جارحانہ حکمت عملی کی بدولت ہی عمل میں لایا جا سکتا ہے اور یہ تصورات حد سے گزر چکے ہیں اور حالیہ جنگ کو اسی کا نتیجہ کہا جا سکتا ہے۔

تعجب ہے ایسے نصب العین پر جو آخرکار جنگ کے باعث بنتے ہیں پھر ہمیں آیندہ کے لیے کیا نصب العین قرار دینا چاہیے یہ بہت کٹھن سوال ہے مگر ہم آپ اور سب ایسی دنیا چاہتے ہیں کہ جہاں شانتی ہو مرفہ حالی ہو، انسانیت کے لیے ہر قسم کی مفید ترقی ہو قوم پرستی کو چاہیے کہ وہ اپنی جگہ بین الاقوامیت کو دے مجلس اقوام کا یہی مقصد حیات تھا مگر وہ کامیاب نہ ہو سکی اس لیے کہ اقوام نے اس کو اس جذبہ کے تحت نہ چلایا جو ولسن کے پیش نظر تھا سامراج اور مجلس اقوام دو متضاد تصورات ہیں جن کا ایک ساتھ قایم رہنا ناممکن ہے آیندہ کے لیے ایک بین الاقوامی قوت کی ضرورت ہے چاہے یہ مجلس اقوام ہو یا کوئی اور ادارہ مگر ایسی مجلس نہیں جو صرف قراردادیں منظور کرتی رہے اور کوئی عملی قدم نہ اٹھائے یا دو تین ریاستوں کے اشاروں پر کام کرتی رہے اس کے چند قواعد کو پیش نظر رکھنا پڑے گا پہلے عوام میں بین الاقوامی شعور پیدا کرنا چاہیے اس کے بہترین ذرایع مدرسے، اخبارات، سنیما اور ریڈیو پروپیگنڈا ہیں دوسرے مستعمرات کو بین الاقوامی قوت کے تحت دیدیا جائے اور آبادی کے نقل وطن پر کسی قسم کی پابندی نہ ہو تیسرے بین الاقوامی اہمیت رکھنے والے اڈے مثلاً نہر سوئز جبل الطارق اور سنگاپور بین الاقوامی مجلس کے زیر نگرانی ہوں اور چوتھے ایسے حالات پیدا کر دیے جائیں کہ تمام ممالک معاشی طور پر ایک دوسرے کے محتاج رہیں تاکہ جنگ کی طرف زیادہ راغب نہ ہو سکیں ہم اپنے اس مضمون کو اس امید پر ختم کرتے ہیں کہ ایسا زمانہ جلد آئے گا اور دنیا کو آئے دن کی ادھیڑبن سے نجات دلائے گا۔

سید التفات حسین بی اے (آنرز)

اے ہند

بدلیں گے اور ضرور ہمارے بھی رات دن — اے ہند تیرے ہوش میں آنے کی دیر ہے
پھر گونجنے لگیں گے محبت سے بام و در — ذہن و زباں کو کام میں لانے کی دیر ہے
[illegible] سر فروش آئیں گے نذرِ وفا لیے — محفل میں صرف شمع جلانے کی دیر ہے
پھر تیری خاک پاک سے پھوٹے گی زندگی — تجھ کو ترا فسانہ سنانے کی دیر ہے
بیچارگی کو ملنے لگے گا پھر اختیار — مایوسیوں کو زہر پلانے کی دیر ہے
شانوں میں زندگی کا تبسم ہے بے قرار — پھولوں کا گرم خون بہانے کی دیر ہے
بدلے گا پھر کساں کی قسمت کا فیصلہ — موجودہ خرمنوں کو جلانے کی دیر ہے
پھر مفلسی کے ہاتھ میں تڑپیں گی بجلیاں — دولت کے سر پہ چوٹ لگانے کی دیر ہے
ہر دل میں مضطرب ہوئی زندگی کی آگ — اب میکدے کو عام بنانے کی دیر ہے

وہ شیواجی اور وہ جلیانوالا باغ!
وہ سینۂ سراج وہ ٹیپو کے دل کے داغ!
بزمِ اودھ کے آخری بجھتے ہوئے چراغ!
دلی کے میکدے کے وہ کچلے ہوئے ایاغ!
مل جائے گا ہمیں بھی کبھی اذنِ انتقام — دنیا کو دل کے زخم دکھانے کی دیر ہے

ورسائی کا وہ جبر دکھاتا ہوا فرانس!
کمزور گردنوں کو جھکاتا ہوا فرانس!

پھرتا ہے آج ٹھوکریں کھاتا ہوا فرانس!
ہٹلر کے آگے اشک بہاتا ہوا فرانس!
ہی تو سننے آئے گا ایسی ہی داستاں — محفل میں صرف شور مچانے کی دیر ہے

وہ روس کا دیار وہ ذلت کی رہگذر!
وہ زار لعدِ زار تباہی کا شور و شر!
تھا ہی کا کر دو فروہ لیڈروں کے زور پر
لیکن جنوں نے رکھدیا سب بیپا کر
اے ہند! تیری محفلِ خاموش کی قسم — تیرے بھی اب زبان ہلانے کی دیر ہے

فضل الدین آثر ایم اے

دعا

وہ ضو کہ امانت ہو مری خاک میں یارب!
اُس ضو کو عطا کر تو ہم آغوشیٔ جبریل
ہر منزلِ تحسین کو آسودہ بنا دے
مدّت سے گراں ہو مرے افکار کی زنبیل
نامحرمِ انجام ہیں امروز کے راہی
تدبیر سے کر ان کے خیالات کو تبدیل
ہر سینۂ مردہ کو سکھا ذوقِ تب و تاب
ہر دل میں جلائے مرے احساس کی قندیل
اک دورِ رنیا ہو مرے ہر خواب سے پیدا
فردا کی سحر ہو مرے اجمال کی تفصیل
زندہ ہو مری لذتِ تجدید سے دنیا!
ہر شعر سے پیدا ہوں نواہائے سرافیل
ہر نقشِ تخیل ہے حقیقت میں ادھورا
میں چاہتا ہوں تجھ سے فقط فرصتِ تکمیل

فضل حسین کیف اسرائیلی

سیّاح سے

یہ عمارات، یہ ایوان، یہ پتھر کے نقوش
عہدِ ماضی کے ہیں شہ کار انہیں دیکھ لے سیاح!

یہ حسیں صبح، یہ ہر چیز میں نیچر کے نقوش
منظرِ وادیٔ و گلزار انہیں دیکھ اے سیاح!

آ، اسی سر بفلک نقرئی ایواں کے قریب
ڈائری کو تری اک [illegible] دید ملے

ہاں اسی دلکشیٔ صحنِ گلستاں کے قریب
تجھ کو تفریح کے کچھ اور بھی سامان دید ملے

یہ جو کھیتوں سے چلی آتی ہے شیریں آواز
بھوک اور پیاس کی ٹھکرایا ہوا نغمہ ہے!

وہ [illegible] نے فضاؤں میں کیا [illegible] روح کا گھ [illegible]

[illegible] تو دریا سے ابھی جس نے یہاں جوڑے ہیں
تجھ کو حیرت ہے کہ وہ آدمی مردہ کیوں ہے

[illegible] نے کچھ پھول گلستاں سے ابھی توڑے ہیں
تو نے پوچھا ہے وہ دوشیزہ فسردہ کیوں ہے؟

دیوتا اور شہنشاہ کے سایوں ہی میں [illegible] بیٹھے ہیں لیے دولت!

ان ہی ایوان و طرب گاہ کے سایوں ہی میں
کتنے انسان یہاں چیخ رہے ہیں لے دوست!

سلام مچھلی شہری

ہر طرف سے اُٹھ رہی ہو موج نغمہ آفریں
آہ یہ ساعات رنگیں، اُف یہ لمحات حسیں
ہر طرف سے آرہی ہو بھینی بھینی سی مہک
میرے دل میں ہو رہی ہو میٹھی میٹھی سی چسک

چھیڑتا ہے جب کوئی ساز خموشی ناگہاں
یاد آتی ہے مجھے بھولی ہوئی اک داستاں
آخری راتوں کے تاروں کی سہانی چھاؤں میں
دل پہنچ جاتا ہے یمپا کی مہکتی چھاؤں میں

مٹتا جاتا ہے سکونِ زندگانی کا سو[illegible]
[illegible] کا خیال
[illegible] جاتا ہوں خوشی سے دور، کلفت سے قریب
[illegible]ہم گل کو بھی ہیں بے چاند کی راتیں نصیب

[illegible]ہو گیا ہنگامہ عالم سکوتِ دل نشیں
[illegible]مہندسی برسا رہی ہو کائنات سُرمگیں
[illegible]حسرت حالات میں گم تلخیٔ آلام ہو
منتظر آنکھیں ہیں، سنولایا ہوا اک بام ہو

[illegible]ہوں پر دل کی چھایا ہو اُداسی کا فسوں
ایک ناکام محبت کی جوانی کیا کہوں
منظروں سے دور دو غم لے کر پلٹتی ہو نظر
جس طرح ہوتی ہو سونی گرمیوں کی دوپہر

سحر رامپوری

غزل

دنیا کسے پا کے چھوڑتی ہے — نامرد بنا کے چھوڑتی ہے

کیا کیا ہیں کنوئیں حسین محبت — انساں کو جھکا کے چھوڑتی ہے

خود موت نہ نکلے جن کو۔ دنیا — ایسوں کو بھی کھا کے چھوڑتی ہے

حیرت زدگان عشق چونکے — [illegible] آنکھ جگا کے چھوڑتی ہے

پرچھائیں بھی چھوٹے ساتھ دنیا — اس موڑ پہ لا کے چھوڑتی ہے

انسان کو کیا بتائیں وہ آنکھ — کس گرد [illegible] لگا کے چھوڑتی ہے

سنتے ہیں کہ رفتہ رفتہ وہ [illegible] — [illegible] بنا کے چھوڑتی ہے

بیگانہ بھی ہو وہ نرگس شوخ — [illegible] بنا کے چھوڑتی [illegible]

ہوتے تھے جسے۔ نگاہ تیری — [illegible] بنا کے چھوڑتی ہے

جو کچھ بھی کہیں، تری محبت — انسان بنا کے چھوڑتی ہے

[illegible] سے ہر ایک کو محبت — بیگانہ بنا کے چھوڑتی ہے

غم سے نہیں بچنے دیتی دنیا — [illegible] لا کے چھوڑتی ہے

[illegible] بنا دی محبت — [illegible]

اے دوست امید آج تیرا — دامن [illegible] کے چھوڑتی ہے

[illegible] جو رحمت ہو وہ آ [illegible] — [illegible] بنا کے چھوڑتی ہے

بجلی ہے فراق یاد اس کی

[illegible] تڑپا کے چھوڑتی ہے

فراق گورکھپوری

وہبی

(منشی شیو پرشاد وہبی تلمیذ خواجہ ارشد علی خاں قلق اودھ اخبار کے مہتمم تھے [illegible]ء میں ان کا مجموعۂ کلام مرقع ارژنگ چین کے نام سے طبع ہوا۔ رنگ کلام کسی خصوصیت کا حامل نہیں اس مرقع سے جو اچھے اشعار مل سکے وہ یہ ہیں)

لبریز میری عمر کا کیا جام ہو گیا — کیا ختم دور بادۂ گلفام ہو گیا
پرتو جو اُن کے عارضِ پُرنور پر پڑا — ہر ذرہ پہ گمان ہوا آفتاب کا
[illegible] اس جہاں میں ہوا کونسا غریب — ہر راہ رو کو ہوتا ہے دھوکا سراب کا
ہے خوف دل میں سنگِ حوادث کا اس لیے — سینہ سے میں لگائے ہوں شیشہ شراب کا
[illegible] باز نہ آؤں گا ناصحا! — مجبور ہوں کہ ہے ابھی عالم شباب کا
ساقی جو تیرے ہاتھ سے ہو دورِ آفتاب — بڑھ جائے اور لطف شبِ ماہتاب کا
[illegible] پیش نظر تھا سب کچھ — غضب ہوا آنکھ سے پنہاں تو ہوا تو پیدا
[illegible]ے والوں سے بیکار ہے پردہ اُن کا — چار سو ہم کو نظر آتا ہے جلوہ ان کا
[illegible] — مشکل نظر آتا ہے سنبھلنا مرے دل کا
[illegible]ے آتا ہے تصور ترا اے شوخ — کچھ اور نظر آتا ہے نقشا مرے دل کا
[illegible] ہے یاد بتوں کی — کعبہ کہیں ہو جائے کلیسا مرے دل کا
میری نظروں سے نہاں رہتے ہیں آپ — میرے دل میں مثل جاں رہتے ہیں آپ
[illegible] خاکساری پر مری — مجھ سے کیوں دامن کشاں رہتے ہیں آپ
ہے خوفناک منزلِ عشقِ بتاں بہت — اس راستہ میں لوٹے گئے کارواں بہت
لائی ہے دیکھا مری قسمت کہاں مجھے — جنس وفا و مہر گراں ہے جہاں بہت

ٹوٹی ہے صورتِ دلِ بےکس جو بار بار ۔۔۔ توبہ شکستہ دل ہے مرے ہر گناہ سے

قید اس کی کچھ نہیں کعبہ ہو یا بتخانہ ہو ۔۔۔ ہر جگہ ہم کو خیال جلوہ جانانہ ہو

اس بھروسہ پہ گناہ کرتے ہیں وہی ہم زہد ۔۔۔ رحم کرتی ہے عطا اس کی خطا سے پہلے

وہ ہم اسیرِ قفس ہیں کہ مر کے چھوٹیں گے ۔۔۔ ہمیں ہے ایک خزاں آئے یا بہار آئے

محو رہتا ہوں تصور میں رخ و ابرو کے ۔۔۔ کام کعبہ سے کچھ دیر کی تصویروں سے

جو مٹ چکے ترے کوچہ میں گرد ہو کے اٹھے ۔۔۔ غبار دل نہ بنے گرچہ گرد ہو کے اٹھے

رہا نہ عشق میں راحت طلب مزاج اپنا ۔۔۔ جو ہم جہاں سے اٹھے اہلِ درد ہو کے اٹھے

جو ہم کو سجدے کیے اس قدر ۔۔۔ ہماری جبیں سنگِ در ہو گئی

جب مجھے دن بسر کے ہوتے تیر ۔۔۔ کام آتا نہیں ہنر کچھ بھی

کون مرتا ہے کون جیتا ہے ۔۔۔ بے خبر تجھ کو ہے خبر کچھ بھی

ایک صورت پہ نہیں سارا زمانہ [illegible] ۔۔۔ [illegible] رہتا ہے اگر کوئی تو نا شاد کوئی

ایداد ہجر کی ہے کہ زندہ ہے لب [illegible] ۔۔۔ حیران ہوں کہ بھول گئی کیا قضا مجھے

کرتا ہے توبہ کوئی بھی فسق [illegible] ۔۔۔ [illegible] مجھے

رسوا کیا شراب کے دھبوں نے بارہا ۔۔۔ لوگ جانتے تھے بڑا پارسا مجھے

ہو گئی بے پوچھے ہم تر دامنوں کی [illegible] ۔۔۔ [illegible] ندامت ہو گئی

دستِ عدم سے کھینچ کے لایا یہاں مجھے ۔۔۔ لے جائے گا یہ جوشِ جنوں اب کہاں مجھے

احباب چل بسے نہ لیا مجھ کو اپنے ساتھ ۔۔۔ [illegible]

دیکھا نہ ایک رنگ پہ باغِ جہاں کبھی ۔۔۔ آئی بہارِ گل کبھی خزاں بھی

میں کیا ہوں جو تم سے دل لگا [illegible] ۔۔۔ اک بات ہے یہ بھی دل لگی کی

ہو جائے وہی اپنی شفاعت کا وسیلہ ۔۔۔ ہم کو تو کوئی ایسی خطا بھی نہیں آئی

مرسلہ حبیب کیفوی

نام ملک یا صوبہ	تعداد افراد فی مربع میل	نام ملک یا صوبہ	تعداد افراد فی مربع میل
جرمنی	۳۶۴	اطالیہ	۳۴۴
فرانس	۱۹۷	پرتگال	۷۳۵
صوبجات متحدہ	۴۹۱	ٹراونکور	۷۹۸
کوچین	۹۶۱		

اس گنجانی کے باوجود جب ہم ملک کے پیشوں پر نظر ڈالتے ہیں تو حالت اور زیادہ خراب نظر آتی ہے ہمارے یہاں کے آبادی کے بڑے حصہ کا پیشہ زراعت ہے اور عام حالات میں یہ پیشہ اب نفع بخش نہیں رہا لوگ اس میں اس لیے مشغول نہیں ہیں کہ دوسرے پیشوں کے مقابلہ میں یہاں زیادہ فائدہ ہے بلکہ مجبوری سے مصروف ہیں کیونکہ ان کے سامنے کوئی اور پیشہ ہی نہیں ہے، اس ملک کی معاشی حالت کبھی اچھی نہیں ہو سکتی جو محض زراعت پر منحصر ہو اور زراعت بھی فرسودہ اور قدیم طریقوں سے کی جاتی ہو ہندوستان کی معاشی زندگی کو بگاڑنے والی چیزیں بارش کی کمی یا زیادتی، خشک سالی، طوفان، آندھی، ٹڈی دل اور دوسرے کیڑے کوڑے ہیں جب کسی سال فصلیں خراب ہو جاتی ہیں تو نہ صرف کاشتکار متاثر ہوتے ہیں بلکہ حکومت کا مالیہ، ریلیں، تجارت، لین دین، مشترکہ کاروبار اور انجمنیں غرضکہ ساری چیزوں پر اثر پڑتا ہے گویا ہمارے ملک کی معاشی زندگی غیر مستقل حیثیت رکھتی ہے ظاہر ہے کہ ایک متزلزل شے کسی مستحکم اور پائدار عمارت کی بنیاد نہیں ہو سکتی ان حالات میں اور زیادہ مایوسی اس لیے بھی ہو جاتی ہے کہ آبادی میں اضافہ کے ساتھ ساتھ رقبۂ کاشت میں اس تناسب سے اضافہ کے بجائے کمی ہوتی جا رہی ہے ۱۹۱۵ء میں زراعت پیشہ آبادی ½۱۵ کروڑ اور رقبہ کاشت ۲۰ کروڑ ایکڑ تھا ۱۹۳۱ء میں زرعی آبادی ۱۹ کروڑ اور رقبہ کاشت ¾۲۲ ایکڑ تھا اس مرتبہ زرعی آبادی کا اندازہ ۲۴ کروڑ ہے اور ۳۷-۱۹۳۶ء میں رقبہ زیر کاشت ¾۲۳ ایکڑ تھا یعنی ایک کاشتکار کے حصہ میں ایک ایکڑ کے قریب زمین آتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک ایکڑ زمین کسی طرح بھی معاشی کھیت نہیں ہو سکتی

زراعت کو چھوڑ کر جب ہم ہندوستان پر مجموعی نظر ڈالتے ہیں تو حالات میں کچھ تبدیلی نہیں ہوتی یعنی ہمارے یہاں فی کس آمدنی کا عام اوسط بہت کم ہے اگرچہ اب تک ہندوستانیوں کی صحیح آمدنی کا اندازہ

تنقید و تبصرہ

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

سیاسی کتابیں :-

ٹروٹسکی :- از نریندر ناتھ سیٹھ، ناشر مکتبہ اردو لاہور، صفحات ۱۰۰، سائز ۲۰×۳۰/۱۶، قیمت ۶ ؍، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی۔

کچھ عرصہ سے مکتبہ اردو لاہور سیاسی عام فہم، مفید، آسان اور ارزاں کتابیں چھپوا رہا ہے یہ اسی سلسلہ کی ایک کتاب ہے ٹروٹسکی نے انقلاب روس کے لیے جس پرسوز بیدار مغزی تدبر اور سیاست سے کام لیا ہے وہ کبھی بھلایا نہیں جا سکتا اس کی زندگی ایک بہادر سورما کی نصیحت بخش، ہمت افزا رومان کی حیثیت رکھتی ہے، [illegible] اور اس کے مسلک پر دو ایک اچھی کتابیں اردو میں نکل چکی ہیں یہ کتاب بھی اس موضوع پر اچھی لکھی گئی ہے ٹروٹسکی کی زندگی کے حالات اور اس کے پیغام کو مشرح اور مدلل لیکن آسان زبان میں بیان کیا گیا ہے [illegible] آخر تک قایم رہتی ہے۔

جواہر لال نہرو :- از گوپال متل صاحب، ناشر مکتبہ اردو لاہور، صفحات ۹۴، سائز ۲۰×۳۰/۱۶ قیمت ۶ ؍، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی۔

جواہر لال نہرو پر یہ مختصر کتاب بھی دلچسپ ہے حالانکہ بیشتر مواد ان کی اپنی کتابوں سے ماخوذ ہے پھر بھی متل صاحب نے محض ان ہی حالات پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ پنڈت جی کی سیاست پر ہلکا لیکن پُرمغز تبصرہ بھی ساتھ ساتھ کرتے گئے ہیں جس سے کتاب کی افادیت یقیناً بڑھ جاتی ہے۔

گاندھی :- از گوپال متل صاحب ناشر مکتبہ اردو لاہور، صفحات ۹۶، سائز ۲۰×۳۰/۱۶، قیمت ۶ ؍، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی۔

گاندھی جی کی اپنی سوانح عمری تلاش حق میں بہت کچھ ہے لیکن وہ صرف سنہ ۱۹۲۰ء کے حالات

تک ہے۔ زیر نظر کتابچہ میں زمانہ حال تک کے واقعات لکھنے کی کوشش کی گئی ہے حالانکہ یہ کتاب بہت مختصر ہے پھر بھی گاندھی جی کی زندگی کے خط و خال واضح ہو جاتے ہیں ساتھ ہی ان کی سیاست پر ہلکا سا تبصرہ گاندھی جی کے متعلق بہت سی باتوں کو اجاگر کرتا ہے۔

فاسزم :- از ہیرلڈ لاسکی مترجمہ باری، ناشر مکتبہ اردو لاہور، صفحات ۶۲، سائز $\frac{۲۰×۳۰}{۱۶}$ قیمت ۱ر، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی۔

پروفیسر لاسکی نے اس مختصر کتابچہ میں یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ صرف ایک یورپی انقلاب ہی ہٹلر کو تباہ کر سکتا ہے یورپ کے عوام کو چاہیے کہ وہ بغاوت کریں انگلستان انھیں اس کام کے لیے امید دلائے اور ان کی رہبری کرے۔ اپنا انگریزی نقطۂ نظر ثابت کرنے کے لیے لاسکی نے یورپ کے واقعات کا حسب منشا احاطہ کیا ہے ترجمہ بھی برا نہیں ہے موجودہ جنگ سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کو ضرور اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

ادبی کتابیں :-

نغمۂ زندگی :- از سید فضل احمد کریم فضلی، ملنے کے پتے دفتر انجمن ترقی اردو دہلی و فضلی برادران لمیٹڈ کنٹ ہاؤس مشن رو ایکسٹنشن کلکتہ صفحات ۱۸۴، سائز $\frac{۲۰×۲۶}{۱۶}$ قیمت جلد چرمی عہ جلد پارچہ ولایتی ہیر، کاغذ و طباعت نہایت نفیس

خیال تھا کہ اب غزل کے دن پورے ہوگئے اور دلّی کے رنگ میں کہنے والا غزل گو اب تو کیا پیدا نہ ہوگا لیکن فضلی صاحب کی غزلوں کا یہ مجموعہ دیکھ کر طبیعت کو خوش ہونا پڑا وہی دلّی کی صاف ستھری اور نکھری ہوئی زبان ہے زود فہمی فطری معلوم ہوتی ہے اور دل درد آشنا غالب کا سہل ممتنع اور داغ کی سی روانی اور کلام میں ہلکی سی شستہ جوانی، اس چیز نے فضلی صاحب کا کلام قابل مطالعہ بنا دیا ہے

یہ فضلی کا لطف سخن دوستو [illegible] خدا داد ہے اکتسابی نہیں ہے

زبان پختہ اور استادانہ رنگ لیے ہوئے ہے روزمرہ پر عبور معلوم ہوتا ہے ساتھ ہی محض محاورہ بندی یا لفاظی نہیں ہے۔ خیالات لطیف، سیدھے سادے الفاظ اور سیدھی سادی طرز میں برجستہ سمو دیے

چکے ہیں۔ عرض حال میں خود اپنے کلام کے متعلق بھی یہی لکھتے ہیں۔

زباں دیکھو تو بالکل سیدھی سادی — نہ مضموں میں کوئی جدت نئی ہو
وہی ہیں روزمرہ ہونے والی باتیں — وہی حسن کا سیاں لا حاصلی ہو
یہ سب کچھ ہے مگر پھر بھی جو دیکھو — تو ان میں اک نرالی تازگی ہو

ان کے منتخب کلام سے ان کی خصوصیات زیادہ آشکارا ہوں گی۔

جینے میں یہ لطف کہاں تھا — شادر ہے تڑپانے والا
ہم تو کوشش کرتے ہیں فضلی بہت — دل بہلتا ہی نہیں بہلائیں کیا

کیا دن تھے وہ یارب کیا وہ شب جب جمع تھے سارے ہم مشرب
اک کیف میں ڈوبے سب کے سب اک لطف مسلسل جینا

وہ غصے میں ہیں تو لگتے ہیں اور بھی پیارے — بری بھی چیز بھلی لگتی ہے حسینوں پر
کچھ عجب حال اب ہے فضلی کا — تم نے کیا کر دیا نہیں معلوم
پھر جھوٹے آنسوؤں میں مزا پا رہا ہوں میں — سو دھو کے جاں بوجھ کے پھر کھا رہا ہوں میں
پھر دل سے ہو گئیں وہی باتیں مری شروع — سمجھا رہا ہے وہ کبھی سمجھا رہا ہوں میں
پھر بیٹھے بیٹھے دیکھتا ہوں جاگتے میں خواب — وہ مسکرا رہے ہیں اور کھلا جا رہا ہوں میں
شانے پہ میرے بکھری ہوئی ہے پھر ان کی زلف — اور انگلیوں سے پھر اسے سلجھا رہا ہوں میں
جاؤں میں غیر کے کھٹکے کا لطف تھا — گھبرا رہے ہیں وہ کبھی گھبرا رہا ہوں میں
اس نے کیا کیا! ہم کو ہوا کیا! — وہ کیا بتائے! ہم کیا بتائیں!
تم بن یہ غم کے بجلی گرا دیں — تم مسکرا دو اور ہم مسکرا دیں!

غرضکہ غزلیات میں اسی قسم کی سادگی و پرکاری کے اشعار بکثرت ہیں لیکن یہی سادگی قومی نظموں بالکل ناکامیاب ثابت ہوئی ہے قومی نظمیں قصیدوں کی قسم کی چیزیں ہوتی ہیں ان میں جب تک بلند آہنگی نہ ہو ان میں جان نہیں آتی۔ اس لیے وہ پانچ چھ نظمیں جو فضلی صاحب نے درد قومی -

زیرِ اثر کہی ہیں وہ محض درد کے اظہار کے اثر انگیز نہیں ہو سکی ہیں البتہ آخر میں آکسفورڈ کی دلچسپیوں
پر جو بیانیہ نظم ہے اس میں ان کی سادگی و روانی خوب کام آئی ہے بعض اوقات میر حسن کے اثر کا دھوکا
ہونے لگتا ہے غرضکہ فضلی صاحب غزل اور بیانیہ نظم یا مثنوی میں بہت کامیاب رہے ہیں اور وہ اگر
ان ہی میں اپنا میدان عمل محدود رکھیں تو ان کے اور ان کی شاعری دونوں کے لیے مفید ہوگا۔

مضامین عظمت — عظمت اللہ خاں مرحوم ملنے کا پتہ علی اسد اللہ خاں برکت
ٹھیگی چیل قدیم حیدرآباد دکن صفحات ۲۵۸، سائز ۲۰×۳۰/۱۶ قیمت عمر کاغذ، کتابت و طباعت اچھی

عظمت اللہ خاں مرحوم کی نظموں کا مجموعہ "سریلے بول" پہلے شائع ہو چکا ہے یہ ان کے
مضامین کا پہلا حصہ ہے جس کا وعدہ سریلے بول کے دیباچہ میں کیا گیا تھا عظمت اللہ خاں مرحوم جہاں
اردو شاعری میں نئی نئی باتوں کے کہنے اور نئی طرز سے کہنے کے شائق تھے وہاں انھوں نے
اردو نثر میں بھی اپنا خاص اسلوب پیدا کیا تھا وہ یہ تھا کہ مرحوم سنجیدہ مضامین کو غیر سنجیدہ اور ظریفانہ
انداز میں لکھتے تھے تاکہ عام پڑھنے والے ان کی طرف متوجہ ہو جائیں اور پڑھ کر فائدہ اٹھائیں انھیں وہ اگر
سنجیدہ طور پر سمجھانے کی کوشش کرتے تو ناظرین یا سامعین کا جی نہ لگتا مثلاً ان کے مضامین کے
عنوان ہی جاذب توجہ ہیں "زندہ بدست مردہ" "لڑائی کھٹراتی" "انگریس گڑیا خانہ" "سورما چپنا
بیر یا پان" وغیرہ۔ مرحوم یہ چاہتے تھے کہ خوش مذاقی کے ساتھ ساتھ ہی مفید اور ضروری باتیں بھی
سمجھا دی جائیں۔ پھر بھی مرحوم کے مضامین میں مزاح کم اور سنجیدہ باتیں زیادہ ہیں لیکن مضامین کی
افادیت سے انکار نہیں ہو سکتا خود عظمت مرحوم نے خوش مذاقی کی تعریف یہ کی ہے کہ اس کی ایک بڑی خصوصیت
یہ ہے کہ اس میں رکاکت اور سوقیانہ پن بالکل نہ ہو اور منطقی ہیر پھیر سے اور داؤ پیچ ذہن کے لیے پرلطف ورزش
بھی ہو جائیں۔ مرحوم کی کوشش اس خوش مذاقی کے حصول میں کامیاب ہے لیکن وہ اسے
کمال پر نہ پہنچا پائے تھے کہ داعی اجل کو لبیک کہا رشید الدین صدیقی کی بعض بعض تحریریں
اس خوش مذاقی کی کسوٹی پر پوری اترتی ہیں زیرِ نظر مضامین میں مولیر کے ایک ڈرامہ "علم دوست خواتین"
کا ترجمہ بھی شامل ہے ترجمہ کی مشکلات کو مرحوم نے بڑی قادر الکلامی سے طے کر لیا ہے زبان اس

اور مضامین کی افادیت ہر صورت سے یہ مضامین لایق مطالعہ ہیں

بھید (ترجمہ کینڈڈا از برنارڈ شا): مترجمہ نورالحسن ہاشمی ایم اے، ملنے کا پتہ ارشاد بکڈپو مسلم یونیورسٹی علی گڈھ، صفحات ۸۴، سائز [illegible]، کاغذ [illegible] ابھی قیمت درج نہیں غالباً دس بارہ آنے میں مل سکے گی۔

یہ ڈراما دراصل برنارڈ شا کے اشتراکی [illegible] زمانے کی چیز ہے جس میں بتلایا گیا ہے کہ گھریلو روزمرہ کی زندگی میں عورت کا مرتبہ مرد سے کتنا بلند ہے نیز مرد محض اقتصادی وجوہات کی بنا پر اسے غلام بنائے رکھنا چاہتا ہے یہ صرف عورت ہی ہے جو اس بات کو جانتے ہوئے بھی اپنی اصلی [illegible] کی خاطر ان باتوں کو نظرانداز کر دیتی ہے۔ یہ ترجمہ رسالہ جامعہ میں باقساط شایع ہوتا رہا اور اب کتابی صورت میں شایع کر دیا گیا ہے فروخت کرنا اس کا مقصد نہیں ہے محض کتابی صورت [illegible] کے لیے رسالہ مذکور سے کچھ جز بے نکلوا لیے گئے ہیں ترجمہ رواں، بامحاورہ اور قابل مطالعہ ہے۔

بگولے :- از احمد ندیم قاسمی، ناشر مکتبہ اردو لاہور، صفحات ۲۴۴، سائز $\frac{20 \times 30}{16}$، قیمت عہ کاغذ، کتابت و طباعت اچھی۔

قاسمی صاحب کی زندگی دیہاتوں میں زیادہ گزری ہے وہ خود ایک کسان ہیں اس لیے کسانوں کی زندگی سے تمام تر واقف زیر نظر افسانوں کے مجموعہ میں زیادہ تر دیہاتی زندگی ہی کی عکاسی کی ہے اور یہ حقیقت ہے کہ منشی پریم چند کے بعد دیہاتی زندگی کو پیش کرنے میں سب سے زیادہ سرگرمی قاسمی صاحب ہی نے دکھلائی ہے لیکن قاسمی صاحب ایک جوان آدمی ہیں اور شاعر، اس لیے ان کے کردار وں اور افسانوں میں شاعری کا زیادہ عنصر ہے انھیں کسانوں سے ہمدردی ہے اس لیے وہ ان تمام مظالم کو بھی آشکارا کرنا چاہتے ہیں جو پٹواری، نمبردار اور پولیس ان پر کرتی رہتی ہے اس طرح پر گویا ان کا قلم رومان و واقعیت کو ملا دینا چاہتا ہے۔ لیکن وہ یہ اکثر بھول جاتے ہیں کہ دیہات کی زندگی میں زندگی کا عنصر زیادہ نمایاں اور شباب و شاعری کا عنصر دبا ہوا ہوتا ہے قاسمی صاحب

کے کردار شاعر کی طرح حساس ہیں اور بعض تو شاعری کرنے لگتے ہیں مثلاً کریا کرم کی ہیروئن قاسمی مقصد ان کا نفسیاتی تجزیہ سب صحیح لیکن ان کا اسلوب کچھ اس طرح کا ہے کہ ان کے پیش کردہ مظالم کے مرقعے باوجود صحیح ہونے کے دوسرے اشتراکی فنکاروں کی طرح ایک پروپیگنڈہ یا نمایش معلوم ہوتی ہیں اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ دانستہ وہی پلاٹ منتخب کیے گئے ہیں جو ظلم و زیادتی کا مرقع پیش کرتے ہیں دیہات میں اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔ قاسمی صاحب کی حساس شاعری ان کی قوت مشاہدہ، ان کا تفکر اور رنگین سی طرز وہاں بہتر ثابت ہوتی ہے جہاں وہ شہر والوں کی زندگی یا کوئی نفسیاتی تجزیہ پیش کرتے ہیں مثلاً بھیے۔ السلام علیکم (جو ایک انگریزی افسانہ ہے جسے قاسمی صاحب نے خوب اپنایا ہے) دیہاتیوں کی زندگی پیش کرنے میں معلوم ہوتا ہے کہ قاسمی صاحب پہلے سے ایک نتیجہ سوچ لیتے ہیں اور پھر اس کے مطابق واقعات گھڑ دیتے ہیں مثلاً "ماں" میں جو نتیجہ دکھلایا گیا ہے وہ ایک کلیہ نہیں ہے بلکہ بحث طلب مسئلہ ہے جہاں تک اسلوب کا تعلق ہے یہ صحیح ہے کہ دیہات میں بھی شاعر اور [illegible] ہیں لیکن اس کا اسلوب بھی دیہاتی ہوتا ہے قاسمی صاحب کا اسلوب اور طریقہ شاعرانہ زیادہ ہے دیہاتی زندگی کے پیش کرنے میں اسلوب بھی اگر منشی پریم چند کی طرح شستہ سلیس اور ٹھیٹھ ہندوستانی ہو تو کامیابی یقینی ہے۔ ورنہ وہ میرے خیال میں نفسیاتی تجزیے والے اور شاعرانہ افسانوں میں زیادہ کامیاب ہوں گے بشرطیکہ ان کے کردار اپنی طبیعت و ماحول کے لحاظ سے ان کے اسلوب کے ہم آہنگ ہوں۔ مثلاً "سیئوں کا محل"، "ماں کی میاؤں" وغیرہ

پارۂ کجکول :۔ از سائل دہلوی۔ ملنے کا پتہ کتب خانہ رحیمیہ، ۱۱ دومازار متصل جامع مسجد دہلی، سائز ۲۰×۳۰/۱۶۔ قیمت ۸/ صفحات ۷۰، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی۔

یہ حضرت سائل دہلوی کی چند غزلوں کا مجموعہ ہے جو ان کے احباب و شاگردوں کے تقاضوں کی بنا پر شائع کیا گیا ہے اکثر یہ غزلیں ریڈیو سے بھی نشر ہوتی رہتی ہیں ایسے مختصر مجموعہ پر مفصل تبصرہ نہیں کیا جا سکتا۔ پھر بھی حضرت سائل دہلوی کی تمام خصوصیات اس میں پائی جاتی ہیں دلی کی ٹکسالی ستھری زبان، برجستہ نشست الفاظ آسان اور رواں روزمرہ شروع سے آخر تک موجود ہے

وہی قادرالکلامی ہے جو شاد نصیر، ذوق اور داغ کی وساطت سے یہاں تک پہنچی ہے حالانکہ وہ معنویت جامعیت اور روحانی ستھرائی ہیں جو میر، سودا، سوز اور درد کی دہلوی روش کا نشتر لگائے۔

پہلی کتاب ہینی ریڈنگ (انگریزی) مرتبہ حافظ فیاض احمد انصاری ملنے کا پتہ شرکت اردو مکتبہ جامعہ دہلی سائز ۲۲×۱۸/۱۶ صفحات ۸۴، قیمت ۶ر، کاغذ، کتابت وطباعت اچھی۔

اس کتاب میں چند انگریزی اخلاقی نظموں کو معہ ان کے منظوم اردو ترجمہ کے جمع کر دیا گیا ہے دراصل اس کا مقصد یہ ہے اس کے ذریعہ بچوں میں سمجھنے اور یاد کرنے کا مادہ پیدا کیا جائے انگریزی زبان کو بھی اس طرح سیکھنے میں مدد ملے گی اور اخلاقی اسباق کے ساتھ ساتھ ان کی اپنی زبان میں انگریزی سے ترجمہ کرنے کی صلاحیت بھی بڑھے گی طلبا اور ماہرین تعلیم کے لیے یہ کتاب مفید ہے۔
(م ح)

مذہبی کتابیں

تسہیل الترتیل:- مولفہ الیاس برنی، مطبوعہ دارالطبع جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن، سائز ۳۰×۲۰/۱۶ [illegible] قیمت ۱۱ر، کاغذ معمولی، کتابت وطباعت اچھی ملنے کا پتہ مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن

الیاس برنی صاحب جہاں علم و ادب میں کافی کام کر چکے ہیں وہاں مذہبی کام بھی خوب کر چکے ہیں اور مختلف مذہبی کتابیں ان کے قلم سے نکل چکی ہیں زیر نظر کتاب [illegible] انہوں نے بہت سلیس اور عام فہم انداز میں پیش کیا ہے ترتیب کا کام برنی صاحب خصوصیت سے خوب کر لیتے ہیں چنانچہ اس مختصر سی کتاب میں بھی قرأت کی ضرورت اور اس کے اصول وطرق بڑے اچھے طریقے سے سمجھائے ہیں جن سے اس فن کے تمام نکات و اشارات واضح ہو جاتے ہیں اور قرآن پڑھنے میں ایک نئی بصیرت پیدا ہو جاتی ہے یوں تو یہ فن ہمیشہ سے مسلمانوں کے مکمل اور پختہ تر فنون میں سے ہے اور عربی، فارسی اور اردو میں متعدد کتابیں فن قرأت پر ملیں گی لیکن اپنی ترتیب و تفہیم کے لحاظ سے یہ کتابچہ ضرور لائق مطالعہ ہے۔

شان خدا:- مولفہ عبیدالرحمٰن عاقل رحمانی پبلشر کتابستان پوسٹ بکس نمبر ۲۱۶۳ بمبئی نمبر ۲ سائز ۳۰×۲۰/۱۶، صفحات ۵۷، قیمت ۸ر، کاغذ، کتابت وطباعت اچھی۔

اس کتاب میں خدا کی ہستی کو عقلی دلائل سے ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ الحاد اور دہریت جو آج کل بطور فیشن رائج ہو رہی ہے منہدم ہو جائے تقریباً تمام پرانے فرنگی فلاسفہ کے اقوال دیے گئے ہیں اور مادئین کے اعتراضات بھی دیے گئے ہیں، اور ان کا جواب بھی دیا گیا ہے نتیجہ یہ نکالا گیا ہے کہ اعتقاد خالق ایک فطری چیز ہے [illegible] اگر یہ اعتقاد [illegible] اور عقل سے حاصل نہ ہو سکے تو اس کا [illegible] خدا کا وجود ہی نہیں کیونکہ یہ اعتقاد عقل سے حاصل کرنے کی چیز ہی نہیں دہریت کو منانے کا خیال ایک مقصد ہے یقیناً یہ بڑی حد تک مبارک ہے مگر اس [illegible] متکلمین فلاسفہ [illegible] پیش کرنے کی کمی رہ گئی ہے بہر حال پھر بھی قابل مطالعہ رسالہ ہے۔

محمد رسول اللہ - مترجمہ مولانا عبید [illegible] ملنے کا پتہ [illegible] پاکستان پوسٹ بکس نمبر ۴۱۶۳ بمبئی نمبر ۳، سائز ۲۰×۲۶/۱۶ صفحات ۴۲، قیمت ۸ ر، کاغذ کتابت و طباعت اچھی

یہ کتاب [illegible] کارلائل کی ایک کتاب کے ایک باب کا [illegible] کارلائل کا مقولہ ہے کہ تھوڑے [illegible] بعد ادوار ہستی سے ایک ایسا فرزند پیدا ہوا کرتا ہے جو حق و حقیقت کی آواز بلند کرتا ہے اور کفر و باطل کی باتوں کی پول کھول دیتا ہے ایسے فرزندان حقیقت کو کارلائل بطل عظیم گردانتا ہے ایسے بطل کا وجود کسی صورت میں ہو خواہ وہ شاعر ہو یا مصلح پیغمبر ہو یا بادشاہ لیکن ہوتا وہ فرزند توحید و حقیقت ہے محمد رسول اللہ کو بھی کارلائل ایک بطل عظیم گردانتا ہے جن کا پیغمبر کی صورت میں ظہور ہوا یہ باب کارلائل کا بہت مشہور ہے اور اس میں ان تمام عیسائی پادریوں کے اعتراضات کے مسکت جواب دیے گئے ہیں جو اس زمانہ میں پیغمبر کی ذات گرامی پر کیے جاتے تھے اردو میں اس کا ترجمہ کئی بار چھپ چکا ہے موجودہ ترجمہ بھی اچھا، رواں اور باترتیب ہے جس نے کارلائل کا یہ مقالہ ابھی تک نہ دیکھا ہو اس ترجمہ سے مستفید ہو۔

بلاکشانِ اسلام : مصنفہ مولانا ادیس احمد [illegible] کا پتہ [illegible] کوچہ ناہر خان بیت السعید دہلی۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶، صفحات ۸۴ قیمت ۸ ر، کاغذ معمولی، کتابت و طباعت اچھی

مولانا احمد سعید صاحب نے ایک موتمر المصنفین قایم کی ہو تاکہ اہل قلم اس میں شامل ہو کر خاموشی سے تصنیف و تالیف کا کام کر سکیں یہ اس سعی کی پہلی کتاب ہو اس میں ان اٹھائیس صحابہ اور صحابیات کا مختصر تذکرہ ہو جنھوں نے اسلام کے ابتدائی دور میں اسلام قبول کر لینے پر سخت مالی اور جانی اذیتیں برداشت کیں کتاب مختصر بہت ہو اس لیے اس سے سیری نہیں ہوتی اس موضوع پر ایک سیر حاصل تذکرہ ہونا چاہیے تھا۔ (ع۔ ح)

رسائل [illegible]

ماہنامہ کتاب :- زیر ادارت جناب پروفیسر محمد سرور رضا صاحب مقام اشاعت کتاب خانہ پنجاب، لاہور [illegible] سالانہ [illegible] کاغذ معمولی، کتابت و طباعت اچھی۔

یہ رسالہ جنوری ۱۹۴۲ء سے نکل رہا ہو اس کا مقصد یہ ہو کہ اردو زبان کی ترقی میں کوشاں ہو اور اس کی اچھی نئی کتابوں کا تعارف کراتا رہے رسالہ بڑی لیاقت اور قابلیت سے مرتب ہوتا ہو کتابوں کا تعارف و تبصرہ بڑی جامعیت سے کیا جاتا ہو اکثر اچھے مختصر مضامین بھی ہوتے ہیں جناب مدیر کی وسعت معلومات اور دلکش اسلوب اس موضوع کے لحاظ سے ایک گونہ محدود رسالہ کو بھی برتر بنا دیتا ہو اردو داں حضرات کے لیے عموماً اور شائقین کتب و لائبریریوں کے لیے اچھا تحفہ ہو۔

رسالہ حیوانیات :- مرتبہ مرزا محمد اقبال مسعود صاحب، زیر نگرانی عنایت علی خاں صاحب [illegible] حیوانیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، سائز ۲۰×۲۶/۸، صفحات ۶۲، قیمت درج نہیں کاغذ معمولی کتابت و طباعت بھی [illegible]

مسلم یونیورسٹی میں اکثر اچھے کام ہو جاتے ہیں چنانچہ زیر نظر رسالہ جو فروری ۱۹۴۲ء میں شایع ہوا تھا یقیناً ایک قابل دید رسالہ ہو اس میں سات مضامین ہیں جن کے عنوان یہ ہیں ذیابیطس کے اسباب اور اس کا علاج، پرندوں میں گانے کے مقاصد، جانوروں میں جنس کی ابتدا، ارتقا اور عروج، جانوروں کے اخلاق و آداب، انسان اور حیوانات میں جذبات کا اظہار، رنگ حیوانات، حیاتین۔ تقریباً ہر مضمون قابل مطالعہ ہو رسالہ کا معیار بہت بلند ہو حیوانیات کی جدید دریافتوں کو عام فہم اردو میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہو کاش سائنس کے موضوعات پر اردو میں اس قسم کے اور بھی رسالے نکلیں شعبۂ حیوانیات لائق صد مبارکباد ہو کہ اس نے ایسا مستحسن اقدام کیا۔

[redacted]

نہیں ہوسکا مگر جو کچھ کوششیں ہوئیں اور ان سے جو نتائج نکلے وہ حسب ذیل ہیں

محقق	تخمینی سال	آمدنی فی کس سالانہ
دادا بھائی نوروجی	۱۸۷۰ء	۲۰ روپے
لارڈ کرزن	۱۹۰۰ء	۳۰ "
فنڈلے شیراز	۱۹۱۱ء	۵۰ "
پروفیسر کے ٹی شاہ	۱۹۲۱ء	۴۶ "
سائمن کمیشن	۱۹۲۸ء	۱۱۰ "
مختلف اشخاص	۱۹۳۲ء	۱۲۰ "

اس وقت بھی فی کس آمدنی کا اندازہ ۳۰ روپے سے ۱۴۰ روپے سالانہ تک ہے اس میں بڑے بڑے کروڑپتی لکھ پتی اور وہ لوگ بھی شامل ہیں جن کی آمدنی اس اوسط سے بہت زیادہ ہے اس طرح عام اوسط میں اور تخفیف ہوجاتی ہے۔

ہندوستانی آبادی کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ وہ زیادہ تر دیہات میں رہتی ہے چنانچہ ہندوستان کو دیہاتوں کا براعظم کہا جاتا ہے یہاں ۷،۲½ لاکھ کے قریب دیہات ہیں اور ہمارے یہاں ۹۰ فیصد آبادی دیہات میں رہتی ہے۔ حالانکہ دوسرے ملکوں میں شہری آبادی کی کثرت دکھائی دیتی ہے مثلاً انگلستان میں ۸۰، امریکہ میں ۵۲، فرانس میں ۴۳، اور جرمنی میں ۶۴ فی صدی آبادی شہری ہے شہری اور دیہی آبادی کی اس غیر مساویانہ تقسیم کا یہ نتیجہ ہوا ہے کہ ملک کی معاشی حالت ابتر ہوتی چلی جا رہی ہے تہذیب و ترقی ہمیشہ شہروں سے شروع ہوتی ہے صنعتی ترقی کے مرکز شہر ہی ہوتے ہیں تعلیم و تمدن اور دوسری مفید اور تعمیری تحریکات یہیں سے شروع ہوتی ہیں اور پھر ملک کے اندرونی حصوں میں پہنچتی ہیں اس مرتبہ آبادی کے جو اعداد شائع ہوئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ اکثر مرکزی شہروں میں قابل لحاظ اضافہ ہوا ہے اور نئے نئے شہر بھی پیدا ہوگئے ہیں مگر اس میں موجودہ جنگ کا بھی بڑا دخل ہے اور اگر اس جز کو نظر انداز کر دیا جائے تب بھی ہندوستان میں شہری آبادی کے اضافہ کی سخت ضرورت ہے اور یہ نئی نئی صنعتوں، کاروباروں اور نئے شہروں کے وجود سے

رجسٹرڈ ایل نمبر ۱۸۹۲

پنڈت جواہرلال نہرو کی شہرۂ آفاق کتاب

جگ بیتی

دنیا کی تاریخ سنین و سلاطین کی فہرست کا نام نہیں ہے نہ مختلف حکمراں خاندانوں کے عروج و زوال اور تاج و تخت کے لئے زور آزمائی کرنے والوں کی باہمی کش مکش کو تاریخ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ دراصل تاریخ نام ہے افراد کی ذہنی ارتقاء کا جماعتی نظام کی تنظیم کا تہذیب و تمدن کے اصولوں کی تدوین کا اور علوم و فنون کی ترویج کا۔ پھر تاریخ کا دائرہ کسی ایک ملک یا قوم کے حالات تک محدود نہیں ہوتا اسکے پیش نظر تمام ممالک اور تمام اقوام ایک سلسلے میں منسلک ہوتے ہیں اور ایک دوسرے سے متاثر ہوتے اور متاثر کرتے ہیں۔

جگ بیتی میں پنڈت جواہرلال نہرو نے انھی اصولوں کو پیش نظر رکھا ہے اور مختلف زمانوں میں تمام ممالک اور تمام اقوام کے حالات پیش کرکے دنیا کی ایک یکجائی تصویر کھینچی ہے۔ اسلئے ان کی یہ کتاب ہندوستان کے تاریخی ادب میں ایک جدت ہے ایک تنوع ہے جس کی مثال مشکل ہی سے مل سکے گی۔ قیمت جلد اوّل تین روپے (سے ر)

مکتبہ جامعہ

دہلی۔ نئی دہلی۔ لکھنؤ۔ بمبئی ۳

پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی اے مطبوعہ محبوب المطابع پریس دہلی

ہو سکتی ہے۔

ملک کی بڑھتی ترقی میں تعلیم کا بڑا حصہ ہوتا ہے مگر ہندوستان میں تعلیم کی بڑی کمی ہے چنانچہ اس مرتبہ سے مرد ں کی تعداد ... لاکھ معلوم ہوئی ہے مردم شماری کے قانون میں پڑھے لکھے کی تعریف ... کہ وہ آدمی جو کسی زبان میں بھی ایک معمولی خط لکھ پڑھ سکتا ہے لکھا پڑھا ہے۔ اس معمولی معیار کے ... ہندوستان میں صرف ۱۲ فی صدی آدمی لکھے پڑھے ہیں۔ پھر اس تعداد کا بڑا حصہ شہروں میں رہتا ... چنانچہ مردم شماری کے موقع پر اس عجیب و غریب بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ ہندوستان میں اکثر ۵ ہزار ... ی کے دیہات ایسے ہیں جہاں کوئی لکھا پڑھا موجود نہیں اس حقیقت کے باوجود کہ ہندوستان میں ... کی اتنی کمی ہے ہمارے یہاں تعلیم یافتہ بے روزگاروں کی تعداد کافی ہے یہ دراصل ایک دوسرا مسئلہ ... کا تجزیہ اس مختصر مضمون میں نہیں کیا جا سکتا

کسی ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے نئے نئے ذرائع معاش تلاش کرنے کا ایک طریقہ ترک وطن ... نو آبادیات اسی اصول کے تحت بسائی جاتی ہیں۔ مگر ہندوستان سیاسی حیثیت سے آزاد نہیں ہے۔ ... نو آبادی کا مسئلہ پیدا نہیں ہوتا اب یہ ہو سکتا ہے کہ یہ اپنی بڑھتی ہوئی آبادی کو دوسرے ملکوں میں کھپائے ... یہ ہندوستانیوں کی بڑی تعداد جنوبی اور مشرقی افریقہ، لنکا، برما، ملایا اور کم تعداد جزائر فجی اور جزائر ویسٹ انڈیز میں آباد ہے ... کچھ دنوں پہلے تک ہندوستانی یہاں آزادانہ طور پر جا کر بس سکتے تھے چنانچہ ان علاقوں میں ... غیر مہارت رکھنے والے مزدوروں سے لے کر مالدار کاروباری تاجروں تک ہر قسم کے لوگ آباد ہیں مگر اب ہندوستانیوں کے ترک وطن پر نہ صرف پابندیاں لگا دی گئی ہیں بلکہ وہاں کے آبادکاروں کو تمام قوانین ... نسل و رنگ کے امتیاز اور غیر مساوی حقوق اور نامنصفانہ سلوک کی بدولت بڑی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اور ہندوستانیوں کی بڑی تعداد ان مقامات سے واپس آ رہی ہے اگرچہ ہندوستان جیسے ... کروڑ ... ملک کے لیے اس سالانہ ترک وطن خارجی کی کوئی زیادہ اہمیت نہ تھی۔ مگر اب رہا سہا راستہ بھی رک گیا اور ہندوستان کو اپنے سپوتوں کو خود ہی پالنا ہوگا۔

ہندوستان میں شرح پیدائش اور شرح اموات دونوں زیادہ ہیں اور شرح بقا بہت ادنیٰ ہے شرح

پیدائش کی زیادتی ہمارے لیے زیادہ خوش کن اس لیے نہیں ہوسکتی کہ شرح اموات بھی بڑھی ہوئی ہو بہتر یہ ہوتا ہے کہ کم بچے پیدا ہوں اور زیادہ زندہ رہیں اور کثرت پیدائش سے جو نقصان ہوتے ہیں ان سے ملک محفوظ رہے جو بچے زندہ رہتے ہیں ان میں بھی ناتواں کمزور زردگی اور ناکارہ بچوں کی تعداد کافی ہوتی ہے ایسے بچوں میں معمولی معمولی بیماریوں کی مدافعت کی بھی صلاحیت نہیں ہوتی چنانچہ بہت کم لوگ عمر طبعی کو پہنچتے ہیں اور اسی لحاظ سے ہندوستان میں اوسط عمر بھی دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں بہت کم ہے چنانچہ چند ملکوں پر عمروں کے اوسط حسب ذیل ہیں۔

نام ملک	مرد کی اوسط عمر	عورت کی اوسط عمر
سویڈن	۵۶ سال	۵۴ سال
انگلستان	۵۶ ״	۶۰ ״
جاپان	۴۳ ״	۴۳ ״
ہندوستان	۲۳ ״	۲۶ ״

آبادی کو کم کرنے والے وہ موانعات جو انسانوں کو دنیا میں آنے سے روکتے ہیں ہمارے یہاں بہت کم ہیں مثلاً تعلیم کی سخت کمی ہے حالانکہ تعلیم کی عمومیت سے آبادی میں کمی ہوسکتی ہے۔ علم الحیات کا یہ مسئلہ طے ہو چکا ہے کہ جیسے جیسے انسان کی دماغی قوتیں ترقی کر رہی ہیں ویسے ویسے اس کی قوت تولید کم ہوتی جا رہی ہے عورتوں کی تعلیم اور عملی زندگی میں ان کی جد و جہد بھی آبادی کو روکتی ہے۔ مثلاً ہمارے یہاں تعلیم بہت کم ہے عورتیں جو دخیل نہیں پھر ملک کا عام معیار زندگی بہت ادنی ہے اور ترے کنبہ کو پالنا دشوار نہیں یہ شادیاں جلد کی جاتی ہیں شادی کے بعد ضبط سے کام نہیں لیا جاتا افلاس اور تنگ دستی کی وجہ سے مصنوعی طریقوں پر کاربند نہیں ہوسکتے بلکہ یہی چیز اضافہ پیدائش کی تحریک بن جاتی ہے جب مفلس طبقہ کے سامنے افلاس سے نجات پانے کی کوئی صورت نہیں رہتی تو متواتر مایوسی اس کے اخلاق کو بھی خراب کر دیتی ہے۔ چنانچہ مستقبل کا لحاظ کیے بغیر آبادی خوب بڑھتی ہے اور چونکہ ایسے طبقوں میں اجرتیں کم ہوتی ہیں اور یہاں عورتوں اور بچوں کو کمانے کے موقعے بھی ہوتے ہیں لہذا اضافہ آمدنی کی خاطر تعداد میں اضا

کیا جاتا ہے مگر وہ لوگ یہ اصول نہیں سمجھتے کہ اعلیٰ اجرتیں صرف اسی وقت برقرار رہ سکتی ہیں جبکہ کام کرنے والوں کی تعداد ایک خاص حد سے متجاوز نہ ہو۔

جب کسی ملک میں آبادی بڑھنے لگتی ہے تو لوگوں کی عام صحت اور توانائی کم ہونے لگتی ہے ان کی ذہنی کارکردگی گھٹنے لگتی ہے۔ معیار زندگی پست ہونے لگتا ہے اور اس کا نتیجہ آمدنی کی مزید تخفیف کی صورت میں نمودار ہوتا ہے اور ملک میں افلاس عام ہونے لگتا ہے اسی کی بدولت فرقہ وارانہ جھگڑے اور مذہبی مناقشات پیدا ہوتے ہیں اور جرائم میں اضافہ ہونے لگتا ہے اضافہ کی ایک صورت عام بیروزگاری کی شکل میں پیدا ہو جاتی ہے اس وقت موجودہ جنگ نے حالات میں بڑی تبدیلی پیدا کر دی ہے جنگ کے نئے نئے کاروبار کھل گئے ہیں پرانے کاروباروں میں کام کا وقت بڑھ گیا ہے رات کو بھی کام ہونے لگا ہے نئی نئی وجوں کے لیے سپاہی، کارخانوں کے لیے میکانک، ہسپتالوں اور قومی کیمپوں کے لیے ڈاکٹر، کمپاؤنڈر اور نرسوں کی بھرتی ہو رہی ہے اس لیے بے روزگاری میں بڑی حد تک کمی ہو گئی ہے مگر یہ خیال رکھنا چاہیے کہ جنگ ایک عارضی چیز ہے اور ملک کی آبادی ایک مستقل حیثیت رکھتی ہے لہذا عارضی چہل پہل اور رونق سے متاثر ہو کر اس مسئلہ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور نہ اس سے انکار کیا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کی آبادی کثیر نہیں ہے لہذا ایسی صورت میں ہر ہندوستانی محب وطن اور ہر سمجھدار ذی فہم انسان کا فرض ہے کہ وہ قانونی، اخلاقی، اور شخصی تدابیر کو اختیار کر کے اور ان کا زیادہ سے زیادہ پروپیگنڈا کر کے ملک کی آبادی کے اضافے کو روکے اور اس طرح ملک کی ایک حقیقی اور تعمیری خدمت انجام دے جس کے لیے آنے والی نسلیں اس کی ممنون رہیں گی۔

حکومت نے جو مختصر اعداد و شمار یکم مارچ ۱۹۴۱ء کو چھاپے ہیں وہ حسب ذیل ہیں تمام اعداد کے آگے تین صفر بڑھا کر پڑھیے؛

	آبادی ۱۹۴۱ء	آبادی ۱۹۳۱ء	کمی، اضافہ فیصدی	خواندگی ۱۹۴۱ء
کل ہندوستان	۳۸۸,۸۰۰	۳۳۸,۱۱۹	+۱۵	۴۷,۳۲۲,۷
صوبے	۲۹۵,۸۲۷	۲۵۶,۸۵۵	+۱۵.۲	۳۷,۰۱۹,۲

مقامات	آبادی سنہ ۱۹۲۱ء	آبادی سنہ ۱۹۳۱ء	کمی و اضافہ فیصدی	خواندگی سنہ ۱۹۳۱ء
۱- مدراس	۴۲،۳۲۲	۴۶،۲۰۵	+۱۱٫۹	۶،۳۲۰٫۹
۲ بمبئی	۲۰،۸۵۸	۱۷ ۹۹۲	+۱۵٫۹	۴،۰۶۷٫۸
۳- بنگال	۴۰،۳۱۴	۵۰،۱۱۶	+۲۰٫۳	۹۰۶۳۰٫۴
۴- صوبہ متحدہ	۵۵،۰۲۱	۴۸،۴۰۹	+۱۳٫۹	۴،۲۵۳٫۵
۔ آگرہ	۴۰،۹۰۶	۳۵،۶۱۴	+۱۵٫۱	۳،۶۳۱٫۸
۔ اودھ	۲۸،۱۱۴	۱۲ ۷۹۵	+۱۰٫۴	۹۲۱٫۵
۵ پنجاب	۲۸ ۴۱۹	۲۳،۵۸۱	+۲۰٫۳	۳،۶۶۵٫۷
۶- بہار	۳۶،۳۴۰	۳۲،۳۷۱	+۱۲٫۳	۳،۳۳۹٫۷
بہار	۲۸،۸۲۴	۳۵،۷۲۹	+۱۲	۲،۶۸۵٫۸
چھوٹا ناگپور	۷،۵۱۶	۹،۶۴۲	+۱۳٫۱	۶۵۳٫۹
۷- صوبہ متوسط و برار	۱۶،۸۲۳	۱۵،۳۲۳	+۹٫۸	۱،۹۰۹٫۷
صوبہ متوسط	۱۳ ۲۲۰	۱۱،۸۸۱	+۱۱٫۳	۱،۳۵۲٫۸
برار	۳،۶۰۲	۳،۴۴۲	+۴٫۹	۵۵۶٫۹
۸ آسام	۱۰،۲۰۵	۸،۶۲۳	+۸٫۲	۱۷۴٫۳
۹- صوبہ سرحد	۳ ۳۸	۲،۴۲۵	+۲۵٫۲	۲۳۳٫۹
۱۰ اڑیسہ	۸ ۷۲۹	۸،۰۲۶	+۸٫۸	۹۴۸٫۲
۱۱- سندھ	۴،۵۳۷	۳ ۸۸۷	+۱۶٫۷	۴۷۳٫۸
۱۲ اجمیر میواڑ	۵۶۴	۵۰۷	۱۵٫۱	۷۹٫۰
۱۳- جزائر انڈمن اور نکوبار	۳۴	۲۹	۱۵٫۵	۶٫۹
جزائر انڈمن	۲۱	۱۹	۱۱٫۸	-

مقامات	آبادی سنہ ۱۹۴۱ء	آبادی سنہ ۱۹۳۱ء	کمی و زیادتی فیصدی	حوامگی سنہ ۱۹۴۱ء
جزائر نکوبار	۱۳	۱۰	+۲۲.۵	—
۱۴۔ بلوچستان	۵۰۲	۴۶۴	+۸.۲	۵۲.۳
۱۵۔ کرگ	۱۶۹	۱۶۳	+۳.۳	۳۴.۶
۱۶۔ دہلی	۹۱۷	۶۳۶	+۴۴.۱	۲۳۵۰.۷
ریاستیں اور ایجنسیاں	۹۲،۹۷۳	۸۱،۳۴۷	+۱۴.۳	۱۰،۳۰۹.۵
۱۷ ریاستہائے آسام	۷۲۵	۶۲۶	+۱۵.۹	۵۷.۴
۱۸۔ ریاستہائے بلوچستان	۳۵۶	۴۰۵	-۱۲.۱	۸.۱
۱۹ ریاست بڑودہ	۲،۸۵۵	۲،۴۴۳	+۱۶.۹	۳۵۶.۸
۲۰۔ ریاستہائے بنگال	۲،۱۴۴	۱،۸۹۳	+۱۴.۱	۱۲۷.۵
۲۱۔ ایجنسی وسط ہند	۷،۵۰۲	۶،۶۳۸	+۱۳.۰	۵۲۵.۴
۲۲۔ ریاستہائے چھتیس گڑھ	۴،۰۵۴	۳،۵۸۴	+۱۳.۲	۱۵۷.۹
۲۳ ریاست کوچین	۱،۴۲۳	۱،۲۰۵	+۱۸.۱	۵۴۱.۱
۲۴۔ ریاستہائے دکن و کولہاپور	۲،۷۸۶	۲،۴۵۸	+۱۳.۴	۲۹۶.۸
۲۵ ریاستہائے گجرات	۱،۴۵۷	۱،۲۶۵	+۱۵.۲	۱۱۹.۲
۲۶ ریاست گوالیار	۴،۰۰۶	۳،۵۲۳	+۱۳.۷	۲۹۹.۸
۲۷ ریاست حیدرآباد	۱۶،۱۸۴	۱۴،۴۳۶	+۱۲.۱	۱،۱۱۱.۲
۲۸ ریاست کشمیر	۴،۰۲۱	۳،۶۴۶	+۱۰.۳	۲۶۴.۲
کشمیر	۳،۹۴۵	۳،۵۸۲	+۱۰.۱	۲۹۳.۰
گلگت اور سرحدی علاقے	۷۶	۶۴	+۱۸.۲	۱.۴
۲۹۔ ریاستہائے مدراس	۴۹۸	۴۵۳	+۱۰.۰	۶۶.۱

مقامات	آبادی ۱۹۲۱ء	آبادی ۱۹۳۱ء	کی اضافہ فیصدی	خواندگی ۱۹۴۱ء
۳۰ ریاست میسور	۷ ۳۲۹	۶۰۵۵۷	+۱۱٫۸	۸۹۶٫۴
۳۱ صوبہ سرحد (ایجنسیاں اور قبائلی علاقے)	۲٫۳۷۸	۲٫۲۵۹	+۵٫۳	۱۹٫۲
۳۲ ریاستہائے اڑیسہ	۳٫ ۲۵	۲٫۶۸۳	+۱۲٫۷	۳۶۸٫۹
۳۳ ریاستہائے پنجاب	۵ ۴۵۹	۴٫۴۹۷	+۲۱٫۴	۳۳۴ ۸
۳۴ کوہستانی ریاستیں (پنجاب)	۱ ۹۴	۹۹۰	+۱ ٫۵	۸۰٫۸
۳۵ راجپوتانہ ایجنسی	۱۳٫۹۷	۱۱٫۵۷۱	+۱۸٫۱	۷۷۲٫۵
۳۶ ریاست سکم	۱۲۲	۱۱۰	+۱۰٫۹	۵٫۹
۳۷ ریاست ٹراونکور	۶٫۰۷۰	۵٫۰۹۶	+۱۹٫۱	۲٫۸۹۳٫۴
۳۸ ریاستہائے صوبہ متحدہ (رامپور، بنارس)	۹۲۸	۸۵۶	+۸٫۴	۵۷٫۶
۳۹ ایجنسی ریاستہائے ہند مغربی	۴ ۹ ۱	۴ ۲۲۲	+۱۲٫۱	۷۱۷٫۲

مدرجہ بالا اعداد وشمار اکثر قطعی اعداد وشمار ہیں سوائے چند ایسے مقامات کے اعداد وشمار کے جہاں شمار کنندگی ہنوز جاری ہے لیکن اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔

خواندگی ۱۹۴۱ء کے اعداد و شمار سر دست شمار کنندوں کی فہرست سے لیے گئے ہیں۔ جنگ کے باعث برطانوی ہند میں خواندگی کے اعداد و شمار سے متعلق گوشوارہ تیار نہیں کیے جائیں گے بعض بڑی ریاستوں میں یہ گوشوارے تیار کرکے ضرور شائع کیے جائیں گے (ف ا ا)

محمد احمد سبزواری ایم اے

روسی وسائل

ان کی پرانی اور نئی جائے وقوع

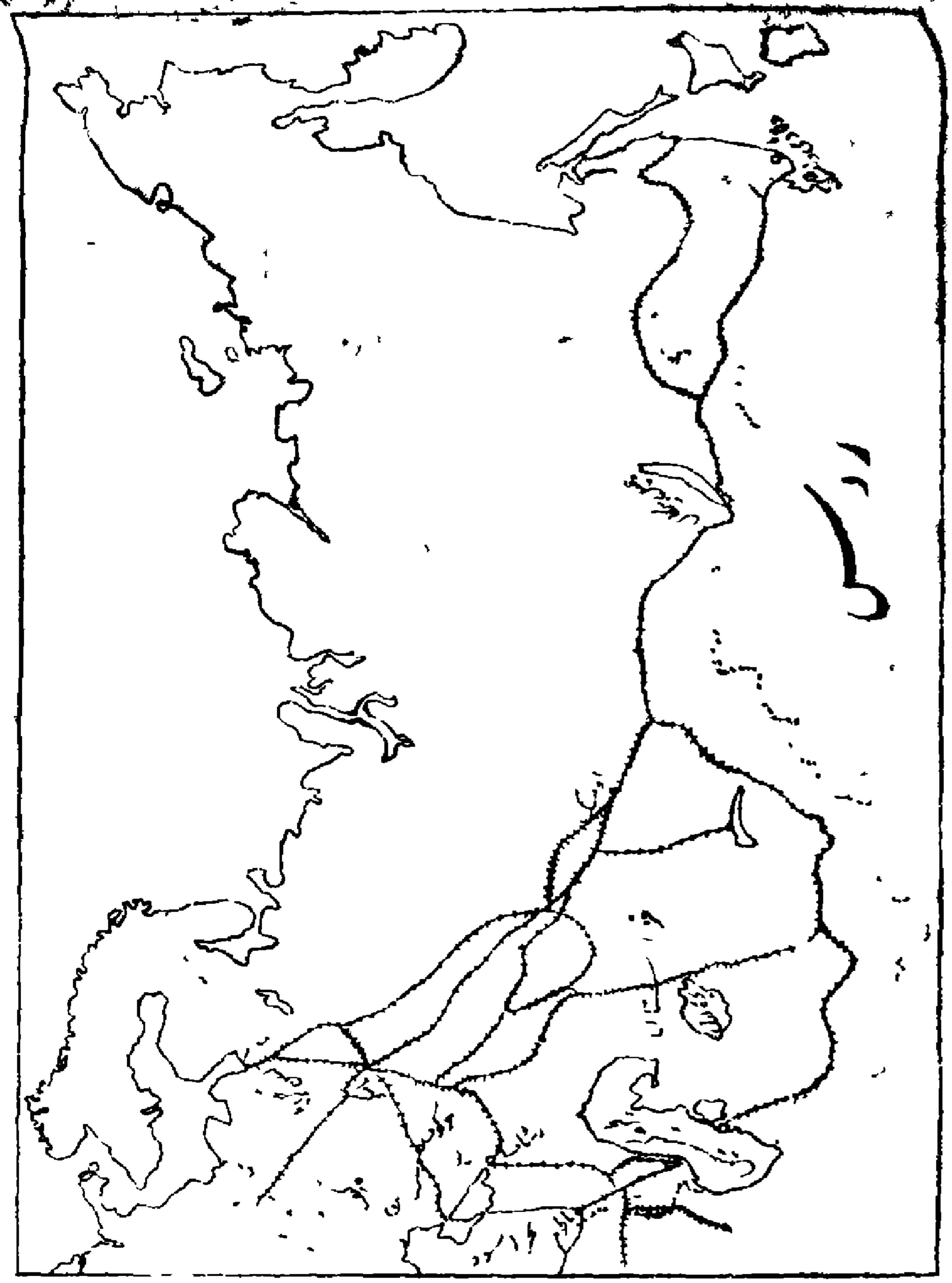
روسی وسائل رصنعت سازی | جرمنی نے روس پر حقیقتاً اس لیے حملہ کیا ہے کہ وہاں کے محکمہ جنگ اور عوام کے لیے اس ملک کے بے پناہ وسائل سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جائے جو بحر بالٹک اور کریمیا سے لیکر بحر الکاہل تک اور جنوبی ایشیا کی کوہستانی سرحد سے چین تک ۸۰،۲۰۷،۵۹،۸ مربع میل کے رقبہ میں پھیلا ہوا ہے۔ درحقیقت اس کے وسائل بہت زیادہ ہیں۔ لوہا سب سے زیادہ پیدا کرنے والے ملکوں میں روس ریاستہائے متحدہ کے درجہ پر ہے اور مینگنیز، گیہوں، چقندر کی شکر، رائی، جو، السی، سن اور جئی کی پیداوار کے لحاظ سے دنیا میں اس کا درجہ اول ہے اور بہت سی ضروریات مہیا کرنے میں بھی اس کا اہم حصہ ہے مگر ہمیں اس کے رقبے کی وسعت اور آبادی کے تناسب کو بھی مدنظر رکھنا چاہیے (اس مضمون کے آخر میں اعداد و شمار دیکھیے) گزشتہ بیس سال تک روس والوں نے ملک کو جو ابھی تک صرف زراعتی رہا تھا موجودہ طرز کا صنعتی اور کاروباری بنانے میں بہت سختیاں سہیں یہ کام دولت کی بربادی اور طویل جنگ، انقلاب اور ۱۹۱۴ء اور ۱۹۲۱ء کے درمیان کی خانہ جنگی کی وجہ سے اور مشکل ہو گیا اس کے علاوہ باہر کا سرمایہ نہیں مل سکا اور نئی صنعتوں کی ترویج اور پرانی صنعتوں کی تنظیم ملک کے استعمال ہی اور جو کچھ بچا کھچا مال باہر بھیجا جا سکتا تھا اس کی بچت سے کی جاتی تھی زراعت کو صنعت سازی میں تبدیل کرنا محض مزدوروں اور کام کرنے والوں کے بدلنے سے ممکن نہیں پھر سرمایہ صنعت و حرفت میں بہت زیادہ صرف ہوتا ہے اور سرمایہ جمع کیے بغیر یہ تبدیلی ممکن نہیں جس پیمانے پر یہ تبدیلی ہوئی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۹۲۶ء اور ۱۹۳۹ء کے درمیان دیہاتی آبادی گھٹ گئی اور شہری آبادی دو سو فی صدی سے زیادہ یعنی دو کروڑ ۶۰ لاکھ اور پانچ کروڑ ۶۰ لاکھ کے درمیان بڑھی پیداوار ۱۹۱۴ء سے ۱۹۲۱ء تک کے زمانے میں بہت گھٹ گئی اے اشیا خوردنی

کے رہ گئے مطابق کا سامان کرنا پڑا اور جو اشیا بنائی گئیں وہ ۱۹۲۱ء سے ۱۹۳۲ء تک چودہ کروڑ سالانہ لاگت سے سترہ کروڑ تک بڑھ گئیں اور انھیں اس صنعت کے لیے بھی مال فراہم کرنا تھا جو جنگ کے بعد مغربی اضلاع میں پھیلی ہوئی تھی اور جسے جنگ اور انقلاب سے بہت نقصان ہوا تھا پھر انھیں مشرق میں بہت سے صنعت ساز مرکز قایم کرنا تھے

یہ واقعات اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ دنیا کے اس بہت بڑے گیہوں پیدا کرنے والے ملک میں ۱۹۳۲ء تک روٹی کے لیے پروانے کیوں دیے جاتے تھے اور یہ بھی کہ وہ چیزیں جو روس میں بہت زیادہ بنائی جاتی تھیں وہ باہر بھیجنے کے لیے بہت کم کیوں بچتی ہیں۔

یہ امر بحث طلب ہے کہ وہ مقصد معین جو روس نے حاصل کرنا چاہا تھا وہ ملک کا بہترین مفاد تھا یا نہیں مگر اس کے بارے میں جو چیز محرک تھی وہ آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے آج کل خود کفالتی کا اصول بادجود وقتوں کے مسلمہ ہو چکا ہے اس ضروری سامان میں جو روس میں باہر سے لایا جاتا ہے بہت سا کچا مال جس میں ربڑ، تانبا، دوسری اہم دھاتیں، مشین اور اس کے پرزے بھی شامل ہیں اور وہ سامان جو برآمد کے لیے کافی مقدار میں بچ رہتا ہے وہ بہ ترتیب قیمت، عمارتی لکڑی گیہوں دوسری اشیا خوردنی (جس میں شکر بھی شامل ہے) تیل، سمور، روئی اور میگنیز ہیں ان میں عمارتی لکڑی سب سے زیادہ اہم ہے نئے کنووں کے کھودنے کے باوجود تیل کم بچنے لگا ہے کیونکہ زراعتی مشینوں، ملوں اور ریل و رسائل میں اس کا بہت خرچ ہے روس کوئلے اور لوہے کے معاملے میں کسی کا محتاج نہیں جن دوسری دھاتوں کی ملک میں ضرورت ہوتی ہے ان میں ۷۰ فی صدی المونیم ۸۰ فی صدی تانبا ۹۹ فی صدی جستہ ۷۷ فی صدی سیسا اور ۲ فی صدی دوسری دھاتیں وہیں مل جاتی ہیں میگنیز زیادہ بچ رہتا ہے ان دھاتوں کی بھی بہت سی کانیں ہیں لیکن انھیں ابھی کھودا نہیں گیا۔

روئی پہلے باہر سے بہت آتی تھی لیکن اب اس کی کاشت روسی وسط ایشیا یعنی روسی ترکستان، آذربائیجان اور کریمیا میں کی جاتی ہے ترکستان میں جب نہریں مکمل ہو جائیں گی تب اس کی کاشت اور بڑھ جائے گی گرم ممالک کی پیداوار مثلاً چائے سرحدی علاقوں سے لائی جاتی ہے عام طور



سے کیمیاوی زہر سے کام لیا جاتا ہو اب ایک مناسب جگہ منتخب کر کے وہاں مشین لگائی جانے والی ہو جس سے اچھا مصنوعی ... تیار کیے جانے کی امید ہو۔ مشینیں بہت زیادہ باہر سے آتی ہیں مگر بہت سی چیزیں تیار بھی کی جاتی ہیں مثلاً ٹرکٹر، زراعتی مشینیں اور موٹریں باہر سے آنا بند ہو گئیں حالانکہ سنہ ۱۹۲۹ء میں باہر کی مشینیں استعمال کرنے والے عاموں نے پانچ لاکھ ٹرکٹر، ۱۲۵۰۰۰ فصل کاٹنے والی مشینیں اور ۲۱۰۰۰ لاریاں استعمال کی گئی تھیں برقی طاقت میں وسیع اضافہ کر کے صنعت سازی کو بہت زیادہ ترقی دی گئی ہو باوجود تمام کوششوں کے اب بھی نصف برقی آلات باہر سے آتے ہیں سنہ ۱۹۳۰ء میں ۵۰ فی صدی ٹربائن باہر سے آتے تھے سنہ ۱۹۳۴ء میں ۹۰ فی صدی روس ہی میں بنائے گئے۔

مگر صنعت و حرفت کی ترقی ہی پر کام ختم نہیں ہو گیا جرمنی کے دوبارہ مسلح ہونے اور یورپ اور مشرق بعید کی سیاسی فضا میں عام ابتری کا تقاضا یہ تھا کہ سوویٹ حکومت کو بھی مسلح کرنے کی زبردست کوشش کی جائے سنہ ۱۹۳۴ء میں مدافعتی کارروائی کے لیے ۱۷ ارب روبل مقرر کیے گئے جو کل اخراجات کا ایک تہائی ہو یہ امید کی جاتی تھی کہ اس خرچ نے داموں کے بیچ مال میں جو قلت عرصے سے چلی آ رہی تھی اسے پورا کیا جا سکے گا مگر جنگ کے لیے سامان میں لگا اور اسے پھر ملتوی کر دینا پڑا۔ اس کے علاوہ مغربی یورپ۔ روس کے اہم حصوں میں صنعت سازی کے اجتماع سے خطرات پیدا ہوتے تھے دوسری طرف مشرق بعید میں لشکر کیلیے سامان رسد بھیجنا ضروری ہو اور اس کی وجہ سے ٹرانس سائبرین ریلوے لائن پر بہت زیادہ خرچ کرنا پڑتا ہو جو ماسکو سے واڈیواسٹک پانچ ہزار میل پھیلی ہوئی ہو۔ ان تمام وجوہ سے فوجی اور جنگی نقطۂ نظر سے یہ لازمی ہو گیا کہ تجارت اور صنعت و حرفت کے اہم مرکز مشرق کی طرف ہٹ کر قایم کیے جائیں تاکہ مغربی یورپ کے بمباروں اور فوجی حملے کی زد سے دور رہ سکیں۔

سنہ ۱۹۳۳ء کے پہلے سے اس پر عمل کیا جانے لگا اور کچا مال جو کچھ بچتا اسے اس میں کھپایا جاتا یہ صنعتی اصلاح روس جیسے وسیع ملک میں جہاں رسل و رسائل کم ہوں خاص طور سے ضروری ہے۔ صنعت و حرفت کے نئے مرکز وہیں قایم کیے گئے جن کے اطراف سے کچا مال آسانی سے حاصل کیا جا سکے صنعت سازی کی مرکزیت قایم رکھنے کی وجہ سے مزدوروں کی اس جگہ فراہمی اور ان کے لیے کھانے اور دیگر سامان کی ضرورت

ہوئی۔ اس صنعت سازی کی ضرورت کے یہ معنی ہوئے کہ مال خریدنے والوں کی ضروریات کو اس قدر نہیں پورا کیا جا سکا جتنی امید کی جاتی تھی اور اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ روزمرہ کی ضروریات کی چیزوں کی بھی کمی پیدا ہو۔

صنعت و حرفت کی جگہوں کی دوبارہ ترتیب بہت پیچیدہ مسئلہ تھا اور اس وقت جبکہ دور دراز فاصلے اور آب و ہوا کے فرق کو مدنظر رکھنا پڑتا ہے۔ ان صفحوں میں نکاسی کی وسعت اور اس کے بڑھنے کے امکانات کی تشریح کو نظر انداز کر دیا گیا ہے محض صنعت ساز علاقوں میں گزشتہ دس پندرہ سال میں جو تبدیلیاں ہوئیں ان سے بحث کی گئی ہے۔

پرانے صنعتی علاقوں میں لینن گراڈ اور اس کے مضافات تھے جہاں انجینیری دھاتوں کے کارخانے کپڑے کی ملیں، چھاپہ سازی اور دوسری صنعتیں تھیں۔ ماسکو اور اس کے اطراف کے اضلاع میں کپڑا بننے کے اہم مرکز؛ خاص طور پر آئیوانوو واسنک پر تھے اور کئی ملکی مشینوں کے کارخانے بھی تھے۔ یوکرین، وادی نیپرا اور وادی ڈونیز کوئلے، لوہے اور پانی سے حاصل کی جانے والی برقی طاقت سے مالامال ہیں اور ابھی تک صنعت سازی کے اہم ترین مرکز ہیں تھے۔ گارکی اور دریائے والگا کے کنارے جو دیگر پرانے مرکز تھے وہ بھی ضمنی حیثیت رکھتے تھے۔ دریائے والگا اور اس کے درمیان کا حصہ جس کا جنوبی حصہ کھدائی کے سلسلے میں تیل کے چشموں کے نکل آنے کی وجہ سے باکوئے ثانی کہلاتا ہے، میں بھی صنعتی مرکز ہیں جنھیں حال میں ترقی دی گئی ہے اور کوزنیز کا علاقہ جو مغربی سائبیریا میں ہے اور جو ٹرانس سائبیرین ریلوے پر واقع ہے اور وسط ایشیا کا کچھ حصہ اور روسی مشرق بعید کے اور تازہ صنعتی علاقے بھی اس ترقی میں شامل ہیں۔ اس ترقی اور بہت سے لوگوں کے نقل مکان کا مطلب یہ تھا کہ روسی قوت کا مرکز مشرق کی طرف بڑھے۔ اس طرزِ عمل سے ایسے ہی اہم نتائج پیدا ہوں گے جو آخری انیسویں صدی میں سائبیریا کے بسانے سے پیدا ہوئے تھے۔

مفصل نقشے میں سارا روس دکھایا گیا ہے اور خاص صنعتی مرکزوں کے نقشے الگ پیش کیے گئے ہیں مختلف علاقوں کی نسبتی صنعتی اہمیت کا اندازہ مندرجہ ذیل اعداد و شمار سے ہو سکتا ہے پہلی مثال برقی قوت کی تقسیم کی ہے۔ لینن نے صنعتی ترقی کے لیے برقی قوت کی فراہمی پر بہت زور دیا تھا بجلی کے بڑے بڑے

بجلی گھر پہلے خاص صنعتی مرکزوں میں بنائے گئے۔ سنہ ۱۹۳۲ء تک مختلف صنعتی علاقوں میں کام دینے والی قوت کی تقسیم کا یہ تناسب تھا

برقی قوت پیدا کرنے والے علاقے	ان علاقوں کی تقسیم فی صدی
ماسکو	۳۱٫۷ فی صدی
لینن گراڈ	۱۶٫۹ "
یوکرین	۳۲٫۲ "
یورال	۱۱٫۸ "
علاقہ قفقاز	۷٫۱ "

کوئلے کی صنعت کا تناسب یہ تھا

۱۹۳۷ء میں کوئلے کی تقسیم

علاقہ	فی صدی	علاقہ	فی صدی
ڈن باس	۶۰٫۳	مشرق بعید	۳٫۷
مغربی سائبیریا	۱۴٫۴	مشرقی سائبیریا	۴٫۰
قزاقستان	۳٫۳	ترکستان	۰٫۷
ماسکو	۶٫۱	قفقاز	۰٫۳
یورال	۶٫۴	دوسرے علاقے	۰٫۸

کوئلہ فراہم کرنے کے نئے علاقے قایم ہو جانے کے باوجود کوئلہ کی کان کا اب تک اوسطاً ۳۴۴ مربع میل تک رقبہ ہو سکا ہے

تیل کے لیے دوسری جگہوں پر نئے علاقے دریافت ہو چکے ہیں۔ مگر ابھی تک علاقہ قفقاز نوے فیصدی تیل فراہم کرتا ہے ۱۹۳۲ء میں فی صدی تناسب یہ تھا۔

تیل اس کی مقدار اور علاقوں کا کل فراہمی میں ۱۹۳۸ء کا تناسب

علاقے	میٹری ہزار ٹن	تناسب فیصدی
آذربائیجان و جارجیا	۲۲،۱۱۹	۷۲٫۸
گروزنی	[illegible]	[illegible]
میکوپ	۲،۱۶۱	۷٫۲
داغستان	۱۰۲	۰٫۳
اِمبا اور اکتیوبنسک	۹۳۹	۳٫۱
سخالین	۷۰۱	۲٫۳
وولگا اور یورال	۱،۲۹۲	۴٫۲
ترکستان (وسط ایشیا)	۶۶۰	۲٫۲
میزان کل	۳۰،۴۰۱	۱۰۰٫۰

توقع کی جاتی تھی کہ ۱۹۴۲ء تک چار کروڑ ساڑھے آٹھ لاکھ ٹن تیل نکالا جا سکے گا جس میں سے وولگا اور یورال کے علاقوں سے ۴۲٫۷ فی صدی نکل سکے گا۔

کچے لوہے، فولاد اور پختہ فولاد کا ۱۹۳۷ء میں یہ تناسب تھا۔

علاقہ	کچا لوہا	فولاد	پختہ فولاد
ال	۱۸	۲۰	۲۱
ب روس (جس میں یوکرین بھی ہے)	۶۳	۵۳	۵۲
ج سائبیریا	۱۰	۹	۹
د روس (ماسکو اور لینن گراڈ کے علاقے)	۸	۱۸	۱۷

گزشتہ دس سالوں میں ان تمام علاقوں میں دھاتیں کثرت سے نکلیں لیکن ان میں سب سے نمایاں اضافہ یورپی روس اور مشرقی سائبیریا کے کزباس کے علاقے نے کیا۔

ان اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ مغربی یورپی روس کے پرانے مرکزوں نے اپنی عظمت برقرار رکھی

ROLLED STEEL ۔ PIG IRON

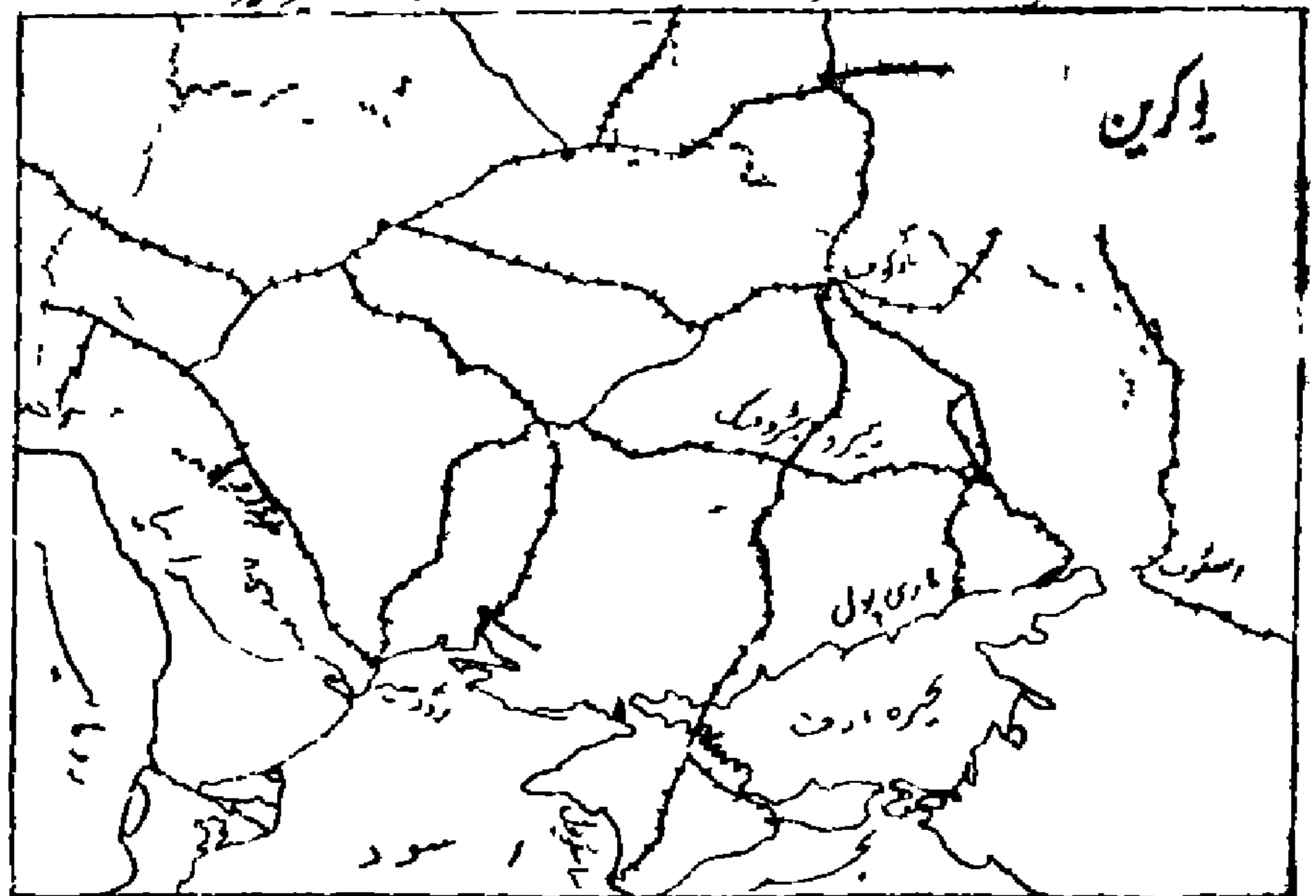
ہو لیکن اب دوسرا نمبر ماسکو سے نو سو میل یورال کے پہاڑوں کا اور اس کے نو سو میل اور دور مشرقی سائبریا کا نووسبرسک کا علاقہ ہو گیا ہے۔ اور مشرق بعید یعنی ولاڈی واسٹک میں بھی روس کے اہم معادن کے تحفظ کے لیے صنعتیں اچھے پیمانے پر قائم ہیں مغربی صنعتی مرکزوں کا نقصان بہت زبردست دھکا پہنچائے گا مگر تب بھی یورال اور سائبریا میں صنعت سازی کے کافی مرکز باقی رہ جاتے ہیں۔

۴ پرانے صنعتی مرکز:- گو مشرق کی طرف ہٹ کر اہم صنعتی مرکز قائم کرنے کی کوششیں کامیاب ہو چکی ہیں لیکن مال تیار کرنے اور صنعت سازی میں اب بھی مغربی یورپی روس کے پرانے مرکز بڑھے ہوئے ہیں یورال اور سائبریا میں بڑے بڑے شہر آباد دیکھے جا چکے ہیں پھر بھی روس میں کوئی شہر ماسکو (۴۰ لاکھ) لینن گراڈ (۳ لاکھ) اور خارکوف کا مقابلہ نہیں کر سکتا مشینیں بنانے میں ان کا درجہ اول ہے اور ٹارک دنیں اوزار بنانے کی تو یہی جگہیں ہیں۔ ماسکو زرعی مشینوں، اوزاروں اور وسیع پیمانے پر موٹریں بنانے کا خاص مرکز ہے۔ اس کے علاوہ وہاں کپڑا بنانے اور عوام کے لیے دیگر سامان بنانے کا کام بھی بہت سے کارخانے کر رہے ہیں لینن گراڈ میں جہاز سازی ہوتی ہے عام انجینیری کی مشینیں بنائی جاتی ہیں اور ربڑ بنانے کے بھی کارخانے ہیں ٹولا جس کی آبادی ۳۴۲،۰۰۰ ہے سامان جنگ اور انجینیری کی مشینیں بنانے کا پرانا مرکز ہے۔ خارکوف میں کئی طرح کی بھاری مشینیں بنانے کے کارخانے ہیں۔

ان جگہوں پر بے حد مزدور ان صنعتوں سے واقف اور پرانے کار آزمودہ ہیں اس بات کی کوئی اطلاع نہیں ملی کہ روس کا سامان جنگ ان جگہوں سے کس قدر مہیا ہوتا تھا مگر خیال ہے کہ کافی سامان فراہم کیا جاتا ہوگا۔

مغربی یورپی روس میں دوسرا اہم صنعتی علاقہ یوکرینی سوویٹ اشتراکی جمہوریہ ۱ ہے دو سال ہوئے جب جنوبی بوکووینا اور پولش یوکرین اس میں شامل کر دیے گئے تھے اور ملداویا اس سے علیحدہ کر دیا گیا تھا اس سے اس کا رقبہ ۲۳۷،۴۷۱ مربع میل اور آبادی تین کروڑ ایک لاکھ ہو گئی تھی اس طرح یہ علاقہ گو سارے روس کے رقبہ کا ۲ فی صدی تھا مگر اس کی آبادی کا تناسب ۱۸٫۲ فی صدی تھا اس کی زراعتی زمین جو سیاہ مٹی والے علاقے سے تعلق رکھتی تھی سارے زراعتی رقبے کا ۱۷٫۸ فی صدی تھی یوکرین کے چار بڑے شہر

کیوے اور خارکوف (۸,۰۰۰,۰۰۰ سے زیادہ آبادی) اوڈیسہ (۶۰۰,۰۰۰) اور نیپرو پیٹروسک (۵۰۰,۰۰۰) روس



کے بڑے بڑے گیارہ شہروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ روسٹوف آن ڈون جو اس علاقہ کے باہر کنارے پر واقع ہے ابھی تک صنعتی مشینیں خوب پیدا کرتا رہا ہے۔ اس علاقے کا سارے روس کی پیداوار کا ۱۹۴۰ء میں یہ تناسب تھا۔

سارے روس کی پیداوار میں یوکرین کا تناسب فی صدی

کوئلہ	(۱۹۳۸) ۶۰/۰	زراعتی مشینیں	۷۰/۰
کچا لوہا	۶۱/۲	مینگنیز	۳۴/۹
پکا لوہا	۴۳/	المونیم	۰۲/۱
رولڈ دھاتیں	۴۷/۸	مشین سازی	۲۰/۰
شکر	۶۸/۰	رنگ	۳۳/۰
غلہ	(۱۹۳۸) ۲۲/۷	سپرفاسفیٹ	۴۰/۰
سورج مکھی کے بیج	۲/	سوڈا	۸۰/۰

جب مشرق کی طرف اور مرکز قایم کیے جائیں گے تب یہ تناسب کچھ کم ہو جائے گا۔ دریائے نیپر کے مغرب میں کریوائی راگ اضلاع کی لوہے کی کانیں ہیں نیکوپول میں مینگنیز کے ذخیرے اور اوڈیسا نیکولیین اور خیرسن کی بندرگاہیں اور ہوائی جہاز بنانے کے مرکز ہیں دریائے نیپر کے کنارے دھاتوں کا سامان بنانے والے تین ہریپروپٹروسک، نیپروپٹروسک اور زاپوروزہے ہیں آخرالذکر میں فولاد کا کام ہوتا ہے۔ اس دریا کے مشرقی کنارے پر ڈونباس کی کوئلے کی کانیں ہیں جہاں بہت سے صنعتی مرکز ہیں جن میں خارکوف جہاں ٹریکٹر ٹربائن وغیرہ ملتے ہیں، روس کی بھاری مشینیں بنانے والا خاص مرکز ہے۔ بحیرہ آزوف کے کنارے ماریوپول اہم بندرگاہ ہے۔ ان متذکرہ بالا مرکزوں کے علاوہ بہت سی چھوٹی جگہیں بھی ایسی ہیں جہاں مخصوص چیزوں کے کارخانے ہیں۔ اس علاقے میں دریائے نیپر کے کنارے کنارے نیپراسٹرائی کے بہت بڑے بجلی گھر سے برقی قوت حاصل کی جاتی ہے۔ اور نلوں کا ایک سلسلہ روستوف آن ڈان سے گزرتا ہوا اسے قفقاز کے تیل کے چشموں سے ملاتا ہے۔

یوکرین کو جو زراعتی اور بھاری صنعتی کاروبار کے قدرتی ذرایع حاصل ہیں وہ روس میں شاید سب سے زیادہ ہیں اور علاوہ اس بات کا کوئی اندیشہ نہیں کہ اس کی اصلیت قایم نہ رہے گی سوائے کسینز کی وادی کے جو بہت دور واقع ہے ایسا اچھا کوئلہ کہیں نہیں پایا جاتا یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہاں تیل کے چشمے بھی ہیں لیکن ابھی تک وہاں ایک ہی کنویں سے کام لیا جا رہا ہے لیکن یہ گزشتہ جنگ عظیم اور حالیہ جنگ میں میدان کارزار رہ چکا ہے۔ اور اسی وجہ سے موجودہ ہوائی لڑائی کے زمانے میں دشمنوں نے فی الحال اس پر قبضہ کر رکھا ہے۔ جیسا کہ ذیل میں دیے ہوئے فاصلوں سے ظاہر ہوگا۔

کانسٹینزا یا بکارسٹ سے دناس تک — ۵۰۰-۶۰۰ میل

رومانوی سرحد سے کیف — ۲۰۰ "

کانسٹینزا سے اوڈیسا — ۲۰۰ "

جنوب کے علاقے میں جو گیہوں جاڑوں میں بویا جاتا ہے اس کی فصل جون کے آخر میں کٹتی ہے اور شمال میں جولائی کے درمیان۔

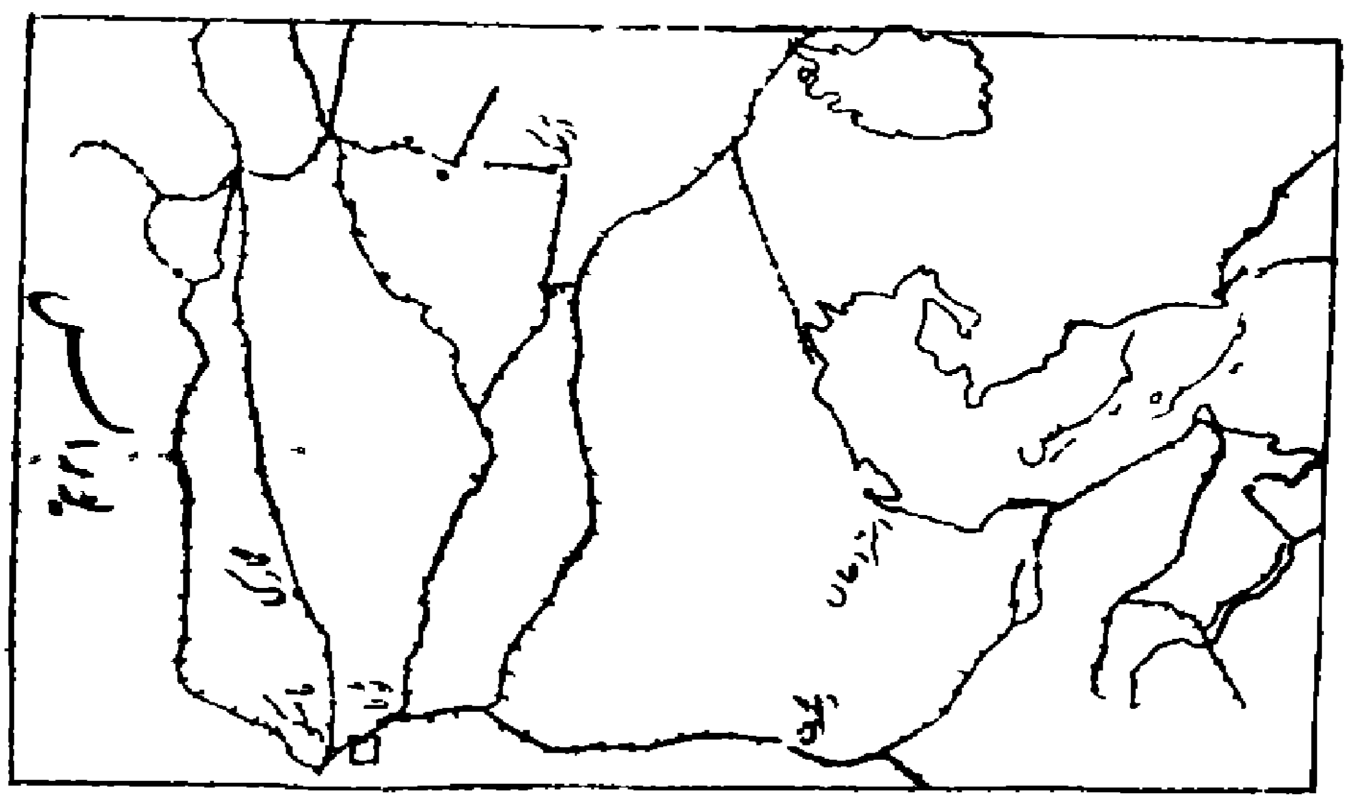
۴ - صنعتی علاقے یورال۔ روس کی صنعتی پالیسی کا خاص مقصد یہ رہا ہے کہ مقامی طور پر کچا مال فراہم کر کے ملک کے معدنی ذخیرہ کا جو تقاضی ہے، یورالس کے علاقوں میں بھاری صنعتوں کے مرکزوں کو ترقی دی جائے [illegible] سورڈلوسک، چلیابنسک، چکالوف اور کاشغر کے صوبے شامل ہیں ۱۹۱۳ء میں کچھ معدنیات [illegible] کو اس علاقہ میں محض زراعت ہوتی تھی آج کل ترقی قوت پیدا کرنے میں ماسکو لینن گراڈ اور یوکرین کے بعد اس کا چوتھا درجہ ہے۔ یوکرین اور سائبیریا کے بعد تیسرا نمبر کوئلے نکالنے میں اور ماسکو گروزنی اور میکوپ کے بعد چوتھا درجہ تیل نکالنے میں۔ میگنیٹو گارسک اور تارسک ہلیوٹ میں لوہا اور کیزل میں کوئلہ نزگلیار کا میں تانبا اور سونا، تارسک میں نکل اور کرومیم، اسٹرمیں تیل، سولیکمسک میں پوٹاش کے خاص ذخیرے ہیں یہاں ترقی کی راہ میں اچھا کوئلہ نہ ملنے کی بڑی رکاوٹ رہی ہے۔ چالیس لاکھ ٹن کوئلہ کزنیز اور کاراگنڈا سے لایا جاتا ہے اور اسے بہت راستہ طے کرنا پڑتا ہے ابھی تک تیل کی بیشتر مقدار قفقاز سے لائی جاتی ہے میگنیٹو گارسک سے چلیابنسک ہوتی ہوئی سورڈلوسک تک ریل بن گئی ہے اس طرح دو خاص لائنیں شمال سے جنوب تک مل گئی ہیں۔ اور اس علاقہ کا اور فروغ ہو سکا ہے۔

۱۹۳۹ء میں خاص صنعتی مرکز مع اپنی آبادی کے میگنیٹو گارسک (۱۴۵،۸۷۰) سورڈلوسک ۴۲۵۵۴۴ اوفا (۲۴۵،۸۶۳) نزنی تاگیل (۱۵۹،۸۶۴) چلیابنسک (، ۲۷۳) ہلیوٹ اور ریوڈا ہے۔

روس میں میگنیٹو گارسک میں لوہے اور فولاد کے بہت بڑے بڑے کارخانے ہیں اور بھاری مشینوں کا کام بہت تنوعات کے ساتھ ہوتا ہے۔ زراعتی مشینیں زیادہ تر چلیابنسک میں بنائی جاتی ہیں جون ۱۹۳۰ء میں نزنی تاگیل میں دھات کے کام کا بہت بڑا کارخانہ کھول دیا گیا تھا یہ کہا جاتا تھا کہ کام کرنے والے حصے میں ، ۶۳۵ ٹن سالانہ کی صلاحیت ہے اور جب یہ کارخانہ مکمل ہو جائے گا تو تقریباً بیس لاکھ ٹن پٹا ہوا لوہا اور پندرہ لاکھ ٹن پختہ لوہا نکالا جا سکے گا اور سورڈلوسک اور دوسری جگہوں اور موٹر اور انجینیری کے کارخانے کو کچا لوہا دے سکے گا یہ کارخانہ لوہے کی کانوں میں واقع ہے اور وادی کزبز جو سوسیل ہے اس کے اور مقامی کیزل کے کوئلہ کو ملا کر جلایا جاتا ہے اطراف کے اعلیٰ ذخیروں کو کام میں لانے کے لیے ہلیوٹ میں ایک دوسرا فولاد کا کارخانہ اس علاقے کے جنوبی حصے میں کھولنے کا ارادہ کیا جا رہا ہے۔ سورڈلوسک کے قریب

ریوڈا کے تابا صاف کرنے والے کارخانے نے ۱۹۴۰ء میں کام شروع کر دیا تیل کے ذخیرے مشرق
تفقاز کے باہر سمجھے جاتے ہیں یہ کہا جاتا ہے کہ تیل کا علاقہ یورال سے والگا تک اور شمال میں ڈیچورا کی
وادی سے کاما کی وادی اور والگا کے کنارے شہر سراں اور والگا کے پار شمالی قزاقستان کے جنگلات
تک پھیلا ہوا ہے۔ پانچ صد سال کی کھدائی کے لیے بھی مشکلات کے باعث اس علاقے سے ۱۹۳۹ء میں
صرف ۰۰ لاکھ ٹن تیل نکالا جا سکا ہیں کے اہم حصے جو کام دے رہے ہیں وہ آشیمبوف میں ہیں ان چشموں
سے نلوں کے ذریعہ تیل اوفا بھیجا جاتا ہے جہاں موجودہ اصولوں پر اسے صاف کرنے کی مشین ہے۔ سنزان
میں بھی صاف کرنے کی مشین موجود ہے کی شیف (شمارا) اور پرم کے اطراف میں تین (کراسوکمک، سیورڈلگ
اور پلازنا) اصلاع ہیں جہاں اس کام کو فروغ دیا جا رہا ہے یہاں کا تیل سراٹوف میں صاف کیا جاتا ہے
یوگور و سلان و صوبہ چکالوف میں واقع ہوا ہے آخرالذکر بہت ہی زرخیز کہا جاتا ہے کروڈ آئل میں گندھک ملا ہوتا
ہے اور تیل صاف کرنے کی مشینوں سے جو کچھ بچتا ہے اسے کھاد کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے وہاں پوٹاش
سوڈیم سلفیٹ اور فاسفوریٹس کا بھی کافی ذخیرہ ہے اور کیمیاوی صنعتوں کے لیے کافی کچا مال ملتا ہے تیل
صاف کرنے والے کارخانوں کے اطراف میں کیمیاوی کارخانے بھی قایم کیے جانے والے ہیں

آخر میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس تمام وسیع ترقی کے باوجود یہ علاقہ کچھ عرصے تک پرانے صنعتی مرکزوں
کا محتاج رہے گا جس میں ماسکو اور لینن گراڈ خاص طور سے قابل ذکر ہیں اور جہاں خاص مشینوں اور اوزار



بنانے والے بحرہ کارستری بستے ہیں گو اب کچھ اوزار یورالس کے علاقے میں بھی بس گئے ہیں۔

سنہ ۱۹۳۹ء کی مردم شماری سے ظاہر ہوتا ہے کہ تعقار کی آبادی سنہ ۱۹۲۶ء میں ۵۵ لاکھ تھی اور سنہ ۱۹۳۹ء میں اس میں ۲۵ لاکھ کا اضافہ ہوا اور یہ ۸۰ لاکھ ہو گئی گویا اور علاقوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ اضافہ نہیں مگر اس سے صنعتی کاروبار میں کافی ترقی ظاہر ہوتی ہے۔

بحر کیسپین کے بندرگاہ باکو سے سب سے زیادہ مال لادا جاتا ہے اور دوسری بندرگاہوں کے مقابلہ میں اب اس کی اہمیت اور زیادہ بڑھ جائے گی کیونکہ بحر اسود خطرے کے علاقے میں ہے باکو سے کھماچ کیل اور استراخان کو خام تیل لے جاتے ہیں۔ آذربائیجان اب تک صرف روس کا اسی فیصدی تیل ہی نہیں فراہم کرتا رہا بلکہ یہ تیل صاف کرنے کا اہم مرکز بھی ہے اور اس کا فضلہ کیمیائی صنعتوں کے کام آتا ہے جارجیا کی تیل کے چشموں میں دو رکے اضلاع میں چار چھوٹے علاقے ہیں زیادہ اہمیت باطوم کے تیل صاف کرنے کے کارخانوں کی ہے جن میں کچھ عرصے پہلے توسیع کی جا چکی ہے۔ تیل کے علاوہ چیاتوری سے مینگنیز اور آرمینیا سے تانبا ابھی تک حاصل کیا جاتا ہے دوسرے معدنیات پہاڑوں میں ہیں جس میں پارہ اور ٹنگسٹن (ایک دھات) اہم ہیں وہ ابھی تک پوری طرح نہیں کھودے گئے البتہ سنکھیا نکالا جاتا ہے اور سنہ ۱۹۴۱ء میں نالچک سے پچاس میل کے فاصلہ پر مولبڈنم (ایک دھات کا نام) کا کارخانہ کھولا گیا ہے۔ تعقار کی پرانی صنعتوں میں جارجیا میں ریشم کا کام جنگ کے لیے زوروں پر ہو رہا ہے ہوائی چھتریاں وغیرہ بنائی جاتی ہیں چائے بھی زیادہ مقدار میں پیدا کی جا رہی ہے۔ سیون جھیل کے پانی کو کام میں لا کر بجلی پیدا کی جاتی ہے اور آرمینی صنعتوں کو مدد دی جا رہی ہے۔ آرمینیا میں ایک قسم کا پتھر بھی ملتا ہے جس سے ایریوان میں کیمیائی ربڑ بنائی جاتی ہے۔ یہ تیار شدہ مال لینن گراڈ کے ربڑ کے کارخانے میں کام میں لایا جاتا ہے ڈیوالف میں سیمنٹ بھی بنایا جاتا ہے۔

مغربی سائبیریا میں کراس اور قزاقستان | دریائے ادبی کی وادی میں دونبہ سنگ کے قریب کرپیرتے کوئلے کے علاقے کو حال ہی میں خاص ترقی دی گئی ہے۔ یہ زرخیز علاقہ ایندھن اور ریلوں کے کوئلے کی کئی قسمیں اور مغربی سائبیریا، علاقہ یورالس اور مشرق بعید کی صنعتوں کے لیے کوئلہ مہیا کرتا ہے۔ یوکرین کی کانوں کے بعد

اسی کو سب سے زیادہ اہمیت ہو اطراف میں لوہے کے ذخیروں سے پورے طور پر کام لیا جاتا ہو لیکن مقامی صنعتوں کی ضروریات کے لیے کچا لوہا باہر سے بھی لایا جاتا ہو اس علاقے میں بھاری صنعتوں کا بہت بڑا مرکز قایم کرنے کا ارادہ رہا ہو۔ کیونکہ یہاں ہوائی حملوں کا امکان نہیں۔ اس علاقے کے گاؤں بڑے بڑے صنعتی مرکز بن گئے ہیں اور نئے نئے شہر آباد ہو گئے ہیں۔ کوئلے کی کانوں کے قریب کے کارخانے وسط ایشیا کی دوسری دھاتوں کو افراط سے کام میں لا سکتے ہیں۔ اس درمیان میں علاقہ کزاس کے خاص شہروں نے جو ترقی کی وہ یہاں کے کاروبار کی اچھی مثال ہو۔

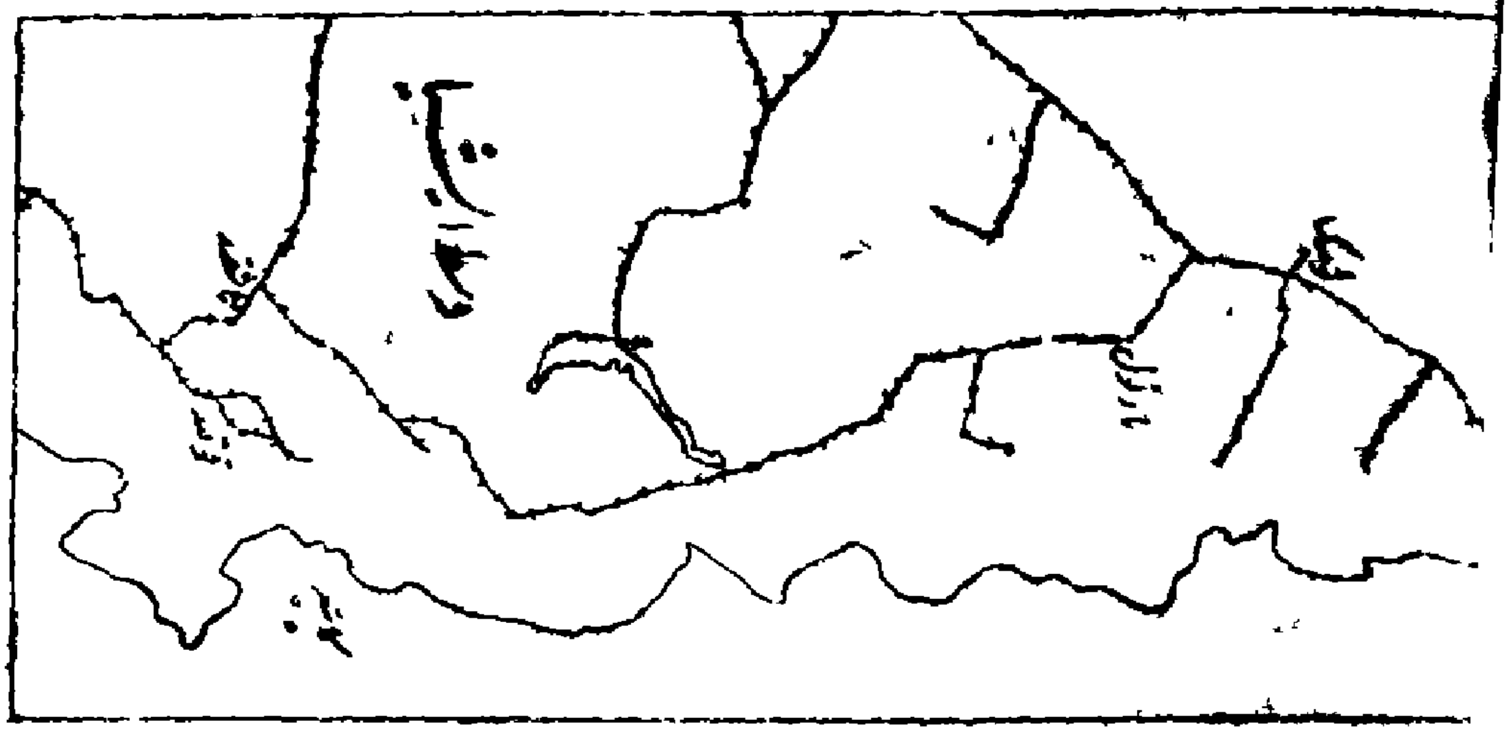
صنعتی شہروں کی ترقی آبادی

شہر	سنہ۱۹۲۶ء	سنہ۱۹۳۹ء
توسرک	۱۲۰،۱۲۸	۴۰۵،۵۸۹
کیمیروف	۲۱،۶۲۲	۱۳۲،۹۷۸
سٹبل سک	۳۸۹۴	۱۶۹،۵۳۸

برنال میں کپڑا بنا جاتا ہو اور اسکا منوگارسک میں نیاتا با صاف کیا جاتا ہو قزاقستان کے مشرقی اضلاع میں نے صنعتی علاقہ کو فروغ دیا جا رہا ہو گا راگنڈا کی کوئلے کی کانوں پر یہ صنعتی سرگرمی ہو دس سال پہلے اس کی پیداوار ۹۰ ٹن تھی مگر سنہ۱۹۳۴ء میں ان سے ۲،۳۰،۰۰۰ ٹن کوئلہ نکالا گیا۔ سنہ۱۹۲۶ء میں کاراگنڈا کا شہر تھا ہی نہیں اور سنہ۱۹۳۹ء میں اس کی آبادی ۱۶۵،۹۳۷ تھی سارے قزاقستان میں جس کا بیشتر حصہ ابھی تک صحرائی ہو صنعتی مال نصف سے زیادہ بنایا جاتا ہو لوہے کے علاوہ دوسری دھاتوں کی صنعت میں خاص ترقی کی گئی ہو۔ لاپرواہی، بدانتظامی اور غیر مہذب مقامی مزدوروں کے باوجود مال بہت زیادہ بنایا جاتا ہو۔

چمکنٹ میں جس کی آبادی ۷۴،۱۸۵ ہو۔ سیسے اور جستے کے کارخانے ہیں یہ یونین کے مال کا ۶۰ فی صدی بناتا ہو۔ اور رڈر کا مختلف دھاتوں کا کارخانہ سیسے کے سامان ۲۲ فی صدی فراہم کرتا ہو بہت سی نادر دھاتوں کے ذخیروں کے لیے کہا جاتا ہو کہ موجود ہیں مگر امی سوائے اومسک میں دو لعرام دھات کے اور

کوئی کمزوری نہیں کی گئی چمکنت، پڈرا کار اگنڈا اور بلکا شل اہم مرکز ہیں جہاں موجودہ طرز کے بڑے بڑے کارخانے کھولے گئے ہیں اور یوکرین وسط روس اور یورپی روس کے دوسرے حصوں سے تربیت یافتہ مزدوروں کے جتھے یہاں کام میں مدد لی گئی ہے۔



سویٹ وسط ایشیا | اس میں ترکستان، ازبکستان، قزاقستان جو علیحدہ خود مختار ریپبلک شامل ہیں پہلے اس علاقے میں ابتدائی اصولوں پر تجارت ہوتی تھی اور خانہ بدوش مویشی پالتے اور ان کی پرورش کرتے تھے مگر گزشتہ پندرہ برس میں یہاں بڑے پیمانہ پر صنعتوں کے لیے کاشت کی جانے لگی خاص طور پر روئی کی کاشت ہوتی ہے اور صنعتی فروغ کی کوشش کی جا رہی ہے آبادی محض تاتار، ترکمان اور منگول نسل کی ہے یہ سنہ ۱۹۲۰ء میں ایک کروڑ تیس لاکھ سے بڑھ کر سنہ ۱۹۳۹ء میں ایک کروڑ ساٹھ لاکھ ہو گئی۔ ازبکستان تمام یہاں کی آبادی دس لاکھ بڑھی مگر خاص اضافہ شہروں میں ہوا تاشقند کے تاریخی شہر کی موجودہ آبادی ۵۰۰ ہے اور سمرقند و بخارا، خوقند میں موجودہ طرز کے وسیع محلے بسائے گئے ہیں۔ اس علاقے میں پانچ ہزار والٹ کی بجلی گھر، کپڑے کی ملیں اور دوسرے کارخانے ہیں محکمہ آب پاشی کی وجہ سے سنہ ۱۹۲۰ء سے سنہ ۱۹۳۰ء تک روئی کی کاشت دگنی ہو گئی کچھ روئی تو اسی جگہ پر فرغانہ، ترکستان، عشق آباد، ترکمانستان کے نئے قائم کردہ کارخانوں میں بنتے اور کاتنے میں استعمال کی جاتی ہے۔ اس علاقے میں تیل، کوئلے، لوہے

مولب ڈنم اور دوسری دھاتیں پائی جاتی ہیں لیکن ان معدنیات کی وسیع پیمانے پر کھدائی ابھی شروع ہی کی گئی ہے ترکمانستان میں نبٹ ڈاگ میں تیل کے نئے چشمے کھودے جا رہے ہیں۔

مشرق بعید اروسی مشرق بعید میں صوبہ پیرمنایم اور خابر دوسک کے علاقے ہیں جس میں آمور کھیکا، آمورسیمی سخالین اور خابر دوسک کے صوبے شامل ہیں روس کو یہ خطرہ ہے کہ اسے مشرق بعید کو جاپان سے بچانا پڑے گا اسی وجہ سے وہ اس علاقے میں صنعتوں کو بڑھا کر آبادی اور وسائل میں اضافہ کر رہا ہے۔ تاکہ وہاں لڑنے والی فوجیں صرف اسی رسد کی محتاج نہ رہیں جو ٹرانس سائبیرین ریلوے پر لائی جاتی ہیں گو وہاں دوہری ریل بچھا دی گئی ہے لیکن فوجوں کے لیے ریلیں اتنی دور ماسکو سے جو ۵ میل ہے یا یورال سے بھی جو ۴ میل ہے سامان پہنچانے کی صورت برداشت نہیں کر سکتیں۔ یہاں کھانے کا سامان بھی کافی نہیں کیونکہ غلہ کم پیدا ہوتا ہے۔ اور ان سالوں میں مویشیوں میں بھی کوئی اضافہ نہیں ہوا اس لیے سامان صوفی سائبریا سے بھیجا پڑے گا۔ صنعتوں کو ترقی دینے کے منصوبوں کو بہت تاخیر سے عمل میں لایا جا رہا ہے ولاڈی واسٹک کے مشرق میں لاسس اسوچن۔ کی کانیں اچھے کوئلہ کا خاص وسیلہ ہیں، بورئیا کی وسیع بوریے رنگ کے کوئلے کی کانوں سے کوئلہ نکالنے میں بہت کم ترقی کی گئی ہے کچا لوہا زیادہ نہیں پایا جاتا مگر نکولیوسک اور لٹل ہنگان میں اس کے ذخیرے موجود ہیں۔ اس درمیان میں خابر دوسک کے موجودہ اور کمسومولسک کے بھاری کام کے نئے کارخانوں کے لیے لوہا اور فولاد مشرقی سائبریا اور یورال سے لایا جاتا ہے۔ آنستراں میں فولاد اور لوہے کا ایک وسیع کارخانہ قایم کیا جا رہا ہے لیکن مغرب سے ضروری سامان نہ ملنے کی وجہ سے کافی دیر ہو رہی ہے۔

ولاڈی واسٹک کے شمال میں ٹیٹوگ میں جستے کی کانیں کھودی گئی ہیں اور سچوتا ایلن پہاڑ کی چاندی اور سیسے اور اس جستے کو کام میں لانے کے لیے ایک انجمن بنا دی گئی ہے تعمیر کے لیے پتھر اور عمارتی لکڑی بہت ہے اور یسوری ریلوے پر واقع اسپاسک میں سیمنٹ فیکٹری کھولی گئی ہے تیل کی جو ضرورت پڑتی ہے وہ امریکہ سے ولاڈی واسٹک کے ذریعے سے لایا جاتا ہے گو سنہ ۱۹۳۲ء میں سخالین میں ۳۶۰ ٹن تیل نکالا تھا روسی مشرق بعید میں ٹین، مولب ڈنم اور ٹنگسٹن کے قیمتی ذخیرے بھی ہیں جنہیں ابھی کھودا نہیں گیا ہے۔

۴ روس کی پیداوار صنعتوں اور معدنیات کی مجموعی کیفیت | اس فہرست سے ظاہر ہوگا کہ ۱۹۳۸ء یا اکثر جگہ ۱۹۳۹ء میں ساری دنیا کی پیداوار صنعتوں اور معدنیات میں روس کا فیصدی کیا تناسب رہا ہے اور دوسرے ممالک میں اسکا درجہ کیا ہے

معدنیات

اشیا	نکاسی میٹری ٹن	ساری دنیا میں تناسب	درجہ
پٹرولیم (۱۹۳۹)	۲۹,۵۳۰۰۰	۱۰٫۹	دوسرا
کوئلہ	۱۳۲,۸۸۸,۰۰۰	۱۰٫۹	چوتھا
کچا لوہا	۱۴ ۹۰۰,۰۰۰	۱۹٫۵	پہلا (امریکہ کے ساتھ)
باکسائٹ، کچا	۲۵۰,۰۰	۹٫۱	آٹھواں
کروم (۱۹۳۷)	۹۰۰	۱۶٫۳	تیسرا
تانبا	۹۸,۰۰۰	۴٫۸	چھٹا
سونا	——	۱۲٫۵	تیسرا
سیسا	۹۹ ۰	۳٫۹	آٹھواں
مینگنیز	۱,۵۰۰,۰۰۰	۴۱٫۳	پہلا
پارہ (۱۹۳۳)	۲۶۸,۰۰	۵٫۲	پانچواں
نکل	۲,۵۰۰	۲٫۳	تیسرا
جستہ	۷۰۰	۳٫۷	ساتواں
اسبسٹوس (۱۹۳۶)	۱۲۵۰۰	——	——
فاسفیٹ	۲,۰۳۳,۰۰۰	۱۵٫۸	دوسرا
پوٹاش	۱۲۲,۰۰۰	۴٫۱	چوتھا

بُننے کا سامان

اشیا	نکاسی میٹری ٹن	ساری دنیا میں تناسب	درجہ
روئی (۱۹۳۹)	۸۸۰,۰۰۰	۱۳٫۵	تیسرا
کتان (۱۹۳۹)	۹۳۳,۰۰۰	۶۸٫۰	پہلا

اشیاء	نکاسی (میٹرک ٹن)	ساری دنیا میں تناسب	درجہ
سن (۱۹۳۹)	۱۱۰,۰۰۰	۲۹٫۳	پہلا
ریشم (خام)	۱,۸۰۰	۳٫۶	چوتھا
اون	۱۳۷,۰۰۰	۷٫۶	پانچواں
تیل نکالنے والی اشیاء			
بنولا (۱۹۳۹)	۱,۹۰۰,۰۰۰	۱۳٫۵	تیسرا
السی	۷۵۰,۰۰۰	۲۳٫۱	دوسرا
تل	۹,۰۰۰	۱٫۴	آٹھواں
سویا کی پھلیاں (۱۹۳۷)	۱۰۰,۰۰	۱٫۳	چھٹا
غلہ اور دیگر سامان خوردنی			
جو	۸,۲۰۰,۰۰۰	۱۹٫۲	پہلا
کمن	۱۹۸,۰۰۰	—	—
جوار	۲,۶۹۰,۰۰۰	۲٫۳	چھٹا (ہنگری کے ساتھ)
گوشت	۲,۳۰۳,۰۰۰	—	—
جئی	۱۶,۹۹۰,۰۰۰	۲۵٫۲	پہلا
رائی	۲۰,۹۳۰,۰۰۰	۴۳٫۴	پہلا
موٹا چاول	۳۱۷,۰۰۰	٫۳	اکیسواں
چائے (۱۹۳۹)	۱۱,۰۰۰	۱٫۸	ساتواں (چین کو نکال کر)
شکر (چقندر کی-۱۹۳۹)	۲,۴۰۰,۰۰۰	۲۳٫۰	پہلا
تمباکو (۱۹۳۶)	۲۷۶,۰۰۰	۱۱٫۹	تیسرا
گیہوں	۴۰,۸۸۰,۰۰۰	۲۵٫۰	پہلا

(مترجم ش-ا-ک)

جاپان کی اقتصادی کمزوری اور قوت

معاشی طاقت کے ذرائع | بڑی طاقتوں میں جاپان کا شمار ابھی حال ہی میں ہوا اور وہ اپنی طاقت کے اقتصادی منابع کے اعتبار سے سوائے اطالیہ کے سب سے پیچھے ہے یا یوں سمجھیے کہ موجودہ جنگ کے شروع میں تھا۔
البتہ یہ صحیح ہے کہ بلحاظ آبادی وہ اقوام عالم میں ممتاز ہے ۳، لاکھ لوگ جاپان خاص میں ۳۱۰ لاکھ رعایا کوریا، فارموسا، کوانٹنگ اور سکھالین میں ہے مزید براں ۲۹ لاکھ کی آبادی منچوریا اور حصول میں علاوہ چین کے متعدد حصوں کی آبادی کے کم و بیش اس کے زیر نگیں ہے اس کی قومی آمدنی صرف جاپان خاص کی برطانیہ کی قومی آمدنی کے نصف سے کسی قدر کم ہے اور اس لیے وہ بحیثیت مال برآمد کرنے والے اور تاجر کے ریاستہائے متحدہ، برطانیہ، جرمنی اور فرانس سے خاصا پیچھے ہے مزید براں چونکہ اس کی فی الاصل آمدنی کسی بڑی قوت والے ملک کے لحاظ سے بہت ہی کم ہے لہذا اس کی مجموعی پیداوار کی طاقت کا تناسب آبادی کی ضروریات پورا کرنے کے بعد جنگ جیسے مقاصد کے لیے نسبتاً بہت کم رہ جاتا ہے۔
اب سوال یہ ہے کہ پھر جاپان کی بڑائی کا انحصار کس چیز پر ہے اول یہ کہ اس حیثیت کا انحصار جغرافی جائے وقوع پر ہے مغربی تہذیب کے مرکزوں سے دور دراز ہے اور ان گنجان آبادیوں سے نزدیک ہے جن کا معاشی معیار نسبتاً پست ہے اور جس سے اسے نفع بخش تجارت کے موقعے ہاتھ آتے ہیں یہ دو وجہ اعتباً سے بھی اس کی کم مخالفت کر سکتے ہیں [illegible] یہ کہ اسے اپنے تجارتی بیڑے پر بھروسہ ہے جو بذات خود اس کے جغرافی احول کی پیداوار ہے جو کہ دنیا میں تیسرے نمبر پر ہے اگرچہ جسامت کے اعتبار سے امریکہ کے نصف اور برطانیہ کے ایک ثلث کے برابر ہے اس کی بدولت اس کی بحری طاقت بھی قائم ہے جو کہ دیگر دول کی طاقتوں کے تقریباً برابر ہے۔ سوم یہ کہ جاپان ایک بڑی طاقت یوں بھی ہو گئی کہ وہ اپنے وسائل زیادہ تر فوجی اور جہازی مقاصد کے لیے استعمال کرتا رہتا ہے دس سال قبل فتح منچوریا سے پہلے ہی جاپان تقریباً ساڑھے چار فیصدی قومی آمدنی اور ۳۰ فی صدی ریاست کی آمدنی فوجوں پر خرچ کر رہا تھا اس کے مقابلہ

میں برطانیہ کا خرچ ۲ ۳/۴ اور ۱۴ فیصدی علی الترتیب تھا۔

<u>جنگی قوت</u> | جاپان کا عام معاشی نظام عموماً ایسا نہیں ہے کہ اس کو ایک بڑی جنگی قوت بنا سکے مثلاً کوئلہ ہے تو کافی لیکن کان کنی کے اعتبار سے گراں پڑتے ہیں لوہے کے وسائل بہت کم ہیں پھر بھی ان کی مدد سے اس کی فولاد کی نکاسی ان دنوں غالباً سات لاکھ میٹرک ٹن سالانہ ہے۔ فلزیات کے باب میں قدرتی کمزوریوں نے اسے بجائے بھاری صنعتوں کے ہلکی صنعتوں کا ماہر بنا دیا ہے تقریباً نصف صنعتی کارکن کپڑے کی صنعتوں میں لگے ہیں اور انجینیری صنعتوں نے بالکل بنیادی یا انتہائی مکمل قسم کا سامان بنانے میں کم ترقی کی ہے مثلاً ایک طرف مشینوں کے پرزے نہ ملیں گے تو دوسری طرف مکمل شدہ موٹریں اور ہوائی جہاز کم ہوں گے

اگرچہ اسے پارچہ بافی پر بہت بھروسہ ہے لیکن پھر بھی کئی اعتبار سے اس وقت جاپان کی اقتصادی حالت برطانیہ کی گزشتہ درمیانی صدی والی اقتصادی حالت سے ملتی جلتی ہے۔ جاپان کی مقبوضہ آبادی کا نصف حصہ زراعت یا ماہی گیری پر گذر کرتا ہے رہی صنعت و حرفت سو وہ اس وقت بڑی حد تک گھریلو دستکاری یا چھوٹے چھوٹے کارخانوں کے دم پر ہے لیکن ۱۸۵۰ء کے برطانیہ سے اس جو اختلافات ہیں ان کی وجہ سے بنیادی یکسانیت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے مثلاً یہ کہ معاشی قوت کا چند دولتمند خاندانوں کے ہاتھ میں ہونا یہ جاپان کی جدید جزوی صنعت کا بڑے پیمانے پر پھیلنا وغیرہ وغیرہ اگر جاپان کی زراعت کا اوسطاً ایک صدی پہلے کے برطانیہ کی زراعت سے مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوگا جاپانی زراعت مقابلتہً پست ہے تاہم یہ کوئی بڑا فرق نہیں ہے۔

جنگ کے نقطہ نظر سے جاپانی معاشیات کی کمزوری اس وقت اور اجاگر ہو جاتی ہے جبکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس کی حیثیت کا انحصار بیرونی تجارت پر کس قدر ہے بمقابلہ برطانیہ کے جاپان کی بیرونی تجارت اس کی قومی آمدنی کے لحاظ سے بہت کم ہے لیکن جہاں یہ تقریباً صحیح ہے کہ ماکولات کے سلسلہ میں انگلستان کا انحصار درآمد پر ہے اور اس کے بعد صنعتی خام مال پر ہے وہاں یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ جاپان غذا کے معاملہ میں اپنا آپ کفیل ہے اور صنعتی خام مال اور اس حصہ کے لیے باہر کا محتاج ہے۔ جنگ سے پہلے جاپان کی تجارت درآمد کی فہرست میں سب سے بڑی شق کپاس کی تھی، (سنہ ۱۹۳۷ء کی کل درآمد کا ۲۱ فیصدی) دوسری اہمیت خام اون کی تھی

۵۰ء۵ فی صدی) معدنی تیل (۷۰،۰ فی صدی) پٹا لوہا کچا لوہا اور آہنی کترن (۹۰،۰ فیصدی)، کھاد (۸۰،۴ فی صدی) اور ربڑ (۷۰،۲ فی صدی) اس کے علاوہ تھے ان تمام ضروری سامان کی درآمد ۷۰،۵ فی صدی سے زیادہ تھی یہ صحیح ہے کہ بوقت ضرورت اس کے سوتی کپڑے کی برآمد میں کمی یا التوا اس کی کپاس کی ضرورت میں کمی کرسکتے ہیں لیکن بات یہ ہے کہ اس درآمد کا بیشتر حصہ نیز دیگر متذکرہ چیزیں خود اس کے ذاتی استعمال کے لیے ضروری ہیں چنانچہ اس کے فولادی مال کے ½ حصہ سے زیادہ کی تیاری کا انحصار درآمدہ لوہے پر ہے اور ½ درآمدہ پٹے اور کترن کا لوہے پر ہے اور بقیہ سے اسی طرح کچھ لوہے پر۔ کچا لوہا جزوی طور پر منچوریا سے مہیا ہوسکتا تھا لیکن بیشتر فولادی کترن امریکہ سے آتی تھی۔

ظاہر ہے کہ ایک غیرمعمولی جنگ میں بھی اس کی تیل کی ضروریات میں اضافہ ہوگا اور تقریباً ⅔ ضروریات کو کیلی فورنیا پورا کرتا تھا ربڑ اس کے ہاں ہالینڈز انڈیز اور ملایا سے، روئی ہندوستان اور امریکہ سے اور اون آسٹریلیا اور جنوبی افریقہ سے فراہم ہوتا تھا۔ کھاد جو اس کی زراعت کے لیے اشد ضروری ہے کچھ تو منچوریا سے سویابین اور کیک کی صورت میں آتی ہے لیکن اس کی سب سے زیادہ مقدار ہندوستان سے جاتی تھی اسی طرح یہ بھی معلوم ہے کہ جاپان بالکیسٹ اور دیگر آہن آمیز دھاتوں کی ضروریات میں اور جیسا کہ صنعتی ترقی کے باب میں بتایا جا چکا ہے اعلیٰ درجہ کی انجنیری کی پیداوار میں دوسروں کا محتاج ہے اور جو صرف امریکہ برطانیہ اور جرمنی سے فراہم ہوسکتی ہیں۔ لہذا یہ بات صاف ہے کہ اب جبکہ جاپان زبردست بحری مہمات کی جنگ میں الجھ گیا ہے تو اسے اپنے خاص جنگی سامان کی فراہمی کے لیے بڑے بڑے راستوں کا کھلا رکھنا دشوار ہوگا محض مغربی بحرالکاہل پر سیادت ناکافی ہوگی۔

۲۔ جنگ | متذکرہ حالات کے پیش نظر یہ کوئی تعجب انگیز امر نہیں کہ خود اس کا چین سے مناقشہ جسے ساڑھے تین سال سے زیادہ ہوچکے ہیں اور مغرب کی لڑائی اس کی معاشیات پر بہت کچھ اثر انداز ہوئی لیکن عرصہ سے جنگی اقتصادیات کی طرف اس کا رجحان زیادہ رہا ہے اس کا حساب لگایا گیا ہے کہ ۳۷-۱۹۳۶ء میں جب جاپان کے کل تیار شدہ مال کی قیمت ۱۲۰۰۰ لاکھ ین سے بڑھ کر ۴۰-۱۹۳۹ء میں ۲۶۵۰۰ لاکھ ین تک پہنچی تو اس اضافہ میں سے ۳۰۰۰۰ لاکھ ین سامان جنگ کی پیداوار تھی۔ اس کی اصلی نکاسی علاوہ

سامانِ حرب کے، اس دو سال کے وقفہ میں تقریباً ۱/۲ ۱۲ فی صدی گر گئی اور اس کا خاص سبب یہ تھا کہ شہری استعمال کے لیے صنعتی نکاسی میں ایک تہائی سے زیادہ کمی ہو گئی تھی مگر اس کے سنہ ۱۹۳۶ء اور سنہ ۱۹۳۹ء کے درمیان خاص فوجی سامان کی درآمد ۶۶۰۰ لاکھ ین سے ۱۲۴۶۰ لاکھ ین تک پہنچی اور دوسرے مال کی درآمد ۲۱۰۴۰ لاکھ ین سے ۱۴۱۳۰ لاکھ ین رہ گئی۔ اس طرح عمومی شہریوں کے لیے مال کی کھپت میں تقریباً ۱/۳ کی کمی ہو گئی۔

سامانِ جنگ کی خرید کے سلسلہ میں بیرونی شرح مبادلہ میں کمی، پھر جاپانی مال کے غیر سرکاری بائیکاٹ کی وجہ سے، خاص کر اس کی انتہائی اہم ریشم کی برآمد جو امریکہ کو ہوتی تھی، اور ریاستوں پر پابندی کے سبب سے جس کا حساب امریکہ کے تجارتی حلقے نے لگایا تھا کہ شروع ۱۹۳۹ء میں ۶ فی صدی کمی ہوئی تھی، تجارت درآمد پر سخت گیری کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس سلسلہ میں ین کی قیمت ۱۹۳۹ء کے وسط تک اس کے ایک سال قبل کی قیمت کا صرف ۶۵ فی صدی رہ گئی۔ ۱۹۳۹ء اور ۱۹۴۰ء میں کچھ اضافہ ہوا لیکن ابھی حال ہی کے چند ماہ میں ۱۹۴۰ء کے تل سے بھی نیچے گر گئی ہے۔ البتہ برآمد میں زیادہ اضافہ ہوا ہے اور بظاہر تجارت کے میزانیہ میں ۱۹۳۶ء میں سونے کی بہ دست نکاسی کے بعد ترقی ہوتی رہی۔ اس چار سال کے عرصہ میں رفتار سرمایہ اور خفیہ تجارت کی ہیئت کے متعلق تو اچھی طرح علم نہیں البتہ بیان کیا جاتا ہے کہ معرکہ چین کے پہلے تین برس میں جو سونا امریکہ کو بھیجا گیا اس کی مالیت ۲۴ لاکھ ین سے زیادہ تھی۔ اس حساب سے موجودہ سونے کی نکاسی تقریباً ۴۰ لاکھ ین سالانہ یعنی اس کا صرف نصف ہوئی۔

تجارت درآمد پر سختی کا یہ اثر ہوا کہ کپڑے کی تیاری میں سخت تخفیف کی گئی۔ ملکی صرف کے لیے بھی کل پیداوار میں بہت کمی کر دی گئی لیکن اس سے تجارت برآمد نقصان اٹھائے بغیر نہ رہ سکی۔ مثلاً ۱۹۳۹ء کے ابتدائی ۷ ماہ میں سوتی کپڑے کی برآمد اس سے ایک سال قبل کے مقابلہ میں نسبتاً ۲۲ فی صدی کم تھی اور ۱۹۳۹ء کے تمام سال میں ۱۹۳۶ء کے مقابلہ میں ۱۱ فی صدی کم تھی۔ کچے ریشم کی برآمد بھی بہت گھٹ گئی یعنی ۱۹۴۰ء کے ابتدائی ۷ ماہ کے مقابلہ میں ۱۹۳۹ء کے بہ نسبت ۳ فی صدی کم ہو گئی اور ۱۹۳۹ء میں بہ مقابلہ ۱۹۳۶ء کے بہ حیثیت مجموعی ۲۲ فی صدی کم تھی۔ اس کے علاوہ کوئلہ پر پابندی اور برق آبی کی موسمی

کمی کی وجہ سے سنہ ۱۹۴۰ء کے شروع میں رقی قوت میں انتہائی کمی ہوگئی ان تمام باتوں کے با وجود کپڑے کے کارخانے اور دوسری کمپنیاں خوب نفع کماتی رہیں۔

۴ مالیات، دو رقمی اخراجات اور جنگ چین کی وجہ سے قدرتی طور پر حکومت کے مصارف بڑھ گئے نقشہ ذیل سے حالت ظاہر ہے۔

(جاپانی بجٹ کا حساب اس میں ریلوے اور مصارف خصوصی وغیرہ شامل نہیں ہیں لیکن معرکہ چین سے متعلق اخراجات شامل ہیں)

سال	آمدنی	خرچ	خسارہ	قرض وغیرہ (مع جنگ چین)
سنہ ۱۹۳۷ء	۱۵۹۲	۲۲۸۲	۷۲۰	۱۰۷۸
سنہ ۱۹۳۸ء	۲۲۱۹	۵۳۱۱	۳۰۹۲	۴۴۲۲
سنہ ۱۹۳۹ء	۲۹۱۰	۸۱۳۸	۵۲۲۸	۶۰۹۷
سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء	۳۱۰۸	۹۵۰۰	۶۳۹۲	۶۴۳۲
سنہ ۱۹۴۰-۴۱ء	۴۱۹۱	۱۰۳۹	۶۱۷۹	۶۷۶۲
سنہ ۱۹۴۱-۴۲ء	۴۷۸۳ تقریباً	۱۱ تقریباً	۹۰ ۰	۷۶۲۸

اس سے معلوم ہوگا کہ فوجی مصارف مع ان کے جو چین میں برداشت ہوئے کلیتاً قرض سے پورے کیے جا رہے ہیں گزشتہ سال کے آخر میں قومی قرضہ ۲۰ ملین ین تھا سنہ ۱۹۳۱ء کے آخر سے اس قرضہ میں ۱۷ ملین ین کا اضافہ ہوا۔ اور اس قرض کی ادائیگی میں آمدنی کا تقریباً ۲۰ فی صدی کھپ جاتا ہے آخر اتنے زبردست قرض کو چندہ سے کہاں تک کم کیا جا سکتا ہے نیز اس قرض سے بڑی حد تک وضی افراط زر کی خرابیاں پیدا ہو جائینگی موسیو ساکو راؤچی وزیر مالیات نے ایک سال پہلے تخمینہ کیا تھا کہ پبلک چندہ پچھلے سال میں ۱۰۰ ملین ین تک پہنچ چکا تھا۔ اسے ایک قابل لحاظ کامیابی سمجھنا چاہئے کیونکہ یہ رقم قومی آمدنی کے ۱/۴ سے خاصی زیادہ تھی لیکن سنہ ۱۹۴۲-۴۳ء کی باقی شدہ آمدنی کا تناسب ۱/۵ سے زائد معلوم ہوتا ہے لہٰذا یہ کامیابی ممکنات میں سے نہیں یعنی مصارف اور حکومت کے سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء والے قرض مل جل کر اس رقم کو کم و بیش ختم کر دیں گے فرضی

افزائش زر کی خرابیاں جو تیزی سے پھیل رہی ہیں اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ کفایت شعاری تمام بار کو اٹھانے کے لیے ناکافی ہوگی جاپان بنک کے پاس جو سرکاری تمسکات ہیں ان میں ۲۵۰۰ ملین ین کا اضافہ چین کی جنگ کے شروع ہونے پر ہوا اس وقت کل رقم ۳۰۰۰ ملین ین ہے اور نوٹ کا اجرا دگنے سے بھی زیادہ کر دیا گیا ہے۔ زر کی فراہمی کی نسبت سے چیزوں کی قیمتوں کو بڑھنے سے روک دیا گیا ہے اس بات کی براہ راست کوشش کی گئی ہے کہ عام قیمت کی سطح وسط ۱۹۳۸ء کی قیمتوں سے بلند نہ ہونے پائے پھر بھی اکتوبر ۱۹۴۰ء میں کل تجارت کا انڈکس ۱۹۳۸ء کے اوسط سے ۲۲ فی صدی بلند رہا اس کے مقابلہ میں روزمرہ زندگی کے عام خرچ کا انڈکس نومبر میں ۳۱ فی صدی اور غذا کی قیمت کا انڈکس ۱۹۳۸ء کی سطح سے ۴۳ فی صدی بلند تھا اس اضافہ کے ساتھ ساتھ کل مال کی تیاری میں کوئی اضافہ نہیں ہوا چنانچہ جون ۱۹۴۰ء میں صنعتی پیداوار کا عام انڈکس (موسمی تغیرات کو نظر انداز کرتے ہوئے) اس سطح پر رہا جیسا کہ تقریباً ۱۹۳۸ء میں رہا اور ۱۹۳۹ء کے اوسط سے نسبتاً کچھ کم ۱۹۴۰ء میں ۱۹۳۸ء کے مقابلہ میں استعمالی مال کی مجموعی پیداوار ۱۰ فی صدی گھٹ گئی۔ اور وہ سامان سے جن سے دیگر سامان بنایا جا سکتا ہے مجموعی حیثیت سے ۱۱ فی صدی کم رہا لیکن پھر بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ مال کی کل مقدار موجودہ حالات کے ماتحت اپنی انتہائی حد کو پہنچ چکی ہے۔

مالی بحیث موجودہ سطح تک سخت کفایت شعاری سے سنبھالی گئی ہے اس سلسلہ میں کسی قدر جبر و تشدد سے بھی کام لیا گیا ہے (مثلاً کمپنی کے حصہ داروں کو منافع کم دیا گیا وغیرہ وغیرہ) پھر بھی جیسا اوپر ظاہر کیا گیا کہ مصنوعی ذرائع سے روپیہ کی افزائش کی خرابیاں ابھی بڑی حد تک جاری ہیں یکم مارچ کے رسالہ اکونامسٹ میں ایک نامہ نگار نے بیان کیا کہ ۱۹۴۲ء میں جنگی صنعتوں پر ۶۰۰۰ ملین ین صرف کرنے کا ارادہ ہے اگر یہ واقعہ ہے تو ظاہر ہے کہ مصنوعی طور پر زر کی افزائش موجودہ شرح یا اس سے زیادہ پر ضرور بالضرور جاری رہیگی

۵ جاپان کی جنگی تیاری موجودہ قیمتوں کو دیکھتے ہوئے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اس سال ۱۹۴۲ء میں جاپانی قومی آمدنی ۳ ملین ین سے بڑھ سکے گی لہذا حکومت ½ آمدنی کو جنگی مقاصد کے لیے صرف کرنا چاہتی ہے اور دیگر ⅓ کو بھی اسی قسم کے مقاصد کے لیے نئی ضروریات پر صرف کرنا چاہتی ہے حال کے چند سال

تب آمدنی کا اسی تناسب کے لگ بھگ غیر مصرفی مقاصد پر صرف کیا جا چکا ہے یہ ایک ایسے ملک کو دیکھتے ہوئے کہ جس کا معیار زندگی اس درجہ پست ہو ایک قابل لحاظ کارنامہ ہے اوپر کے واقعہ سے ظاہر ہے کہ نہ صرف قومی آمدنی ہی موجودہ حالات میں اپنی انتہا کو پہنچ چکی ہے بلکہ اس کا وہ تناسب جسے جنگی مقاصد پر لگایا جا سکتا ہے بہت آہستہ ہی بڑھایا جا سکتا ہے اس کی ایک وجہ اور بھی وہ یہ کہ برقی قوت وہے خصوصاً سے آہنی کترن پر جس پر جاپان کو بڑا بھروسہ تھا امریکہ نے بند کر دیا) میکانی آلات اور اوزاروں اور مکمل شدہ انجینیری اشیا کی فراہمی میں بڑی دقتیں ہو گئی ہیں ان کی درآمد میں علاوہ خانگی مصرف میں تخفیف کی دقتوں کے مشکلات بڑھتی ہی جا رہی ہیں بالفاظ دیگر جاپان کی جنگی سرگرمی غالباً اب اپنی انتہائی حد کو پہنچ گئی ہے روس کی جنگ کے علاوہ موجودہ جنگ کے لیے اسے بحری بیڑہ استعمال کرنا پڑ رہا ہے جو اب تک باقاعدہ شریک جنگ نہیں ہوا تھا اور اسی لیے چین میں سرگرمیاں فی الحال کم کر دی گئی ہیں۔

نظر ثانی

آیئے جاپان کے معاشی وسائل اور ان کی جدید ترقی کی وجہ سے جنگ کی طوالت کے امکانات کو دیکھ جائیں ڈاکٹر ڈالٹن کا بیان ہے کہ جاپان عرصہ دراز سے اور ایک خالص اقتصادی نقطہ نظر سے جنگی تیاری میں مصروف ہے لیکن اس سلسلہ میں یہ امر بعید از قیاس ہے کہ وہ بآسانی ملکوں کو فتح کر سکے گا۔

اگر جاپان کے اقتصادی، عسکری، ہوائی اور بحری وسائل کا ایک پست معیار پر اندازہ کیا جائے تو یہ بڑی غلطی ہوگی۔ جاپان کے جنگ میں شریک ہونے کا اثر یہ ہوگا کہ جنگ طول کھینچے گی۔

ڈاکٹر ڈالٹن نے بتایا کہ حال ہی کے چند سالوں سے جاپان کے ساتھ ہماری تجارت برآمد کم ہو گئی تھی سنہ ۱۹۳۷ء میں برطانیہ نے ،، ۴۰ پونڈ کا سامان سنہ ۱۹۳۸ء میں ،، ۲ پونڈ سے کچھ کم کا سنہ ۱۹۳۹ء میں ......۱ پونڈ سے کچھ کم کا سامان برآمد کیا تھا اور جرمنی سے جنگ چھڑ جانے پر اس تجارت پر پابندیاں عائد کرنے میں پیش قدمی کی گئی گزشتہ جولائی سے برطانیہ واتحادیوں اور جاپان کے درمیان تجارت بند ہو گئی چنانچہ انجماد سرمایہ کے وقت سے برطانیہ سے جاپان کو برآمد قطعاً بند ہو گئی

ہماری ناکہ بندی خواہ کیسی ہی زبردست ہو ہم جاپانیوں کو عرصہ دراز تک فاقہ کشی پر مجبور نہیں کر سکیں گے۔ ان کی گزر بسر زیادہ تر چاول پر ہے جو ان کے پاس کافی مقدار میں موجود ہے۔ جاپان کے پاس تقریباً تین سال کی رسد موجود ہے نیز انڈو چین اور تھائی لینڈ سے اسے خوراک مل سکے گی۔"

جاپان تیل اور غیر آہنی دھاتوں کے حق میں بہت کمزور تھا۔ اس کے کیمیائی تیل کی صنعت ابتدا میں تھی لیکن ریاستہائے متحدہ کے بحری سکریٹری کرنل ناکس نے حال ہی میں بتلایا کہ ان کے خیال میں جاپان کے پاس ۲۰ ماہ کے لیے زبردست بری، بحری اور فضائی لڑائی لڑنے کیلیے کافی تیل موجود ہے۔ وزارت اقتصادیات جنگ کو اس اندازہ تخمینہ سے بڑی حد تک اتفاق ہوا مگر یہ بھی صحیح ہے کہ جاپان کے پاس تیل اور غیر آہنی دھاتوں کی کمی ہے لیکن توپ میگزین اور بحری بیڑے کی تیاری بالکل مکمل ہو چکی ہے۔

(مترجمہ ا-ا-ف) [illegible]

فلسطین

جنگ کے زمانے میں

آغازِ جنگ ۱ ستمبر ۱۹۳۹ء میں جنگ چھڑتے ہی فلسطین میں نسلی و جماعتی کش مکش پر سکوت طاری ہو گیا یہود و عرب ہر دو آبادیوں نے سمجھ لیا کہ ان کا مفاد برطانیہ سے وابستہ ہے لہٰذا دونوں نے خدمات پیش کر دیں بلا اس کا خیال کیے کہ عہدِ انتداب میں ان دونوں کی حکمت عملی کیا تھی ۱۸ سے ۵ سال تک کے مردوں اور عورتوں کی صہیونی بھرتی کا یہ نتیجہ نکلا کہ ۸۶۰۰ مرد اور ۵۰۰ عورتوں نے جنگ کے لیے خدمات پیش کیں صہیونی جماعتوں میں ایک عارضی راضی نامہ ہوا جس کی رو سے قومی صہیونی کونسل کو ہر طبقۂ رائے کی نمائندگی کے لیے ایک غیر جانبدار صدر کے ماتحت ترتیب دیا گیا لوٹ مار قطعاً ختم ہو گئی اور خاص سڑکوں پر چلنے کے لیے ڈرائیوروں اور مسافروں کو جو فوجی پاس حاصل کرنے کی ضرورت ہوتی تھی اسے عام حالات کو دیکھتے ہوئے اوائل اکتوبر میں قطعاً ختم کر دیا گیا علاوہ ازیں عرب باغیوں اور مشتبہ اشخاص کی ایک بڑی تعداد کو نظر بندی سے رہا کر دیا گیا۔ اس طرح جہاں تک زندگی اور کاروبار کا تعلق ہے فلسطین ایک محاصرہ کی حالت سے نکل کر اوسط حالت میں آ گیا جافا کے عربوں نے ہمسایہ صہیونی شہر تل ابیب سے تجارت شروع کر دی اور بعض دیہی علاقوں میں یہودیوں اور عربوں میں بظاہر برادرانہ تعلقات قائم ہو گئے۔

لڑائی چھڑ جانے پر صہیونی ایجنسی نے فلسطین اور دیگر مقامات سے ایک بڑی یہودی فوج فراہم کرنے کا فیصلہ کیا تھا اس سے یہودیوں کا قومی امتیاز نمایاں ہوتا تھا حکومت نے فلسطینی دستوں کی بھرتی (جن میں عرب و یہودی دونوں شامل تھے) کرنے اور انہیں پہلے موقع پر خدمات ملک کے لیے متعین کرنے پر ترجیح دی۔ پہلے اعلان میں مختلف فوجی دستوں کے لیے ۱۳۶ آدمیوں کو طلب کیا گیا اور اس کے بعد ۱۰۰ اور کیمپوں کی بھرتی ہوئی جس میں چھ چھ سو آدمی تھے ان کا تعلق آگزیلری ملٹری پائنیر دستے سے تھا اس کے

بعد ان دو کمپنیوں میں پیرس کی ایک نامتر یہودی کمپنی کو شامل کر دیا گیا مارچ ۱۹۴۰ء میں نوآبادیات کے سکریٹری نے اعلان کیا کہ ۹ ۷ یہودی اور ۲۹۲ عرب بیرونی خدمات کے لیے نامزد ہوئے ہیں ان میں سے ۴۲۲ یہودی اور ۱۰۳ عرب پہلے ہی سے فرانس میں کام کر رہے ہیں بعد ازاں اوائل جولائی میں جاری فلسطینی فوجوں کی ترتیب کا اعلان ہوا جن میں ایک آرٹیزن کمپنی، ایک کانسٹرکشن اینڈ لائن کی اور دو مکینیکل ٹرانسپورٹ کمپنیاں تھیں ان میں دو یہودی اور دو کمپنیاں عرب تھیں ۱۵ ستمبر سے قبل جنگی دستوں کے لیے رضاکار بھی بھرتی کیے گئے تھے اس وقت دو کمپنیاں بنائی گئیں ایک عرب دوسری یہودی۔ ان کا تعلق رائل ایسٹ کینٹ رجمنٹ سے تھا سپاہیوں کی کل تعداد ۸۰۰ تھی علاوہ ازیں چار اور کمپنیاں (دو عرب اور دو یہودی) اس وقت سے اس اول الذکر بیڈل سپاہ میں شامل کر دی گئی ہیں مارچ ۱۹۴۱ء کے شروع میں تقریباً ۱۰۰ یہودی اور ۳۰۰ عرب مختلف خدمات پر مشرق وسطیٰ کی برطانوی سپاہ کے ساتھ میدان جنگ میں تھے۔ اس کے علاوہ رائل ایئر فورس میں ۵۰۰ یہودی ہوائی مرکزوں پر مامور تھے آسٹریلیا کی فوجوں کا ملا دستہ بعرض مشق ۴ ارفروری ۱۹۴۰ء سے پہنچنے لگا اہل آسٹریلیا کا فلسطین میں دلی استقبال ہوا دلی اس وجہ سے کہ ان کی آمد سے اکثر مقامی طبقات کی آبادی خوش حال ہو گئی ان میں کیمپ کے رسدی ٹھیکیداروں سے لے کر پھیری والے تک شامل ہیں علاوہ ازیں وہ لوگ (آسٹریلین) جلد ہی دیہاتی عربوں اور یہودیوں سے گھل مل گیے چنانچہ ٹائمس کے یروشلم کا نامہ نگار (۲ اپریل ۱۹۴۰ء) لکھتا ہے برطانیہ کے تازہ ترین سوار فوجیں ہیں مئی میں جولی رہو ٹریت سپاہ سے ایک دستہ آکر آسٹریلی سپاہ سے مل گیا نیز ایک اور آسٹریلی دستہ بھی پہنچ گیا فتح فرانس کے بعد پولینڈ اور آزاد فرانس کے دستوں کو بھی شام سے فلسطین آنا پڑا۔

۴۔ <u>انتقال اراضی کے ضابطے</u> فلسطین میں اندرونی کش مکش کے بظاہر سکوت کا مگر یہ مطلب نہ تھا کہ فریقین اپنے اپنے سیاسی مقاصد سے دست بردار ہو گئے۔ عربوں کو امید تھی کہ ابتدائی طاقت حسب تجویز مشرکہ ڈائل مئی ۱۹۳۹ء والے قرطاس ابیض کی متعدد تجاویز پر عمل پیرا ہو گی دوسری طرف یہودیوں کی تجویز تھی کہ کم از کم یہی دوران جنگ میں متذکرہ حکمت عملی کو عملی جامہ نہ پہنایا جائے ان حالات میں گورنمنٹ نہ تو اقدام اور نہ سکوت ہی سے ایک طویل مدت تک سیاسی احتجاج کو نظر انداز کر سکتی تھی چنانچہ خط

۲۸ فروری ۱۹۴۰ء کو ضابطہ ہائے انتقال اراضی کی وجہ سے جو ظہور پذیر ہوا جو قرطاس ابیض سے متعلق تھے۔ ان ضابطوں کی بدولت ملک تین حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا (۱) ۵۱۲۲ مربع میل کا ایک رقبہ زیادہ تر پہاڑی جس میں فلسطینی عربوں کو یہودیوں کے ہاتھ اراضی منتقل کرنے کی ممانعت تھی فلسطینی عربوں کے علاوہ دوسرے لوگ اس کے مجاز تھے (۲) ۵۱۲۲ مربع میل کا ایک رقبہ جس میں فلسطینی عربوں کے علاوہ دوسروں کو انتقال اراضی کی آزادی تھی لیکن فلسطینی عربوں کے لیے شرائط عاید تھیں (۳) ایک آزادانہ انتقال کا خطہ تقریباً ۲۱۹ مربع میل جس میں طنطورا اور علاقہ حیفا کی جنوبی حد کے درمیان کا زرخیز میدان شامل تھا۔

گورنمنٹ نے ایک تفصیلی بیان شائع کیا جس میں اس امر کا اظہار کیا کہ متعدد ماہرین کمیشن ان خطرات کی طرف توجہ دلا چکے ہیں جو عربوں کے یہودیوں کو زمین دینے سے پیدا ہوں گے یہ خطرات ان حالات کے پیش نظر ہیں کہ عرب آبادی کی شرح پیدائش قدرتی طور پر زیادہ ہے اور عرب کاشتکار کا معیار زندگی پست ہے گورنمنٹ نے اس آخر الذکر مسئلہ کو نہ صرف منفی حیثیت سے حل کرنا چاہا یعنی انتقال اراضی پر شرائط کے ذریعہ سے بلکہ اثباتی طور پر بھی بہتر ذرائع زراعت کو ترقی دے کر بھی۔ انھیں امید یہ تھی کہ جب ان کی یہ مثبت حکمت عملی کامیاب ہو جائے گی تو فروخت اراضی کی پابندیوں کو کم کیا جا سکے گا۔

یہودی ایجنسی اس دلیل کے مقابلہ پر آ گئی۔ اس نے کہا کہ عرب مزارع میں ترقی صرف انھیں کاشتکاروں نے کی ہے جنھوں نے اپنی کچھ املاک یہودیوں کے ہاتھ بیچ دی ہے کہ قرض سے سبکدوش ہو جائیں اور بقیہ اراضی کو ترقی دیں ایجنسی نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ یہ ضابطے اور قرطاس ابیض دونوں انتداب کے مقصد کے خلاف ہیں

۲۹ فروری کو تمام یہودی حلقوں میں عام ہڑتال ہو گئی اور یروشلم تل ابیب حیفہ اور دوسرے شہروں میں مظاہرے ہوئے اور پولیس میں تصادم ہو گیا ان مظاہروں میں زخمی یہودیوں میں سے دو مر گئے یہ ہڑتال ۷ مارچ تک رہی مذکورہ کے جواب یہودی مسلم جماعتوں نے برطانیہ اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں بھی احتجاجات کیے اور دارالعوام میں یہودیوں کے اس معاملہ کو قرارداد کی تائید ملی۔

ادھر عربوں میں ضوابط کی تائید میں مسلم مجلس اعلیٰ، احمد حلمی پاشا (عرب مجلس عالیہ کے ایک رکن جنھیں ملک میں داخلہ کی اجازت مل گئی تھی) اور امیر شرق اردن کی جانب سے ہائی کمشنر کو تار دیے گئے عربوں سے حکومت

کے اس اقدام کا خیر مقدم کیا انہیں یہ امید بھی تھی کہ اس کے بعد رہی ترقی کی حکمت عملی پر عمل کیا جائے گا نیز
یہ بھی سمجھے کہ اس سے قرطاس ابیض کی تنظیمی دستوری تجاویز کو پورا کیا جائے گا چنانچہ دونوں فریقے یہود و عرب
بے چینی و بے صبری سے (بے چینی یہودیوں کو اور بے صبری عربوں کو) اس بات کے منتظر ہے کہ آیا حکومت نئی
پالیسی کی آئندہ قطع دے گی یا نہیں۔ غالباً جنگ کی وجہ سے یہ صورت حال ابھی حل نہیں ہو سکی۔

یہودیوں کا داخلہ | یہودی مہاجرین کے سلسلے میں یکم اپریل ۱۹۴۰ء سے ۳۰ ستمبر ۱۹۴۰ء تک چھ ماہ میں ۹۰۰۰
تبدیل وطن کے نئے ٹکٹ دیے گئے تھے اس میں چار ہزار پناہ گزیں بھی شامل تھے۔ ان سرٹیفکٹوں کو اتحادی
اور غیر جانبدار ممالک میں تقسیم کیا گیا تھا اس تمام تعداد کو تین قسطوں میں تقسیم کرنا تھا دوسری اور تیسری قسط میں
شرط یہ تھی کہ ان میں غیر قانونی تارکان وطن کی تعداد کے لحاظ سے جو گزشتہ دو مہینے میں ہوئی ہو گی کمی کر دی
جائے گی جہاں سے یہودی آنے والے تھے ان ممالک کے سیاسی حالات اور نقل و حمل کی دقتوں کی
وجہ سے ان سرٹیفکٹوں میں سے صرف ۱۲ استعمال میں لائے جا سکے اس امر کے پیش نظر کہ مجوزہ مہاجریں ایسے
وقت میں فلسطین نہ پہنچ سکے جس عرصے میں انہیں آنے کی اجازت دی گئی تھی گورنمنٹ نے آئندہ چھ ماہ کے لیے
مزید اجازت کا دروازہ بند کر دیا۔

وجہ یہ تھی کہ باوجود آمد و رفت کی دقتوں کے اور اجازت کی کمی کے کوئی ۱۲۰۰ یہودی جنگ کے پہلے بارہ مہینوں
میں فلسطین غیر قانونی طریقے پر پہنچ چکے تھے ان میں سے اکثر بحر ہند اور بحر احمر کے راستے سے گئے تھے حتیٰ کہ ۱۹۴۰ء
کے موسم گرما تک یہ سلسلہ آمد کا کچھ نہ کچھ جاری رہا دسمبر ۱۹۴۰ء میں یروشلم میں سرکاری طور پر اعلان کیا
گیا کہ اپریل ۱۹۳۹ء اور ستمبر ۱۹۴۰ء کے درمیان ۱۶۱۰ یہودی فلسطین میں غیر قانونی طور پر داخل ہوئے ہیں اسی عرصہ میں
قانونی مہاجرین کی تعداد ۱۲۰۰ تھی۔ ۲۰ نومبر ۱۹۴۰ء کو حکومت نے اعلان کیا کہ آئندہ غیر مجاز مہاجرین ایک
برطانوی نوآبادی میں بھیج دیے جائیں گے اور زمانہ جنگ تک انہیں وہیں رکھا جائے گا یہ طے نہیں پایا کہ وہ
جنگ کے بعد بھی وہ نوآبادی ہی میں رہیں گے یا پھر فلسطین کو بھیج دیے جائیں گے غیر مجاز مہاجرین کا پہلا
جتھا تعدادی ۱۹۰۴ بندرگاہ حیفہ میں ایس ایس پیٹریا جہاز پر روانگی کے لیے جمع کیا گیا ۲۵ نومبر کی صبح کو پیٹریا
ایک دھماکے کے ساتھ غرق ہو گیا یہ حرکت مہاجرین کے ہمدردوں کی تھی تاکہ جہاز انہیں نہ لے جا سکے اس

۰ قانی میں تعداد اموات ۷، اتک تھی لارڈ خاص رحم کھاکر پس ماندگان کو فلسطین میں رہنے کی اجازت دیدی گئی پھر بھی اس وقت سے ۱۶ یہودی ماریشس کو بھیجے جا چکے ہیں۔

۴۴ **اقتصادی حالت** | اقتصادی حالت بہتر ہوا اور اس حالت سے بہتر ہو جس کی آغاز جنگ کے وقت توقع تھی فلسطینی تجارت کی ہیئت یک طرفہ ہو یعنی میزانیہ بظاہر بہت کچھ نامساعد ہو اس کی وجہ سے ۱۹۳۷ء میں ۵۰ لاکھ پونڈ کی برآمد کے مقابلہ میں درآمد تقریباً ۱۴۰ لاکھ پونڈ کی تھی اور چونکہ زیادہ تر برآمد کا انحصار ترنج کے پھلوں پر تھا، ۴۰ لاکھ پونڈ ۱۹۳۷ء میں) لہذا خطرات ظاہر تھے کہ اگر کسی وجہ سے ملک میں سرمایہ کی آمد بند ہو گئی یا تجارت برآمد پر ناکہ بندی ہو گئی تو عصب ہی ہو جائے گا چنانچہ ۱۹۴۰ء میں ترنج کی تجارت برآمد گزشتہ سال کی اس تجارت کے نصف سے کچھ کم تھی اور اٹلی کے شریک جنگ ہو جانے سے جہازرانی میں جو دشواریاں بڑھ گئی تھیں انھوں نے ۱۹۴۱ء کے فصلی حالات کو بدسے بدتر کر دیا تھا۔ چاہے مال کی کھپت فوج میں کی جاتی یا سرکہ جیسی ضمنی پیداواروں کو مکمل کیا جاتا۔ تجارت برآمد کے بازار کے نقصان کی کمی کسی طرح نہ ہو پاتی تھی۔

ادھر وہ عرب اور یہودی کاشتکار جو ۱۹۴۰ء میں اپنا اپنا مقررہ حصہ مال کا بذریعہ جہاز برآمد کرنے پر رضامند نہ ہوتے تھے جنوری ۱۹۴۱ء میں آپس میں مل گئے اور حکومت کے پاس اپنی تجاویز پہنچانے کے لیے انھوں نے ایک کمیٹی کا تقرر کیا اسکے جواب میں ہائی کمشنر نے اعلان کیا کہ گورنمنٹ اور بینک اس کام پر قرض دینے کے لیے تیار رہیں پھر جس زمین پر ترنج کی کاشت ہوتی ہو اس پر دیہی محصول میں بھی کمی کر دی جائے گی اس قسم کی امداد مشروط تھی یعنی صنعت کو ایک ترنج کنٹرول بورڈ کی نگرانی میں اصولی طور پر چلایا جاتا تھا اس جماعت کا تقرر اکتوبر میں ہو گیا امدادی قرضہ جس کی ضامن تھوڑی بہت حکومت بھی تھی۔ ۲۲۵ پونڈ تھا اس سے ان لوگوں کو ہی مدد دی گئی جن کے درختوں میں عنقریب پھل آنے والے تھے۔ جنگ سے پہلے ہی فلسطین کی ترنج کی پیداوار کو مصیبت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی دنیا کے اور حصوں میں اس کی پیداوار میں تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا لہذا حکومت پر ظاہر ہو گیا کہ ایسے حالات میں زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کرنے کے لیے عوام کا روپیہ صرف کرنا مناسب نہیں اس صنعت کی مزید امداد کے لیے نوآبادیات کے انڈر سکریٹری نے جب ۱۲ مارچ ۱۹۴۱ء کو دارالعوام میں اعلان کیا تو ساتھ ہی یہ کہا تھا کہ پورے تیار اور پوری فصل دینے والے

درختوں کی کافی تعداد کو محفوظ رکھنا ہی ہمارا مقصد ہے۔

اس آشوب کے خطرات کو کم کرنے کے لیے دوسرے طریقوں سے مدد کی گئی مثلاً بے روزگاری بہت بڑھی ہوئی تھی چنانچہ جنوری ۱۹۴۲ء میں ۔ ۷۵ پونڈ (؟) سے قرض اور عطیات کی شکل میں ملک کی امداد کی گئی جولائی میں ملک کی قوت افزائش کو بڑھانے بیرونی درآمد اشیاء خوردنی کی جگہ ملکی پیداوار کو ترقی دینے کی غرض سے کاشتکاروں کے لیے ۔۔ پونڈ (؟) کی امداد علیحدہ کر لی گئی چنانچہ ۱۹۴۲ء میں فلسطین کی فصل ایک امتیازی حیثیت رکھتی تھی اور اس کی وجہ سے ضروری کھانے پینے کی چیزوں میں کمی کا کوئی خطرہ نہیں رہا تھا اگرچہ قیمتیں بڑی تیزی سے بڑھ چکی ہیں یہودی ایجنسی کے اعداد و شمار سے حساب لگایا ہے کہ آغاز جنگ (؟) اکتوبر ۱۹۴۲ء تک ضروریات زندگی کی قیمت میں ۲۴۴ فی صدی کا اضافہ ہوا اور صرف ماکولات کی قیمت میں اضافہ اس سے بھی زیادہ تھا

صنعت پر نقصان کا اثر کم پڑا وجہ ٹھیکوں کی ایک کثیر تعداد کی وجہ سے تجارت بری کی بالکل گئی بحیرۂ روم (؟) آمد سے پوٹاش اور برومائن کی برآمد جنگ کے پہلے سال میں دوگنی ہو گئی ادھر مشرق وسطیٰ میں ایک زبردست برطانوی فوج پڑی ہوئی تھی ادھر فلسطینی مہاجر سے دہلی کالفرلس (؟) میں آئے ہوئے تھے لہذا یہ امید تھی کہ فلسطین میں جنگی صنعتیں خاصے بڑے پیمانے پر جاری ہو جائیں گی لیکن ان امیدوں نے عملی جامہ نہ پہنا اب حالت یہ ہے کہ اس ملک میں خام مال کی کمی ہے پھر آج کل ان کا یا میکانی اوزاروں کا وہاں پہنچنا مشکل ہے ہاں یہ ضرور ہے کہ فوجوں کے متعدد ذخیروں کی درآمد کی وجہ سے تھوڑا بہت روزگار جاری رہے گا۔

(مترجمہ ا-ا-ف)

عراق کی حیثیت مشرقِ وسطیٰ میں

مضمون ہٰذا کے متعلق جو نقشہ ہے اس کا خاص مقصد یہ ہے کہ اس سے مشرقِ وسطیٰ میں عراق اس کی ریلوں اور دیگر ذرائع حمل و نقل کا ہمسایہ ممالک سے جو تعلق ہے واضح ہو جائے جب شط العرب میں خلیج فارس کے دہانہ پر بصرہ کی حیثیت پر غور کیا جاتا ہے تو وہاں برطانوی شاہی فوجوں کے قیام کا مقصد واضح تر ہو جاتا ہے عراقی سرحد سے پار ایرانی صوبہ خورستان کے سطح کے میدانوں اور آبادان کے تیل صاف کرنے کے کارخانوں میں برطانیہ کا مفاد مضمر ہے۔ اگر برطانیہ کے اس زبردست مفاد میں کسی قسم کی مداخلت کی جائے تو اس مرکز یعنی بصرہ سے اسے روکا جا سکتا ہے۔ بحرین میں تیل کی ترقی پذیر پیداوار کو نیز عراق اور ترکی تجارت کو جو بصرہ کے راستہ سے ہوتی ہے یہیں (بصرہ) سے بچایا جا سکتا ہے بصرہ سے بغداد تک چھوٹی لائن ہے سامان تجارت بغداد تک جہاز سے پہنچایا جاتا ہے۔ جب سے بصیحت الکوچک کی ریلوے لائن مکمل ہوئی ہے اس وقت سے بغداد سے استنبول تک براہ راست سلسلہ آمد و رفت ہو گیا ہے (پہلی مسافر گاڑی بغداد سے ۱۰ جولائی سنہ ۱۹۴۰ء کو روانہ ہوئی) یہ استنبول بغداد لائن ترکی ریلوے سے مل گئی ہے۔ شمال میں انقرہ اور اناطولیہ کے دوسرے مرکزوں سے اور جنوب میں شامی فلسطینی ریلوے سے اور یہاں تک کہ سوئز سے ملی ہے ادھر موصل کے نفطی میدان میں کرکک سے بھی تعلق ہے لیکن یہاں سے تیل کی نکاسی خلیج فارس سے نہیں بلکہ نلوں کے ذریعہ حیفہ کے رستہ ہوتی ہے تیل کی اسی ایک شاخ سے ان دنوں کام لیا جا رہا ہے کیونکہ شام میں جو شاخ طرابلس کو جاتی تھی اسے کاٹ دیا گیا یعنی جولائی سنہ ۱۹۴۰ء کے پہلے ہفتہ میں زوال فرانس کے بعد ہی اس سے مقصد یہ تھا کہ اس بندرگاہ طرابلس کے رستے دشمن کو تیل پہنچانا ناممکن ہو جائے۔

نقشے میں صحرائے شام سے ہو کر شرق یردن سے شام اور فلسطین کو جانے والے موٹر سروس کے خاص راستے تو دیئے ہوئے ہیں لیکن اس میں خود عراق کی خاص سڑکیں نہیں دکھائی گئیں ہیں۔ اس بات کا خیال رہے کہ عراق میں اندرون ملک کی سڑکوں میں خاصی ترقی ہو گئی ہے اور بعض خاص سڑکیں بجائے

کچے رستوں کے پختہ چکنی سڑکیں بن گئی ہیں چنانچہ بصرہ و بغداد کے درمیان دو سڑکیں ہیں اور بغداد کے شمال میں دریائے دجلہ کے برابر ایک سڑک موصل کو جاتی ہے جہاں سے یہ دو حصوں میں تقسیم ہو کر ترکی اور شام کی سرحدوں کو جاتی ہے ایک اور اہم سڑک بغداد سے پہلے شمال مشرق کو اور پھر شمال میں کرکک کو جاتی ہے اس کی ایک خاص شاخ مشرق کی جانب ایرانی سرحد کو جاتی ہے اور یہ خود شمال مغرب میں موصل کی طرف مڑ جاتی ہے۔

ان راستوں میں جو بحیرۂ روم کے ساحلی شہروں کو جاتے ہیں جنگ چھڑنے کے وقت تک جو سب سے زیادہ مشہور تھا دمشق-بغداد کا رستہ تھا جسے نقشہ میں دکھایا گیا ہے لیکن موجودہ حالات میں صورت یہ ہے کہ عمّان کی مغربی شاہراہ سے جو ایک راستہ شرق اردن ہوتا ہوا فلسطین کو جاتا ہے اس پر مسافروں کی آمد و رفت بڑھ گئی ہے۔

بصرہ کی اہمیت اس اعتبار سے کہ وہ بحر ہند اور ممالک مشرق وسطیٰ کے درمیان ایک رودبار رسل و رسائل ہے امن کے زمانہ میں بھی صاف ظاہر ہے اور آج کل تو اس کی اہمیت بے انتہا بڑھ گئی ہے۔ کیونکہ ادھر بحر روم جنگ کا ایک گرماگرم اکھاڑہ ہے برطانیہ نے ۲۶ اپریل کو اس کے تمام حصوں کو جہاز رانی کے لیے خطرناک بتا دیا تھا، ادھر بحر ہند اور خصوصاً خلیج فارس اس خطۂ جنگ و جدل سے باہر ہیں لہذا مسافروں اور رسد کے لیے اس راستہ میں دشمن سے کوئی خطرہ نہیں ہے اس جگہ سے محض عراق ہی کی نہیں بلکہ ایران، روس اور دیگر ریاستوں اور خصوصاً ترکی کی مدد ہو سکتی ہے۔ ترکی کی تجارت بصرہ کے راستے بہت بڑھی ہوئی ہے اور اگر ریل اور دیگر ذرائع جو اس وقت ناکافی ہیں مدد و معاون ہو گئے تو اور بھی بڑھ جائے گی جنگ یورپ کی وجہ سے وسط مشرق کی تجارت تھوڑے دنوں تک بہت کچھ مشرقی رنگ میں رنگ گئی تھی چنانچہ اکتوبر میں یہ انتظام کیا گیا تھا کہ عراق سنہ ۱۹۴۰ء کی اپنی کل روئی کی پیداوار جاپانی فرم تسومتی کے ہاتھ بیچ ڈالے گا (ملاحظہ ہو فائنانشل نیوز ۹ اکتوبر اور مانچسٹر گارڈن ۱۸ اکتوبر سنہ ۱۹۴۰ء) پھر سنہ ۱۹۳۹ء کی فصل کا باقی مال بھی اس میں شامل ہے (تقریباً ۲۳ ہزار گٹھے)، اس جاپانی سودے میں ۷ ٹن بنولے، ۲ ٹن السی، ۷ ٹن تل اور ۴ ٹن جو بھی شامل تھے ادھر جاپان نے بھی عراقی کھجور خریدنے کا وعدہ کیا تھا۔ طے یہ پایا تھا کہ یہ نقل و حمل جاپانی

جہازوں کے ذریعہ ہوگی جب ترکی کی تجارت جرمنی کے ساتھ بہت کم ہوگئی تو اسے نئے بازاروں کی تلاش ہوئی نہ صرف برطانیہ عظمیٰ کے ساتھ بلکہ ہندوستان، جاپان اور امریکہ کے ساتھ بھی اس تجارت کے پیش نظر استنبول بغداد ریلوے کے کوچک ایشیائی حصہ کی تکمیل ہوتے ہی ایک ترکی گماشتہ بصرہ روانہ ہوگیا اس کا مقصد یہ تھا کہ آیا اس بندرگاہ کے ذریعہ مال بھیجنے کے امکانات ہیں توقع تھی کہ شاید تجارتی تعلقات بڑھانے کی غرض سے وہ ہندوستان بھی پہنچے۔

مشرق وسطیٰ میں فضائی مدافعت کی کمک کے طور پر طیاروں اور دیگر سامان حرب کی شکل میں بندرگاہ مذکور کی جائے وقوع سے بڑے فائدے ہیں خصوصاً یہ کہ ہوائی جہازوں کو وہاں سے ایندھن مل سکتا ہے نیز وہیں سے عدہ ترکی اور برطانوی مقبوضات کے متعدد ہوائی اڈوں کو روانہ کیے جاسکتے ہیں مزید برآں اگر ترکی کو براہ راست کسی وقت فوجی مدد کی ضرورت پیش آئے تو بصرہ سے مل سکتی ہے۔

<u>عراق کی شرائط معاہدہ</u> جون ۱۹۳۰ء کے انگریزی عراقی معاہدۂ اتحاد پر بغداد میں ۳ جون ۱۹۳۰ء کو دستخط ہوئے اس کا اولین مقصد تو یہ تھا کہ عراق برطانوی انتداب کی سیادت سے آزاد ہوجائے اور اس کا داخلہ جمعیۃ الاقوام میں بحیثیت ایک ریاستی رکن کے ہوجائے معاہدہ مذکور کے مطابق ۱۹۳۲ء میں عراق جمعیۃ مذکور میں داخل ہوگیا اور اس کو مکمل آزادی اور سیادت دی گئی اور یہ معاہدہ ۲۵ سال کے عرصہ کے لیے جاری و قابل قرار دیا گیا برطانوی معاہدہ اتحاد نے عراق پر خاص پابندیاں عائد کردیں ان میں سے بعض صرف پانچ سال کے لیے تھیں اور بقیہ مستقل مقصد یہ تھا کہ خارجی معاملات میں پورا اور پرخلوص باہمی مشورہ ہو نیز یہ بھی کہ اگر برطانیہ یا عراق کسی سے برسرپیکار ہو تو دونوں کو ایک دوسرے کی مدد کرنا چاہیے۔ دفعہ ۵ کی رو سے ہر حالات میں برطانیہ کے اہم سلسلۂ رسل و رسائل کو مستقل و محفوظ رکھا جائے اور اس مقصد کے پیش نظر برطانیہ کو بصرہ کے قرب میں اور فرات کے مغرب میں ایک جگہ برطانوی فضائی مستقر قائم کرنے کی اجازت ہو۔ فضائی مقامات ٹھیکہ پر دینے کے شرائط، ریلوں کے تبادلے کے انتظامات بھی طے کیے گئے اور بندرگاہ بصرہ کا نظم و نسق ایک وقف کے حوالہ کیا گیا۔ یہ سب معاہدۂ مذکور کے ایک ضمیمہ اور ایک متعلقہ نوٹ سے کافی واضح ہیں معاہدہ کے ساتھ ہی ساتھ جو مختصر خط و کتابت ہوئی ہے اس کے دوران میں اس امر پر بھی اتفاق کیا گیا کہ

بغداد میں برطانوی نمائندہ کی حیثیت ایک سفیر جیسی ہوگی نیز جب عراق کو باہری افسران کی ضرورت ہو تو عموماً بالعموم برطانوی ہونا چاہئیں اور بری اور بحری فوجوں کی طاقت بڑھانے کے لیے حکومت عراق کو برطانوی مشاورتی ملٹری مشن سے رجوع کرنا چاہیے۔

از روئے معاہدہ بصرہ اور حبانیہ اہم ہوائی اڈے برطانیہ کے قبضہ میں ہیں۔

خارجی تعلقات | انگریزی عراقی معاہدہ ہی وہ اساس ہے جس پر عراق کی آزادی قائم ہوا اور اس وجہ سے عراق کے خارجی تعلقات میں یہ ایک زبردست عنصر ہے۔ چونکہ اس ملک کا شاہی خاندان ہاشمی ہے (موجودہ صغیرالسن بادشاہ کے دادا امیر فیصل تھے جو گزشتہ جنگ میں عرب کی آزادی کے لیے لڑے تھے اور برطانیہ کی مدد سے تخت عراق پر بٹھائے گئے تھے) لہذا شرق اردن کے ساتھ قدرتی طور پر اس کے دوستانہ تعلقات تھے شرق اردن کا حکمراں امیر عبداللہ شاہ فیصل اول کا بھائی تھا البتہ سعودی عرب کے ساتھ اس کے تعلقات بوجوہ ہمیشہ اچھے نہیں رہے ہیں مثلاً (۱) ابن سعود ہی نے ہاشمی شاہزادے شریف حسین کو حجاز سے بے دخل کیا تھا۔ (۲) علاوہ اس کے جنوبی عراق زیادہ تر شیعہ ہے اور ابن سعود کے وہابی کٹر اور متعصب سنی مسلمان ہیں (۳) سرحدی خانہ بدوش قبائل جو غیر متعین سرحد کے آس پار رہتے ہیں ان سے مستقل کشمکش رہتی ہے تاہم ان دونوں ریاستوں میں ۲ اپریل ۱۹۳۶ء کو اخوت عرب کے نام سے ایک معاہدہ ہوگیا۔ ادھر ایران کے ساتھ ایک سرحدی جھگڑے کے سبب عرصہ دراز سے تعلقات کشیدہ تھے یہ کشمکش شط العرب کے تصرف کے سلسلہ میں تھی کیونکہ خلیج فارس جانے کے لیے یہ ایک نہایت اہم دریائی راستہ ہے لیکن اس باب میں ۴ جولائی ۱۹۳۷ء کو سمجھوتہ ہوگیا اس کے چار دن بعد ترکی، ایران، عراق اور افغانستان کے مابین معاہدہ سعدآباد ہوا۔ ہر چہار دول اپنے مشترکہ مفاد پر اثر انداز ہونے والے معاملات میں باہم مشورہ کرنے نیز باہم جارحانہ اقدام سے گریز کرنے پر رضامند ہوگئیں۔ رہیں خلیجی ریاستیں خصوصاً کویت اور بحرین یہ اس سے علیحدہ ہیں ان کے تمدن کا مرکز بغداد ہے۔

ستمبر ۱۹۳۹ء میں جب جنگ چھڑ گئی تو عراق نے جرمنی سے تعلقات منقطع کر لیے غیر ملکی جرمنوں کو یا تو ملک بدر کر دیا یا حراست میں لے لیا ایسی صورت میں جرمنی کے پروپیگنڈے کے لیے جو قریب ترین

مرکز تھا وہ طہران تھا لیکن جب اطالیہ لڑائی میں کودا تو اس کے ساتھ عراق کے تعلقات دستور قائم رہے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اطالوی سفارت خانہ پروپیگنڈے کا مرکز بنا رہا اسے برلن اور باری کے عربی نشر سے بہت کچھ مدد ملتی رہی محوری نقطۂ نظر قصص و موسیقی کے ساتھ عراقیوں کے سامنے پیش کیا گیا اس سے کافی دلچسپی لی گئی فلسطینی اور شامی عربوں پر برطانوی اور فرانسیسی استبداد" کے چھوٹے چھوٹے قصوں کو بڑا طول دیا گیا۔ عراق میں عرب کی ہمدردی کو ابھارنے کے لیے تمام فلسطین کے تمام واقعات کافی مواد فراہم کر دیا کرتے ہیں، اور عربیوں سے کہا گیا کہ محوری طاقتیں انھیں خوشحال کر دیں گی اور مغرب کی سرمایہ دار زنجیروں یعنی اتحادیوں سے انھیں آزادی مل جائے گی۔ چنانچہ عراقی ان عرب پرستی جرمنی کے اعلانات کو پورا پورا شائع کرتا اور برطانیہ کی خبروں پر بہت کم متوجہ ہوتا تھا اگرچہ عراق کے تعلقات برطانیہ کے ساتھ سرکاری طور پر ٹھیک رہے اور ترکی کے ساتھ خوشگوار پھر بھی برطانیہ کے خلاف کافی جذبات پیدا ہو گئے یہ بات خاص طور پر عراقی فوج میں تھی جو برطانیہ کے زیر سایہ اور اس کے سامان کی مدد سے ایک زبردست قوت بن گئی تھی۔

داخلی حالت | گزشتہ ۳ اپریل سنہ ۱۹۴۱ء کو جو انقلاب حکومت ہوا تھا اس کے ذمہ دار فوجی افسران ہیں قیاس ہے کہ جرمن پروپیگنڈے کے بعض پہلوؤں سے متاثر ہو کر انھوں نے ایسا کیا خیر یہ جیسے بھی ہوا ہو جب برطانوی حکومت نے اپنے معاہدہ کے حقوق کو استعمال کیا اور سلسلۂ رسل و رسائل کو از سر نو جاری کرنے کے لیے شاہی فوجیں بصرہ بھیج دیں تو نئی حکومت (حکومت عراق) نے فوجوں کی موجودگی کا اعلان وہاں ۱۹ اپریل کو کر دیا گیا تھا بہت مناسب برتاؤ کیا یعنی فوجوں کو پوری پوری آسانیاں بہم پہنچائی گئیں پیر برطانوی سپہ سالار کی پیشوائی اور اس سے تعاون کے لیے ایک اعلیٰ فوجی افسر بھیجا گیا مزید دوستانہ تعلقات کا راستہ دوری سنہ ۱۹۴۱ء میں سر کنہان کارنوالس کے برطانوی سفیر مقرر ہونے سے ہموار ہو گیا صاحب موصوف ملک سے خوبی واقف تھے یہ سنہ ۱۹۲۱ء سے سنہ ۱۹۳۵ء تک بغداد میں بحیثیت مشیر وزارت داخلہ بھی رہ چکے تھے اس فوجی انقلاب ریاست نے ان آن گنت واقعات کا خاتمہ کر دیا جنھوں نے سیاست عراق کو قدرے غیر متوازن کر دیا تھا لیکن یہ امر ایک ایسے ملک میں جہاں حریت اور جمہوریت کا کم تجربہ ہو غالبا

تعجب انگیز نہیں ہے اکتوبر ۱۹۳۶ء میں ایک فوجی انقلاب ریاست ظہور پذیر ہوا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جنرل بکر صدقی نے حکومت کا تختہ الٹ دیا تھا شاہ فیصل ثانی سات سال کے بچے ہیں یہ اپنے والد شاہ غازی کی وفات پر جو ۴ راپریل ۱۹۳۹ء کو ایک حادثہ کی بدولت واقع ہوئی تخت نشین ہوئے شاہی اختیارات ایک والی یعنی شاہ موصوف کے ماموں امیر عبداللہ کے ہاتھ میں دیدیے گئے تھے۔

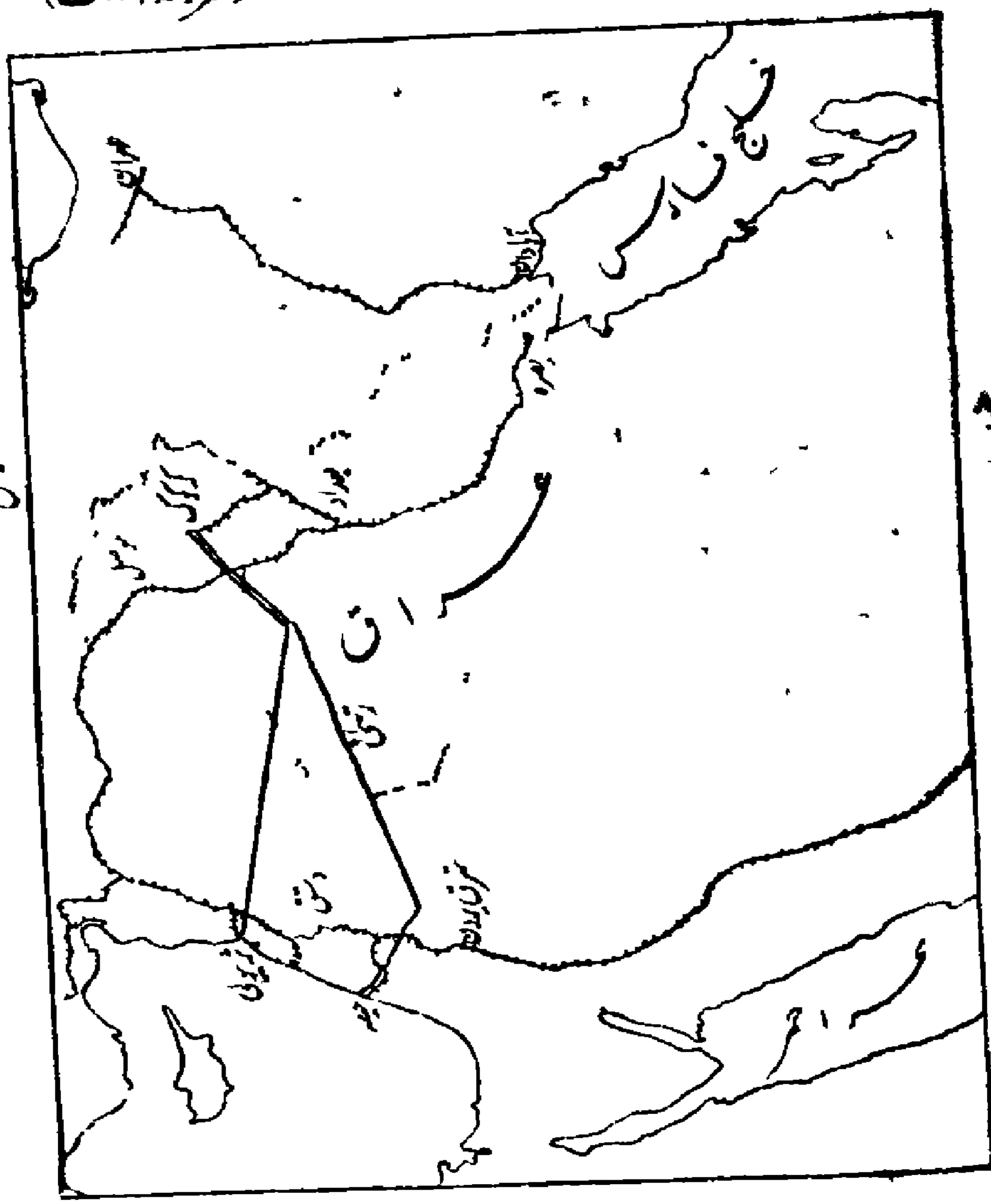
۱۹۴۰ء میں دو نازک واقعات ظہور میں آئے انہیں جزوی طور پر فوجی افسران کے اثر کی طرف منسوب کیا جاتا ہے پہلا واقعہ جنوری میں سید رستم حیدر وزیر مال کا قتل ہے اس وقت اس سلسلہ میں جنرل نوری سعید نے جو اس وقت وزیر اعظم تھے ایک طویل تحقیقات کرنی چاہی تھی لیکن اس میں کامیاب نہ ہو سکے دوسرا واقعہ وہ تھا کہ جب اطالیہ کے داخلہ جنگ پر اس سے قطع تعلق کا سوال پیدا ہوا۔ اس وقت راشد عالی گیلانی وزیر اعظم تھے حکومت پر عدم اعتماد کا ایک اہم سبب یہ تھا کہ فلسطین کے عربوں کی حمایت کے معاملہ میں اس نے کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا تھا جنوری ۱۹۴۱ء میں وزارت امور خارجہ سے جنرل نوری کے استعفے دینے پر اور بھی مصیبت آئی ۳۱ر جنوری کو راشد عالی سے زبردستی استعفے لیا گیا اور جنرل طہٰ الہاشمی کے زیر قیادت جو سرداران فوج کی ریشہ دوانیاں روکنے سے قاصر تھے ایک نئی کابینہ مرتب ہوئی۔

۳ر اپریل کو سید راشد عالی نے اعلیٰ فوجی کمان کے چار مستعد یاں اسلامی ارکان کی مدد سے نئی کابینہ کو نکال باہر کیا والی کو معزول کر دیا اور اس کے بجائے خانوادہ ہاشمی کے ایک اور فرد کو مقرر کر دیا یہی حکومت حکومت مدافعت قوم کے نام سے سید راشد عالی کے ماتحت وجود میں آئی۔ سید راشد عالی نے اعلان کر دیا کہ عراق کے بین الاقوامی معاہدانہ تعلقات قائم رکھے جائیں گے نیز یہ کہ فوج نے ملک کے امن و نظم کی بقا کا اسے ذمہ دار بنایا ہے اور دستور مملکت کو تعدی کے حملے سے محفوظ رکھنے کا فرض اس پر عائد کیا ہے انہی حکومت نے ترکی کے ذریعہ برطانیہ پر یہ بات واضح کر دی کہ خارجی حکمت عملی میں رد و بدل نہ ہوگا۔ برطانوی حکومت اس پر کچھ خاموش رہی ۹ راپریل کو دار العوام میں مسٹر ایٹلی نے بیان کیا کہ ملک معظم کی حکومت کو اس انقلاب پر افسوس ہے ان کے نزدیک یہ انقلاب قطعاً غیر دستوری ہے بہرحال معاہدہ پر پورا پورا عمل کیا جائے گا۔

یہ ہیں وہ حالات نامساعد کہ جن کے سبب شاہی فوجیں وسط اپریل میں بصرہ پہنچیں لیکن ان کا استقبال

س دوستانہ طور سے کیا گیا اس سے امید بڑھی کہ عراق اور برطانیہ کے تعلقات پہلے سے بھی زیادہ بہتر ہو جائینگے بعدازی کابینہ نے ملکہ ہر طرح سے اطمینان کرلیا تھا کہ یہ فوجیں حسب قرارداد محض سلسلہ رسل و رسائل کے لیے بھیجی گئی ہیں پھر بھی راشد عالی کی فوجوں نے حبانیہ پر حملہ کردیا اس کش مکش میں بالآخر راشد عالی فرار ہوکر ایران چلے گئے اور جرمن سیاست کے مقصد کھل گئے برطانیہ نے دوبارہ امیر عبداللہ کو ریجنٹ بنادیا اور عراق کا ہنگامہ ختم ہوگیا

(مترجمہ ا-ا-ف)



بہارِ جاوداں

بہار آنے پہ ہر پھول مسکراتا ہے — ہر اک پرند مسرت کے گیت گاتا ہے
کچھ اس ادا سے نسیمِ بہار چلتی ہے — کہ کوہ و دشت کے دل سے دعا نکلتی ہے
شجر شجر سے ٹپکتی ہیں مستیاں لاکھوں — ہر ایک شے سے برستی ہیں مستیاں لاکھوں
سرور روح میں رہتا ہے بادہ بو بن کر — شراب تیرتی پھرتی ہے رنگ و بو بن کر
سرور و نور میں بستی ہے کائنات تمام — تھرکتی ہے جھومتی رہتی ہے کائنات تمام

مگر خزاں میں محض بے کسی برستی ہے!
نہ راگ ہے نہ تبسم نہ رقص و مستی ہے!

مگر یہ دل کہ محبت سے آشنا ہے ہنوز — ترے جمال کی جنت سے آشنا ہے ہنوز
یہ دل کہ اس پہ رہی ہے تری نگاہِ کرم — یہ دل کہ اس کو ملی ہے تری پناہِ کرم
یہ دل کہ دردِ محبت سے بہرہ یاب ہوا — یہ دل کہ سوزِ محبت سے آفتاب ہوا
یہ دل کہ تاکِ محبت سے لی ہے مے اس نے — یہ دل کہ تیری نگاہوں سے پی ہے مے اس نے
یہ دل کہ تیرا تبسم ہے گل فشاں اس میں — یہ دل کہ تیری ہی تصویر ہے عیاں اس میں

بہار ہو کہ خزاں بے نیاز رہتا ہے
مدام بادہ کش و بے نوا رہتا ہے

اثر صہبائی

غزل

شب سیاہ کی پہنائیاں معاذ اللہ
اسی سبو سے چھلکتی تو ہے سحر پھر بھی

حریم یار سے ٹکرا کے رہ گئے نالے
مزاج یار کو ہو جائے گی خبر پھر بھی

میں نامراد سہی پھر بھی بے مراد نہیں
فغاں کی بے اثری میں تو ہے اثر پھر بھی

لہو میں رنگ تو ہے بجلیاں نہیں نہ سہی
ہماری خاک سے اُٹھتے نہیں شرر پھر بھی

اسی کے ایک نفس میں درازیٔ شب غم
یہی حیات ہے کہنے کو مختصر پھر بھی

آل احمد سرور

بحرالکاہل میں سمندری اور ہوائی مستقر

امریکہ

بڑے مستقر: بحث ساؤنڈ (واشنگٹن) جزیرہ میر (سان فرانسسکو) سان پیڈرو (کیلیفورنیا) سان ڈیگو (کیلیفورنیا) بلبوا (پناما) ہبسہ رگا پرل (جزائر ہوائی)

چھوٹے مستقر:- سدرگاہ ڈچ (الاسکا) کوڈیاک (الاسکا) رسٹکا (الاسکا) کیکا (الاسکا) کوایت (فلپائن) اولنگاپو (فلپائن) پیگو پیگو (سموا) دیگر:- سندر بارو (الاسکا) فیر بنکس (الاسکا) اینکریج (الاسکا) نوم (الاسکا) ٹاکوما (واشنگٹن) سینڈ پوائنٹ (واشنگٹن) مارچ فیلڈ (لاس انجلیز اور سان ڈیگو کے درمیان) ہملٹن فیلڈ (سان فرانسسکو) خلیج کینوہی (جزائر ہوائی)

کوئلہ لینے، جہازوں کے اترنے اور معمولی رسل و رسائل کے دیگر مرکز:- جزیرہ مڈوے جزیرہ جانسٹن جزیرہ کینٹن- جزیرہ ہاؤلینڈ- جزیرہ انڈربری- جزیرہ ویک گوام- لوپلک (فلپائن)

برطانیہ

بڑے مستقر:- سنگاپور (ملایا) سڈنی (آسٹریلیا) دیگر اہم مستقر:- اسکیومالٹ (کناڈا) ہانگ کانگ (چین) پورٹ ڈارون (آسٹریلیا) جزیرہ تھرس ڈے (آسٹریلیا) آکلینڈ (نیوزی لینڈ) جنوبی سمندروں میں چھوٹے چھوٹے چند مقامات اور بھی ہیں

جاپان

بڑے مستقر:- یوکوسوکا (جاپان خاص) کیور ی (جاپان خاص) سسیبو (جاپان) اومیناٹو (جاپان) مرروان (جاپان) میزرو (جاپان) (چتن کوریا) چھوٹے مستقر:- سندر آرتھر (منچوریا) پرموشیرو (جزائر کیورائل) سندر لانڈ (جزائر بامین) کلونگ (فارموسا) تکوا (فارموسا) جزائر پیسکیڈورس- دیگر:- جزائر سیرائلی (فلپائن اور انڈوچین کے درمیان) انگور (جزائر پلیو) ہیان (خلیج ٹانگ کنگ) تورک (لاروں) سیپاں (جزائر کیرولین) جلوئٹ (جزائر مارشل) یپ (جزائر کیرولین)

فرانس

بڑے مستقر:- سیگاؤں (انڈوچین) کوہ کانگ (انڈوچین) چھوٹے مستقر:- کام ران (انڈوچین) دیگر:- کوانگ چاؤ ان نومیا

تھائی لینڈ:- خاص سدرگاہ ساتاہیپ- سنگرا ہیں

روس:- خاص سدرگاہ ولاڈی واسٹک دیگر:- جزائر کمانڈر کو ٹیمسک پیٹرو پاولوسک

رجسٹرڈ ایل نمبر ۱۸۹۲

مسلمانوں کا روشن مستقبل

(تیسرا ایڈیشن مع ترمیم و اضافہ)

صرف مکتبہ جامعہ مہیا کر سکتا ہے

یہ مسلمانوں کی تین سو سال کی مذہبی، اقتصادی، تعلیمی اور سیاسی تاریخ ہے۔ یہ کتاب دس ابواب پر مشتمل ہے اور ہر ایک باب بجائے خود ایک کتاب ہے۔ مصنف نے مسلمانوں کے ہر شعبۂ زندگی پر اس قدر مواد جمع کر دیا کہ اس کی روشنی میں ہندوستان کے سیاسی اور تمدنی مسائل بڑی آسانی سے حل کئے جا سکتے ہیں۔ جو لوگ ہندوستان کی سیاست کے متعلق نہایت تفصیلی، مستند، بصیرت افروز اور سبق آموز معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں اُن کے لئے اس کتاب کا مطالعہ نہایت مفید ہوگا۔

کتاب کی ان ہی خوبیوں کی وجہ سے اسے اس قدر حسن قبول حاصل ہوا کہ اس کے دو ایڈیشن نہایت کم مدت میں چھپ چکے ہیں اور اب نظرثانی اور حذف و اضافہ کے بعد تیسرا ایڈیشن شائع ہوا ہے جس میں ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے حالات تفصیل سے لکھے گئے ہیں۔ انجمن ترقی اُردو کی پوری تاریخ دی گئی ہے۔ خاکسار جماعت کے کام اور پروگرام پر آزادانہ تنقید کی گئی ہے اور قومی جلسوں کے مختصر حالات اور ان کی منظور شدہ تجاویز کا اضافہ کیا گیا ہے۔ مگر ان سب کے باوجود قیمت وہی دو روپے آٹھ آنے (۲/۸) ہے۔

مکتبہ جامعہ

دہلی، نئی دہلی، لکھنؤ، بمبئی

پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیبؒ بی اے (آکسن) محبوب المطابع پریس دہلی

مکتبہ جامعہ دہلی

جامعہ

زیر ادارت: نور الحسن ہاشمی ایم۔ اے

جلد ۳۶ نمبر ۲ | بابتہ ماہ فروری سنہ ۱۹۴۲ء | چندہ سالانہ صہ فی پرچہ ۸ آنہ

فہرست مضامین

(پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکسن) محبوب المطابع دہلی)

مکتبہ جامعہ دہلی

سے

دار المصنفین اعظم گڈھ، دار الترجمہ حیدرآباد، ہندوستانی اکیڈیمی
الہ آباد، دائرۂ حمیدیہ سرائے میر اعظم گڈھ ندوۃ المصنفین، دہلی
انڈین پریس، الہ آباد اور دیگر تقریباً تمام
اداروں کی مطبوعات اصلی قیمت پر مل سکتی ہیں
اگر آپ اردو کی تازہ ترین مطبوعات کا مطالعہ کرنا چاہتے
ہیں تو اردو اکادمی کی ممبری قبول فرمایئے اور قواعد ضوابط
ایک کارڈ لکھ کر مفت طلب فرمایئے

غالبؔ کی اُردو خطوط نویسی کے آغاز کی تاریخ

سوانحِ غالبؔ کے متعلق یہ بھی ایک اہم مسئلہ ہے کہ انھوں نے کب فارسی میں خط لکھنا ترک کر کے اردو میں لکھنا شروع کیا۔ مولانا حالی فرماتے ہیں کہ میرزا ۱۸۵۰ء تک ہمیشہ فارسی میں خط و کتابت کرتے رہے مگر اس سال جب وہ تاریخ نویسی کی خدمت پر مامور کئے گئے اور ہمہ تن مہرِ نیمروز کے لکھنے میں مصروف ہو گئے تو اس کے بعد چونکہ انھیں اپنی طرزِ خاص میں فارسی زبان میں خطوط لکھنے کے لیے وقت نہیں مل سکتا تھا اس لیے انھوں نے فارسی میں خط لکھنا چھوڑ دیا اور اردو میں لکھنے لگے۔

اگر ہم حالی کا مندرجہ بالا بیان درست مان لیں تو اس سے ثابت ہوگا کہ غالب نے ہم جولائی ۱۸۵۰ء کے بعد اردو خطوط نویسی شروع کی۔ یہ دعویٰ بوجوہ محلِ نظر ہے۔ ہمارے پاس میرزا کے جو مطبوعہ خطوط موجود ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس سے پہلے اردو میں لکھنا شروع کر چکے تھے۔

اردوئے معلیٰ میں جو خطوط شائع ہو چکے ہیں ان میں سے متعدد خطوں پر تاریخیں نہیں۔ ایسے ہی خطوں میں سے ایک خط منشی ہرگوپال تفتہ کے نام ہے لکھتے ہیں[1]

> جناب کا یہ مصرع وتم کو ہم پہنچا دو من تاریخ گوئی میں اس کو کرامت اور اعجاز کہتے ہیں یہ مصرع سلمان ساؤجی اور ظہیر کا سا ہے۔ چار لفظ اور چاروں واقعہ کے مناسب یہ مصرع کہہ کر اک مصرع کی فکر کرنی کس واسطے واہ وا سبحان اللہ اور یہ جو تم کو فر کے لفظ میں تردد ہوا اور ایک سوکھا سہا شعر ظہوری کا لکھا تعجب ہے یہ لفظ میرے مانوس آہنگ میں دس ہزار جگہ آیا ہوگا فر اور فرہ لفظ فارسی ہے مرادف جاہ کے پس جاہ کو اور اس یعنی فر کو کس نے کہا ہے کہ بغیر ترکیب دیے نہ لکھے عالیجاہ اور سکندر جاہ اور مظفر فر اور فریدون فر یوں بھی درست ہے اور صرف جاہ اور فر یوں بھی درست الخ

---

[1] اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۵۹ (طبع اول ۱۹۲۲ء مطبع کریمی لاہور)

میرزا اس خط میں تفتہ کے اس قطعہ تاریخ کی طرف اشارہ کر رہے ہیں جو انھوں نے میرزا کو بہادر شاہ کی طرف سے عطائے خطاب کے موقع پر لکھا ہو۔ قطعہ حسب ذیل ہے:

سراج دین بہادر شاہ غازی داد غالب را — خطابے جوہر ہر لفظ آں روشن تر از اختر
دبیر الملک، نجم الدولہ و یک جزو دگر ہم — نظام اول بود زاں بعد لفظ جنگ او سرور
خطاب و خلعت شش پارچہ بخشید، بر خلعت — فزودہ جیغہ و سرپیچ و مالائے دُر و گوہر
درین توقیر دانستم کہ باشد خسرو دہلی — سخن فہم و سخن گو پرور و دانا و دانشور
پئے تحریر تاریخ خطاب و خلعت شاہی — بدریائے تفکر غوطہ زد طبع سخن گستر
بہ گاہے کہ شد در غوطہ پایش بر زمیں قایم — گہرش تفتہ ہاتف گفت کلک رمز باں آور

گو گر سال ایں بیں آمد اقبال می خواہی
یکے ساماں، دوم حشمت، سوم اعزاز، چارم فر

ساماں حشمت، اعزاز، فر چاروں الفاظ کے اعداد ۱۲۶۶ ہوتے ہیں جو اس واقعہ کی ہجری تاریخ ہے جیسا کہ میرزا نے مہر نیمروز کے آغاز میں لکھا ہے وہ ۴ جولائی ۱۸۵۰ء[1] کو بہادر شاہ کے دربار میں حاضر ہوئے جب ظفر نے انھیں شش پارچہ خلعت اور سہ رقم جواہر کے علاوہ نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ کے خطابات عطا فرمائے اور ساتھ ہی خاندان تیموریہ کی تاریخ لکھنے کی خدمت بھی ان کے سپرد ہوئی لازماً تفتہ نے اس کے بعد جلد ہی یہ قطعہ تاریخ لکھا ہوگا جس پر میرزا نے یہ خط لکھا بہرحال یہ خط کسی صورت میں جولائی ۱۸۵۰ء کے بعد کا نہیں ہو سکتا۔

لیکن کتاب حالی کا یہ مدعا ہے کہ ادھر ۴ جولائی کو وہ تاریخ نویسی پر مقرر ہوئے اور ادھر اگلے دن ۵ تاریخ سے انھوں نے مہر نیمروز لکھنا شروع کر دی اور ساتھ ہی فارسی میں خط لکھنا بھی ترک کر دیا اس تاریخ کے متعلق تقسیم کار کا یوں فیصلہ ہوا تھا کہ مدار المہام شاہی حکیم احسن اللہ خاں بہادر واقعات کا انتخاب کر کے

---

[1] اگرچہ میرزا نے یہاں تاریخ ۴ جون لکھی ہے لیکن جیسا کہ میں ذکر غالب میں ثابت کر چکا ہوں یہ سہو قلم ہے۔ صحیح تاریخ ۴ جولائی ہے۔

مضمون میرزا کے حوالے کر دیتے (اور ممکن ہے وہ اردو میں لکھ کے دیتے ہوں) اور میرزا اس مضمون کو فارسی کا جامہ پہنا دیتے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام ایسا آسان نہیں تھا کہ جولائی سے شروع ہو جاتا اور میرزا فوراً ہی اردو میں خط لکھنے پر مجبور ہو جاتے کیونکہ اب پیرانہ سری اور ضعف کے صدموں سے محنت پژوہی اور جگر کاوی کی طاقت ان میں نہیں رہی تھی۔ اقتباس و التقاط اور ترجمہ میں کتنا وقت صرف ہوا اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ مہر نیم روز کی ضخامت ۱۲۰ صفحات کے قریب ہے اور یہ کہیں فروری یا مارچ ۱۸۵۰ء میں جا کر ختم ہوئی تھی گویا انھوں نے ۱۲۰ صفحے کم و بیش پونے دو سال میں لکھے ہیں۔ اگر میں یہ کہوں کہ اس کا جولائی میں کام شروع کر دینا محالات میں سے ہے تو مبالغہ نہ ہوگا لیکن اس کے باوجود وہ جولائی میں تفتہ کو اردو میں خط لکھ رہے ہیں۔ پس حالی کا یہ دعویٰ کہ یہ اپنے مہر نیم روز کے شروع کرنے کے بعد اردو خطوط نویسی کا آغاز کیا غلط معلوم ہوتا ہے۔

پھر اس خط سے عیاں ہے کہ اردو میں یہ پہلا خط نہیں جو میرزا نے ان کے نام لکھا ہو وہ دوسروں کی طرح انھیں بھی فارسی میں خط لکھا کرتے تھے تفتہ کے نام کے فارسی خط پنج آہنگ میں موجود ہیں لازماً جب انھوں نے فارسی چھوڑ کر اردو میں لکھنا شروع کیا ہوگا تو اس کی توجیہ کی ہوگی اور وہ خط یقیناً اس جولائی والے خط سے پہلے لکھا ہوگا۔ پنج آہنگ میں تفتہ کے نام کا آخری خط ۱ فروری ۱۸۴۹ء کا لکھا ہوا ہے۔[۱] غالب ہے کہ انھوں نے تفتہ کو پہلا اردو خط ۱ فروری ۱۸۴۹ء اور جولائی ۱۸۵۰ء کے درمیان کسی تاریخ کو لکھا ہوگا لیکن میرا خیال ہے کہ وہ ۱۸۴۹ء میں اردو میں لکھنا شروع کر چکے تھے۔ اس کی تائید ایک اور خط سے ہوتی ہے۔ میری مراد منشی جواہر سنگھ جوہر کو لکھتے ہیں۔[۲] جو ان دنوں پنجاب کے کسی مقام پر سرکاری ملازم (غالباً تحصیلدار) تھے۔

. . . . فرا یاد شما خواہد بود کہ کلے از پوست برہ داشتم حالیا آں را کرم خوردہ
و ہم بلے کلاہ ماندہ اگرچہ کلہ نمی جویم اما لنگ ابریشمی چنانکہ در پشاور و ملتان سازند و اعیان
آں قلمرو بسر پیچند می خواہم اما لنگی کہ رنگہائے سرخ بر پایہ نداشتہ باشد و حاشیہ سرخ بود

۱؎ کلیات نثر صفحہ ۲۱۱ (طبع نولکشور کانپور ۱۸۷۵ء)   ۲؎ کلیات نثر صفحہ ۱۲۵۔

وهمانا پروانه‌ہائے نازک و طرہ ہائے مزدا سنتہ باشد تا بابے ہر دو قسم را دران تہ
نگردہ باشند و ابریشم سیاہ و سبز و کبود و زرد در بافتن آں بکار رفتہ باشد و غالب گردہاں
دیارہ ایں چنیں متاع زود و آساں بدست آید تو پید و بہم رساند و سوئے من در ڈاک
روان دارند و قیمت آں بنگارند تا بما خواہد نوشت تو خواہم شد۔ ہدیہ و ارمغاں
آنست کہ ناخواستہ فرستند و آنچہ خواستہ کسے باشد ہدیہ کی تواند بود۔ اگفتار من آں سنجند
کہ ہدیہ از شما نپذیرم بالکلہ لنگ را خریدارم و ہر چہ ناخواستہ با شما آرا نپذیرفتار بہر حال
در فرستادن لنگ درنگ و در نگاشتن قیمت تکلیف کنند والدعا نگاشتہ صبح آدینہ

یکم دسمبر ۱۸۴۸ء۔

اب اس کے بعد مندرجہ ذیل اردو خط ملاحظہ فرمائیں۔

برخوردار منشی جواہر سنگھ کو بعد دعائے عمر و دولت معلوم ہو خط تمہارا پہنچا خیر و عافیت
تمہاری معلوم ہوئی قطعے جو تم کو مطلوب تھے اُن کے حصول میں جو کوشش ہیرا سنگھ
نے کی ہے میں تم سے نہیں کہہ سکتا نری کوشش نہیں روپیہ صرف کیا جب
سب قطعے تمہارے پاس پہنچیں گے تب اس کا حسن خدمت تم پر ظاہر ہوگا۔ کیوں صاحب
وہ ہماری لنگی اب تک کیوں نہیں آئی بہت دن ہوئے جب تم نے لکھا تھا کہ اسی ہفتہ
میں بھیجوں گا والدعا اسد اللہ

میرزا سب سے پہلے لنگی کی فرمائش یکم دسمبر ۱۸۴۸ء کے خط میں کرتے ہیں اس لیے دوسرا خط زیادہ سے زیادہ ۱۸۴۹ء کے اوائل کا ہو سکتا ہے اور یہیں ماننا پڑے گا کہ انہوں نے اس زمانہ میں اردو میں خط لکھنا شروع کر دیا تھا اور تاریخ نویسی سے بعد کا دعویٰ نادرست ہے اور پھر یہ خط بھی پہلا خط نہیں معلوم ہوتا
اس اردو کے خط کے متعلق دو ایک اور باتیں عرض طلب ہیں شروع کے فقرے ہیں بعد دعائے عمر و دولت معلوم ہو خط تمہارا پہنچا خیر و عافیت تمہاری معلوم ہوئی' یہ وہ اسلوب نگارش نہیں جو غالب کے

---

[1] اردوئے معلی صفحہ ۳۳۶

خصوصاً جب وہ ایسے رسمی فقروں سے اجتناب کرتے تھے پس ماننا پڑے گا کہ یہ نہایت ابتدائی زمانے کا اردو خط ہے دوسرے آخر میں صرف اسد اللہ لکھا ہے یہ بھی ابتدا کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

میرزا کے جو مطبوعہ فارسی خطوط کے آخر میں بالعموم صرف اسد اللہ لکھا ہے اردو خطوں کے آخر میں بھی یہ رنگ ملتا ہے اور ۱۸۵۵ء تک خصوصاً وہ صرف اسد اللہ لکھتے رہے غدر کے بعد عام طور پر انھوں نے غالب لکھنا شروع کیا غدر کے بعد کے خطوط میں سے بہت کم ایسے خط ملیں گے جن میں صرف اسد اللہ ہو بالعموم صرف غالب یا اسد اللہ خاں غالب شاید چند خطوں میں غالب علی شاہ یا کوئی ایسا طرہ ہوگا۔

الغرض جواہر سنگھ کے نام کا خط ان کے نہایت ابتدائی خطوں میں سے ہے اور یہ ۱۸۴۹ء کے آغاز کا ہے اردوئے معلیٰ[1] میں ایک اور خط مردان علی خاں رعنا کے نام ہے جس پر تاریخ شائع نہیں ہوئی لکھتے ہیں:

خاں صاحب شفیق عالیشان کو میرا سلام۔ کل تمھارا عنایت نامہ پہنچا رامپور کا لفافہ آج رامپور کو روانہ ہوا نواب صاحب اردو کا تذکرہ لکھتے ہیں۔ فارسی غزل تم سے بے فائدہ لکھی۔ دیکھو صاحب تم نے اپنے مسکن کا پتہ لکھا سو میں نے دوسرے دن تمھارے خط کا جواب روانہ کیا۔ منشی نولکشور صاحب یہاں آئے تھے مجھ سے ملے بہت جوان صورت اور خوش سیرت سعادت مند اور معقول پسند آدمی ہیں تمھارے وہ مداح اور میں ان کا ثنا خواں۔

یہ یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ یہ خط کب کا لکھا ہوا ہے لیکن اگر اس میں نواب صاحب سے مراد نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ اور تذکرہ سے مراد گلشن بے خار ہے تو پھر اردو خطوط شروع کرنے کی تاریخ ۱۸۴۹ء سے ہٹا کر اور پیچھے کرنی پڑے گی شیفتہ کا تذکرہ ۱۲۵۰ھ یعنی ۱۸۳۵ء میں شائع ہوا تھا[2] لیکن مجھے شبہ ہے کہ یہاں

---

[1] اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۵۴۔ [2] غالب نے قطعہ تاریخ لکھا ہے

غالب ایں رنگیں کتاب گلشن بے خار نام — رو کش جنات تجری تحتہا الانہار است
گر کسے در جستہ تاریخ اتمامش بود — گو بہار آں نہم در گلشن بے خار است
۱۲۵۰ھ

شیفتہ کے تذکرہ کی طرف اشارہ نہیں اور نہ کسی اور تذکرہ کا ذکر ہے۔ کیا نواباں رامپور میں سے کسی نے شعرا کا کوئی تذکرہ لکھا تھا؟ منشی نولکشور کی ۱۸۴۲ء میں کیا عمر ہوگی؟ ان دونوں سوالوں کے جواب سے بھی اس خط کی تاریخ پر روشنی پڑ سکتی ہے۔

بہر حال اس امر کے متعلق کسی قسم کا شبہ نہیں کہ وہ ۱۸۴۹ء میں اردو میں خط لکھ رہے تھے۔ بعض اصحاب کے پاس میرزا کے غیر شائع شدہ اصل خطوط ہیں، ممکن ہے ان میں سے اس سے قبل کی کسی تاریخ کا کوئی خط دستیاب ہو جائے۔

میر حالی نے اردو میں خطوط شروع کرنے کی جو وجہ بیان کی ہے، وہ بھی کچھ مضحکہ خیز سی ہے۔ جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے، پوری تاریخ پہلے دو برس میں لکھی گئی تھی یعنی چھ مہینے کے قریب ایک ماہ میں۔ کیا واقعی یہ ایسی ہی غیر معمولی اور ناقابل برداشت مشقت ہے کہ اس کے بعد ان کے لیے فارسی میں خطوط لکھنا مشکل ہو جاتا؟ ماننا پڑے گا کہ حالی نے اردو خطوط نویسی کی جو تاریخ لکھی ہے اور جو توجیہ کی ہے، دونوں غلط ہیں۔ میرزا نے ۱۸۴۹ء میں (یا اس سے بھی پہلے) اردو میں لکھنا شروع کیا اور اس لیے نہیں کہ ان کے لیے فارسی میں لکھنا محال تھا، کیونکہ وہ اس کے بعد بھی کبھی کبھی فارسی میں لکھتے رہے، بلکہ اصل وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ انھوں نے محسوس کر لیا تھا کہ اب ہندوستان میں سے فارسی کا دور دورہ ختم ہو گیا ہے اور مستقبل اردو کے ہاتھ میں ہے۔ عوام تو درکنار رہے، خواص تک فارسی کے صحیح ذوق سے محروم ہوتے جا رہے ہیں۔ ان حالات میں انھیں اپنی فارسی اور فارسیت کی کما حقہٗ داد کہاں مل سکتی تھی، لہٰذا انھوں نے طوعاً و کرہاً فارسی کی جگہ اردو کو اختیار کیا۔ ایک اور وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ انھوں نے شروع میں محض بطور تفنن اردو میں لکھا ہو لیکن جب دیکھا کہ ان کے احباب ان کے اردو خطوط سے بھی اسی طرح لطف اندوز ہو رہے ہیں جیسے فارسی خطوط سے ہوتے تھے تو آہستہ آہستہ انھوں نے ساری خط و کتابت اردو ہی میں کر دی اور اس کے بعد خاص حالات کے سوا آخر تک اردو ہی میں لکھا کیے۔

مالک رام ایم اے

ریڈیائی جنگ

ریڈیو پروپیگنڈا کرنے کا سب سے موثر ذریعہ ہو اور اسی وجہ سے ملک اپنی خارجی پالیسی میں پالیسی دل مثلاً حکمت عملی، اقتصادی مسائل اور فوجی قوت کے پہلو بہ پہلو اس کو بھی جگہ دیتے ہیں روس نے سلسلہ میں نمایاں کام کئے اور ساری دنیا کو سوویٹ حکومت کے زریں حالات سے آگاہ کرتا رہا۔ مسولینی نے اس حربے کو سیکھا اور جس طور پر اس نے اپنے نئے ہوائی جہازوں کا تجربہ اسپین میں کیا اسی طرح سال [illegible]، ور آسٹریا میں ریڈیو کے ان حربوں کی بھی آزمائش کی جو وہ آیندہ انگلستان اور فرانس پر کرنے والا تھا میونخ سے اس نے ریڈیو پر پیغامات نشر کرکے سوڈیٹن لینڈ میں جرمنوں کو جیک حکومت کے مظالم سے آگاہ کیا اسی زمانے میں اطالوی نشرگاہ باری سے پروگرام عربوں کو برطانیہ کے خلاف اکساتے رہے اس کے علاوہ روم اور برلن سے ایسے پیغامات نشر ہوتے رہے جن کا مقصد یہ تھا کہ جنوبی امریکہ کو ریاست ہائے متحدہ سے بدظن کر دیا جائے

موجودہ جنگ سے پہلے ریڈیائی پروپیگنڈا آمروں کے سیاسی اقتدار سالنے اور قایم رکھنے میں نمایاں حیثیت رکھتا تھا مگر جب سے جنگ چھڑی ہو تمام جمہوری آمری اور دوسری حکومتوں نے جو جنگ میں شریک ہیں ریڈیائی پروپیگنڈا کرنے والے شعبوں کو جنگی کارروائی میں بہت وسیع جگہ دے رکھی ہو اپنے ملک میں عوام اور فوجوں کو متحد کرنے اور قربانی کرنے کے لیے آگے دھکیلا جارہا ہو غیرجانبدار ملکوں کو حربی واقعات حاضرہ پر تبصرے اور مباحثے سنائے جاتے ہیں اور دشمن کے گھروں اور چھاؤنیوں میں دلائل، واقعات در الزامات پیش کیے جاتے ہیں جس سے ان کا اعتماد گر جائے۔

<u>ریڈیائی پروپیگنڈا جنگ کے حربے کی حیثیت سے</u>

ریڈیائی پروپیگنڈے سے محض میدان جنگ سے نزدیک اور دور کے لوگوں کو ہموار کرنے ہی کا کام نہیں لیا گیا بلکہ جنگ میں بھی اس سے فائدہ اٹھایا گیا ہو اس طور پر جرمنوں نے اسے ایک تند، کاری وار کی حیثیت دے رکھی ہو جس سے حملے میں بہت مدد ملتی ہو جنگ کے وقت جب

ریڈیائی اعلانات یہ ظاہر کرتے ہیں کہ جرمن جاسوس ہر جگہ ہیں وہ سب کچھ دیکھتے اور جانتے ہیں اور اس کی اطلاع دیتے رہتے ہیں تو اس سے محض یہ مطلب ہوتا ہے کہ مخالفین کے دل بیٹھ جائیں

ایک فرانسیسی بانڈولیئن دستہ پیرس کے قریب مامور تھا اور جرمن اس پر گولہ باری کر رہے تھے اس نے جگہ بدل دینے کا ارادہ کر لیا تھوڑی ہی دیر کے بعد سٹٹ گارٹ ریڈیو سے اس کے نقل منزل کی خبر نشر کی گئی۔ اس میں نئی منزل کی جائے وقوع اور کوچ کا وقت بالکل صحیح بتلایا گیا تھا لیکن اس کا علم ہوٹ لیا گیا اور فرانسیسیوں کو اس کے چند ہی لمحوں کے بعد خبر دیدی گئی جب ریڈن ریڈیو نے ہالینڈ میں ایک شہر کے انگریزوں کو وہیں کے ایک اسلحہ سازی کارخانہ کی جگہ کام کرنے والوں کی تعداد اور ہوائی تہہ خانوں کا صحیح مقام بتایا تو وہ خوفزدہ ہو کر کانپ اٹھے دو فرانسیسی جرنیل میجنو لائن میں رات کو بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ سٹٹ گارٹ ریڈیو نے انھیں کھانے کی پوری تفصیل بتا دی۔

اسی طرح حملے کے وقت ریڈیو نے جیسی اودھیل پیدا کر سکتا ہے جب جرمن پیرس کی طرف بڑھ رہے تھے تو انھوں نے فرانسیسی لہروں پر پیرزہ دار اور ڈراؤنے لہجے میں شہر اور گاؤں کے باشندوں کو خبردار کیا کہ قبل اس کے جرمن ٹینک اور بمبار آئیں وہ اپنی جان سنبھال کر بھاگ کھڑے ہوں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لاکھوں آدمی خوفزدہ ہو کر اپنا مال متاع سنبھالے سڑکوں اور دوسرے راستوں پر نکل کھڑے ہوئے اور سپاہ کے لیے تازہ کمک بھیجنا مشکل ہو گیا

یورپ لنڈ کے ہتھیار ڈال دینے پر یہ دہشت دلانے کی ترکیب پھر کامیاب ہوئی جب جرمن شمالی فرانس میں بڑھ رہے تھے تو انھوں نے بہت سی لہروں پر جو اس قدر قوی تھیں کہ معلوم ہوتا تھا ساری فضا پر چھا گئی ہیں اعلانات کرنا شروع کیے اس میں فرانسیسیوں کو یہ بھڑکایا گیا تھا کہ وہ اس جنگ کو جس میں ان کے لیے کوئی امید نہیں خیرباد کہدیں اور اپنی حکومت کو جھک جانے پر مجبور کریں ۲۸ مئی ۱۹۴۰ء کو نازیوں نے فرانسیسی میں وہاں کے لوگوں کو یہ پیغام بھیجا تھا جسے برٹش (امریکہ) کے سننے والے مرکز نے قلمبند کرایا

جرمنی کی سپاہ کن طاقت سے مجبور ہو کر شاہ بلجیم نے اپنی جنگ کا جو بے معنی ہو چلی تھی خاتمہ کر دیا۔ فرانس کے باشندو اور سپاہیو! بلجیم کی فتح سے فرانس کی فوجی حیثیت یہ

وہ بھی ہو کہ میجنو لائن کا شمالی حصہ چور چور ہو گیا ہو مغربی حصے کی منزلت باقی رہی ہو اپنا
ملک چھوڑ کر اپنی جانیں بچانے کی فکر کرو اپنی حکومت کو صلح کرنے پر مجبور کرو ورنہ اسے۔
الٹ دو۔ امرا، تاجروں، سرمایہ داروں اور انگریزوں اور یہودیوں کو بھاگنے نہ دو ہیں
تو وہ تمہیں دلدل میں پھنسا جائیں گے۔"

یہ ظاہر کیا گیا کہ برطانیہ کا معاملہ دگرگوں ہو چکا ہے اور کچھ ہی دنوں میں وہ ہار مان لینے والے ہیں جرمن ریڈیو نے اس پر اصرار کیا کہ "جلد کام کرو۔ بھاگنے والے انگریز اپنی خبر خود ہی لیں گے ان ذلیل لوگوں کی یہی سزا ہے جو اپنے قول پر قائم نہیں رہتے" معلوم ہوتا ہے کہ فرانسیسیوں نے صلح کی شرطیں اسی وجہ سے مان لیں کہ انہیں برطانیہ کے جلد ہار جانے کا یقین تھا درحقیقت ریڈیو نے ایسے خیالات پیدا کرنے میں نمایاں حصہ لیا۔

اس درمیان میں فرانسیسی نشریات نے وہاں کے سپاہیوں اور عوام کی ہمتیں اور دل بڑھانے کے لیے کچھ نہیں کیا وزیراعظم رینا اکثر ریڈیو پر بولے مگر انھوں نے برطانیہ کی طرح سچ بولنے سے کام نہیں لیا بلکہ وہ ڈرامائی اور خوف دلانے والے لہجے میں مخاطب ہوئے اور اس سے الٹا اثر پڑا متحد کرنے اور ہمت بڑھانے کی بہت کم کوشش کی گئی۔ مارسلائس موسیقی کے علاوہ اور کوئی گانے نشر نہیں کیے جاتے تھے۔ اور گراموفون کا یہ ریکارڈ بھی اس قدر بجایا جاتا تھا کہ وہ فرسودہ ہو گیا اور اس سے حزنیہ کیفیت پیدا ہونے لگی فرانس میں جنگ اور اس کے آغاز کارروائی اور مقاصد سے متعلق جو بے حسی تھی اس کے بہت سے وجوہات تھیں ان میں بہت سے ریڈیو کی اس مردہ پالیسی سے زیادہ بنیادی ہیں مگر تب بھی اس پر الزام عاید ہوتا ہے۔

فرانسیسی پروگراموں میں خاص عیب یہ تھا کہ وہ بالکل خشک تھے اس کے برخلاف ڈاکٹر گوئبلس نے یہ حکم دے رکھا تھا کہ جرمن نشریات میں دلچسپی کو مقدم رکھا جائے۔ فرانس میں جنگ سے پہلے بہت سے مکالمے اور مزاحیہ گانے نشر کیے جاتے تھے مگر اس کے بعد وہ اس وجہ سے بند کر دیے گئے کہ وہ زیب نہیں دیتے۔ سخت احتساب کی وجہ سے خبروں کی بہت تراش خراش کی گئی اور ان میں بھی اتنی دیر کی جاتی تھی کہ پہلے بیرونی ریڈیو انھیں سنا دیتے تھے اس کے علاوہ جنگ کی ضرورت کا بہت کم احساس دلایا گیا

نازی جرمنی پر کھلے ہوئے حملے کم کیے جاتے تھے اور جرمنی کی طرح فوجی باجہ بھی شاید ہی کبھی سنایا جاتا ہو

اس صورت حال کے کئی سبب ہیں فرانسیسی حکومت اور قومی قیادت کی مدافعتی کارروائی کو پیش نظر رکھتے ہوئے ریڈیو کی پالیسی پست تھی ۔ ایلچی کی حیثیت رکھتی تھی پروپیگنڈے کا شعبہ بھی ناکافی تھا ۔ موسیو گیراڈو جو اس کے ڈائرکٹر بنائے گئے تھے مصنف اور ڈرامہ نگار کی حیثیت سے ممتاز تھے مگر انتظامی امور اور پروپیگنڈے کے اصولوں سے نابلد اور انھوں نے طریق کار میں اپنی بلند عالمانہ صلاحیتوں سے مدد لی ان کا عملہ غیر منظم تھا اور اس میں اور پالیسی میں اکثر تبدیلیاں ہوتی رہتی تھیں ریڈیو کے شعبہ میں عملہ بہت کم اور موجودہ سامان حال خال نظر آتا تھا بی بی سی کی طرح فرانس نے بیرونی پروپیگنڈے کو روکنے کے لیے مستعدانہ کارروائی کبھی نہیں کی

فرانسیسی ریڈیو پر خبروں کی کمی اور خشکی اور تفریح کے مسالے کی ابتری کی وجہ سے وہاں کے باشندے مستقل طور پر باہر کی نشرگاہوں کو سنتے تھے سٹٹ گارڈ ریڈیو فرانس کے بہت سے حصوں میں سنا جاتا تھا گو پیرس میں پرانے ٹرانسمٹر Transmitter کے استعمال کی وجہ سے سنا نہیں جا سکتا تھا اس لیے یہاں ہمبرگ کے نشریات عموماً سنے جا سکتے تھے بحیثیت مجموعی لوگ جرمن نشرگاہوں کو بیشتر سنتے تھے خاص طور پر سپاہیوں کا یہی رویہ تھا جنھیں سردیوں کے طویل زمانے میں میجو لائن سے کچھ مطلب نہ تھا۔

اس بات کا کافی ثبوت موجود ہے کہ جرمن ریڈیائی پروپیگنڈے کا فرانس میں رائے عامہ پر کافی اثر ہوا لیکن اس نے سپاہیوں سے زیادہ عام آبادی پر اثر کیا معلوم ہوتا ہے کہ سپاہیوں نے بیرونی ریڈیو کو محض تفریح اور وقت بہلانے کے لیے سنا اور ان کوششوں کے خلاف جو ان کی ہمتیں توڑنے یا انھیں برطانیہ کا مخالف بنا دینے کے لیے کی گئیں نفرت سے کان پھیر لیے بہت سے مبصروں کا یہ خیال ہے کہ پروپیگنڈے کی مسلسل بوچھار کی وجہ سے یہ نفرت کم ہوتی گئی اور ہم دیکھتے ہیں کہ فرانسیسی حکومت نے اپنے سپاہیوں کو جرمن پروگرام سننے سے روکنے یا حوصلہ شکنی کے لیے کچھ نہیں کیا جرمن پروپیگنڈے کے کئی موضوع یہاں مثالاً پیش کیے جاتے ہیں۔ اتحادیوں میں پھوٹ ڈالنے کے لیے نازیوں نے پروگراموں کے آخر میں یہ کہا

شروع کیا انگریز اپنی مشینیں دیتے ہیں اور فرانسیسی اپنے سینے پیش کرتے ہیں بار بار یہ کہا جاتا تھا کہ جب تک ایک بھی فرانسیسی زندہ رہے گا انگریز لڑتے رہیں گے۔ یہ الزام بھی لگایا جاتا تھا کہ انگریز سپاہیوں کو کسی نے میدان جنگ میں نہیں دیکھا کیونکہ وہ فرانسیسی سپاہیوں کی بیویوں کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہے ہیں۔

ہمارا ریڈیائی پروپیگنڈا جو عام باشندوں سے مخاطب ہو کر کیا جاتا تھا زیادہ موثر ہوتا تھا گو اس پروپیگنڈے کا قطعی اثر معلوم کرنا مشکل رہا ہے عوام سے مسلسل اپیلیں کی جاتی تھیں جن کا مقصد یہ تھا کہ ان کے اتحاد اور وفاداری کو متزلزل کر دیا جائے اور فرانس کے جنگی مقاصد اور اس کے جیت جانے کی اہلیت کے متعلق طرح طرح کے شبہات پیدا کیے جائیں سرمایہ داروں اور دولت مند وزرا پر خاص طور سے حملے کیے جاتے تھے اس کے علاوہ پارلیمنٹ اور یہودیوں کے خلاف بھی بہت پروپیگنڈا کیا جاتا تھا۔ اُن میں دہشت پیدا کرنے کے لیے فرانسیسیوں کو جرمنوں کی برتر طاقت کا احساس بار بار دلایا جاتا تھا جس کے متعلق یہ کہا جاتا تھا کہ وہ ہار سکتے ہی نہیں اور انھیں خوفناک حملوں اور بمباری کی اطلاع دی جاتی تھی جس کا ہونا یقینی تھا اس طور پر فرانسیسیوں نے باہر سے بہتیرے خیالات دماغ میں جا لیے اور فرانس کا ، کارہ اور کوتاہ میں ریڈیو انھیں دور نہ کر سکا وہاں کے سپاہی اور عوام قبل اس کے کہ جرمن حملہ کریں ریڈیو کی لڑائی ہار چکے تھے۔

جب جرمن حملہ ہوا تو ریڈیو جس طور پر اوپر بیان کیا جا چکا ہے فتوحات کے لیے استعمال کیا جانے لگا مگر اس کی تکمیل سے پہلے ہی یہ دو دھاری تلوار کا کام کرنے لگے تھے کیونکہ جرمن فرانس کی ساری نشرگاہیں استعمال کر کے مفتوح قوم پر برطانیہ کے خلاف پروپیگنڈے کی بارش کر سکتے تھے مگر وہ انھیں لندن سے جنرل ڈیگال مسٹر چرچل یا پریسیڈنٹ روزولٹ کی دوبارہ نشر کی ہوئی تقریریں بی بی سی سے سننے سے نہیں روک سکتے تھے برطانیہ نے ناروے، ہالینڈ اور بلجیم والوں کے لیے جب سے وہ ہارے ہیں باقاعدہ انھیں کی زبانوں میں ریڈیائی پروگرام نشر کر کے ان کی ہمتیں بڑھا رکھی ہیں اور جب سے فرانس نے صلح کی ہے انھوں نے روزانہ وہاں کے مصیبت زدہ لوگوں کے لیے پروگرام نشر کیے ہیں اور اس کا خاصا اثر بھی ہوتا ہے جیسا کہ اس قصہ سے ظاہر ہوگا گزشتہ ستمبر کے آخر میں ایک امریکی پیرس کی بان مارچ بازار جوتا خریدنے کے لیے گیا۔ اسے دکان

کے سامنے جوتے کے خریداروں کی بھیڑ دیکھ کر بہت تعجب ہوا اس نے وجہ دریافت کی تو یہ معلوم ہوا کہ پچھلی رات کو جنرل ڈیگال نے فرانسیسیوں سے کہا تھا کہ وہ جتنے جوڑے جوتے ممکن ہو خرید لیں اور جرمنوں کے ہاتھ میں نہ پڑنے دیں جو عنقریب سارا مال لے لینے والے ہیں۔

دشمن کے علاقہ میں پروپیگنڈا پہلے دشمن کے علاقہ میں پروپیگنڈا کرنا مشکل تھا مگر ریڈیو کے سحر سے آسان ہو گیا ہے۔ پیشتر پرچے تھے یہی ہوائی جہازوں سے اشتہار گرایا یا غبارے اڑایا ان کا حلقہ محدود اور اثر بھی کم ہوتا تھا لیکن ریڈیو آسانی سے دشمن کی سرحد میں داخل ہو جاتا ہے واقعہ تو یہ ہے کہ یہ ایک پل میں زمین کے سات چکر کر لیتا ہے۔

نازیوں نے شروع میں جرمنوں کو بیرونی نشرگاہوں سے سننے کی ممانعت کر دی تھی۔ برطانیہ نے یہ نہیں کیا۔ ہاں کے اخبار والے بہت خلوص سے ہر ہٹلر کی تقریر کا وقت لکھ لیا کرتے تھے حال میں انگلستان میں اس طرح سننا وطنیت کے منافی قرار دے دیا گیا ہے۔ ضمناً دونوں فریق جنگ کے گرفتار قیدیوں کے نام سناتے ہیں تاکہ دشمن پروگرام میں دلچسپی لے۔

دشمن کی ہمت اور ضبط نفس توڑنے کے لیے عوام کو ان کے لیڈروں کی امن کے زمانے کی بداعمالیاں اور زمانہ جنگ کی نااہلی بتائی جاتی ہے بی بی سی نے جرمنوں سے کہا ہے "اور اب کچھ ڈاکٹر گوبلز کے متعلق سنیے آپ اس کے معقول طریق کار سے تو واقف ہیں، شاید اسی وجہ سے اس نے آپ کو اپنے محل کی بابت بہت کم بتایا ہے جو دریائے برجبی کے کنارے واقع ہے جس کی دیواریں سنگ مرمر سے آراستہ ہیں اس کے علاوہ اس کا ایک دیہات میں گھر ہے جو دریائے لینگ گنسی پر واقع ہوا اور ایک سو پچاس کمروں کا احاطہ برلن میں بھی ہے" اسی طرح گورنگ ہیملر اور ربن ٹراپ کو بے نقاب کیا گیا اس سلسلہ میں یہ بتانا دلچسپ ہوگا کہ برطانیہ ہٹلر کی ذات پر کوئی حملے نہیں کرتا لیڈر کی حیثیت سے اس پر نکتہ چینی کرتا ہے

دشمن کے علاقہ میں ہلچل شبہات اور اضطراب پیدا کرنے کے لیے تمام لڑنے والی حکومتیں مضرت رساں پروپیگنڈے سے کام لیتی ہیں یہ ثابت کر دینے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے کہ دشمن کے لیے کوئی امید نہیں سماجی، اقتصادی اور مالی حالت اگر دگرگوں نہیں تو سنگین ضرور بتائی

جاتی ہے جرمنی برطانیہ اور فرانس سے سوال کرتا تھا کہ وہ ذیرگ لڑنے کیوں جاتے ہیں، مزدور طبقے سے وہ مخاطب ہو کر کہتے تھے کہ زوال آمادہ اقتدار کو بچانے کے لیے تم اپنی جانیں کیوں قربان کرتے ہو۔ یہ قومی اپیل برطانیہ بھی اپنے جرمن نشریات میں کرتا تھا بی بی سی نے ۸ جولائی ۱۹۴۰ء کو یہی کہا کہ جرمنی کے نئے نظام کے معنی یہ ہیں کہ وہاں ہمیشہ طبقاتی نزاع رہے گا۔ "یہ نظام جس کے متعلق ہٹلر کو یقین ہے کہ ایک ہزار سال سے زیادہ قائم رہے گا سرمایہ داروں کا ایک چلتا ہوا حربہ ہے جس کا مقصد مزدوروں کے اتحاد کو ختم کر دینا ہے۔

جرمن بار بار یہودیوں پر حملے کرتے رہتے ہیں اس کا مقصد یہ ہے کہ برطانیہ فرانس اور ریاستہائے متحدہ میں طبقاتی جنگ کا بیج بو دیا جائے اور اس کے ساتھ ہی ہٹلر اور بہت سے ملکوں کی یہودیوں کے جانی دشمن کی حیثیت سے تحسین و آفریں حاصل کرے نازیوں نے برطانیہ سے کہا ہے "وہ یہودی اس لیے زندہ ہیں تاکہ دنیا کی دولت اور قوت پر غلبہ حاصل کریں انھیں قومی حقوق اور آرزوؤں کا بالکل لحاظ نہیں نہ انسانی جذبات اور شائستگی کا پاس ہے۔ اور امریکہ والوں سے یہ کہا کہ جرمنی کو نہ تو یہودیوں کے خلاف کچھ کہنے کی ضرورت ہے اور نہ اس کے نسلی اصولوں کی وضاحت کی کیونکہ دونوں باتیں امریکہ میں قانون حیات کی طرح مان لی گئی ہیں۔"

غیر جانبدار ملکوں اور خاص کر ریاستہائے متحدہ کو ملانے کی کشمکش میں ریڈیو نے اہم کام کیے ہیں یہاں پر بیرونی پروپیگنڈا کرنے والے کو اپنے جوہر دکھانے کا موقع ملتا ہے کیونکہ یہاں نہ تو محتسب (censor) ہے جو بیرونیستان کی باتوں کو عوام تک پہنچنے نہ دے اور نہ پولیس جو دشمن کی باتیں نہ سننے دے اگر زیان کا ریڈیو امریکہ کو کسی سمندری لڑائی کا غلط یا بڑھا کر چڑھا کر حال سناتا ہے تو امریکی ریڈیو یا بی بی سی سے اس کی تردید لازمی ہے لڑنے والی حکومتوں کے اس جھوٹے پروپیگنڈے کو دور کرنے کے لیے امریکہ میں ان لوگوں نے بہت کچھ کیا ہے جو خبروں کی ترتیب اور تجزیہ کرتے ہیں اس کے علاوہ اگر بیرونی پروپیگنڈا کرنے والا اپنے سننے والوں کی تعداد برقرار رکھنا چاہتا ہے تو اسے ان کی زندگی رسوم اور ادب کو سمجھنا اور ان کا نقطۂ نظر بھی جاننا چاہیے اور آخر میں اسے یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ

گزشتہ جنگ میں دونوں فریقوں نے ناقص تدابیر کیں خاص کر مظالم کی داستانیں بہت نمک مرچ لگاکر بیان کی گئیں اس وجہ سے لوگوں کو پروپیگنڈے کا احساس ہوگیا اس صورت حال کی وجہ سے بہت مبہم اور دھیمے انداز میں پروپیگنڈا کیا جاتا ہے۔

غیر جانبدار ملکوں کی ہمدردی حاصل کرنے کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ اپنا مفاد دشمن کے مقاصد سے برتر پیش کیا جائے اور یہ ظاہر کیا جائے کہ ہمارے مقاصد سچے اور مثالی ہیں اور دشمن کے جابرانہ اور پُرفریب ہیں اسی اصول کے ماتحت بی بی سی پر ریورینڈ میک کارمک نے امریکہ والوں سے کہا۔ "برطانیہ اور وہ تمام چیزیں جن کا وہ مدعی ہے کبھی فنا نہیں ہوسکتیں۔ وہ آخر ایک دن ضرور جیتے گا کیونکہ وہ اچھائی، حق، صداقت اور شرافت کا علمبردار ہے" اے وی الگزنڈر امیرالبحر امریکہ والوں کو یاد دلاتے ہیں کہ اگر انگریز فرانسیسی بیڑے کو جرمنی کے قبضے میں چلا جانے دیتے تو امریکہ کی حالت کس قدر مخدوش ہوجاتی" اس کے برخلاف ڈاکٹر آٹو کوائشل وزارامریکہ کو یہ پیغام بھیجتے ہیں جرمن جنگ کی سختیاں برداشت کرنے کے لیے تیار ہیں انہیں کسی مبہم، تاریک، بدل جانے والے نصب العین کی ضرورت نہیں جسے مثالی کہا جاتا ہو وہ محض زندہ رہنے کے حق کی مدافعت کررہے ہیں جو بہت ابتدائی، بنیادی اور مسلمہ حق ہے" ایک اور موقع پر نازیوں نے کہا "اب جرمنی آزاد حکومت کی حیثیت سے قائم رہنے کے لیے لڑ رہا ہے وہ رہنے کی جگہ کے لیے مصروف جنگ ہے . اس کی مراد اس جگہ سے ہے جس کی ایک قوم کو پرسکون اقتصادی ترقی کرنے کے لیے ضرورت ہوتی ہے اس میں وہ کوئی سازش یا معاہدے روا نہیں رکھ سکتا جرمنی کو قدرت ہی نے وسط یورپ کی جگہ رہنے کے لیے دی ہے۔ دشمنوں کو اس سرزمین سے باہر رکھنا ظلم نہیں"

جنگ کی کارروائی میں ہر فریق نے ایک دوسرے پر لعن طعن کی ہے برطانیہ پولینڈ پر مظالم سمندری جنگ میں بہت سے غیر انسانی افعال، مفتوح ممالک کی لوٹ مار اور کھلے شہروں کی بمباری پر نالاں رہا ہے ہیمنگس ۵ دسمبر ۱۹۴۲ء کو امریکیوں سے اس طور پر مخاطب ہوئے "میں بول رہا ہوں اور بم برسائے جا رہے ہیں جو پانچ میل تک تباہی اور بربادی پھیلا دیتے ہیں قتل عام، خونریزی میں

جان بوجھ کر نہایت دردناک قتل عام ہو رہا ہے کل ڈبے ہیے اور دم گھٹے ہوئے مرد، عورتوں اور بچوں کی ایک اور داستان ہوئی اور نازی اطمینان کے سانس لیں گے۔"

جرمن الٹے برطانیہ کی احتسابی کارروائی، استمارک کی تلاشی اور عوام کی بمباری کی بے ضابطگی پر زور دیتے ہیں۔ مثال دیکھیئے "ہمارا یہ خیال تھا کہ انگلستان بھی عوام مرد، عورتوں اور بچوں کو محض تفریحاً نہیں مارے گا۔ . . . جرمن عوام پر جو کچھ ہو رہا ہے اسے بہت توجہ سے یاد رکھا جا رہا ہے اور جب اس کی تفصیل پیش کرنے کا وقت آئے گا تو برطانیہ کو اس کی زبردست قیمت ادا کرنی ہوگی" برطانیہ نے اوران میں فرانسیسی بیڑے کے خلاف کارروائی کی تو برلن سے ای ڈی وارڈ نے اس کا مقابلہ اس طرح کیا جس سے اس کا ایسا ہی نقصان ہوا۔

جنگ کے ابتدائی مہینوں میں جب جرمن یہ کوشش کر رہے تھے کہ امریکہ سے تعلقات میں زیادہ کشیدگی پیدا ہو تو وہ امریکہ والوں کو جرمن سورماؤں مثلاً جرمن ہرکمر کی یاد دلاتے تھے جو جنگوں میں لڑتے تھے یا جنہوں نے وہاں کی زندگی میں نمایاں کام کیے مثلاً ڈاکٹر ہلن برگ جو پین سلوینیا میں مبلغ تھے جب امریکہ نے برطانوی فتح کی خواہش کی تو نازی پروپیگنڈے کے تیور بدلے دوسرے موضوع اختیار کیے جو ان کے مادی عناد کو ظاہر کرتے تھے اس میں اکثر دھمکی بھی ہوتی جس کا ذکر آگے کیا جائے گا۔

لڑنے والا جب ریڈیو اس غرض سے استعمال کرتا ہے کہ غیر جانبدار ملکوں کے ساتھ معاہدہ اور بعض اتحاد میں یگانگت ظاہر کرے تو وہ اس کے ساتھ ہی چاہتا ہے کہ اس کے دشمن سے ان ملکوں کے تعلقات خراب ہو جائیں جرمنی نے ریڈیو پر امریکہ کو بہت سے تاریخی اختلافات کی یاد دلائی۔ ان لڑائیوں اور تنازعوں کا بھی ذکر کیا ہے جو بوسٹن چائے پارٹی (Boston Tea Party) سے لے کر جنگی قرضے تک ہوتے رہے۔ نازیوں کے الزامات کا ایک محبوب موضوع یہ تھا کہ ۱۹۱۷ء کی طرح آج بھی برطانیہ امریکہ کو جنگ میں کھینچنا چاہتا ہے۔ "نام تاریخیں اور ترتیب بدل دیجئے" ای ڈی وارڈ کا قول ہے "اور آپ وہی داستان پائیں گے جو بائیس برس پہلے لکھی گئی تھی" رودبار انگلستان کی دوسری جانب سے انگریز مقرر اس وسیع خلیج کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو نازی عنائیت اور امریکہ کی جمہوری تخیلات کے درمیان حائل ہے اور اس

بات پر زور دیتے ہیں کہ امریکہ کے بین الاقوامی اخلاق کے تصورات ڈنمارک، ہالینڈ اور بلجیم پر جرمن حملے کو روا اور بجا قرار نہیں دے سکتے

امریکی امداد کے لیے ریڈیو کی لڑائی | اقتصادی، سیاسی اور فوجی معاملات کی طرح ریڈیو کی لڑائی میں بھی ڈکٹیٹروں کا رویہ تیز و تند اور جارحانہ رہا ہے اور جمہوریتوں کا کم از کم جنگ فلانڈرس تک تو ضرور دھیما اور مدافعتی رہا۔ ڈکٹیٹروں کو اس جنگ کو بہت پہلے برتری حاصل تھی روسیوں نے اشتراکی پرچار کرنے والوں کو جمہوریتی ممالک میں بھیجا مگر ان لوگوں نے اس تحریک کے خطرات کے باوجود اس کے ردعمل کے لیے ریڈیو سے بہت کم کام لیا جرمنوں نے عام رائے دہندگی میں سارے والوں کی موافقت حاصل کرنے کے لیے زبردست پروپیگنڈا ریڈیو سے شروع کر دیا اور فرانس کے پاس اس کا کوئی علاج نہ تھا اطالوی ریڈیو برابر عربوں کو انگریز ظالموں کے خلاف بھڑکاتا رہا اور برطانیہ نے دو سال کی خاموشی کے بعد کہیں اس کا دندان شکن جواب دیا۔

جب موجودہ جنگ چھڑی تو نازیوں نے اس میں پہل کی اور کئی مہینوں تک یہ سلسلہ جاری رہا ان کے پاس برسوں کے تجربے کا اعلیٰ ساز و سامان اور منظم عملہ تھا اور کچھ ہی دنوں میں وہ شمالی امریکہ والوں کو روز ۱۱ گھنٹے کا پروگرام سنانے لگے اور یہ وعدہ کرتے تھے کہ ساز رقص، لطائف و ظرائف فرانسیسی موسیقی اور دوسرے لطیف اور شیریں گانے اور باجے اور مزیدار چٹکلے آپ لوگوں کو برابر سنائے جائیں گے اور جنگ کا ان پر کوئی اثر نہ ہوگا۔ ساز رقص اور ہم آہنگ موسیقی کے درمیان تقریریں اور حالات حاضرہ پر تبصرے ہوتے تھے سب سے پہلے جرمنوں نے اس غرض سے امریکی مرد اور عورتوں سے کام لیا وہ سب امریکی زندگی سے آشنا تھے اور کچھ تو آئیوا اس فرڈ کالج (   ) کی طرح خاص علاقوں میں رہنے والوں سے انہیں کے انداز اور لب و لہجے سے گفتگو کر سکتے تھے شروع ہی سے ان مقرروں نے برطانیہ سے خود ساختہ الزامات اور مظالم منسوب کر دیے اور ان کا زبردست مظاہرہ کر کے امریکہ والوں کو جنگ میں حصہ لینے سے خبردار کیا ریاست ہائے متحدہ میں چند جماعتوں اور انجمنوں پر سخت نکتہ چینی کی جاتی تھی ان میں یہودی، اخبارات اور سیاست دان مخصوص تھے اس کے ساتھ ہی ان کی ہمدردی حاصل کرنے

اور یہ ظاہر کرنے کی کہ جرمنوں کی فتح سے امریکہ کے مفاد پر کوئی اثر نہیں ہوگا ہر ممکن کوشش کی جاتی تھی۔

۱۹۴۱ء کی گرمیوں سے نازی ریڈیو نے ریاست ہائے متحدہ کے ریڈیائی پروپیگنڈے میں نیا پہلو اختیار کیا گیا تھا اور چند ماہ تک زور و شور سے قائم رہا جرمن مقرر ان کی ہمدردی حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے تاکہ حکومت سے بے اعتباری پیدا ہو اور فرقہ واری جنگ چھڑ جائے پہلی مرتبہ نازی پروپیگنڈا کرنے والے اپنی بحث کرتے معلوم ہوتے تھے پھر ان کی کوشش محض یہ رہی کہ امریکہ جو برطانیہ کو روز بروز زیادہ امداد دے رہا ہے اسے روکا جائے اس کی کوشش میں وہ علانیہ حملے بھی کرتے تھے وہ امریکہ والوں کو خبردار کرتے تھے کہ اگر انھوں نے برطانیہ کی امداد جاری رکھی تو انھیں کف افسوس ملنا پڑے گا چونکہ امریکی تاجر آج کل جرمنوں سے تجارت نہیں کرتے وہ جنگ کے بعد بھی نہیں کر سکیں گے اور پھر ملک کو بہت سے نقصانات ہوں گے معیار زندگی گر جائے گا وغیرہ وغیرہ اور ان تنبیہوں کے ساتھ یقین دلایا جاتا تھا کہ ہٹلر کی جنوبی امریکہ پر نیت نہیں اور نہ وہ ریاست ہائے متحدہ پر کوئی تشدد انہ کارروائی کا منصوبہ رکھتا ہو۔ ریاست ہائے متحدہ اس کے رہنماؤں اور اداروں پر جرمنوں کے بڑھتے ہوئے حملے دیکھتے ہوئے اور اس حقیقت کو مدنظر رکھتے کہ جرمن ریڈیو کا جو رویہ امریکہ اور برطانیہ کی طرف ہے اس میں بہت کم فرق رہ گیا۔ امریکہ والوں نے لازماً یہ نتیجہ نکال لیا کہ جرمن انھیں دشمن خیال کرتے ہیں۔

برطانوی پروپیگنڈا فرانسیسی سے زیادہ منظم اور مالی حیثیت سے بہتر تھا مگر اس کے مقابلہ میں جرمن عاری سے پہلے پھس اور بے جان تھا پرنسٹن مرکز سماعت امریکہ نے اس کا جو تجزیہ کیا تھا وہ پیش کیا جاتا ہے۔

"ریاست ہائے متحدہ والوں کے سننے والوں کے ساتھ نوآبادیات اور مقبوضات کا سا رویہ تھا۔ کیونکہ سننے والوں کو خبریں سنانے کے لیے لندن کی نشرگاہیں اپنے غیر ملکی محکمہ پر اعتماد کرتی تھیں جو مقبوضات کو بھی خبریں سنایا کرتا تھا اور امریکہ والے معمولی خبریں بھی اس طرح سننے کے عادی ہو گئے تھے وہ سارے نظام شمسی کی تباہی کا پیش خیمہ ہوں اور ملک کے اندر جو طرز عمل تھا اسی سے یہ پالیسی ہم آہنگ نوآبادیات اور مقبوضات کی امداد جنگ اور ان کی فوجوں کے برطانیہ میں نقل و حرکت بیان کرنے پر بہت صرف کیا جاتا تھا" لارڈ مسٹر ابولجی برطانوی مزدوروں کے نمائندے نے فروری ۱۹۴۲ء میں بی۔ بی سی

کی نشر کی ہوئی خبروں کی قلت، تکرار اور پھیکے پن کی شکایت کی تھی اور امریکہ کے سننے والوں نے اس سے اتفاق کیا تھا۔

لیکن مئی ۱۹۴۲ء کے آخر سے برطانیہ کے امریکی نشریات بڑھ گئے اور جاندار بھی ہو گئے۔ خاص طور پر پروگرام تیار کر کے وہاں والوں کو سنائے جاتے تھے اس میں سترہ مقرر حصہ لیتے تھے جن میں سے جے بی پرسٹلی، وکہم اسٹیڈ، لسلی ہاورڈ، سامرسٹ ماہم وغیرہ بھی شامل تھے برطانیہ نے ان ممتاز لوگوں سے کام لے کر جنہیں امریکہ والے تصانیف یا سائنسی کمالات کی وجہ سے جانتے تھے جرمنوں پر فوقیت حاصل کر لی جرمنی کے مقرر امریکہ والوں کے لیے اجنبی تھے اور اکثر ایسی زبان اور لہجہ اختیار کرتے تھے جو ان کے مذاق کے مطابق نہیں ہوتا تھا برطانیہ نے دلچسپ مباحثے اور اعتراضات بھی نشر کرنا شروع کیے جو ابھی تک جرمنی کا امتیاز تھا امریکہ والے جو بی بی سی کے محتاط اور پروقار مقرروں کو سننے کے عادی تھے اس قسم کے اعلانات سن کر جو نئی پالیسی کے مظہر تھے کافی متحیر ہوئے کہ شاہزادی الزبتھ کو نہ بھولیے گا وہ آئندہ اتوار کو گرینچ اسٹینڈرڈ ٹائم پر پونے آٹھ بجے تقریر کریں گی۔"

جنگ فلانڈرس کے بعد ریڈیو کے نظم و نسق میں جو یہ ترقی ہوئی اسی کے متوازی پروپیگنڈے میں نئی حیثیت سے نمایاں تبدیلی کی گئی اس سے پہلے برطانیہ والے محض اپنی فتح ہونے پر زور دیتے تھے جس کا مقصد یہ تھا کہ جرمن دھمکیوں کا کوئی لحاظ نہ کیا جائے اور آزادی سے اتحادیوں کو مدد دی جائے برطانیہ والے یہ بھی کہتے تھے کہ وہ پروپیگنڈے سے بالکل محترز ہیں۔ مگر انھوں نے نیا طرز عمل اختیار کیا ریڈیو کے موضوعات دفعتاً بدل گئے انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ برطانیہ اور امریکہ کی قسمتیں الگ نہیں کی جا سکتیں ہیں اور ہٹلر کا اگلا نشانہ امریکہ ہی ہے چونکہ امریکہ کے تحفظ میں برطانیہ پہلی کڑی ہے اس وجہ سے یہ مناسب ہے کہ امریکہ کی مادی اور اخلاقی امداد پر زیادہ سے زیادہ اعتماد کیا جائے جرمن ریڈیو امریکی رائے عامہ میں تفرقہ پیدا کرنا چاہتا تھا۔ اس کے برخلاف برطانیہ ان کو اپنی امداد کے لیے متحد کرنا چاہتا تھا اس کے مقرروں نے اتحاد اور دونوں قوموں کے مفاد اور جذبات میں یگانگت پیدا کرنا چاہی۔

فرانسیسیوں نے جنگ چھڑنے پر امریکی رائے عامہ کی طرف کوئی توجہ نہیں کی اور انھوں نے امریکہ کی مدد لینے کا کام برطانیہ ہی کے سر ڈال دیا ان کے امریکی پروگرام میں محض خبروں کا خلاصہ پیش کیا جاتا تھا جس میں صرف واقعات ہوتے تھے اور گانے، ڈرامے اور ادبی چیزیں بہت عالمانہ اور بے روح ہوتی تھیں۔ یہ اکثر بالکل عقیدت مندانہ ہو جاتیں اور اس دلچسپی اور جاذبیت سے عاری تھیں جو کہ اکثر برطانوی پروگراموں میں ہوتی تھی ان میں بہت سے فنی عیوب تھے مثلاً ایسے فرانسیسی مقرر … تھے جو خبروں کا لفظ بہ لفظ اور وہ بھی دقت پر ترجمہ کرتے تھے اور اکثر زنانے لہجے میں بولتے تھے جو ایک جنگ ملک کے لیے بالکل مناسب نہیں تھا۔ پروگرام امریکہ والوں کے مذاق کے مطابق بنانے کی بہت کم کوشش کی جاتی تھی لیکن ڈنمارک پر حملے کے بعد ہی فرانسیسیوں نے اپنی ساری ریڈیو پالیسی کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا گو ملکی پروگراموں میں کم ترقی کی گئی لیکن بیرونی نشریات خاص طور سے ہالینڈ پر حملے کے بعد بہت بہتر ہو گئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس زمانے سے لے کر شکست کھانے تک کے مختصر عرصہ میں فرانس نے پروگراموں کا ایسا سلسلہ پیش کیا جو امریکہ میں سے جانے والے تمام نشریات سے زیادہ دلچسپ تھے پروگراموں کے درمیان خبریں سنائی جاتی تھیں چنگ و رباب کی بجائے فوجی بینڈ اکثر و بیشتر بجایا جاتا تھا اور امریکی سفیر اور پناہ گزیں اکثر تقریریں کرتے تھے۔ جمہوری ممالک میں پیرس موبائل پہلی نشرگاہ تھی جو امریکی مقررین کو اپنے پروگراموں میں باقاعدہ جگہ دیتی رہی۔

اس اٹھارہ ماہ کی ریڈیائی جنگ پر نظر ڈالتے ہوئے ہمیں یہ نتیجہ نکالنا پڑتا ہے کہ نازی ریڈیو نے وسیع تجربے، بہتر نظم و نسق اور زیادہ جاندار اور جارحانہ پالیسی کے باوجود امریکی عوام پر برطانیہ سے کم اثر کیا۔

پہلے تو ریڈیو پروپیگنڈے کی فضا برطانیہ کو راس آئی ہے گیلپ میں جو رائیں لی گئی تھیں اس کے مطابق ریاست ہائے متحدہ میں بہت زیادہ لوگ برطانیہ کے ہمدرد نکلے وہ لوگ عموماً اس خیال کے حامی ہیں کہ اقتصادی، فوجی اور تمدنی نظریات کے علاوہ مفاد بھی متوازی اور اکثر ایک ہی ہے۔ قدرتاً ہر شخص اپنے ساجھے دار اور دوست کی بات زیادہ ہمدردی سے سنے گا نہ کہ اس کی جو تجارت میں اس کا حریف اور ساتھ ہی دشمن بھی ہو برطانیہ میں مسٹر ونسٹن چرچل ایسے مقرر ہیں جن کی پر اعتماد دھیمے تلے اور موزوں طرز ادا

کا جس میں جا بجا طنز اور بذلہ سنجی جھلکتی رہتی ہے کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا اس کے علاوہ جنگ کے بنیادی حقائق ایسے ہیں جو امریکہ کے سننے والوں کو جرمن مفاد کے علمبرداروں سے پہلے ہی سے بدظن کر دیتے ہیں۔ گزشتہ جنگ میں جرمنی نے بلجیم پر جو دست درازی کی اور آبدوزوں اور زہریلی گیس کا استعمال کیا اسے وہ کبھی نہیں جھٹلا سکتا اسی طرح وہ جو کچھ یہودیوں پر کر رہا ہے اور کرنے والا ہے یا جس بے دردی سے اس نے راٹرڈم کو برباد کیا ہے اسے گانے کے ٹکڑے یا اور بہلانے والی باتیں کسی طرح دور نہیں کر سکتیں۔

دوسرے ریڈیو سننے والوں کا معاملہ ہے یہاں بھی برطانیہ کو برتری حاصل ہے مستند اعداد و شمار سے یہ پتہ چلتا ہے کہ امریکی سننے والوں میں دس پندرہ فی صدی سے زیادہ یورپ کی شارٹ ویو نشریات کو نہیں سنتے اطالوی یا جرمن شارٹ ویو نشریات سننے والے زیادہ تر یا تو نوآبادیوں یا جن کی امریکہ میں پہلی پشت ہے حقیقتاً اس موضوع میں دلچسپی لینے والوں میں بہتوں کا خیال ہے کہ نازی اور فاسستی ریڈیو کا خاص مقصد یہ ہے کہ ان جماعتوں سے عقیدت پیدا کی جائے یا اسے قائم رکھا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے ہمدردوں اور ایجنٹوں کالم والوں کی رہبری کی جائے تاکہ وہ ملک میں اس قسم کا پروپیگنڈا کر سکیں امریکی عوام میں ایسے سننے والوں کا تناسب بہت کم رہا اس کے برخلاف بہت سے برطانوی پروگرام امریکہ میں دوبارہ نشر کیے جاتے ہیں سنہ ۱۹۴۰ء کے آخر تک اٹھائی امریکی نشرگاہیں بی بی سی کی خبریں نشر کرنے لگی تھیں اور امریکہ ایک خاص سلسلہ نشریات باہمی) تو انھیں پھر سے سناتا تھا اور مسائل حاضرہ پر تقریریں بھی کراتا تھا اس کے علاوہ کناڈا کی نشرگاہوں کو ریاست ہائے متحدہ میں اکثر جگہ اچھی طرح سنا جا سکتا تھا اور وہ لندن کے نشریات کو مفصل پیش کرتی تھیں مزید براں جنگ پر ان کے اپنے خیالات برطانیہ ہی کی طرح ہوتے تھے کناڈا کے ریڈیو کے اس بیش بہا وسیلۂ گفتگو کا جرمن مقابلہ نہیں کر سکتے۔

ایک اور فوقیت جو برطانوی ریڈیو کو جرمنی پر حاصل ہے وہ اس کی راست بازی ہے اطالوی اور جرمن نشریات میں عموماً واضح طور پر غلط تصویر پیش کی جاتی ہے اور غلط بیانی یا سراسر جھوٹ سے کام لیا جاتا ہے۔ گو بی بی سی سچ سے کبھی نہیں ہٹتا بی بی سی البتہ اکثر پوری حقیقت نہیں بیان کرتا یا بعض خبریں دیر میں سناتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ سچ کی تلاش میں اسے دیر لگ جاتی ہے ہمیشہ اس کی نشریات میں بہت زیادہ

سچائی سے کام لیا گیا ہے۔ جرمن اور برطانوی ریڈیو ان وکیلوں کی طرح ہیں جن میں ایک تو شہادت بناتا ہے اور دوسرا، اخلاق سوز حرکتوں سے محترز رہ کر اپنے موکل کا مقدمہ بہتر سے بہتر تیار کرتا ہے اس بات کا کافی ثبوت موجود ہے کہ امریکہ میں سننے والے برطانوی خبروں پر جرمن خبروں سے زیادہ یقین کرتے ہیں اور بی بی سی کے اسی رویہ سے امریکیوں کو اس کی خبروں پر زیادہ اعتماد ہو گیا اور انھیں پروپیگنڈے کا جو خوف گھیرے ہوئے تھا وہ قطعاً دور ہو گیا۔

پروپیگنڈے کا یہ تصور بھی آزاد خیالی میں بہت بڑی رکاوٹ ہے شریک جنگ ملک کی ہر بات پروپیگنڈا قرار دے کر اس سے کان پھیر لینے کی ذہنیت بڑی حماقت ہے۔ اہم مسئلہ تو یہ ہے کہ آیا یہ بات صحیح اور اپیل مناسب ہے یا نہیں اکثر دیکھا گیا ہے سینما میں جب تباہ کردہ کوونٹری کے مناظر پیش کیے جاتے تھے تو طالب علم اسے پروپیگنڈا کہتے ہوئے اپنی نشستوں پر اچھلے پڑتے تھے ہمیں غلط فہمی کی وجہ سے سچ کو جھوٹ نہ سمجھ لینا چاہیئے اور نہ مفروضہ باتوں پر کام کرنا چاہیئے۔ (ترجمہ)

مترجمہ شفقت اللہ کرمانی بی اے (آنرز)

سائنس اور معاشرہ

موجودہ زمانہ کو عام طور پر سائنس کے دور سے تعبیر کیا جاتا ہے ظاہر اس کا سبب یہ ہے کہ سائنس اگر انسانیت کے تمام شعبوں میں نہیں تو کم از کم اکثر میں اپنا اقتدار پوری طرح قائم کر چکی ہے عموماً سمجھا جاتا ہے کہ ازمنۂ گزشتہ میں سماج کے پیچھے جو مقصدی طاقت تھی اس کا نام تھا مذہب یا توہمات، اصنام پرستی اخلاقیات اور تصرف کا وسیع میدان یہ سب اس صنف میں شامل کیے جاتے ہیں لیکن صنعتی انقلاب نے ان سب کو بدل ڈالا مذہب کو سائنس کے آگے جھکنا پڑا۔ انیسویں صدی عیسوی میں اس طریقۂ فکر نے بڑی ترقی کی خصوصاً ڈارون، ہکسلے اور اسپنسر نے مذہبی اعتقادات کی بنیادوں کو کمزور کر کے دلیل کو اس کی جگہ پر پوری طرح مسلط کر دیا اس زمانہ سے آج تک صنعتی ایجادات، فطرت کی تسخیر، حیاتیاتی اور انسانیاتی ترقیوں نے فاصلہ کو کم کر دیا، مجموعی پیداوار کو بڑھا دیا اور انسانیت کو اس کے اسان نابندہ ہونے کا یقین دلا کر اس کی ذہنی آزادی کو وسعت دی مختصراً یوں کہا جا سکتا ہے کہ اس کا اثر یہ ہوا کہ سائنس نے مذہب کو اس کی مربیانہ سرپرستی سے جو وہ سماج کی کرتا رہا ہے بالکل خارج کر دیا اس عقلیت پسندی سے متاثر ہو کر انسانی دماغ مستقبل کی پہنائیوں میں ڈوب کر کچھ حقائق کی تلاش کرنا چاہتا ہے خیال پرستانہ کتابیں لکھی جاتی ہیں اور سنجیدہ آدمی طفلانہ پیشین گوئیوں میں مبتلا ہو کر معاشرہ کی ترقی اسی نہج پر قرار دیتے ہیں ان پیشین گوئیوں کے پیچھے یہ اصول کارفرما ہے کہ جو طریقہ ہائے کار آج عمل پیرا ہیں وہ اصولاً آئندہ بھی بغیر روک ٹوک اسی طرح کام کرتے رہیں گے مختصر یہ ہے کہ معاشرہ کی ترقی کو ایک نئے عہد سعادت تک پہنچنے کے لیے راستہ مل جائے گا۔

بعضوں کا یہ خیال ہے کہ معاشرہ کے ارتقا میں سائنس کسی طرح کی کوئی امداد نہیں کر سکی مگر یہ تصور تاریخی حیثیت سے بھی درست نہیں یہ اس غلط ذہنیت کی پیداوار ہے جو اس نام نہاد متمدن دور پر طاری ہے اور جس کو بے جا اہمیت دی جاتی ہے یہ تنگ نظریہ اس گروہ کا ادعا ہے جو بزعم خود اپنے آپ کو تعلیم یافتہ

بہت سی حیرت انگیز سائنسی ایجادات یعنی سائنس کے ان شعبوں کی ترقیاں جو حقیقی معنوں میں سماج سے تعلق رکھتی ہیں اور انسان کی روزمرہ کی زندگی نے یہ ایک ذہنیت کب پیدا کی ہو، تو یہ ہو کہ سائنس اور سماجی ترقی دونوں ساتھ ساتھ چلتی ہیں سماجی ترقی میں سائنسی عنصر کے پیچھے بڑی طویل تاریخ ہے۔ تاریخ میں اس قدیم زمانہ تک سے حاوی ہوتے عموماً قبل از تاریخ کہا جاتا ہے آگ کا اکتشاف شاید سب سے بڑا سائنسی کارنامہ تھا جانوروں کی پرداخت ترقی پاکر مینڈل کے نظریہ وراثت تک پہنچ گئی اور اسی طرح مویشی کی افزائش نسل کے نئے طریقے ہیں۔ جو دایک بڑا کارنامہ میں کشتی بنانے کی، تب ان کوششیں، ہتھیاروں کا رواج، مٹی کے برتنوں کا استعمال، مکانوں کی پہلے پہل تعمیر قدیم انسان کا سردی اور گرمی سے بچنے کا احساس اور کوشش، کپڑوں کی ایجاد اور زراعت کا رواج، کھانا پکانے کے لیے آگ کا رفتہ رفتہ استعمال —— یہ تمام مثالیں معاشرہ پر سائنس کے اثر کے سلسلہ میں پیش کی جاسکتی ہیں یہ سلسلہ چلتا رہا اور یہاں تک کہ یونانی اور لاطینی زمانہ بھی جاری رہا۔ جون آسٹریجی کے الفاظ میں قرون سابقہ کے ابتدائی کارنامے ہوتے تھے اور ان میں اس طرح کی چیزیں شامل تھیں جیسے زمین کی کاشت کا رواج بعض جانوروں کا پالنا اور جہازوں کی ایجاد وغیرہ" اس نوع کی اور بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں مثلاً فن تحریر کی ایجاد اور ترقی، کاغذ کی ایجاد، سنار اور لوہار کے کاموں کی ابتدا، فن تعمیر کی حیرت انگیز ترقی کا اندازہ ایشیا کے محلات، اہرام مصر، شمالی ہند اور وسط افریقہ کی عبادت گاہوں سے آسانی کیا جاسکتا ہے اسی طرح کے چھوٹے بڑے بے شمار ایجادات، اکتشافات اور تجربات یہ ثابت کرتے ہیں کہ سائنس ہمیشہ ان مسائل کے حل کرنے کی کوشش کرتی رہی جس سے تاریخ للقا کے سلسلے میں دوچار ہونا پڑا انسان کی یہ کوشش اپنی زندگی کا معیار بلند تر کرنے کے لیے ہوتی رہیں۔ یہ عمل قرون وسطیٰ میں بھی جاری رہا جیسا کہ بالخصوص صنعتی فنون اور جہازرانی کی ترقیوں سے ظاہر ہوتا ہے اور اس طرح انسانی زندگی کی یہ دلفریب کہانی موجودہ زمانہ تک آپہنچی ہے۔

کارل مارکس نے کہا تھا کہ مادی زندگی میں پیداوار کا طریقہ عمومی پہلوؤں یعنی سماجی، سیاسی اور روحانی عوامل کو متعین کرتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں تاریخ کا مادی تصور ہم کو یہ بتاتا ہے کہ تاریخ بہت

سے اسباب کا ایک پیچیدہ نتیجہ ہے جس میں اقتصادی یا صنعتی سب سے اہم ہے اس اصول کو تسلیم کرکے اور اس موجودہ معاشرہ پر منطبق کرکے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ صنعتی پیداوار کا طریقہ ہی معاشرہ کا عامل متعین کرکے اس کے مستقبل کی تشکیل کرتا ہے اسی کو دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ موجودہ معاشرہ کا واحد اور سب سے بڑا کارنامہ پیداوار کا بدلا ہوا طریقہ ہے جو صنعتی انقلاب کی وجہ سے وجود میں آیا اس طرح ہم یہ دیکھ سکتے ہیں کہ آج معاشرہ اور سائنس کا تانا بانا کس طرح ایک ساتھ ملا ہوا ہے اگر سادہ الفاظ میں صنعتی انقلاب کی تعریف کی جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ نام ہے صنعتی پیداوار میں سائنسی طریقوں کے استعمال کرنے کا۔ ان سائنسی ایجادات ہی کی وجہ سے یہ ممکن ہوا کہ صنعتی پیداوار کے سلسلے میں تقسیم کار کا ٹھیک ٹھیک لحاظ رکھا جائے۔ اور اس کا نتیجہ ایک زبردست صنعتی پیداوار کی صورت میں ظاہر ہوا۔ دنیا میں ہر قسم اور ہر رنگ کی چیزیں پھیل کر عام ہو گئیں اشیاء کی مقدار میں اضافہ ہو جانے سے ان کی قیمتیں گھٹ گئیں۔ یہ طریق عمل پیچیدہ اور طولانی سا تھا مگر اس کا عمومی اثر یہ ہوا کہ ہمارا معیار زندگی ایسا بڑھ گیا کہ کسی دوسرے زمانہ میں اس کی کوئی اور مثال نہیں ملتی نت نئے تکلفات سیلاب کی طرح امنڈ آئے اور پرانے تعیشات اپنی اہمیت کھو بیٹھے اور جہاں تک صنعتی ممالک کا تعلق ہے اس میں متوسط اور مزدور طبقہ کا معیار زندگی بدل گیا بلکہ پرانے خیالات کی قدروں میں ایک زبردست انقلاب پیدا ہوا یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے اور ہمارے خیالات تیزی سے بدل رہے ہیں یہاں تک کہ کل کے حالات کی آج تعبیر کرنا بھی آسان نہیں۔ نوع انسان بلند سے بلند تر معیار کی طرف جا رہی ہے اور وہ چیز جس نے اس عظیم الشان کارگہ ترقی کو چلایا اور اب بھی چلا رہی ہے وہ سائنسی اختراع کی کرشمہ سازی ہے صنعتوں میں برابر مشین کا استعمال کیا جا رہا ہے اور پیداوار میں انسانی عنصر رفتہ رفتہ برائے نام رہ گیا ہے اسی سے ہمارے متمدن دور کا یہ اہم مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ اجتماعی زندگی میں ہمارے کام کی وہ دلکشی باقی نہیں رہی جو پہلے تھی سائنس نے نہ صرف صنعت و حرفت کو مشینوں کے پھیلے ہوئے جال میں جکڑ دیا بلکہ اس کی کوشش انسان کو بھی میکانکی بنا دیا ہے۔

اس طرح سائنس نے معاشرہ کے پورے اساس کو بدل دیا قرون وسطیٰ کی سماج کے آثار پر اس جدید سرمایہ دارانہ نظام کی بنیاد پڑی جس طریقہ عمل سے یہ عہد تغیر پیدا ہوا اس کا نام صنعتی انقلاب ہے۔

اور یہ صنعتی انقلاب صرف ان چند سائنسی ایجادات کا نتیجہ ہے جنھوں نے اپنا اثر صنعتی پیداوار کے اصولوں پر ڈالا اس فضا سے سائنس برابر ترقی کر رہی ہے اور صنعت و حرفت میں ایسا انقلاب برپا ہوا ہے کہ ہمارا معاشرہ بڑی بڑی تبدیلیوں سے ہو کر گزر رہا ہے سرمایہ داری کو سائنس نے روشناس کیا اور یہ بھی پیداوار کے اصولوں میں سائنس کی روز افزوں اہمیت ہے جو ہمارے معاشرہ کی تشکیل کا مطالعہ کر رہی ہے پس سائنسی ایجادات کا جدید معاشرہ کے بنانے میں بھی پورا پورا ہاتھ ہے ہوئے سماجی نظام کی پیداوار میں بھی وہ اپنا اثر ڈال رہی ہیں صنعتی انقلاب کے دوران میں سائنسی اختراعات کو ایک بنانا یا سماجی نظام اپنا کام کرنے کیلیے مل گیا جس کا نام سرمایہ داری ہے اگرچہ سماجی ترقی اس پرانے سماجی نظام کو بہت پیچھے چھوڑ چکی ہے جس طرح کہ صنعتی انقلاب کے زمانہ میں ہوا لیکن پھر بھی ہی چیزوں میں ہم آہنگی قائم رکھنے کے لیے ایک معاشرتی سلسلہ اب بھی قائم ہے البتہ اس میں فرق یہ ہے کہ سرمایہ داری کو خوش آیند سمجھ کر عام طور پر قبول کر لیا گیا اور اشتراکیت کی آج بڑی سخت مخالفت کی جا رہی ہے حقیقت یہ ہے کہ سرمایہ داری کی کبھی بھی یہ کوشش نہیں تھی کہ پرانے راستہ سے قطعی طور پر علیحدگی اختیار کر لی جائے مگر برخلاف اس کے اشتراکیت سرمایہ دارانہ سماج کو جڑ بنیاد سے پھینک دینا چاہتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تبدیلیاں ایک زبردست اندرونی کشمکش کے خارجی اثرات ہیں یہ کشمکش ایک حرکیاتی قوت کی ہے جو کسی سیاقی معاشرہ میں؛ سائنسی ایجادات سیلاب کے بہاؤ کی طرح بڑھتے چلے آتے ہیں معاشرتی ڈھانچہ آتش فشاں پہاڑ کی طرح خاموش رہتا ہے اور پھر ایک بارگی ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔

نہ صرف یہ کہ سائنس نے صنعت و حرفت کے اصولی پہلوؤں کا نئے سرے سے چولا بدل ڈالا اور اس طرح گویا معاشرہ کے اساسی عنصر میں تبدیلی رونما ہوئی بلکہ اس کا کام معاشرہ پر خبر رسانی اور جنگ کے ضمن میں بھی اثر انداز ہوا خبر رسانی کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ سائنس نے دو مختلف قسم کے نتائج پیدا کیے ہیں سائنسی تحقیقات کا ایک پہلو یہ ہے کہ اس سے یہ مرکز گریز نتیجہ پیدا کیا اور دوسرا اس کے بالکل برعکس مائل بہ مرکز۔ بھاپ کی ایجاد کے بعد دخانی انجن نے نقل و حمل میں سب سے بڑی تبدیلی پیدا کر دی کیونکہ اسی کی وجہ سے موٹر اور ہوائی جہاز وجود میں آئے اور سمندر کی موٹر کو بھی اسی میں شمار کرنا چاہیے موٹر اور ہوائی حرکیات کی، انجینیری کی غیر معمولی ترقی اور اسی کے ساتھ ساتھ مختلف دھاتوں اور ہوائی حرکیات

کی ایجادوں اور کام ہے وقت اور رفتار کے تمام نظریے بدل ڈالے ہیں ہوائی جہاز نے دنیا کے اس وسیع کرہ کی لمبائی کو سمیٹ کر مختصر کر دیا ہو لیکن، کنگز فورڈ اسمتھ اور اسکاٹ کی پروازوں نے زمین کے بہت سے خطوں کا کھوج لگایا ہو جو مہذب دنیا سے الگ تھلگ تھے پوسٹ اور گیٹے کی دنیا کے گرد پروازوں نے تمام کرہ کی ہوابازی کے اور اسی طرح روسی قطب کی پروازوں نے لمبے فاصلہ کی ہوابازی کے امکانات زیادہ وسیع کر دیے ہیں۔

ہوائی جہاز سے بھی زیادہ اہم موٹر ہو کیونکہ ہوائی جہاز ابھی تک دولت مندوں کا کھلونا ہو لیکن فورڈ نے موٹر کو متوسط طبقے تک پہنچا دیا ہو جیسا کہ ہونا چاہیے تھا اس کے نتائج غیر معمولی طور پر دوررس ثابت ہوئے مختصراً یوں کہا جا سکتا ہو کہ ہر طرح کے فاصلے کم ہو گئے اس طرح اگر تمام نہیں تو کم از کم آپس کے اکثر چھوٹے شبہات رفع ہو کر مختلف اقوام کا رشتۂ اتحاد اور زیادہ مضبوط ہو گیا اس طرح کے رابطہ محبت بڑھ جانے سے بین الاقوامی اخوت کے مواقع اور زیادہ بڑھ گئے سفر کے سستا اور مختصر ہو جانے کے باعث انسان کو جرأت ہوئی کہ وہ تمام دنیا میں جائے اور ان ملکوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھے جنھیں وہ صرف عالم خواب میں دیکھتا تھا۔

جبکہ ہوائی جہاز، موٹر اور دریائی موٹر ہمیں اپنے گھروں سے باہر جانے کی دعوت دیتے ہیں ریڈیو گرامو فون اور متحرک فلم ہمیں ترغیب دیتے ہیں کہ ہم ان سے زیادہ دور نہ رہیں صحیح معنوں میں ریڈیو اور گراموفون نے "دنیا کو ہمارے سامنے لا کھڑا کیا ہو" جیسا کہ جولین ہکسلے نے کہا ہو "اس دس لاکھ آوازوں کے گانے والے تار نے سیاستداں اور موسیقار، استاد اور مبلغ کی آوازوں کو محض ایک لکھے ہوئے بیاں کے بجائے ان کے سامنے پیش کر دیا ہو اس طرح اس نے ہمیں موقع دیا کہ ہم نغمہ و سرود کی صحبتوں سے لطف اندوز ہوں جو سیکڑوں اور ہزاروں میل کے فاصلہ پر برپا ہیں" اسی نوع کا اثر گراموفون کا بھی ہو ریڈیو اور گراموفون سے ہم صرف سن سکتے ہیں مگر سینما ہمیں دیکھنے کا بھی موقع دیتا ہو اور یہاں تک کہ بعض مصنفین کی بلند پروازی اس میں سونگھنے اور محسوس کرنے کے امکانات بھی تلاش کر رہی ہو۔

اس سائنسی ایجادات کے اجتماعی اثرات بہت مختلف النوع اور دوررس ہوئے عمومی طور پر یہ

کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے نئی موسیقی، لطف اندوزی کے نئے خیالات اور مختصر یہ کہ ایک نئی ذہنیت پیدا کی ہے یہ نئی موسیقی، ریڈیو گراموفون اور ناطق فلم کے ذریعہ سے عالم وجود میں آئی ہے نئی موسیقی کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلی چیز جس کا لحاظ ہمیں رکھنا ہے وہ یہ کہ اس کے ذرائع اظہار عالمگیر ہیں دوسرے یہ کہ وہ عالمگیر دلچسپی کی رعایت سے بنی ہے اور تیسرے یہ کہ دنیا کے بیشتر حصوں کے عوام عموماً ادنیٰ درجہ کا جمالیاتی ذوق رکھتے ہیں اس کے علاوہ یہ بھی واقعہ ہے کہ سینما اور ریڈیو کی قسم کے بہت سے موسیقیاتی کھیلوں کا اصل مقصد روپیہ کا انبار پیدا کرنا ہے اور اسی سے وہ جدید موسیقی وجود میں آئی جسے جاز کہتے ہیں۔ الڈس ہکسلے لکھتا ہے "تاثرات ہر جگہ یکساں ہوتے ہیں لیکن ان کا فن کارانہ اظہار ایک زمانہ سے دوسرے زمانہ اور ایک ملک سے دوسرے ملک میں مختلف ہوتا رہتا ہے جس طرح فاصلہ کی دوری اس کو علیحدہ کر دیتی ہے اسی طرح وقت کی دوری بھی" نہ بجائے خود یہ واقعہ کہ جاز تمام اقوام کے سامعین کے لیے بنایا گیا ہے یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس میں کسی باریکی اور نازک خیالی کی گنجائش نہیں یہاں اتنا کہہ دینا ضروری ہے کہ چونکہ جدید جاز امریکی پیداوار ہے لہذا جاز کی نازک خیالی بھی امریکی ہوگی جو ایک جاپانی یا ہندوستانی کی سمجھ سے باہر ہوگی اس طرح اگر جاز کے سروں کی ترتیب تال کے لحاظ سے دیکھی جائے تو اس کی آواز "ٹم ٹم ٹم ٹم" کی طرح نکلتی ہے اور یہ موسیقی کا ایسا ساز ہے جو تمام ملکوں میں مشترک ہے خواہ ان میں گانے کا رواج کتنا ہی کم کیوں نہ ہو جاز موسیقی کے بہت ابتدائی اثرات کے لیے تسکین بخش ثابت ہو سکتی ہے جو تمام انسانوں میں مشترک پائے جاتے ہیں اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ جدید جاز کی ہم آوازی اور ہم آہنگی کے دو اساس میں اولاً سائنسی ایجادات کی بدولت عالمی بازار کا لحاظ ثانیاً ایک ایسے ناچ کی ایجاد جو موسیقی کو اس طرح تقسیم کر دے کہ اس کو عالمگیر طور پر سمجھا اور لطف اٹھایا جا سکے گراموفون اور ریڈیو نے جاز کو عام مقبولیت بخشی ہے اور اب یہی کام سینما بھی کر رہا ہے موسیقی فلم بنائے جانے کے بعد یہ دلچسپ حقیقت تسلیم کرنا پڑتی ہے کہ اس جدید جاز کو بغیر ناچ کے پس منظر کے سمجھنا دشوار ہے سینما کے معاشرتی اثرات میں سے جو چیز سب سے نمایاں نظر آتی ہے وہ یہ کہ اس نے لطف اندوزی کا ایک نیا معیار اور ایک نیا صناعانہ رنگ پیدا کیا ہے وہی دو اثرات جن کے باعث جاز کا وجود عمل میں آیا — عالمی بازار کا لحاظ اور عالمگیر لطف اندوزی — انھیں نے فلمی فن کاری کو بھی موجودہ صورت بخشی ہے محض یہ لحاظ کہ ہالی وڈ اور اسٹری

میں جو فلم بنایا جائے وہ بھی اپنی اشاعت میں اتنی ہی وسعت اختیار کرے جتنی کہ مغربی تہذیب، اس بات پر مجبور کرتا ہو کہ اداکاروں اور سینمائی ساز و سامان پر بے اندازہ روپیہ صرف کیا جائے۔ اس مصروف، پریشان اور تنگی ہوئی دنیا میں سینما زندگی کے لیے بڑی تسکین ہو ہمارے متمدن معاشرہ میں اسی کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہوا اور اسی لیے وہ عالمگیر تفریح کا ذریعہ بن گیا ہو۔

اب تک ہم نے سائنس کے کارنامہ کے اس حصہ پر گفتگو کی ہو جس نے انسانی معاشرہ کی یکجہتی میں امداد کی ہو سائنس کا کارنامہ جنگ کے میدان عمل میں معاندانہ ذہنیت کا کھڑا کر دینا ہو جس کا انجام قوموں کا الگ الگ ہو کر آپس میں دست و گریبان ہو جانا ہو۔

جنگ کے سلسلے میں سائنس کا سب سے پہلا کارنامہ جنگی ہولناکیوں کو آخری درجہ تک بڑھا دینا ہو سائنس کی مدد سے بنائے ہوئے جنگی اسلحہ کی تیزی اور موجودہ لڑائیوں میں زہریلی گیسوں کے استعمال نے نہ صرف سپاہی بلکہ شہری کی زندگی کو بھی خطرہ میں ڈال دیا ہو جنگ کا دوسرا مگر سب سے بھیانک پہلو جنگ کی تباہ کاریاں ہیں اگر یوں کہا جائے تو کوئی مبالغہ نہیں کہ آج کل کی جنگ میں نہ بم سے عمارتیں ٹکڑے ٹکڑے ہوتی ہیں اور نہ زہریلی گیس جانوں کو ہلاک کرسکتی ہو اصل یوں ہو کہ اس جنگ کا سارا رومان ختم ہو گیا ہو بارود کی ایجاد نے جنگ سے انسانی عنصر کو خارج کر دیا اور سائنس نے جنگ کو میکانکی بنا دیا —— یعنی ریاضیاتی قوتوں صحیح توازن اور تناسب کا باہم ٹکرانا۔ آج کل کی جنگ سائنسداں اپنے دارالتجربہ میں اور ماہر اعداد و شمار اپنے معمل میں لڑتا ہو۔ البتہ خاک و خون میں آلودہ ہونا اور مرنا سپاہی کا کام ہو۔ ان فوری نتائج کے علاوہ بھی سائنسی جنگ کے اثرات بہت دور تک پہنچتے ہیں جنگ تو ختم ہو جاتی ہو مگر ہمارے معاشرہ کو لاتعداد مصیبتیں اپنی پوری پوری زور آزمائیوں کے ساتھ گھیر لیتی ہیں جن میں سے ہر ایک جنگ سے زیادہ خطرناک ہو مثلاً اقتصادی نظام کا درہم برہم ہونا، ایسے لاکھوں جانبازوں کی بیکاری، انسانوں کا اندھا ہو جانا جنوں، ہاتھ پیر کٹ جانا، اعصابی کمزوریاں، بدمزاجی اور تقدیر پرستی۔

آج کل کی جنگ کے معاشرتی اثرات بھی نظر انداز کر دینے کے قابل نہیں قوانین بالکل اپنے ہاتھ میں لے لیے جاتے ہیں اور عام رواج سے بالکل مختلف حقوق اور فرائض کا ایک انوکھا معیار قائم ہو جاتا ہو

ہو سپاہی کا ایک اچھا شہری بننے نہیں دیتا۔ یہی نہیں بلکہ موجودہ طریقۂ جنگ کی بربریت اسے انسانی زندگی کے لیے درشت اور سفاک بنا دیتی ہے۔ بندوق اس کے لیے صرف ہتھیار ہی نہیں بلکہ شعار بھی بن جاتی ہے۔ شاید انہیں اثرات نے متمدن معاشرتی زندگی میں لوٹ مار اور منظم تشدد کو اس کے مسلمہ عناصر میں شامل کر دیا ہے مگر اس سے بھی زیادہ ہیبت ناک اثرات نفسیاتی ہیں۔ جنگ عظیم نے اعصابی کمزوری اور رویوں سے دہشت انگیزی کی لاتعداد مثالیں پیش کی ہیں۔ کچھ افراد کا دماغی توازن اُلٹ دینے کے علاوہ جنگ کا عام نفسیاتی اثر بھی سب لڑنے والوں پر ضرور پڑتا ہے۔ بد مزاجی تقدیر پرستی اور تمام مسلمہ معیاروں کو الگ پھینک دینا اس طرح کے رجحانات اس سپاہی میں ضرور پائے جائیں گے جو لڑائی سے تازہ واپس ہوا ہے آہستہ آہستہ ایک طرح کی سراسیمگی اور بے چینی سماج پر حملہ کر کے اسے دبا لیتی ہے جرائم میں اضافہ ہوتا ہے۔ فسادات رسوخ پاتے ہیں اور عام اخلاقی معیار بالکل پست ہو جاتا ہے۔

اس کے علاوہ سائنسی جنگ نے امن پسندی کو ایک اہم مسئلہ بنا دیا ہے۔ مذہب امن پسندی اپنی ترویج کے لیے ایلڈوس ہکسلے، نارمن انجل اور کینن شیپرڈ جیسے مختلف النوع مبلغین تلاش کرنے میں کامیاب ہوا ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ امن پسندی کا مسلک ہر قسم اور ہر طبقہ کو اپنی جانب مائل کر رہا ہے ہمیں اس کے صرف ایک پہلو پر گفتگو کرنا ہے یعنی یہ کہ سائنسداں کا طرز عمل لڑائی میں کیا ہے اور کیا ہونا چاہیے۔

موجودہ صورت میں سائنسداں کا طرز عمل بالکل غیر یقینی ہے اس نے اپنی تحقیق تو شروع کر دی مگر یہ قطعاً بھول گیا کہ اس کے اثرات کیا ہوں گے مگر اس ذہنیت کو تبدیل کرنا ضرور ہے۔ سائنسداں پر ایک سماجی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اس کو اپنے میں سماجی شعور پیدا کرنا چاہیے معاشرہ کے ایک فرد کی حیثیت سے اس کا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے علم کا ناجائز استعمال نہ کرے۔ جہاں تک پیشہ کی نوعیت کا تعلق ہے اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا کیونکہ طب پوری طرح ثابت کر چکی ہے کہ پیشہ ورانہ کام اعلیٰ معیاری حالتوں میں بھی کیا جا سکتا ہے۔ ایک طریقہ جس سے سائنسداں جنگ کی ہولناکیوں کو کم کر سکتا ہے یہ ہے کہ وہ ان مسائل پر تحقیق کرنے سے انکار کر دے جس کا تعلق جنگ سے ہو۔ وہ یہ کر سکتا ہے کہ اپنا کام کرنے میں اس کا مادی پہلو پیش نظر رکھے یا اپنی کسی ایجاد کو محفوظ کر لے یا بیک وقت اس کو دنیا کی جملہ اقوام کو دے دے یا سب

بہتر یہ کہ کسی ہر نئی ایجاد کے ساتھ اس کے لیے تریاق بھی تلاش کرے اور دونوں ایجادات کا ساتھ ساتھ اعلان کر دے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آج بہت سے سائنسداں قومی دارالتجربوں میں خالص نوں آشام تحقیقات میں مصروف ہیں اس کا سدباب آسانی سے بین الاقوامی سائنسدانوں کی ایک منظم جماعت کر سکتی ہے وطن پرستی کا گمراہ کن تصور اکثر اس کا محرک ہوتا ہے اور اس نوع کی تحقیقات سے یہ جھوٹی امید بھی قائم کی جاتی ہے کہ اس کے اثرات انسانیت کے زخموں کے لیے مرہم کا کام کریں گے۔ اگر امن پسند سائنسداں افادی مقصد کو سامنے رکھ کر پروپیگنڈہ کریں تو اس نام نہاد وطن پرستی کا آسانی سے بھرم کھل جائے دوسرے پہلو کے متعلق ذرا سی حقیقت شناسی سے کام لینا ضرور ہے اور وہ یہ کہ اس حقیقت کو ہرگز نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ متمدن امن پرستی اپنی جگہ ناقص ہے ایلڈوس ہکسلے اسی مسئلہ کی ایک بیباکانہ تشریح پیش کرتا ہے کہ ہم اپنے دماغوں کے لیے تجریدی توجیہ، استعارہ اور تشبیہ کا سہارا ڈھونڈھتے ہیں اور اس حقیقت سے بچتے ہیں جس کو صاف سمجھنے کی ہم کوشش نہیں کرنا چاہتے ہم اپنے ضمیر سے جھوٹ بولتے ہیں تاکہ ناواقفیت کا بہانہ تلاش کر سکیں اصل یہ ہے کہ سائنسداں کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس سازش سے علیحدہ رکھے جس میں وہ اب پوری طرح شریک ہے یہ فرض سائنس اور انسانی معاشرہ دونوں جانب سے اس پر عاید ہوتا ہے۔

مگر اس مقصد کے حصول میں بہت سی دشواریاں حائل ہیں سائنسداں کو اس سیاسی اور معاشی نظام کا بھی مقابلہ کرنا پڑتا ہے جو اس کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے ایک خود مختار قوم کی ریاست میں رہتے ہوئے اس کے لیے یہ ناممکن ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے اصول اور مطمح نظر کے مطابق کام کر سکے اسے اپنے وطن کے مطالبات کی بھی تشفی کرنا ہوتی ہے وہ ایک عجیب کش مکش میں مبتلا ہو جاتا ہے قومی مجبوریاں سزایابی کا خوف اور سماج کی طعن و تشنیع اس کے اصول سے دوچار ہوتے ہیں اور بیشتر وہ سہل ترراستہ اختیار کرنے پر مجبور ہوتا ہے پھر سماجی حالات کو دیکھتے ہوئے روٹی کا سوال بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ایسی مجبوریاں کبھی کبھی اسے خون کے آنسو رلاتی ہیں مگر اس کا کام بہر صورت جاری ہی رہتا ہے جنگی تحقیقات میں پورا پورا مالی سامان موجود ہے کالج کے معمل سے دہیں سائنسدانوں کا سرکاری دارالتجربوں

سے رہا سدے ہوگا سائنس چاہے اپنی سی کیسی ہی کوشش کرلے معاشرہ اس کی ایک نہ چلنے دیگا
امن پسندی کا مسئلہ گویا اس طرح اب حقیقتاً صرف سماجی اور سیاسی ہوکر رہ گیا ہی جب تک ان
دونوں شعبوں میں پوری پوری تبدیلیاں نہ ہوں سائنس اپنی کسی طرح اندازی دکھانے سے قاصر رہیگی
سائنس اور معاشرہ کا تعلق صحت و حرکت، رسل و رسائل اور جنگ کے پہلوؤں سے واضح کرنے
کے بعد ہمیں چند عام مشاہدات کو پیش کرنا باقی رہ جاتا ہی۔

سائنس معاشرہ کے جدید جو ہریت پسند نظام کو ایک عالمگیر مقصد کی طرف لے جا رہی ہی اگرچہ موجود
ہ ترقی نظام سائنس کا پیدا کیا ہوا ہی مگر آنے والا معاشرہ جو اس کی تردید کرے گا اس کا باعث بھی اسی سائنس
کی انقلاب پسندی ہوگی تاریخ تردیدات کا ایک طویل سلسلہ ہی اور ساری ترقی کا قانون بھی اسی انکاریت میں
مضمر ہے جسے ہیگل کے الفاظ میں تردید کی تردید کہہ سکتے ہیں جدید معاشرہ کے ہر حقی پہلو میں تبدیلی رونما ہو چلی
ہی پرانا نظام نئے آنے والے دور کے لیے جگہ خالی کر رہا ہی جس میں سائنس اپنا پورا پورا کام کرتی رہی ہو
منطقی رو سے یہ دور تغیر پرسکون ہونا چاہیے تھا مگر حقیقت میں نظر جو کچھ دیکھتی ہی وہ اس سے بالکل مختلف
ہی سائنس کو اگر تنہا رہنے دیا جاتا تو وہ اس معاشرتی تعمیر میں اپنا کام کر جاتی لیکن تبدیلی کے اس بہتے چشمے
کو معاشرہ کا یہ سرکشانہ اور تاریخی طور پر غلط نظام جگہ جگہ روکتا رہتا ہی سائنسی تفتیش سیاست کے اشاروں پر
چلتی ہی اور جو بے اندازہ روپیہ صحت عامہ کے لیے صرف کیا جانا چاہیے تھا جنگی تحقیقات پر بہایا جا رہا ہی۔
معاشرہ کا اقتصادی نظام ان چیزوں اور آسائشوں کی مساویانہ تقسیم ہونے نہیں دیتا جو سائنس فراہم کرتی ہی
اور جس کے ذریعہ ہی نوع انسان کی صحت اور مسرت میں اضافہ ہو سکتا تھا۔

کسی سماج کا وہ عمومی وجود جو پہلے اتنا ندار ہوتا رہا ہی اور وہ سائنس جس کی ترقی سماج سے رکی ہی
ہمیں آخر یہ تلخ حقیقت یاد دلاتے ہیں کہ باوجود صدیوں کی کوشش کے انسانی زندگی میں وہ خصوصیات
پائی جاتی ہیں جس ہوبس نے اس تاریخ کے اولیں دور سے منسوب کیا تھا ــــ اب بھی پہلے کی طرح
زندگی غلیظ، وحشیانہ اور مختصر ہی؟ کیا یہی انسانی تاریخ کا مآل ہی؟ کیا اسی کے لیے بے شمار نسلوں نے
کام کیا اور ختم ہو گئیں؟

اگر غور سے دیکھا جائے تو اس مسئلہ کے اسباب آسانی سے سمجھ میں آسکتے ہیں اولاً یہ کہ موجودہ سائنسی ایجادات کو عملی مسائل میں استعمال نہیں کیا جا رہا ہے۔ اس سے انکار کی گنجایش نہیں کہ صنعتی اداروں نے سائنسی ایجادات کے حقوق محفوظ کرا لیے انھیں اپنے تک محدود کر رکھا ہے میکانکی ایجادات اور کیمیاوی اجزا کے متعلق یہ امر کم یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے۔ سرمایہ کی کمی کے سبب سے سائنس سے بعض امور میں فائدہ اٹھانا ممکن نہیں مثلاً مکانوں کی ترتیب اور شہروں کے خاکہ میں کوئی نمایاں اصلاح یا اسی طرح کا کوئی اور مفید کام اکثر ناگزیر برائیوں کی مجبوریاں مثلاً جنگی تحقیق جو صرف ذاتی منافع کی سرمایہ داری کی صورت میں پیدا ہوتی ہے۔ صحت عامہ اور اسی نوع کے ضروری امور میں کافی خرچ کرنے نہیں دیتی دوسرے یہ کہ روایت پرستی اور قدامت پسندی پہلے زمانہ کی طرح آج بھی ایسی بنیادی تبدیلیاں نہیں ہونے دیتی جس کا ہونا نہ صرف ضروری ہے بلکہ ممکن بھی ہے۔ تیسرے یہ کہ اگرچہ مخصوص معاشرتی مسائل کا مطالعہ سائنسی طور پر کیا جا رہا ہے مگر معاشرتی متعلقات کے پورے ماحول کو ایک نئے سائنسی زاویہ نگاہ سے دیکھنا اب بھی باقی ہے عمرانی اور سماجی مسائل سائنسی تفتیش کے انتظار میں ہیں چونکہ سائنسداں کا معاشرتی شعور پوری طرح بیدار نہیں ہوا شاید اسی لیے اس مسئلہ کو وہ اہمیت نہ دی جا سکی جس کا یہ محتاج ہے اور پھر یہ کہ قدامت پسند ہرگز نہیں چاہتے کہ پرانے خیالات میں کوئی تبدیلی کی جائے یہاں قصور جتنا سائنس کا ہے اتنا ہی معاشرہ کا بھی ہے!

مقبول الرحمٰن ایم۔ اے

ہمارا معاشرہ اور اس کا اثر معاش پر

ہر ملک کے معاشرتی اور مذہبی اداروں نے تاریخ کے ہر دور میں اہل ملک کی معاشی زندگی پر گہرا اثر ڈالا ہے ترقی کے اس موجودہ دور میں مذہب اور سماج کے ان بندھنوں کو بہت کچھ توڑا جا سکا مگر ہندوستان ابھی معاشی اور ذہنی ترقی کے اس معیار تک نہیں پہنچا ہے کہ جس میں مذہب اور سماج کی یہ بندشیں بالکل توڑی جاتی ہیں اور انسان اپنے قول و فعل میں کامل اختیار رکھتا ہے تعلیم کی ترقی اور مغربی خیالات کی آمد سے ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ ان چیزوں کا بہت کم لحاظ کرتا ہے مگر اس کی تعداد اتنی کم ہے کہ یہ ہندوستان کے اصل ذہنی رجحان کی نمائندگی نہیں کر سکتا ہندوستان کی اصل آبادی پر ابھی تک مذہبی اور رواجی جوش اعتقادیوں کا گہرا اثر ہے۔

ذات پات کی بندش - یہ ہماری سماجی زندگی کی ایک اہم خصوصیت ہے اور اس سے بڑے دور رس معاشی اثرات مرتب ہوتے ہیں ہمیں اس سے کوئی بحث نہیں کہ اس کی ابتدا کیسے ہوئی خواہ بھگوت گیتا کے مطابق سری کرشن جی نے اس تقسیم کی ابتدا کی ہو یا جیمس مل کے مطابق تقسیم عمل کی اہم ضرورت کا نتیجہ ہو یا پھر سینارٹ کے خیال میں قدیم آریائی اداروں کا ارتقا ہو جسے ہندوستان کے حالات نے موجودہ صورت دی تھی - بہرحال کسی نہ کسی طرح بھی ذاتوں کی تقسیم ہمارے معاشرہ کا ایک اہم جزو بن گئی ہے اور ہماری زندگی پر اس قدر چھا گئی کہ امپیریل گزٹ آف انڈیا کے الفاظ میں۔

"پیدائش ہی سے انسان کے معاشرتی اور گھریلو تعلقات ہمیشہ کے لیے معین ہو جاتے ہیں اور اسے اپنی ذات والوں کے طور طریقوں کے مطابق کھانا پینا پہننا اور شادی بیاہ وغیرہ سب کچھ کرنا پڑتا ہے"

اس طریقے سے بہت سے خاندانوں کا ایک خاص پیشہ اختیار کر لینا ایک ہی بزرگ کی اولاد ہونا اور تقریباً ایک ہی قسم کے مذہبی خیالات رکھنا مراد ہے"

ذات پات کے طریقے نے ہندوستان میں اپنی انتہائی شکل اختیار کرلی ہر ذات کے علیحدہ پیشے بن گئے ایک پیشے سے دوسرے پیشے میں جانا ناممکن ہوگیا۔ اس تقسیم نے اردو اور مسلمانوں پر بھی اثر ڈالا ان کے ہاں بھی خاندانی پیشے کو چھوڑ کر دوسرے پیشے اختیار کرلینا بڑے ننگ کا باعث سمجھا جانے لگا آج بھی خاندانی مراتب کا خیال ہندوستان میں لوگوں کی معاشی ترقی میں سدراہ بنتا ہے ہندوستان کے بہت کم گھرانے ایسے ہوں گے جنھوں نے ان خیالات کو پس پشت ڈال رکھا ہو تعلیم یافتہ طبقہ چاہتا ہے کہ ان بندشوں کو توڑ دے مگر اسے بھی خاندان کے ننگ و ناموس کا خیال اور بزرگوں کا لحاظ ایسا کرنے سے روکے رکھتا ہے علاوہ ازیں بڑی خرابی یہ ہے کہ ہمارا روشن خیال طبقہ عوام کے ساتھ زیادہ راہ و رسم نہیں رکھتا ان کی تمام سرگرمیاں اپنے ہی حلقے میں محدود رہتی ہیں جس کی وجہ سے عوام پر جدید ترقیات کا رنگ چڑھنے نہیں پاتا اس پر طرہ یہ کہ تعلیم کی رفتار بہت سست اور اس کی قیمت بہت گراں ہے غریب عوام جو دو وقت کی روٹی بھی حاصل نہیں کرسکتے کیونکر اپنے بچوں کو تعلیم دلا سکتے ہیں ان حالات کے تحت ملک میں روشن خیالی پھیلے تو کیسے اور معاشی ترقی کا دور دورہ ہو تو کس طرح؟

موجودہ زمانے میں ہندوستان میں تین قسم کی ذاتیں پائی جاتی ہیں۔ (۱) پیشہ واری ذاتیں یہ وہ ذاتیں ہیں جن کا تقسیم عمل کی ضرورت سے وجود ہوا ان میں برہمن، کھتری اور ویش وغیرہ شامل ہیں۔ علاوہ ازیں چھوٹی چھوٹی صنعتی برادریاں جیسے سنار، بڑھی، حجام، دھوبی اور کمہار وغیرہ بھی اسی تقسیم میں شامل ہیں۔

(۲) نسلی یا آبائی۔ یہ ذاتیں ہندوستان میں بہت سی ہیں بنگال کے چنڈیل اور راج بنسی، راجپوتانے اور پنجاب کے جاٹ گوجر وغیرہ نسلی امتیاز کی بدولت وجود میں آئیں۔

(۳) وہ ذاتیں جو مذہبی اختلافات کی وجہ سے پیدا ہوگئیں فرقہ داری ذاتیں کہلاتی ہیں بمبئی کے لنگایت اس تقسیم کی ایک اچھی مثال ہیں۔

یہ امر تو اب کسی تشریح کا محتاج نہیں کہ آج بھی ہمارے دیہات میں ذات پات کی تقسیم کا دور دورہ ہے اگرچہ اس کے بندھن ڈھیلے ہو چلے ہیں اب دیکھنا یہ ہے کہ لوگوں کی معاشی زندگی پر اس تقسیم

کا کام اثر ہوتا ہے۔

ذات پات کے طریقے کو سراسر برا بتانا بھی ٹھیک نہیں اس میں چند خوبیاں بھی ہیں اول تو یہ کہ
اس سے ایک طرح کی تقسیم عمل پیدا ہو جاتی ہے جس سے سوسائٹی میں کارکردگی اور نظم پیدا ہوتا ہے۔ علاوہ
ازیں ہر شخص اپنی برادری کے ماحول میں اور اپنے والدین کی مدد سے آسانی سے مہارت حاصل کر لیتا ہے
خاص کر قدیم زمانے میں جبکہ آج کل کی طرح کے قدیم کالج نہیں کھلے تھے اپنی ذات والوں کی مدد سے
اپنے کام میں کوئی شخص نہ صرف ماہر ہو جاتا تھا بلکہ اپنے آبائی پیشوں کے ان رازہائے سربستہ سے بھی واقف
ہو جاتا تھا جو قدیم سے سینہ بسینہ چلے آتے تھے ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ پیشوں کے ذات میں محدود ہونے
کی وجہ سے مسابقت کا دائرہ بھی محدود رہتا ہے اور مسابقت کی وہ خرابیاں پیدا نہیں ہو سکتیں جو اس کی
انتہائی صورت میں عام نظر آتی ہیں۔

باوجود ان تمام خوبیوں کے ذاتوں کی تقسیم معاشی حالات پر مضر اثر ڈالتی ہے اور خاص کر موجودہ
دور میں اس کی خرابیاں اور بھی زیادہ بڑھ گئی ہیں۔ مسٹر سی پی بلیس اپنی کتاب علم تمدن میں لکھتے ہیں

> معاشی آزادی کا مخالف اور معاشی ترقی کے راستہ میں رکاوٹ ڈالنے میں کوئی طریقہ
> اس نظام (ذات پات کی تقسیم) سے بڑھ کر نہیں ہو سکتا۔"

بڑی خرابی اس طریقے میں یہ ہے کہ ہر شخص مجبور ہوتا ہے کہ اپنی ذات کے پیشے پر ہی زندگی گزارے اگر یہ
پیشہ اس کی طبیعت کے موافق ہوا تو خیر ورنہ زندگی وبال جان ہو جاتی ہے۔ ہر شخص اسی کام میں اچھا رہتا
ہے جس کی اس میں صلاحیت ہو مگر اس طرح مجبور کرنے سے اس کی صلاحیت ابھرنے نہیں پاتی وہ دیکھتا
ہے کہ دوسرے پیشوں میں اس کے لیے ترقی کا زیادہ موقع ہے مگر ذات پات کی بندشیں اسے ترقی سے
روکے رکھتی ہیں اور یہ چیز معاشی پستی کا باعث ہوتی ہے۔

کاریگر ایک پیشے سے دوسرے پیشے میں نہیں جا سکتا اس لیے اپنا اصل بھی دوسرے پیشے میں
منتقل نہیں کر سکتا اس طرح گویا محنت اور اصل کی نقل پذیری ناممکن ہو جاتی ہے۔

مزید براں ذاتوں کی تقسیم سے محنت کی رسد بھی محدود ہو جاتی ہے رسد طلب کے بڑھنے

یا گھٹنے کا ساتھ نہیں دے سکتی پیدائش بر پیمانہ کبیر کے راستے میں بھی مشکلات پیدا ہوتی ہیں اصل محنت اور تنظیم۔ یہ تینوں عاملین پیدائش جن کی طریق بیمانہ کبیر میں ایک ساتھ ضرورت ہوتی ہے الگ الگ ذاتوں میں بٹے ہوئے ہوتے ہیں جس کی وجہ سے ان کو یکجا کرنے میں بڑی مشکلات پیش آتی ہیں۔

یہ تو ایک مختصر سا خاکہ ذات پات کی اس تقسیم کا جو ہمارے معاشرے کا ایک اہم جزو ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے تعلیم ذرائع آمد ورفت اور انگریزی قانون کے اثر سے ذاتوں کی تقسیم کم ہونا شروع ہو گئی ہے اور ہم نے پوری تندہی اور دل سے کام کیا تو وہ دن دور نہیں جب ہم اپنی سوسائٹی کے دامن سے یہ بدنما دھبہ مٹانے میں کامیاب ہو جائیں گے ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کی رپورٹ میں بھی یہی رائے ظاہر کی گئی ہے کہ ملک میں ذات پات کے بندھنوں کو ڈھیلا کرنے اور ان امتیازات کو فنا کر دینے کا ایک عام رجحان پایا جاتا ہے۔

مشترک خاندان۔ ذات پات کی طرح مشترک خاندان کا طریقہ بھی ہندوستان ہی کی ایک خاص خصوصیت ہے یورپ اور امریکہ میں ایک کنبہ میاں بیوی اور بچوں پر مشتمل ہوتا ہے مگر ہندوستان میں خاندان کے دوسرے رشتہ دار بھی ساتھ رہتے ہیں خاندان کا بزرگ تمام خاندان کی معاشی بہبود کا ذمہ دار اور گھر کا منتظم ہوتا ہے گھر کی بڑی بوڑھی گھر کے کل اخراجات اور دوسرے کام کاج کی نگرانی کرتی ہے کل افراد خاندان کی آمدنی مشترک طور پر خرچ ہوتی ہے اس طرح رہنے سہنے سے ہمیں بہت سے معاشی فوائد حاصل ہوتے ہیں ہر شخص کو گزارے کے لیے کچھ نہ کچھ مل جاتا ہے یتیم، بیوائیں، بیمار اور بوڑھے بھی پرورش پاتے ہیں سب آمدنی یکجا کر کے خرچ کرنے میں بھی کفایت رہتی ہے کاروبار میں اہل خاندان سے ہر وقت صلاح مشورہ اور مدد حاصل کی جا سکتی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تقسیم اور انتشار اراضی کی مشکلات پیش نہیں آتیں کیونکہ مشترک جائداد میں کاشت بھی مشترک ہوتی ہے۔

مگر اس طریق میں سب سے بڑی خرابی تو یہ ہے کہ ہر شخص کو کچھ نہ کچھ ضرور مل جاتا ہے جس کی وجہ سے بہت سے کاہل لوگ مفت کی روٹیاں توڑا کرتے ہیں علاوہ ازیں ہر شخص پر خاندان کے کل افراد کی ذمہ داری ہوتی اور انفرادی اولوالعزمیوں کو اجاگر ہونے کا موقع نہیں ملتا اتنے بڑے خاندان

دادا اور رواجی ذمہ داریاں اس کے دائرہ عمل کو محدود کر دیتی ہیں اور اس کی طبیعت کے وہ جوہر جو جلا ہونے پر انسانیت کے لیے مفید ثابت ہو سکتے ضائع ہو جاتے ہیں۔

گر ذات کی طرح۔ بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ تیزی کے ساتھ یہ طریقہ آج کل زوال پذیر ہے۔ اب تو کہیں کہیں مشترک خاندان آج بھی نظر پڑجاتے ہیں مگر وہ اپنی زندگی کے آخری دن پورے کر رہے ہیں۔ مشترک خاندان کا وہ پہلا سا نظام اب کہیں نظر نہیں آتا لیکن اس گئی گزری حالت میں بھی اس طریقے کا اثر ہمارے معاشرے پر باقی ہے۔ آج بھی اکثر گھرانوں میں بیوی بچوں کے علاوہ کسی بھائی، بیوہ بہنیں، بوڑھے والدین اور بعض قریبی رشتہ دار جن کا کوئی آسرا باقی نہیں رہا ہے پرورش پا رہے ہیں۔

مغربی خیالات، انفرادیت کے جدید تخیل اور قدیم پیشوں کی تباہی اور برطانوی سول قانون نے اس نظام کی جڑیں ہلا ڈالی ہیں جائداد کے حصے بخرے ہو جانا اس لحاظ سے تو بہتر ہے کہ دولت چند لوگوں کے ہاتھ میں جمع ہونے نہیں پاتی بلکہ تقسیم ہو کر متوسط طبقے کی تعداد میں اضافہ کرتی ہے مگر چھوٹے چھوٹے حصے ہونے کی وجہ سے کسی کے پاس بھی اصل کی اتنی بڑی مقدار جمع نہیں ہونے پاتی کہ جس سے جدید طرز کے کاروبار بیمانۂ کبیر پر چلائے جا سکیں لیکن اس خرابی کی اصلاح اس طرح ممکن ہے کہ ملک میں مشترک سرمایہ دار کمپنیوں کے طریق کو زیادہ سے زیادہ رواج دیا جائے۔

غرض کہ مشترک خاندان کے نظام میں اچھائیاں بھی ہیں اور برائیاں بھی۔ مگر واضح رہے کہ یہ برائیاں اس قسم کی ہیں کہ اگر ان میں ترمیم یا اصلاح کر دی جائے تو پھر کسی قسم کا کھٹکا نہیں رہتا اور بقول مسٹر بریم ناتھ بنرجی کے

> "ایک ایسے ملک میں جہاں نہ تو حکومت اور نہ کوئی دوسرا ادارہ ہی معاشرے کے پناہ گزین یعنی بوڑھوں، غریبوں، یتیموں اور بیواؤں کی روزی کا سامان کرنے کی طرف متوجہ ہوتا ہے مشترک خاندان کے ٹوٹ جانے سے بہت سی عملی مشکلات پیش آئیں گی۔"

دیہاتی برادریاں — ہندوستان کی ۸۹٫۵ فی صدی آبادی دیہات میں رہتی ہے نا انصافی

ہوگی اگر ہم گاؤں کے معاشی نظام کی اہمیت نظر انداز کر جائیں آج سے نہیں صدہا برس سے ہماری دیہاتی زندگی برابر اپنی پرانی ڈگر پر چلی جا رہی ہے نئے خیالات نئے رنگ اور نئے حالات آتے ہیں دیہات کی ظاہری صورت پر بھی تھوڑا بہت مستقل یا غیر مستقل اثر ڈالتے ہیں۔ مگر دیہاتی نظم کی روح سدا برقرار رہتی ہے۔

الفنسٹن صاحب کی رائے ہے کہ دیہاتی برادریاں ریاست کے تمام لوازم کی حامل ہیں۔ اور واقعہ بھی یہی ہے کہ ہر گاؤں اپنی پنچایت کی مدد سے اپنے کل معاشی اور معاشرتی مسائل کا تصفیہ کر لیتا ہے۔ بہت کم ان دیہات والوں کو شہر کی عدالت میں جانے کی نوبت آتی ہے۔ ہر گاؤں میں زمیندار (خواہ وہ حکومت ہو یا کوئی اور) اور کاشتکار کے دو اہم طبقے ہوتے ہیں ان کی ضروریات کو پورا کرنے کیلیے چند دوسرے کاریگر مثلاً بڑھئی، لوہار، تیلی، جولاہے وغیرہ بھی گاؤں میں بستے ہیں ان کو خدمات کے عوض غلہ دینے کا دستور تھا مگر اب نقد زر دیا جاتا ہے۔ آڑے وقت میں کاشتکاروں کی امداد کرنے والا ایک ساہوکار بھی ہوتا ہے جو ضرورت کے وقت ان کو قرض دیتا ہے اور پھر ان کی سادہ لوحی سے فائدہ اٹھاکر دوگنا، تگنا سود وصول کرتا ہے مگر آج کل بعض قوانین اور انجمن ہائے امداد باہمی کی بدولت اس خرابی کا سدباب کیا جارہا ہے

گاؤں والے دنیا سے الگ تھلگ اپنی برادری میں مگن رہتے ہیں بیرونی دنیا سے ان کے تعلقات بہت کم اور رسمی ہوتے ہیں اپنی ضروریات کے لیے خود کفیل ہوتے ہیں۔ اپنی ضروریات کی تمام چیزیں انہیں گاؤں ہی کے کاریگروں سے مل جاتی ہیں گاؤں کے باہر کبھی کبھار صرف فصل فروخت کرنے کے لیے وہ جاتے ہیں ورنہ اکثر اپنی پیداوار دیہاتی ساہوکاروں کے ہاتھ یا گاؤں کی منڈی میں بیچ ڈالتے ہیں۔

گاؤں کے اس طرزِ بود و ماند کے گہرے معاشی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اچھے بھی اور برے بھی اول تو یہ کہ دیہات کے سیدھے سادے نظام میں لوگوں کے مفاد ایک دوسرے سے بہت کم ٹکراتے ہیں مسابقت کی گرم بازاری نہیں ہونے پاتی جس کی وجہ سے آزاد مسابقت کی خرابیوں سے حفاظت رہتی ہے محنت اور اس کے ساتھ اصل بھی گاؤں کی ریتوں میں مقید رہتا ہے جس سے کاشتکار ترقی کے بہت سے مواقع سے

دوم ہو جاتا ہے۔

گاؤں کے اکثر معاملات رواج کی مدد سے طے پاتے ہیں مقابلے کی جگہ ۔رواج کا زیادہ دور دورہ ہے ہماری حکومت کے آنے کے بعد مسابقت کا زیادہ زور شور ہوا مگر حکومت نے مسابقت کی حرابیوں کے نقطے سے بالکل فنا تو نہیں کیا البتہ محدود ضرور کر دیا ہے اور اب گاؤں سے لگان وصول کرنے میں بھی وصول کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔اجرت کا بھی یہی حال ہے وہ بھی رواج ہی کے مطابق معین ہوتی ہے کسی زمانے میں قیمتیں بھی رواج کے مطابق معین ہوتی تھیں مگر اب قانون طلب و رسد کے تحت ان کا تعین ہوتا ہے۔

آج کل دیہاتی نظام بھی رفتہ رفتہ بدل رہا ہے وسائل آمد و رفت کی سہولتوں اور برطانوی قانون کی بدولت اس نظام پر سختی سے اب کہیں بھی عمل نہیں ہوتا قرائن بتا رہے ہیں کہ ہندوستان کی معاشی زندگی میں انقلاب آنے والا ہے۔

ہماری سماج میں مذہب کو بڑی زبردست اہمیت حاصل ہے ذات پات کے بندھن، مشترک خاندان، اور نظام دیہہ سب کے سب بری طرح مذہب سے متاثر ہوئے ہیں۔ مذہبیت ہمارے ہر روایتی نظام کا جزو لاینفک بلکہ روح رواں ہے مذہب کے اس عمل دخل کو دیکھتے ہوئے ایک خیال یہ پیدا ہو گیا ہے کہ مذہب ہماری معاشی پستی کا باعث ہے کیونکہ یہ معاشرے پر براہ راست اور معاش پر بالواسطہ اثر انداز ہوتا ہے۔ملک کا نوجوان طبقہ اس خیال کا بڑی حد تک حامی ہے۔مگر دراصل یہ مذہب سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ مذہب ہماری معاشی حالت پر اثر انداز ضرور ہوتا ہے مگر اس حد تک نہیں کہ معاشی ترقی کی راہ میں دیوار بن کر حائل ہو بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مذہب کا اثر معاشی جدوجہد کرنے والوں میں دیانتداری اور راست بازی پیدا کرتا ہے جو معاملت میں کامیابی کی روح رواں ہیں۔

اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بعض مذہبی عقائد ہمارے ہاں ایسے ہیں جو ایک خاص قسم کی معاشی جدوجہد سے روکتے ہیں سب سے پہلے تو ذات پات کی کڑی بندشیں ہی ہیں جن کا مفصل ذکر پہلے بھی کیا جا چکا ہے علاوہ ازیں بعض دوسرے، معتقدات بھی ہیں مثلاً بعض ہندو ذاتوں میں مچھلی، ہڈی اور فضلے کا استعمال بطور کھاد کے ناجائز سمجھا جاتا ہے۔ان کے ہاں گوشت کا بیوپار بھی معیوب ہے اسی طرح

مسلمانوں میں شراب کا بیوپار اور سود کا لین دین حرام ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ہندوستانیوں میں اولوالعزمی کا فقدان ہے ورنہ کرنے کے لیے سیکڑوں کاروبار ہیں بدقسمتی سے حکومت بھی ملک کی ترقی اور مفاد سے پوری ہمدردی نہیں رکھتی۔

یہ رکاوٹیں آج ہی نہیں ہیں۔ مگر تعجب ہوتا ہے جب ہم قدیم ہندوستان کی مادی ترقی پر نظر ڈالتے ہیں یہی غربت اور افلاس کا مارا ہندوستان کسی زمانے میں دنیا کے نہایت دولت مند ملکوں شمار ہوتا تھا ہندوستان کی صنعتوں نے یورپ کی منڈیوں پر قبضہ جما رکھا تھا اور اٹھارویں صدی تک ہندوستان کی تجارت یورپ کی تمام قوموں سے بڑھی ہوئی تھی آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ ملک کی نئی صنعتی اور تجارتی تعمیر میں اہل ہنود میں مارواڑی، جینی اور بھاٹیہ اور مسلمانوں میں خوجے میمن اور بوہرے سب سے پیش پیش ہیں حالانکہ مذہب کے معاملہ میں یہی لوگ سب سے زیادہ راسخ العقیدہ واقع ہوئے ہیں۔

بات دراصل یہ ہے کہ مذہب فی نفسہ معاشی ترقی کو نہیں روکتا اور واقعہ یہ ہے کہ ایک عام انسان کے لیے معاشی محرکات بھی اسی قدر طاقتور ہوتے ہیں جس قدر کہ مذہبی محرکات دراصل ہندوستان کی اس معاشی پستی کے اسباب کچھ اور ہیں دیسی حکومت کے برباد ہونے کے بعد ملک میں بدنظمی کا دور دورہ ہو گیا انگریزی حکومت کی روش بھی شروع شروع میں حد درجہ جابرانہ رہی اپنے مفاد کی خاطر کمپنی نے ملک کی معاشی ترقیات میں انتہائی مشکلات پیدا کر دیں انیسویں صدی میں قحط اور وباؤں کا بھی دور دورہ رہا۔ غرض ان تمام حالات نے مل کر اہل ملک کے حوصلوں کو پست اور ان کے زاویہ نگاہ کو مایوسانہ بنا دیا اسی قسم کی مایوسانہ کیفیت سائنس کے جدید دور کے شروع ہونے سے قبل یورپ پر بھی طاری ہو چکی ہے مگر سائنس کی مدد سے اس کا خاتمہ کر دیا گیا۔

ہندوستان کی حالت بھی اب بدلنی شروع ہو گئی ہے مغربی اثرات کے پڑنے سے یہاں بھی مذہبی اعتقادات کو نئے سے معنی پہنائے جا رہے ہیں تعلیم کی ترقی بھی اگرچہ سست ہی سہی اس مایوسی کو کچلنے میں بہت کچھ کامیاب ہو چکی ہے مگر اب بھی بہت کام باقی ہے۔ ضرورت ہے کہ

۔صرف مردوں میں تعلیم عام کی جائے بلکہ علم کی روشنی مستورات میں بھی پھیلائی جائے کیونکہ مذہبی
۔در۔۔واہی خوش اعتقادیاں اور تباہ کن رسوم اسی طبقے میں زیادہ پائی جاتی ہیں۔

نئے دور میں ہم کو ایک نئے نظام کی ضرورت ہے مگر ہم مغرب کی اندھی تقلید میں مشرق
ی مقدس روایات کو ترک نہیں کریں گے ہمارے نئے نظام میں نہ تو فرسودہ تمدن کے گلے سڑے
ور مضرت رساں عناصر ہوں گے اور نہ ہی مغرب کی انتہا سے بڑھی ہوئی مادیت ہماری اس
نظیم نو کی کوشش سے ہی زندگی کی تمام خوبیاں وابستہ ہوں گی

آیۃ اللہ بیگ عارف

جان کیٹس کی زندگی

روما۔

پیازا دسپانیا (میدان اسپانیا)۔

فروری ۱۸۲۱ء۔

ایک مکان کے معمولی کمرہ میں جس کا رخ میدان کی طرف ہے چھبیس سال کا ایک نوجوان لیٹا ہوا ہے جو ستم رسیدہ ہے غمزدہ ہے اور ہر طرح کی کلفتیں اس کی آزمایش میں مصروف ہیں۔

وہ عزت و شہرت کا خواستگار رہتا لیکن سوائے محرومی و ناکامی کے کچھ اس کے حصہ میں نہ آیا۔

وہ اگرچہ سبزہ آغاز تھا لیکن سل کا شکار رہتا اس لیے وہ شباب کی ہلچل سے لطف اندوز نہ ہو سکا وہ صحت کی دعائیں مانگ رہا تھا لیکن ستم تقدیر سے شیشہ دل کو چور کرنے والی محبت کا شکار ہو گیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ محبت کے تیروں نے اس کے مرض کو دونا کر دیا اور زندگی کا جنازہ بالآخر قبرستان پہنچا دیا گیا۔ یہ جان کیٹس ہے۔

یہ اس شخص کا ذکر ہے جس کی زندگی کی آخری سانسیں روما میں منقطع ہوئیں جس کے چہرہ ہاتھ اور زبان تینوں کا رنگ بدل گیا تھا جو دوستوں سے مہجور رہتا ہم وطنوں سے دور رہتا غریب تھا اور علاج کے لیے محض طبیب کی شفقت کا سہارا۔ وہ عالم فانی سے رخصت ہوتا ہے اور حال یہ ہے کہ اس کے نزدیک نہ اعزا و اقارب ہیں نہ کوئی دوست و غمگسار ہاں اگر کوئی ہے تو ایک جوانمرد جس نے اپنا وقت، اپنی آسایش، اپنی نیند غرض اپنا سب کچھ اس بدنصیب عبقری کی خدمت کے لیے وقف کر دیا ہے۔

مشہور انگریزی شاعر اور نقاد رابرٹ برجیس نے لکھا ہے "اگر آج خدا مجھ کو اختیار دے کہ میں عالم بالا سے صرف ایک انگریزی شاعر کو بلا سکوں تاکہ وہ اپنے ناتمام اعمال کی تکمیل کرے تو میں انگلستان کا تاج اتحاد جان کیٹس کے سر پر رکھ دوں۔"

اس کے باوجود موت کے بہت دنوں بعد تک کیٹس تنقید نگاروں کا موضوعِ سخن بنا رہا۔ اس کی مقرب ہرس وناکس کی ہدفِ ملامت تھی۔ دیکھئے! ٹامسن ڈیکوئینسی نے اس پر کتنی جگر خراش تنقید کی ہے "کیٹس نے ہماری مادری زبان کو اس طرح کچلا کہ جس طرح عقل و خرد سے عاری ایک بھینس کسی زمان کو کچل ڈالے۔"

اس کے ذکر کی ضرورت نہیں کہ آج تنقید نگاروں کے نزدیک کیٹس کی کیا عظمت ہے انہوں نے صرف ڈیکوئینسی کے خیال کے خلاف ہی نہیں کہا بلکہ آج کی تنقید نگاری کا اجماع ہے کہ وہ شیکسپیر اور ملٹن کے مرتبہ سے کسی طرح کم نہ تھا اور اسے ان دونوں کے علاوہ، اسلوب بیان اور فصاحت و بلاغت میں ہر شاعر سے بہت بلند قرار دیتے ہیں

۲۹؍اکتوبر ۱۷۹۵ء کو کیٹس ایک متوسط الحال گھرانے میں پیدا ہوا۔ ابھی نو سال کا بھی نہیں ہوا تھا کہ اس کے والد ۱۸۰۴ء میں گھوڑے سے گرے اور مر گئے اب اس کی ماں کے سر اس کی اور تینوں بھائیوں اور بہنوں کی تربیت عاید ہوئی جارج سب سے بڑا بھائی تھا ٹامس جان اس سے چھوٹا تھا اور ایک بہن سمتی جو سب سے چھوٹی تھی کیٹس کو باپ سے وراثتہ اس کا اخلاق اس کے عادات اور اس کا رنگ روپ ملا تھا لیکن بدقسمتی سے ماں کی جانب سے سب سے زیادہ بدبخت وراثت ملی یعنی سل کا نامبارک مرض جس نے پچیس سالہ جیسی سرمست بہار بھی گذارنے کا موقع نہ دیا۔

یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ اس کی زندگی شروع سے نامراد اور اس کے اعضا کمزور اور قویٰ مضمحل تھے۔ یہ اس کی ایک غلط تصویر ہے جس کی اشاعت میں شیلی مددومعاون ہوا کیونکہ اس کی موت کے حادثہ نے اس پر سخت جذباتی اثر کیا اور اسی کا تقاضا تھا کہ اس نے اس مضمون نگار پر سخت حملہ کیا ہے جس نے کیٹس کے اینڈیمیئن پر سخت تنقید کی تھی اور اس کو کیٹس کا قاتل قرار دیا ہے یہ دراصل اس خیال کی ترجمانی ہے کہ کیٹس کی موت کا باعث اس کی نظموں پر سخت ترین تنقیدیں ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ کیٹس کی موت کا باعث سل کا مرض تھا باوجودیکہ اس کے متعلق یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ابتدائی تعلیم کے زمانے میں اتنا تندرست اور صحیح القویٰ تھا کہ بسا اوقات جون کی روانی سے

مجبور ہوکر اپنے دوستوں اور ہم سبقوں سے کشتی لڑنے لگتا تھا کیٹس کی جسمانی طاقت، تندرستی، جسمانی ریاضت اور دوستوں سے لڑنا جھگڑنا ان ہی باتوں کا طفیل تھا کہ وہ جو کچھ چاہتا تھا سو لیتا تھا۔ ان تمام خصوصیتوں کی بنا پر اس سے واقف کاروں کا خیال تھا کہ وہ ایک عظیم الشان مستقبل کا مالک ہوگا لیکن پیشین گوئی میدان جنگ یا اور دوسرے میدانوں سے ... گئی تھی نہ کہ علم و ادب کے خطرناک منازل کے متعلق۔ یہ مشہور ادیب ہو مز کا خیال ہے جو تعلیم کے زمانے میں اس کا دوست تھا۔

لیکن کیٹس کی طبیعت میں جسمانی قوت کے ساتھ ساتھ قوت احساس اور جذبات و خیالات کا فطری عطیہ بھی موجود تھا جس سے اس کی حلاوت آمیز شاعری کا چشمہ ابل پڑا کیونکہ اس کے جذبات کا یہ حال تھا کہ لحظہ بہ لحظہ تبدیل ہوتے رہتے تھے ابھی وہ بہت خوش اور بشاش ہے اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس کے اوپر کسی طرح کے غم کے آثار ہیں لیکن پھر دم بھر میں سخت غمگین ہے اور آنکھوں سے حزن و ملال کا چشمہ جاری ہے اس کے غم کا ایک واقعہ یہ مشہور ہے کہ جب اس کی والدہ کا سنہ ۱۸۱۰ء میں اچانک انتقال ہوگیا تو چند دنوں تک کیلئے وہ اپنے استاد کے کتب خانہ میں گھس گیا اور غم سے نڈھال ہوگیا تمام دوستوں اور استادوں نے لاکھ تسلی دی لیکن کچھ اثر نہ ہوا۔

کیٹس کو مدرسہ میں ابھی بہت دن بھی نہیں گزرے تھے کہ جسمانی تندرستی اور کشتی وغیرہ کا شوق یکقلم موقوف ہوگیا اور اس کے بجائے مطالعہ اور تحصیل علم کی رغبت پیدا ہوگئی چنانچہ اس نے ادب کے تمام اوّل انعامات حاصل کرلیے لہو و لعب کی تمام دلچسپیوں سے بالکل نفرت سی ہوگئی اور فرصت کے اوقات جسے دوسرے طلبا دلچسپیوں میں گزارتے تھے وہ ورجل اور روکس کی کتابوں کو انگریزی میں منتقل کرنے میں صرف کرنے لگا اس کے انہماک کا یہ حال تھا کہ اساتذہ کو مجبوراً کھیل کود کی تلقین کرنی پڑی اور کمرے سے نکالنا پڑا۔ لیکن وہ برابر اصرار کرتا کہ مجھے ایسے ہی کاموں میں مشغول رہنے دیجئے پر جب یہ راضی نہ ہوتے تو ہاتھ میں کتاب لے کر کمرے سے باہر چلا جاتا اور اس طرح استادوں کے حکم کی تعمیل اور اپنی خواہش دونوں ہی ہوجاتی اس کمسنی کے زمانے میں لاطینی زبان سیکھ ڈالی۔ اب تک باضابطہ یونانی پڑھنی شروع نہیں کی تھی لیکن پھر بھی یونانی زبان سے غافل نہیں ہوا بلکہ یونانی سے بھی کچھ کتابیں انگریزی میں ترجمہ کرڈالیں اس زمانے میں

روبنسن کروزو کا قصہ پڑھا، شیکسپیر کے فیض رساں چشمہ سے تشنگی بجھائی۔ اس کے مطالعہ اور خیالات میں فرق یہ ہے کی سب سے بڑی تصدیق اس کے اس قول سے ہوتی ہے جو اس نے اپنے ایک ساتھی سے کہا تھا جو مدرسہ میں اس کا دوست تھا: "میرا یقین ہے کہ کوئی شخص دو بجے رات کو کمرے میں تنہا بیٹھ کر مکبتھ کے مطالعہ کی جرأت نہیں کر سکتا۔"

قبل ازیں کہ کیٹس اس مدرسے (مدرسہ مسٹر کلارک) کی تعلیم ختم کرے اپنی آخری رشتہ دار اور مربیا کی آغوش تربیت سے ہی چھوٹ گیا اور اب ان چاروں بھائیوں کی تربیت کی ذمہ داری ایک تاجر مسٹر ایبی نے اپنے ذمہ لی۔ کیٹس کے پاس اب جو رقم تھی وہ کسی طرح آٹھ ہزار پونڈ سے زیادہ نہ تھی۔ جب ۱۸۱۱ء کی گرمیوں میں کیٹس نے مدرسہ کلارک چھوڑا (جبکہ اس کی عمر پندرہ سال کی ہوگی) اور طب کی تعلیم کی غرض سے ایڈمنٹن کے ایک مشہور سرجن مسٹر ہامونڈ کے پاس بھیجا گیا۔ ظاہر ہے کہ تحصیل طب کی غرض سے بھیجنے کے لیے کیٹس سے مشورہ نہیں کیا گیا۔ اگر اس سے مشورہ کیا جاتا تو وہ ادبی تعلیم کو طبعی مناسبت کی وجہ سے ترجیح دیتا اور بجائے انسانی اعضا کی تشریح پڑھنے کے اپنے اوقات بھی نظموں کی تیاریوں میں صرف کرتا۔

لیکن خوش قسمتی سے یہی ایک مبارک موقع تھا جب قضا و قدر نے زندگی میں صرف ایک مرتبہ اس کے ساتھ نرمی و مہربانی اور رفق و محبت کا برتاؤ کیا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ باوجود اس کے کہ اس کا تعلق ادب سے منقطع ہو کر طب اور طبابت سے قائم ہو گیا تھا لیکن ایڈمنٹن اور انفیلڈ میں کچھ زیادہ بعد نہ تھا اس لیے کیٹس کے تعلقات مسٹر کلارک کے خاندان سے باقی رہ گئے اور چارلز کاؤڈن کلارک (خلف مسٹر کلارک) اور کیٹس میں خوشگوار دوستی قائم ہو گئی گو کہ وہ عمر میں کیٹس سے چند سال بڑا تھا لیکن روحانی اور فکری صلاحیتوں میں اس کا ہم مشرب تھا اور جیسا کہ معلوم ہوتا ہے کہ چارلز کلارک کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ کیٹس نے اس کی دوستی سے پورا فائدہ اٹھایا اور تاریخ کے سامنے اس کی مساعیوں کا اعتراف بھی کیا ہے چنانچہ ایک قطعہ میں لکھتا ہے جو کہ اسی کے نام سے معنون ہے۔

ترجمہ: "آج ہی سے نہیں بلکہ مجھ کو بہت پہلے سے اعتراف ہے کہ تم ہی نے مجھے سب سے پہلے نغمہ کی تمام شیرینیوں سے آشنا کیا۔"

پھر وہ نغمات کی شیرینیوں کے سارے اقسام کو بیان کرتا ہے جس کا علم اس دوست کے فیض صحبت کا نتیجہ تھا۔

ترجمہ:- ایسے اعلیٰ لذیذ لفظیں، رواں اور ملیح لہجے جو ذکاوت احساس کے ساتھ ترقی کرتے ہیں اور جو عمدہ اور مسرور کن ہیں"

پھر دیکھیے کہ کس طرح صرف چند الفاظ میں دو عظیم الشان شاعر اسپنسر اور ملٹن کے شاعرانہ کمالات اور خوبیوں کو بیان کیا ہے

ترجمہ:- اسپنسر کے الفاظ جو بہت آسانی سے زبان پر رواں ہو جاتے ہیں، ایسے ہیں گویا گرمی کے زمانے میں سمندر پر چڑیاں اڑتی ہوں اور ملٹن کا طوفان اور ملٹن کی لطافتیں ایسی ہیں جیسے میکائیل زرہ پوش ہوں یا مقدس حوا کی برکتیں طلسم میں آگئی ہوں

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ چارلس کلارک کو مطالعہ شاعری پر گہرا عبور حاصل تھا یہی وجہ تھی کہ اس نے اس نوجوان شاعر کے ذہن میں دقت فکر اور احساس کا پائیدار اثر چھوڑا نیز اس نے رومانیات کا بھی شوق پیدا کر دیا چنانچہ کیٹس جو اس سے مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے۔

ترجمہ:- تم نے ہی کلو کی خوبصورتی کو بے نقاب کیا ہے اور محب وطن کو اس کا اہم فریضہ یاد دلایا ہے الفرڈ کی طاقت تل کی کمان، برٹس کا ہاتھ جس نے ظالم کا ہاتھ کچل ڈالا ان سب کی یاد پھر سے تازہ کر دی ہے۔

پھر اپنے دل کی گہرائیوں سے اپنے دوست کی خدمت میں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہتا ہے

ترجمہ:- اگر میں نے تم کو دیکھا نہ ہوتا یا تمہاری مہربانیوں سے ناآشنا رہتا تو میں کیا ہو سکتا تھا؟

اس درجہ تک کیٹس اپنے دوست کا مداح تھا بلاشبہ اگر الفت کا رشتہ قائم نہ ہوتا تو کیٹس نہ انگریزی اور یونانی ادب سے سیراب نہ ہو سکتا اور انگریزی زبان میں ایک قیمتی جوہر کا اضافہ نہ ہوتا۔

اس معاملہ میں کیٹس کی حالت بالکل شیکسپیر کی سی ہے اس کا ادبی تبحر مدرسی تعلیم کا نتیجہ نہ تھا بلکہ محض اتفاقی

ملاقات کے فیض کا اثر تھا کیونکہ کیٹس نے اپنی ادبی تعلیم چارلز کلارک سے حاصل کی اسی طرح اس نے بہت علم اپنے مشہور ادیب اور سیاست داں دوست لی ہنٹ سے بھی حاصل کیا جبکہ وہ جنگلوں کی سیاحت کرتا تھا اور انھیں خوشگوار مناظر اور سکون کے دلآویز لمحات میسر آتے تھے۔

کیٹس ایڈنبرا میں ڈاکٹری کی تعلیم ختم کرنے کے بعد ۱۸۱۵ء میں لندن کے ایک شفاخانہ میں مشق کے لئے منتقل ہوگیا۔ آئندہ سال لی ہنٹ سے تعلقات کا غنیمت موقع ہاتھ آگیا۔ تعارف کا ہونا تھا کہ دونوں میں گہرے تعلقات قائم ہوگئے جو دوستی کی حد سے گزر کر عزت و احترام کی حد تک پہنچ گئے۔ وفاداری و محبت کا ہدیہ شاعر کی طرف سے پیش کیا گیا اور قدرشناسی کا انعام آزاد خیال ادیب کی جانب سے۔ اسی محبت اور خلوص کے گہوارے سے شاعری کا وہ چشمہ پیدا ہوگیا جس کی حلاوت سے آج انگریزی کا مطالعہ کرنے والا ہر فرد لطف اندوز ہوتا ہے۔ ایک سال سے پہلے ہی عالم ادب میں کیٹس کا پہلا دیوان شائع ہوا جس کے شروع میں پہلی نظم کے اندر لی ہنٹ کی محبت اور اخلاص کا شکریہ ادا کیا گیا تھا۔ اور دیوان کو لی ہنٹ کے نام سے معنون کیا گیا تھا چنانچہ بسلسلۂ انتساب و تہدیہ ایک قصیدہ میں لکھا ہے۔

"۔۔۔ مگر اب تک وہ پُرکیف مسرتیں باقی ہیں اور میں اس بنا پر ہمیشہ اپنی قسمت پر ناز کروں گا کہ
آپ جیسے انسان کی خدمت میں یہ حقیر ہدیہ پیش کرکے آپ کا سپاس گزار بن سکتا ہوں۔"

شومئی قسمت اس کی طالب تھی کہ اس دیوان کو ذرہ برابر کامیابی نہ نصیب ہو چنانچہ کسی پڑھنے والے نے نہ تو اس کو خریدا اور نہ ہی اس کو پسند کیا۔ بلا شبہ یہ ایک ایسا رنج تھا جس سے مجد و شرف کے متلاشی نوجوان کا دل پست ہمت ہوگیا لیکن جب اس خراج تحسین کا جو خاص دوستوں اور ممتاز ادبا کی طرف سے پیش کیا گیا تھا جمہور اور عام پڑھنے والوں سے مقابلہ کرتا تو وہ مجبور تھا کہ اس ناکامی کی ذمہ داری غریب ناشر کے سر ڈالے۔ نتیجہ اس واقعہ کی بنا پر کیٹس کے تعلقات مسٹر اولیر جو خود بھی ایک نوجوان ادیب اور شاعر تھے اور جنھوں نے اس کی شاعری سے متاثر ہوکر دیوان شائع کرنے کی ذمہ داری اپنے سر لی تھی منقطع ہوگئے۔

پہلا دیوان مارچ ۱۸۱۷ء میں شایع ہوا لیکن اس کی عدم مقبولیت کا یہ اثر نہیں ہوا اور نہ ہونا چاہیئے تھا کہ کیٹس شاعری کا راستہ ہی ترک کر دے بلکہ اس کے برخلاف اسی سال اس نے اپنا مشہور مرثیہ اَنڈیمیان نظم کرنا شروع کر دیا جو ۱۸۱۸ء میں شایع ہوا جبکہ وہ ایک ڈرامہ ریزا بیلا مرتب کر رہا تھا اس کے بعد وہ انگلستان کی جھیلوں اور اسکاٹ لینڈ کی سیر کو روانہ ہو گیا اور یعنی فیصلہ کر لیا کہ وہ ڈاکٹری کے پیشہ کو قطعی ہاتھ نہیں لگائے گا حالانکہ اس کو کسی آپریشن میں اب تک ناکامی نہیں ہوی تھی کیونکہ اس کو ہر آں یہ خوف لگا رہتا تھا کہ اگر خدانخواستہ کسی آپریشن میں غلطی ہو گئی تو ایک بے گناہ کا خون ہوگا اور اس کا سارا عذاب اس کے سر عاید ہوگا بلاشبہ اس خوف کے پیدا کرنے میں کیٹس کی قوت تخیل کو بہت زیادہ دخل تھا جس کے اثر سے متاثر ہو کر اس نے اپنے رزق کے وسیلہ کو ترک کر دیا اور محض قوتِ بازو پہ زندگی گزارنے لگا جس نے اس کی زندگی کو آزمائشوں میں مبتلا کر دیا اور اس کے دوستوں کا یہ حال کہ روپے کی چار اٹھنیاں بنا رہے تھے۔

کیٹس نے انگلستان کی جھیلوں کی سیاحت اس غرض سے شروع کی تھی تاکہ اس کی صحت سنبھل جائے کیونکہ اب اس پر ضعف اور مرض کے آثار نمودار ہونے لگے تھے لیکن زیادہ دن گزرنے نہیں پائے تھے کہ اس کے حلق میں سوزش شروع ہو گئی اور لندن واپس آنا پڑا اگست اور ستمبر میں رسالہ "کوارٹرلی" اور "بلیک ووڈ" میں "انڈیمیان" پر دو تنقیدی مضامین شایع ہوئے اس تنقید کا مقصد کیٹس سے سیاسی انتقام لینا تھا کیونکہ اس کتاب میں لی ہیٹ کی تعریف کی گئی تھی اور جیل سے رہائی کے موقع پر ایک تہنیت کا قصیدہ لکھا تھا جو اسی کتاب میں شریکِ اشاعت تھا اس کی قید سخت سیاسی کشمکشوں اور باہمی تشاجر کا نتیجہ تھا۔

میں نے اس سے قبل اس غلط فہمی کی طرف اشارہ کیا ہو کہ یہ خیال محض غلط ہو کہ ان دونوں مضامین نے کیٹس کے غم کو بڑھا دیا جس کا حسرت ناک انجام بہت جلد نمودار ہوا یہ خیال بالکل غلط ہو کیونکہ شایع شدہ دیوان پر اتنا غم اس لیے نہیں ہونا چاہیے تھا کہ اس کی امیدوں کا مرکز اب زیرِ تصنیف نئی کتاب تھی اگر شیلی نے مرحوم دوست کی الفت اور اس کی جدائی کے جگر خراش صدمے کی بنا پر اور اگر بائرن ایک شاعر کی موت سے متاثر ہونے کے سبب اور دوسری طرف عبقریت سے متاثر ہو کر یہ فیصلہ کرنے پر مجبور تھے

کہ اس کی موت درحقیقت ان ہی دو مضامین کا نتیجہ تھی تو دوسری طرف ایک تاریخی دستاویز بھی ہے جس نے حقیقت کو بے نقاب کر دیا ہے اور کیٹس کی پیشانی سے بزدلی کا یہ داغ مٹا دیا کہ سخت تنقیدوں کے تیر سے زخمی ہوا اور جانبر نہ ہو سکا چنانچہ ۹ اکتوبر ۱۸۱۸ء کو جو خط ناشر کتاب ہیسی کو لکھا ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کو اپنے موثر پیغام کی کامیابی کا کتنا یقین تھا نیز ان تجربوں، ناکامیوں اور پھر کامیابی کی جد و جہد کس مبارک انجام کا پیغام لائے گی

"میں نے اپنی طاقت کا خوب اندازہ کر لیا ہے کہ مجھ میں کیا نقائص اور کیا خوبیاں ہیں۔ نقد و تبصرہ تحسین کا حامل ہو خواہ تنقیص کا تماشہ مجھ کو بلیک ووڈ اور کوارٹرلی کی تنقیدوں سے سخت تکلیف ہوتی ہے لیکن پھر یہ سوچ کر تسکین ہو جاتی ہے کہ میں حق پر ہوں اور تنقیدوں کا لب و لہجہ درحقیقت اس جذبۂ حسد کا نتیجہ ہے جو میری عمدہ تحریر کو پڑھ کر اس کے دل میں پیدا ہوتا ہے جو کچھ مجھ کو آئے گا لکھتا جاؤں گا لیکن میں نے یہ طے کر لیا ہے کہ اب میں مستقل نہیں لکھوں گا اس سے قبل بغیر تدقیق کے مستقل لکھا کرتا تھا مگر اب نہایت احتیاط سے لکھوں گا شعر کا حسن خود بخود پختگی سے لطیف ہوتا جائے گا۔ خدا سے دعا ہے کہ غیر محسوس طریقہ پر رفتہ رفتہ اس کی خوبیاں ترقی کرتی رہیں۔"

۱۴ اکتوبر ۱۸۱۸ء کو کیٹس ایک خط میں اپنے بھائی جارج کو لکھتا ہے۔

"مجھ کو یقین ہے کہ میں موت کے بعد چند چیدہ انگریز شعرا کی صف میں شمار کیا جاؤں گا رسالہ کوارٹرلی نے مجھ کو رسوا کرنے کی جو ناکام کوشش کی ہے اس کا نتیجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ دشمنوں ہی سے میری شہرت ہو گی مجھ کو جو شخص بھی عوام میں ذلیل کرنا چاہے گا اس کا انجام سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ اس کے ذریعہ بجائے نقصان کے فائدہ ہی ہو گا میں اس شخص کو جانتا ہوں جو مجھ سے زیادہ قابلیت رکھتا ہے اور اسے وہ درجہ بھی دیتا ہوں جس فضیلت و شرف کا وہ مستحق ہے اسی وجہ سے میں اس کو اپنے سوا دوسرے ناقد کا درجہ دیتا ہوں۔"

اں فقروں سے صاف معلوم ہوتا ہو کہ یہ دعویٰ کہ اس دلت سے کیٹس کو اتنا صدمہ ہوا کہ یہی مضامین اس کے حق میں سم قاتل ثابت ہوئے، درحقیقت یہ ایک بے بنیاد دعویٰ ہو جس کی کوئی سند موجود نہیں۔

اکتوبر ۱۸۱۸ء کو کیٹس کے صحیفہ زندگی میں محبت والفت، شوق وبے قراری، غم وفراق کی وہ پہلی سطر لکھی گئی جو تاریخ کے اوراق میں ہمیشہ محفوظ رہے گی۔

کیٹس کی پہلی ملاقات ایک دوشیزہ جان کاکس سے ہوئی اس کے متعلق اپنے بھائی جارج کو ایک خط میں ۱۴ اکتوبر ۱۸۱۸ء کو لکھتا ہو۔

"گو وہ کلوپٹرا نہیں ہو لیکن شامیان سے کسی طرح کم نہیں مشرقی حسن کی فراوانی ہو نگاہیں سحر طراز، اخلاق اعلیٰ جب وہ کمرے میں داخل ہوتی ہو تو دوشیزگی کا سحر پورے کمرے پر چھا جاتا ہو اس دوشیزہ کے دیدار سے ایک سرور سا پیدا ہوتا ہو اس کے دیدار سے مجھ میں حیات کی ایک لہر اور ایک خاص قسم کی زندگی پیدا ہو جاتی ہو میں کسی دوسری مخلوق کے ساتھ رہ کر محسوس نہیں کر سکتا میں اب اپنی ذات کو بالکل بھول گیا ہوں کیونکہ میری زندگی اس کے ساتھ وابستہ ہو گئی ہو۔"

اس عبارت کے دامن میں زیر بحث یہاں ہو بلاشبہ کیٹس کے سیرت نگاروں کا خیال غلط ہو کہ اسکی محبوبہ کا نام جان کاکس تھا جس کی طرف لفظ شامیان سے اشارہ کیا گیا ہو حالانکہ اس نے خود اس کا نام فانی براون بتلایا ہو تعجب تو یہ ہو کہ لارڈ ہاؤٹن نے بھی کیٹس کی سیرت میں مندرجہ بالا خط پر تبصرہ کرتے ہوئے حسب ذیل الفاظ لکھے ہیں

"مناسب معلوم ہوتا ہو کہ ہم اب اس پر بحث کریں کہ اسی خاتون نے جس کا ذکر سابق صفحات میں گزر چکا ہے کیٹس کے دل میں ایسی آگ لگا دی جو تا وفات نہ بجھ سکی۔"

یہ غلطی کوئی غیر متوقع غلطی نہیں جس میں کیٹس کے سوانح نگاروں کا پڑجانا کوئی تعجب خیز امر ہو کیٹس نے اپنے بھائی کو جو خط لکھا ہو اس میں سچائی کے ساتھ اس نے حقیقت اور دل کے سچے جذبات کو پیش کر دیا ہو چنانچہ

عبارت کے بعد لکھتا ہے

"آپ کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوگا کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں بلاشبہ مجھ کو اس سے انتہائی محبت ہے بلکہ محبت سے بھی فزوں تر الفت موجود ہے اب میری حالت وہ نہیں ہے جو اس سے پہلے تھی۔ اس کی یاد میں پوری پوری شب بیداری میں گزار دیتا ہوں جیسے کوئی ہوگا اس کے نغموں میں محو ہو"

لیکن ان الفاظ کو رقم کرتے وقت قضا و قدر کے اٹل فیصلہ کی اسے کیا خبر تھی۔ ابھی اس نے یہ خط بھیجا نہ تھا کہ فانی براؤن سے ملاقات ہوگئی وہ اٹھارہ سالہ دوشیزہ تھی کیٹس سے عمر میں پانچ سال چھوٹی، نرم و نازک حسن و دلربائی کا مرقع، اگر اس کی ذات کو کیٹس کی زندگی میں دخل نہ ہوتا تو اس کی زندگی ان غموں سے خالی ہوتی جس سے اس کے خطوط بھرے پڑے ہیں اگر اس کے جلوۂ جمال کی کارفرمائی نہ ہوتی تو دنیا کیٹس کی عبقریت کے اس مظہر کو کیسے دیکھ سکتی جو قدم قدم پر اس کی نظموں میں جلوہ گر ہے۔ کیا دنیا "بلبل سے خطاب" "یونانی ساغر" "چمکدار ستارہ" اور دیگر ادبی جواہر پاروں سے لطف اندوز ہو سکتی ——؟

کیٹس نے فانی براؤن کے معائب و محاسن ان الفاظ میں بیان کیے ہیں۔

"خوبصورت ہے، اسی قامت ہے، نازک اور چنچل ہے، اس کی ادائیں دلفریب ہیں"

ایک اور موقع پر اس کی تعریف یوں کی ہے۔

"نری تفریح پسند ہے" جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں بعض ایسی عادتیں موجود تھیں جنہیں اس کمسنی میں ہونا ہی چاہیے تھا۔ اس نے اپنے محبوب کے دل میں جلا دینے والے شعلے بھڑکا دیے جس سے مورخین کو موقع دیا کہ وہ اس واقعہ سے فائدہ اٹھائیں اور فانی براؤن کی زندگی پر ایک بدنما داغ لگا دیں حتیٰ کہ سر سڈنی مون نے لکھا ہے۔ "اس عورت کی محبت کیٹس کی زندگی میں سب سے نحس واقعہ ہے" لیکن اس حملہ کی تلخی خود سر سڈنی کے دوسرے جملے سے بہت کم ہو جاتی ہے کہ شاعر کے حالات کا ہی یہ تقاضا تھا کہ خواہ کسی عورت سے محبت کرتا ایسی ہی بدقسمتی کا سامنا کرنا پڑتا تقریباً یہی رائے ارڈ باؤٹن کی بھی ہے کہ کیٹس میں محبت کی شدید جذباتی قوت اس کے فنا کا باعث اور موت کے راستہ پر چلنے کی محرک ہوئی اگر اس کی جذباتی لہر کچھ کم ہوتی تو کچھ زیادہ دنوں تک

زندہ رہ سکتا۔

کیٹس جنت کی دنیا میں داخل ہوتا ہے لیکن وہ خائف ہے مضطرب اور بے چین ہے وہ اپنی شدید نفسانی قوت پر غالب آنے کی کوشش کرتا ہے چنانچہ اپنے ایک دوست کو خط میں لکھتا ہے۔

"میں عوام اور عورت کی خوشنودی دونوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں دونوں کی حالت گندگی سی ہے جس کے بال دیر میں انسان جھٹک کر آزادی کھو دیتا ہے"

ایک شب تقریباً گیارہ بجے کیٹس نہایت مضطرب الحال واپس آیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا نشہ میں مدہوش ہے اس نے اپنے مخلص رفیق و ہمدم براؤن سے کہا مجھے سردی لگ رہی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بخار پھر آئے گا جو ان دنوں آتا ہے۔ بستر پر لیٹنا ہی چاہتا تھا کہ سر تکیہ پر رکھنے سے پہلے ایک خفیف کھانسی آئی فوراً اپنے دوست سے کہا کہ معلوم ہوتا ہے کہ میرے منہ سے خون آگیا ہے روشنی لاؤ تو ذرا دیکھیں کہ خون ہی ہے وہ کچھ دیر تک تکتا رہا اس قرمزی دائرہ کو غور سے دیکھتا رہا پھر نہایت یاس انگیز سکون کے ساتھ اپنے دوست سے کہا۔

"میں اس خون کا رنگ پہچان گیا یہ شریان کا خون ہے ممکن ہے کہ خون کے بارے میں میری تشخیص غلط ہو یہ نقطہ میری موت کا پیغام ہے اور میرا جینا محال ہے"

براؤن نے فوراً سرجن کو بلایا۔ فصد خون کے آپریشن کے بعد کیٹس کو سکون کی نیند آگئی ڈاکٹر کا خیال تھا کہ دونوں پھیپھڑے ابھی سالم ہیں اور حالت تشویشناک نہیں ہے لیکن مریض جو خود بھی صحیح معنوں میں ڈاکٹر ہے اس کی تجویز ڈاکٹر کی رائے سے خلاف ہے اس لیے اس پر ناامیدی چھائی ہوئی ہے جب وہ ناامیدیوں کی کشاکش سے خالی ہوتا ہے تو اپنے دوست سے اس طرح گفتگو کرتا ہے۔

"اگر میری شفایابی کی تمنا ہے تو پہلے اس کی دعا کرو کہ میری گردش دور ہو جائے اور زندگی کی حقیقی مسرتوں سے لطف اندوز ہو سکوں۔ میں اب اتنا کمزور ہو گیا ہوں کہ اب امیدوں سے کھیلنے کے سوا اور کسی قابل نہیں"

ایک دوسرے دن یہ کہتا ہے۔

"میرے ہاتھ کو دیکھو معلوم ہوتا ہے کہ کسی پچاس سالہ انسان کا بے جان ہاتھ ہے۔"

لیکن کیٹس رنج والم کی سخت سے سخت گھڑی میں بھی اپنی محبوبہ کی یاد کو نہیں بھولتا۔ چنانچہ ایک خط میں محبوبہ کو لکھتا ہے کہ اس رات بھی جب شدید ترین مرض کے حملے کا شکار ہوا تھا اور یقین ہو گیا تھا کہ وہ ابدی عالم کے دروازے پر دستک دے رہا تھا اگر اس کے ذہن میں کوئی چیز تھی تو وہ محض محبوبہ کی یاد تھی پھر جوں جوں اس کا مرض بڑھتا گیا محبوبہ کی خدمت میں سلام شوق اور اخلاص و وفا کے خطوط کی تعداد بھی بڑھتی گئی۔ ایک دفعہ وہ ایک خط میں لکھتا ہے:-

"صرف خدا ہی کو معلوم ہے کہ میری تقدیر میں تمہارے وصل کی سعادت لکھی بھی گئی ہے یا نہیں لیکن بہرحال میں اتنا جانتا ہوں کہ یہی میرے لیے بڑی سعادت ہے کہ میں نے تم سے اس حد تک محبت کی اور اگر میری قسمت میں یہی لکھا ہے کہ یہ محبت اس حد سے آگے نہ بڑھ سکے تو میں خدا کی اس نعمت کی ناشکری بھی نہیں کروں گا۔"

ایک دوسرے خط میں لکھتا ہے:-

"تمہاری دلچسپی روزانہ بڑھتی جاتی ہے تمہارا آخری بوسہ سب سے زیادہ شیریں تھا تمہارا آخری تبسم سب سے زیادہ مسرت بخش تھا تمہاری آخری چال سب سے زیادہ حشر خیز تھی کل جب تم میری کھڑکی کے پاس سے گزریں تو تمہاری رنگینی کی بنا پر مجھ کو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ میں نے تم کو پہلی مرتبہ دیکھا ہے میں کبھی یہ محسوس نہیں کر سکتا کہ مجھ کو تمہارے علاوہ کسی دوسرے شخص سے پُرسکون لذت اور اطمینان حاصل ہوگا۔"

ایک منصف تنقید نگار ان ملیح فقروں کو پڑھنے کے بعد یہ تسلیم نہیں کر سکتا کہ فانی براؤن کے تعلقات سے سوا اس کے کہ شاعر کو رنج و محن کا شکار ہونا پڑے اور کوئی حلاوت حاصل نہ ہوئی۔ بلاشبہ اس حادثہ فاجعہ کی ذمہ داری فانی براؤن پر عاید نہیں ہوتی بلکہ یہ سب شاعر کی خراب صحت کا نتیجہ تھا اس کے اعصاب اتنے کمزور ہو گئے تھے کہ طرح طرح کے شکوک اس کے سامنے آتے تھے اور اس طرح بعض سوالات پر مجبور کرتے تھے کہ کیا فانی محبت کے عہد کو برقرار رکھے گی بیماری اور کلفتوں کے باوجود وفا شعاری کا ثبوت دے گی وغیرہ وغیرہ۔

کیٹس کے اعصاب اور جسمانی قویٰ کمزور ہو گئے تھے اس لیے اس کے دل میں طرح طرح کے شکوک پیدا ہوتے رہتے تھے جس کی مثال محبت کی تاریخ میں بہت کم ملتی ہو گیا اس جذبہ کا نتیجہ یہ تھا جب کیٹس نے فانی براؤن کی محبت کا متہم گردانا! کیا اسی جذبہ کا نتیجہ یہ تھا کہ اس نے فانی کو ہر طرح کی دعوت قبول کرنے سے ممانعت کر دی اور شہر میں تنہا جانے پر پابندی عاید کر دی۔ کیا کیٹس نے اس کو لی ہینٹ کے مکان سے قیام کے دوران میں یہ نہیں لکھا!

"میں تم کو تمہارے مسیح کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ جب تم نے اس ماہ وہ کام کیا جس سے مجھ کو دکھ پہنچا ہو تو مجھ سے خط و کتابت کی کوئی ضرورت نہیں شاید اب تم بدل گئیں لیکن اگر تمہارا دعویٰ ہو کہ ایسا نہیں ہوا اور اس کے باوجود تم اس پر قایم رہیں جو میں نے ڈانسنگ ہال اور دوسرے جلسوں میں دیکھا ہو تو پھر مجھ کو زندگی کی کوئی تمنا نہیں اگر تم نے کوئی ایسا کام کیا ہو جس سے مجھ کو دکھ ہو تو میں دعا کرتا ہوں کہ آنے والی رات میری زندگی کی آخری رات ہو میں تمہارے بغیر رہ نہیں رہ سکتا صرف تمہارے ہی بغیر نہیں بلکہ اس صورت میں کہ تم عفیفہ اور پاکدامن بھی رہو"

یہ تھا وہ لب و لہجہ جو کیٹس نے اپنے خطوط میں اس وفا شعار عورت کے لیے اختیار کیا تھا جس پر کسی کو غداری اور خیانت کا شبہ کرنے کی مجال بھی نہیں مگر پھر کیٹس خود ہی اپنی غلطی پر نادم ہوتا تھا اور عذر خواہ ہو۔

"میں چاہتا ہوں کہ ابدیت کا قائل ہو جاؤں اور ابد تک تمہارے ساتھ رہوں"

کیٹس نے اس مہلک مرض سے نکلنے کی جتنی کوششیں کیں سب بے سود ثابت ہوئیں بالآخر ۱۸۲۰ء کے موسم بہار میں یہ رائے طے پائی کہ یہ نوجوان تبدیل آب و ہوا کی غرض سے اٹلی کا ایک طویل سفر کرے۔ اس وقت اس کا ایک مصور دوست سیورن رفاقت سفر کے لیے آمادہ ہوا۔ ان کو شاہی اکاڈمی کی طرف سے سونے کا تمغہ ملا تھا اور یہ وہی تمغہ تھا جو بارہ سال سے کسی کو اس لیے نہیں دیا گیا کہ مبادا کسی غیر مستحق کو نہ مل جائے سیورن کی اس رفاقت کا باعث کیٹس کا وہ احسان بھی تھا کہ جب سیورن کو تمغہ ملا تھا تو کیٹس نے دشمنوں کے حملوں اور

ں کے اعتراضات کا جواب دیا تھا چنانچہ سیفرن نے دولت و ثروت، آرام و آسائش غرض ہر چیز کو
ں بدنصیب عبقری کی خاطر تج دیا، اور ہمہ تن تیمارداری میں منہمک ہو گیا۔
،، اکتوبر ۱۸۲۰ء میں سفر کی پریشانیوں کے بعد جس سے تکلیف اور بڑھ گئی کیٹس اور اس کا دوست .
ں پہنچا وہاں پہنچنے کے بعد اس نے براؤن کو لکھا۔

مجھ کو یقین ہو کہ اب میں اس کو نہیں دیکھ سکوں گا (اشارہ فانی براؤن کی طرف ہو) کیونکہ اب
میری صحت کے سنبھلنے کا امکان نہیں ہو اگر اس دنیا کو الوداع کہنے سے پہلے مجھ کو میری عزیز
براؤن مل سکے تو شاید میں صحت یاب اور تندرست رہ سکوں مجھ کو مر جانے کی طاقت ہو لیکن
جدائی کی تاب نہیں۔ آہ! اے خدا!! اے خدا!!! میرے دل میں اس کی یاد کے جتنے گوشے
موجود ہیں سب تیر بن کر چبھ رہے ہیں وہ تمام ریشمی کپڑے جو اس نے میرے سفری سامانوں
کے ساتھ رکھے تھے میرے دماغ میں سخت تپش پیدا کیے ہوئے ہیں میرا تصور جس میں اس کو
دیکھتا ہوں اس سے باتیں کرتا ہوں سخت دردناک ہو۔

ان دنوں کو یاد کرتا ہوں جب وہ "ہاسٹیڈ" میں تھا اور سارا سارا دن محبوبہ کے مکان کی طرف دیکھا کرتا تھا

مجھے بہت زیادہ امید تھی کہ میں اسے دوبارہ دیکھ سکوں گا۔ لیکن آہ کہ آج مجھے اس کی بھی
امید نہیں کہ اس کے مکان کے قریب ایک گز زمین بھی دفن ہونے کے لیے پا سکوں۔ میں
اب اس کو کچھ لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ اس کی کوئی امید نہیں کہ اب اس کا کوئی خط پا سکوں گا
جب میں اس کی تحریر دیکھتا ہوں تو میرا دل دھڑکنے لگتا ہو یہاں تک کہ اگر کسی موقعہ پر اس کا
ذکر آ جاتا ہو یا اس کا نام کسی جگہ لکھا دیکھتا ہوں تو دھڑکن سی پیدا ہو جاتی ہو اور اب یہ چیز
میری برداشت سے باہر ہو۔

کیٹس نابلی سے روما منتقل ہو گیا جہاں ایک مشہور طبیب مسٹر جیمس کلارک کے پاس گیا اور اس کی
میں ایک خط پیش کیا کریم النفس طبیب نے علاج و معالجہ اور رفق و محبت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا
کان کے سامنے میدان اسپان (پیازا دسپانیا) میں ٹھہرایا لیکن شورِ خیال اور عام جہالت کی وجہ سے

لوگ اس سے اس طرح دور دور رہنے لگے جس طرح ایک صحیح و سالم اونٹ کسی خارشتی اونٹ سے دور دور رہتا ہے کیونکہ جہالت کی وجہ سے لوگوں کا خیال تھا کہ یہ مرض بہت متعدی ہوتا ہے جب کیٹس کو سب سے زیادہ محبت اور دلجوئی کی ضرورت تھی اس وقت اسے نفرت اور کنارہ کشی سے دوچار ہونا پڑا۔

بالآخر قدرت نے یہ دیکھنا گوارا نہ کیا کہ یہ درد سے پُر رنج و غم سے چور زیادہ دنوں تک اس اذیت میں مبتلا رہے۔ بیماری ترقی کرتی رہی معدہ گڑ گیا اور ذرا کھنے پڑھنے کا تصدیھی دشوار اور محنت اذیت دہ ہو گیا چنانچہ وہ اپنے دوست براؤن کو اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے آخری خط میں لکھتا ہے

"اب یہ ناگزیر احساس پوری طرح پیدا ہو گیا ہے کہ میری زندگی ختم ہو چکی ہے اور اب قبر کے عالم میں زندگی گزاروں گا۔"

انتقال کی داستان اس کے دم ساز اور مخلص دوست سیورن نے نہایت دردناک الفاظ میں بیان کی ہے اس موقع پر اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں کہ ان میں سے چند اخلاص سے پُر فقرے نقل کر دوں جس کے حرف حرف سے غم کے آنسو ٹپک رہے ہیں۔

"۱۴ر دسمبر مجھ کو خوف ہے کہ آج ستم رسیدہ کیٹس کی حالت بہت زیادہ خراب ہو جائے گی کیونکہ غیر متوقع ضعف پیدا ہو چلا ہے جس نے اسے بستر پر لٹا دیا ہے اب تمام امیدیں برعکس نظر آرہی ہیں اس کی تکلیفیں بہت زیادہ اور ہیجان میں ضعف حد سے زیادہ بڑھ گیا ہے اور ہر اِن کا دورہ بھی زوروں پر ہے"

۱۷ر دسمبر وقت ۴ بجے صبح صرف ابھی نیند آئی ہے گزشتہ آٹھ راتوں میں صرف پہلی مرتبہ اب تک کھانسی کے وقت پانچ مرتبہ اس کے منھ سے خون آچکا ہے اب کوئی شے ہضم بھی نہیں کر سکتا لیکن اس کے باوجود ہر وقت کھانے کو مانگتا ہے اور یہی کہتا ہے کہ وہ بھوک سے مر جائے گا میں اجازت سے زیادہ کھانے کو دینے کے لیے مجبور ہو گیا ہوں اس کی قوت تخیل اور حافظہ ہر وقت کسی خالق شے کے تصور میں منہمک رہتے ہیں چنانچہ اکثر وہ خوف کی حالت میں اپنے دوست ڈاکٹر براؤن کو یاد کرتا ہے اور ان چار ہفتوں کو یاد کرتا ہے

جو اس نے اس کے ساتھ گزارے پر فانی براؤن اس کی بہنیں اور اس کے بھائی کو بھی یاد کرتا ہے۔

۱۵ر جنوری، وقت ساڑھے بارہ   اس وقت کیٹس سو رہا ہے میں اس کی تیمارداری کے لیے برابر جاگتا رہا اور کوشش کی کہ وہ سو جائے اس نے مجھ سے کہا سیورن، مجھ کو تمہاری پرسکون نظروں میں میلے آسماں سر کی جھلک نظر آتی ہے مجھے جو کچھ نظر آ رہا ہے وہ تم سمجھ نہیں سکتے تم نے میرے لیے بہت زیادہ تکلیف برداشت کی ہے کہ میں نہیں چاہتا ہائے کاش! میرا آخری وقت آ جاتا!! چونکہ ہم لوگ روپیہ لے چکے تھے اس لیے خزانچی ٹورلینیا نے اب مزید روپیہ دینے سے صاف انکار کر دیا اس لیے اب ہم مجبور ہو گئے کہ مکان کے کرایہ کی ادائیگی میں باقی ماندہ چوتھائی پونڈ کی حقیر رقم بھی خرچ کر دیں کیونکہ دوسری صورت میں کیٹس کی موت کے بعد تمام اثاثہ اور کرسیاں وغیرہ جلائی جائیں گی اور دیوار پر پھر نئے سرے سے سفیدی کرائی جائے گی۔ اور اس وقت یقیناً سو پونڈ یا اس سے زائد دینے پڑیں گے لیکن ان سب سے اہم اس نوجوان کا معاملہ ہے جو بستر پر دراز ہے اور زندگی کے آخری لمحات میں بھی روحی سکون سے محروم ہے! اب وہ خط کے پڑھنے کی بھی طاقت نہیں رکھتا اس لیے مجھ سے خواہش کی ہے کہ میں خطوط نہ کھولوں بلکہ اس کے سرہانے رکھ دوں چونکہ شدت مرض سے اس کا دل پاش پاش ہو رہا ہے اسی لیے اب لفافہ کا پتہ دیکھنے کی طاقت بھی باقی نہیں۔

۲۴ر فروری، ہوش و حواس دونوں واپس آنا شروع ہو گئے ہیں۔ رات اس نے بہت گفتگو کی لیکن بہت سکون کے ساتھ پھر وہ گہری نیند سو گیا اس رات اس نے وہ بات جس پر سب سے زیادہ زور دیا یہ تھی کہ اس کی قبر پر یہ عبارت کندہ کر دی جائے۔

یہاں ایک ایسا شخص محو خواب ہے جس کا نام صفحۂ آب پر لکھا گیا تھا

- مجھ کو آج ایک خط ملا جس کو میں نے یہ سمجھ کر کیٹس کو دے دیا کہ تمہارا (براؤن) خط ہے لیکن

افسوس یہ خیال خام تھا اس نے ایک نظڈالی اور فوراً خط کو چاک کیا مگر خط پڑھا نہیں کیونکہ اب اس میں اتنی صلاحیت باقی نہیں تھی کہ پڑھ سکے اس سے وہ چند دنوں تک مستا تر رہا اور مجھ سے کہا کہ ایک تھیلی میں اس خط اور اس کی بہن کے خط کو نعش کے ساتھ رکھ دیا۔

۲۳ر فروری آج رخصت ہوگیا اس نے زندگی کو نہایت سکون سے الوداع کہا گویا وہ تیس سال کی عمر میں میٹھی نیند سونے جا رہا ہو چار بجے سے پہلے موت کے آثار پیدا ہونے لگے اس نے مجھ سے کہا سیفرن امیں   ۔ ذرا مجھ کو اٹھاؤ!   ۔ اب میں مر رہا ہوں۔ میں نہایت سولت اور اطمینان سے چلا جاؤں گا گھبراؤ مت!   صبر سے کام لو اور خدا کا شکر کرو کہ ساعت آگئی   !

اس طرح کیٹس کی شمع زندگی کی آخری دھڑک اٹھی۔

یہ نوجوان شاعر جان کیٹس ابدی دنیا کی طرف پرواز کرگیا۔ لیکن اس کی شہرت اور عزت کا خوشنما رشتہ اس دنیا سے منقطع نہیں ہوا اور آج وہ دنیا کے بڑے بڑے شعراء کی صف میں کھڑا ہے۔

(مترجمہ) بدرالدین عظیم

غزل

رکی رکی سی شب مرگ ختم پر آئی / وہ پو پھٹی، وہ نئی زندگی نظر آئی

یہ موڑ وہ ہو کہ پرچھائیاں بھی دیں گی نہ ساتھ / مسافروں سے کہو اس کی رہ گزر آئی

ترا ہی رنگ سرشک غم جہاں میں بھی تھا / نگاہ میں تری تصویر سی اتر آئی

ستارے چھٹکے جب اس چاند کیلیے رویا / کہ بال کھولے ہوئے شام بے سحر آئی

فضا تبسم صبح بہار تھی لیکن / پہنچ کے منزل جاناں پہ آنکھ بھر آئی

نیا نہیں ہے مجھے مرگ ناگہاں کا پیام / کہ جیتے جی مجھے اکثر مری خبر آئی

کہاں ہر ایک سے انسانیت کا بار اٹھا / کہ یہ بلا بھی ترے عاشقوں کے سر آئی

کہیں نشان سکوں بھی ہے فرش سے تا عرش / مگر یہ بات محبت کی بات پر آئی

غم و نشاط کی دیوی پھر ایک عمر کے بعد / بہ چہرۂ متبسم بہ چشم تر آئی

ذرا وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ اے دوست / ترے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی

شب فراق اٹھے دل میں اور بھی کچھ درد
کہوں یہ کیسے تری یاد رات بھر آئی

فراق گورکھپوری

گُل دورُو

ساقیٔ خود فروش کی چشم سیاہ مست — جامِ مئے طہور کو دینے چلی شکست
اللہ یہ جو فروشیاں گندم نمائیاں — کفر آشنا زبان بایں شکل حق پرست
پایا کہیں نہ منزلِ افتادگاں نشاں — دیکھے ہیں راہِ شوق میں کیا کیا بلند و پست
خود کامیوں کی حد ہے کہ بس خود نما ہوئے — اب کیجئے خود پرست کہیں یا خدا پرست
دعویٰ زہد اور غریقِ فجور و فسق — ریو و ریا شعار و لیے سبحہ بدست
ابرو کشیدہ اور یہ آنکھیں جھکی جھکی — کس بے گنہ کو تاکا ہے کس پر لگائی شست
یہ بے نیازیاں کہ الٰہی تری پناہ — کچھ یاد ہے کہ بھول گئے وعدۂ الست
جائے نہ کوئی خوبیٔ صورت پہ آپ ہیں — مطلب پرست، مال پرست و ہوا پرست
کشتی کسی کی تیرے کہ ڈوبے کہ پار ہو — قلزم صفت جناب کی ہے طبع موج مست
چھوڑے ادھر شگوفے ادھر گل کھلا دیے — ان رنگ بازیوں کا کہاں تک ہو بند و بست
نیرنگِ حسن ایک تماشا ہے کیا کہیں — "معشوق ما بشیوۂ ہر کس موافق است
با ما شراب خورد و بزاہد نماز کرد"

عبداللطیف تپش

بغاوت

یوں تو ——

رقص و نغمہ سے جواں ہو مرا رنگیں شباب
ٹوٹ کر بنتے ہیں تخئیل کے قلزم میں حباب
مسکراتی ہے مری موج سے فطرت کی کلی
زندگی ہو مری مانندِ نسیمِ سحری
فکرِ رنگیں سے دیتا ہوں خیالوں کو ثبات
رنگ دنیا سے سجاتا ہوں شبستانِ حیات
ساحلِ عشق پہ ہوتا ہے تمنا کا گزر
اکثر اک نورِ تصور سے جھپکتی ہے نظر

شعلۂ پیکر کی ادا سے مری فطرتِ قتیل
کھینچ لیتی ہے مجھے بارگہِ حسنِ جمیل

لیکن ——

دیکھتا ہوں درِ مغرور پہ جب جھکتی جبیں
لڑکھڑاتا ہے اثر سے دلِ صد چاک زمیں
جب ہلاتی ہے فلک تلخیٔ ایام میں زیست
ختم ہوتی ہے غلامی کے در و بام میں زیست
دیکھتا ہوں جب اسی دہر میں خرمنِ شباب
بھڑک اٹھتا ہے نوا سے مری فطرت کا رباب
طلعِ زیست پہ ہوتی ہے تجلی کی نمود
ٹوٹ جاتے ہیں تب دنیا سے آئینِ جمود

غیرتِ عشق جوانی کی قسم کھاتی ہے
روحِ احرار بغاوت پہ اتر آتی ہے

فضل حسین کیف اسرائیلی

دعا

سمندر کو لعل و گہر دینے والے — گداؤں کو تاج و کمر دینے والے
دعاؤں کو رنگ اثر دینے والے — دلوں کو مزاج شرر دینے والے
اکیلا ہوں، اک ہم سفر چاہتا ہوں

کیے آسماں کو عطا چاند تارے — دیے بلبلوں کو چمن کے نظارے
کسی کے لیے دام گیسو سنوارے — سبک سیر ندیوں کو بخشے کنارے
بھکاری ہوں، لطف نظر چاہتا ہوں

جبیں آب رنگ ریا سے عاری — طبیعت غرور تمنا سے عاری
ادا شوخی دلبرانہ سے عاری — نظر تنگی زاہدانہ سے عاری
شب غم، ہمہ سیر سحر چاہتا ہوں

جو عقل و عزیمت کو معیار سمجھے — جو دنیا کی ہر جیت کو ہار سمجھے
جو حسن و حقیقت کو نادار سمجھے — جو ہر بار دیکھے، جو ہر بار سمجھے
وہ آزردہ خاطر نظر چاہتا ہوں

گماں نے نہ بخشی مجال نظارا — نہ منزل سے دوری نہ منزل کا یارا
نہیں تلخی نوش ہستی گوارا — بجھا چاہتا ہے جنوں کا شرارا
اگر دے تو عزم ظفر چاہتا ہوں

نہیں نام کا ننگ حاصل تو کیا ہے؟ — نہیں جوہر حسن قابل تو کیا ہے؟
زمانہ نہیں دل کا قائل تو کیا ہے؟ — نہیں طرف دولت پہ مائل تو کیا ہے؟
میں کب جلوۂ رہ گزر چاہتا ہوں

جو بام ثریا پہ بستی بسائیں — جو سدرہ کو اپنی نگہ میں نہ لائیں
جو جبریل کو تازہ نغمے سنائیں — جو بالا ہوں دنیا سے دنیا پہ چھائیں
وہ قلب و جگر، بال و پر چاہتا ہوں

خورشید الاسلام

راسخ دہلوی

مولوی محمد عبدالرحمن راسخ دہلی کے شعراء کی صف اول میں شمار ہوتے تھے ان کے موجودہ کلام میں تغزل کے بہترین نمونے موجود ہیں کلام میں پختگی روانی اور جوش ہے انداز بیاں سلجھا ہوا اور سادہ ہے زبان صاف اور نکھری ہوئی ہے رنگ اساتذہ دہلی ہے جو داغ اور امیر کے ہاں نظر آتا ہے یہ اور بات ہے کہ راسخ کو مرنے کے بعد وہ شہرت نصیب نہ ہو سکی جو داغ اور امیر کے حصہ میں آئی تھی ع

یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

ورنہ شاعرانہ خوبیوں کے لحاظ سے راسخ کا درجہ داغ اور امیر سے کسی طرح کم نہیں ہے ان کا مجموعہ نام معارف جدید حروف نہ دیوان راسخ سنہ ۱۹۰۸ء میں افضل المطابع دہلی میں شائع ہوا تھا یہ انتخاب جو پیش کیا جا رہا ہے اسی دیوان کا ہے۔

پئے تعظیم جھک جاؤں جو دوزخ ہو رضا تیری — پشیمانی سلیقہ ہے مری معصیت شعاری کا

حیا میں شوخی سکھائی تمہیں کرم میں ستم — نگہ میں ناز ادا میں غرور رحم سے ہوا

زندگی سمجھا تھا جس کو موت تھی — مجھ کو راسخ عمر بھر دھوکا رہا

شیخ محراب عبادت سمجھا — اُف رے عالم تری انگڑائی کا

رتبہ پاتی ہے تمہاری شہرت — نام لے کر مری رسوائی کا

پی لیا شیخ نے نادان مری خاطر سے — یوں سمجھ جس نے پلائی وہ گنہگار رہا

چین لینے نہ دیا عشق بتاں نے راسخ — عمر بھر روگ رہا عمر بھر آزار رہا

ساکے لیتے ہیں تصدق مری توبہ راسخ — مرے مرتے بھی ہو جس کو طلب جام شراب

قدامت سے دونوں ہیں شایان قدر — پرانی محبت پرانی شراب

کشش دل سے جب ملیں گے آپ ‏ ‏ ‏ ‏ بے طلب بے سبب ملیں گے آپ

گئی گزری جو لب تک آئی بات ‏ ‏ ‏ ‏ منہ سے نکلی ہوئی پرائی بات

کھیل ہو مجھ کو شغل جانبازی ‏ ‏ ‏ ‏ تجھ کو ہے حجر آزمائی بات

مرے آگے تری جفائیں کھیل ‏ ‏ ‏ ‏ تیرے نزدیک بے وفائی بات

آگ لگ جائے سوز پنہاں کو ‏ ‏ ‏ ‏ آبلہ بن کے لب تک آئی بات

پرتو عکس ہے عارض ساقی شراب میں ‏ ‏ ‏ ‏ دو آفتاب ڈوبے ہیں اک آفتاب میں

عکس رخ نگار ہے ساقی شراب میں ‏ ‏ ‏ ‏ لالے کے پھول ہیں طبق آفتاب میں

دل جلے دل جلائے بیٹھے ہیں ‏ ‏ ‏ ‏ آگ گھر میں لگائے بیٹھے ہیں

درد! تیرے اٹھائے اٹھیں گے ‏ ‏ ‏ ‏ ضعف! تیرے بٹھائے بیٹھے ہیں

وعدۂ حشر وہ کریں تو سہی ‏ ‏ ‏ ‏ میں تو ہنگامہ ساز محشر ہوں

تو اپنی شوخیوں سے وہاں ہے جہاں نہ تھا ‏ ‏ ‏ ‏ میں اپنی بے خودی سے جہاں تھا وہاں نہیں

اللہ رے بیم جلوہ سے وارفتگی مری ‏ ‏ ‏ ‏ میں خود کو ڈھونڈتا ہوں کہاں ہوں کہاں نہیں

سینہ پہ رکھ کے دست تسلی نہ پوچھیے ‏ ‏ ‏ ‏ اب کیا بتاؤں درد کہاں ہے کہاں نہیں

یہ ہے جو شیخ صاحب ایک سال میں انکو ہیں شستہ ‏ ‏ ‏ ‏ جناب آہستہ آہستہ حضور! آہستہ آہستہ

کسی کے عارض تاباں سے پردہ اٹھتا جاتا ہے ‏ ‏ ‏ ‏ کسی کا کام ہو جائے گا طور آہستہ آہستہ

طوفان ماجرا ہو دنیا مرے آگے ‏ ‏ ‏ ‏ ہوتا ہو جہاں کا تماشا مرے آگے

جنت میں وہی مے وہی ساقی وہی حوریں ‏ ‏ ‏ ‏ جو میں نے کیا تھا وہی آیا مرے آگے

بشر کو چاہیے پاس دل بشر رکھے ‏ ‏ ‏ ‏ کسی کا ہو کے رہے یا کسی کو کر رکھے

ہاتھ دل پر دھرے دو بیٹھے ہیں ‏ ‏ ‏ ‏ اس تسلی میں اضطراب بھی ہے

سکوت عیب ہے مشتاق بیم جاں کے لیے ‏ ‏ ‏ ‏ فغاں زباں کے لیے ہے زباں فغاں کے لیے

(مرسلہ) حبیب کیفوی

تنقید و تبصرہ

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

محشرِ خیال: مصنفہ سجاد علی انصاری مرحوم بی۔اے، ایل ایل بی (علیگ)، ناشر خاں الیاس احمد مجیبی۔ قرول باغ دہلی تعداد صفحات ۲۰۲ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ قیمت ۲؍ کاغذ کتابت و طباعت نفیس۔

سجاد انصاری مرحوم سے ہر وہ شخص واقف ہوگا جو اردو ادب کا اعلیٰ اور نفیس معیار و مذاق رکھتا ہے۔ ان کی گرمیِ تخیل کا پہلا حشر اب سے کوئی پندرہ سال پہلے قایم ہوا تھا۔ محشرِ خیال کا یہ دوسرا اڈیشن ہے جو بڑے اہتمام سے شائع کیا گیا ہے۔

انصاری مرحوم علی گڑھ کے ان شاندار اور بیباک سپوتوں میں سے تھے جو اگر زندہ رہ جاتے تو دنیائے ادب میں ایک انقلاب برپا کر دیتے اور لوگوں کے ادبی شعری عقاید و مسلمات میں ایک حشر برپا ہو جاتا۔ شوخیِ تخیل اور پھر اس پر آتش بیانی ایک طوفان ہے جو خس و خاشاک کو جلاتا چلا جاتا ہے۔ محبت کی ماہیت، نفسی عفتِ نسواں، "حقیقتِ عریاں"، "پیام زلیخا سے"، "روزِ جزا" تک پڑھتے چلے جائیے آپ کو وہ نئی نئی باتیں معلوم ہوں گی جن کی فراوانی اور گرمی سے آپ کا ذہن متحیر، آپ کا دل گرم اور آپ کی روح مشتعل ہو جائے گی سوچنے کا طریقہ اور پرکھنے کا ڈھنگ دونوں نرالے ہیں۔ شعر و فلسفہ، عشق و محبت، عصمت و رندی، بوالہوسی اور مذاق زیادہ تر اسی قسم کے موضوع ہیں لیکن طرزِ ادا میں وہ بیباکی، بغاوت اور صدائے تعمیر و اصلاح موجود ہے جو ہمیں کہیں اور نہ دکھائی دے گی۔ شاعرانہ جوشِ تخیل فلسفیانہ حقایق کوشی کے ساتھ مشکل سے مل سکے گا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایک دیوانہ مجذوب ہے جو باصد ہوشیاری و فرزانگی حقایق و معارف کو کمال حسن و خوبی کے ساتھ لٹاتا چلا جاتا ہے۔

اس اڈیشن میں ان کا ایک نامکمل ڈراما "روزِ جزا" بھی دے دیا گیا ہے اس ڈرامے میں قیامت کا منظر دکھایا گیا ہے جس کے افراد آدم و حوا، شیطان اور فرشتے، صوفی و زاہد، خوبصورت مرد اور خوبصورت عورت

پھیلا۔ باوجودیکہ یہ ڈراما نامکمل رہا ہے پھر بھی سجاد کی آتش فشانی بے پناہ ہے۔

آخر میں سجاد کی چند نظمیں اور غزلوں کا انتخاب بھی دیا گیا ہے ان کے اشعار میں بھی وہی بیباکی تخیل باغی تصور اور تعمیری جذبہ نمایاں رہتا ہے۔ چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

دام فریب حرص ہے شعبدۂ نماز کیا	دل ہے طلسم آرزو سجدۂ بے نیاز کیا
صوفی حیلہ ساز بھی بے خبر حال ہے	آئینہ مجاز میں جوہر امتیاز کیا
صورت کائنات ہی پردہ کشائے حسن ہے	زیر نقاب کچھ نہیں شور جہان راز کیا
زہد کرشمۂ ریا، صبر فسوں بے اثر	بادہ کش حیات ہوں مسئلۂ جواز کیا
اللہ رے میرے ذوق نظر کی تجلیاں	حسن ذرہ پر نگاہ پڑی طور ہو گیا
پنہاں تھیں محو میں حسن کی سازشیں تمام	ہر حرف شوق نعرۂ منصور ہو گیا
ہے ہر ہر گنہ میں میں ہزاروں منتیں مضمر	کسی کو اور دکھلا یہ فریب اتقا اپنا
شرمندگی عفو سے ہوں مشتعل بدامن	اے رحمت گستاخ گناہوں کی حیا دیکھ

یقین ہے ارباب ذوق عموماً اور نوجوان طبقہ خصوصاً اس مختصر خیال سے ضرور مستفید ہوگا۔

تاریخ انقلاب روس :- از ایم جوہر ہرشی ناشر مکتبہ برہان قرول باغ دہلی سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ صفحات ۴۸۰ قیمت عہ/ کاغذ معمولی، کتابت مختلف، طباعت اچھی

جوہر صاحب کی سیاسی تحریروں کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہمیشہ معاملہ اور مسائل کو آسان سلجھا کر لکھتے ہیں کہ ایک عام آدمی جو سیاست سے قطعی ناواقف ہو اس مسئلہ کو سمجھ سکتا ہے زیر نظر کتاب دراصل ایک مکمل خلاصہ ہے ٹراٹسکی کی مشہور و معروف تاریخ انقلاب روس کا اس میں روس کے تمام موجودہ سیاسی و اقتصادی انقلابات کے اسباب و نتائج اور دیگر اہم واقعات کو تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے اور موجودہ روس کے نظام کو سمجھنے کے لیے بڑے اچھے پس منظر کا کام دیتی ہے اس کے ساتھ ہی جوہر صاحب کی پہلی کتاب ٹراٹسکی کی طرح یہ بھی ایسے سادہ اور آسان انداز میں لکھی گئی ہے کہ ہر شخص بڑی آسانی سے سمجھ جاتا ہے۔ سیاست سے دلچسپی رکھنے والے یا معلومات حاصل کرنے والے حضرات اس کتاب سے ضرور فائدہ اٹھائیں۔

بچوں کی تربیت:۔ مرتبہ مسرت زمانی صاحبہ، ایجوکیشنل بک ہاؤس سول لائن علی گڑھ، سائز ۲۰×۳۰/۱۶، صفحات ۴۴، کاغذ، کتابت و طباعت خاصی، قیمت درج نہیں۔

یہ کتاب دراصل ہائی اسکول کی لڑکیوں کے تعلیمی نصاب کے لیے مرتب کی گئی ہے ڈاکٹر سومترا بائی لیڈی سول سرجن اور ڈاکٹر محمود صاحب نے اس پر نظر ثانی کی ہے۔ زیر نظر کتاب میں وہ تمام باتیں درج کر دی گئی ہیں جو بچوں کی اچھی نگہداشت اور تربیت کے لیے بہت ضروری ہیں ساتھ ہی اس میں بچوں کی پیدائش کے متعلق تمام ضروری ہدایات دی گئی ہیں جو ہر زچہ کے لیے بہت مفید ہو سکتی ہیں کتاب بڑی لیاقت اور محنت سے ترتیب دی گئی ہے۔ تمام ضروری ماخذ سے استفادہ کیا گیا ہے اور بچوں کی پیدائش، ان کی نگرانی، ان کی خوراک اور ساتھ ہی ان کی ذہنی اور جسمانی تعلیم و تربیت کے تمام طبی، اخلاقی اور تعلیمی اصول درج کیے گئے ہیں عورتوں کے لیے عموماً اور اُن لڑکیوں کے لیے خصوصاً جو مائیں بننے والی ہیں یہ کتاب بہت مفید اور ضروری ہے۔

شمع حرم:۔ مرتبہ راجہ مہدی علی خاں، ناشر پرائس دت سہگل اینڈ سنز، لوہاری دروازہ لاہور، تعداد صفحات ۲۷۲، سائز ۲۰×۳۰/۱۶، قیمت ۱۲؍، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی۔

مہدی علی خاں صاحب نے ہندوستان کی مشہور افسانہ لکھنے والی خواتین کے منتخب افسانے جمع کیے ہیں اس مجموعہ میں حجاب امتیاز علی، حمیدہ سلطانہ، ر۔ ب، سنتا چیٹرجی، مسز عبد القادر، عصمت چغتائی، ڈاکٹر رشید جہاں، سرلا دیوی، مسز شانتی دیوی کے افسانے شامل ہیں ہر خاتون کا اس کے افسانے کے شروع میں بہت مختصر سا تعارف بھی کرا دیا گیا ہے۔ دو ایک جملے ان کے افسانوں کی خصوصیات کے متعلق بھی ہیں اس لحاظ سے یہ مجموعہ بہت اچھا ہے ہمیں تقریباً ہر افسانہ نگار کے متعلق کچھ نہ کچھ علم ہو جاتا ہے انتخاب بھی خاصا اچھا کیا گیا ہے اس قسم کے مجموعے وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہیں تو بہت مناسب ہو۔

گل و بلبل:۔ از جناب قاضی محمد صادق صاحب قریشی، ناشر پرائس دت سہگل اینڈ سنز لوہاری دروازہ لاہور، سائز ۲۰×۳۰/۱۶، صفحات ۱۵۱، قیمت عہ/، کاغذ کتابت و طباعت اچھی۔

یہ افسانے ایسے ہیں جن میں نہ غربت، مزدور اور عورت کا پروپیگنڈا ہے نہ کوئی اصلاحی یا اخلاقی مقصد پیش نظر رکھا گیا ہے۔ یہ بقول مصنف "باغ عالم کی سیر کے بعض عینی یا خیالی مشاہدات کی محض ایک یادداشت ہے۔"

یہ افسانے ایسے ہیں کہ جو حسن خوبصورتی کے لیے خوبصورت طریقہ پر لکھے گئے۔ یہ ایسی چیز ہے جسے حسن برائے حسن یا ادب برائے ادب یا آرٹ برائے آرٹ کہا جا سکتا ہے۔ حسن جہاں کہیں ہو بھلا لگتا ہے۔ اسے زندگی کا پابند ہونے کی ضرورت نہیں۔ خود زندگی والے زندگی سے پریشان ہو کر یا اس سے ملول ہو کر اسی حسن میں اطمینان و سکون حاصل کیا کرتے ہیں بلکہ اپنی زندگی یا تفسیر حیات کا پروپیگنڈا بھی حسن اور آرٹ کے بغیر نہیں کرتے بلکہ آج کل تفسیر حیات محض کھرے ہوئے طریقے پر ہو تو اسے پروپیگنڈا کہا جاتا ہے اور اگر خوبصورت طریقے پر ہو تو اسے ادب کہہ لیتے ہیں اور مقصد کے بغیر ادب کو ادب نہیں سمجھتے۔ ادب اور آرٹ کو آپ کہاں کام میں نہیں لا سکتے لیکن اس کام یا مقصد کو لازمہ ادب یا ادب نہیں کہا جا سکتا۔ ادب تصویر حیات بھی ہوتا ہے اور یہ افسانے بھی ہماری حیات کی تصویریں ہیں تفسیریں نہیں اور خوبصورت تصویریں ہیں۔

صادق قریشی صاحب لائق مبارکباد ہیں کہ ایسے ہی کارآمد آٹھ افسانوں کا مجموعہ پیش کیا۔ امید ہے کہ آئندہ بھی ارمغان ہائے کا سلسلہ جاری رکھیں گے اور آئندہ پنجابی قواعد اردو سے حتی الامکان پرہیز کریں گے۔

بیوی کی تلاش مصنفہ اے ار احسان بی اے (آنرز)، ناشر پرتاپ سنگھ اینڈ سنز لوہاری دروازہ لاہور، سائز ۲۰×۳۰/۱۶
صفحات ۱۸۲، قیمت عہ، کاغذ کتابت و طباعت اچھی

یہ احسان صاحب کے سات مزاحیہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ ابتدا میں اپنا حال بھی مزاحیہ انداز میں لکھا ہے۔ احسان صاحب میں مزاح بھی ہے اور ان کا طرز بھی۔ طبیعت میں ظرافت معلوم ہوتی ہے اور نظر میں تنقید بھی۔ لیکن احسان صاحب کا یہ مجموعہ ابھی شائع نہ ہونا چاہیے تھا۔ ابتدائی کوششوں کو ہمیشہ مشق ہی سمجھنا چاہیے۔ اگر وہ شائع بھی کی جائیں تو بہت کانٹ چھانٹ کے بعد اور عرصہ کے بعد۔ یہ صحیح ہے کہ اپنی چیزوں کی اشاعت کا ہر ایک کو شوق ہوتا ہے اور اپنے محبوب مضامین پردۂ گمنامی میں نہیں رکھے جاتے لیکن زیادہ بہتر ہو اگر یہ چھپتے چھپتے فنا کر دیے جائیں۔ اسی طریقہ سے ایک افسانہ نگار اور ایک ادیب میں پختگی پیدا ہو سکتی اور ہوتی ہے۔ ویسے احسان صاحب کے آخری دو مضامین اپنی لطیف طنز اور ہجو ملیح کے لحاظ سے بہت اچھے ہوئے ہیں لیکن انہیں ابھی اپنے عام مذاق کے معیار کو اور بلند کرنے کی ضرورت ہے۔ بہرحال ہمیں خوشی ہے کہ ان میں ایسی صلاحیتیں موجود ہیں اور ہمیں امید ہے کہ وہ بسیار نویسی اور زود نویسی پر عمل کر کے دوسرے مزاحیہ نگاروں کی طرح اپنی جگہ دوسرے تیسرے درجہ پر نہ قائم کریں گے۔

ساقی:- از آتش گجرانوالیہ۔ ناشر نرائن دت سہگل اینڈ سنز لوہاری دروازہ لاہور۔ سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ صفحات ۱۵۶، قیمت عہ/، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی۔

یہ ایک ناول ہے جس کا پلاٹ مختصراً یہ ہے کہ ایک طوائف ایک امیر کو پھانس لیتی ہے اور خود بھی اس کی محبت میں پھنس جاتی ہے۔ بیچارہ امیر اپنی بیوی کو چھوڑ دیتا ہے اور اپنی دولت اور تمام زمینداری اس عیاشی میں اڑا دیتا ہے۔ بالآخر بیوی اس طوائف کو اپنا درد دکھ لکھتی ہے اسے رحم آتا ہے اور وہ اپنے روپے سے اس کی زمینداری کو دوبارہ خرید دیتی ہے اور شوہر کو بیوی سے ملا دیتی ہے اور ان دونوں کے اصرار سے خود بھی ان کے ساتھ دوسری بیوی کے طور پر رہنے لگتی ہے۔

پلاٹ میں نہ کوئی ندرت ہے نہ جدت، طرز بیان رومانی ہے اور شاعرانہ، کردارنگاری میں بھی ابتدائی پستی جب کوئی کردار نیکی پر آتا ہے تو مجسم نیکی بن جاتا ہے اور جب برائی پر آتا ہے تو مجسم برائی۔

زرونار:- سار شیام سندر ریڈ ور، ناشر نرائن دت سہگل اینڈ سنز لوہاری دروازہ لاہور۔ سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ صفحات ۲۲۲، قیمت عہ/، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی۔

زرونار بھی ایک شاعرانہ ناول ہے شاعری اور رومان سے بھرا ہوا دو رومان سے بھرپور ہستیاں شادی محبت کا عہد و پیمان کر چکے ہیں ساتھ ہی خود کو اور ایک دوسرے کو اس غلط فہمی میں مبتلا کیے ہوئے ہیں کہ ان دونوں کو عشق حقیقی ہے رضیہ کی شادی دوسری جگہ کر دی جاتی ہے اور میاں اسلم در بدر فقیروں کی طرح خاک چھاننے لگتے ہیں کئی سال گزر جاتے ہیں اور رضیہ کا شوہر جمیل ایک دفعہ سخت بیمار پڑتا ہے اور کشمیر تبدیل آب و ہوا کے لیے جاتا ہے اس عرصہ میں اسلم اپنی حالت زار کے متعلق رضیہ کو ایک خط بھیج چکا تھا جس کا رضیہ مناسب جواب دے چکی تھی۔ اتفاق کہ جس ہوٹل میں رضیہ جا کر سری نگر میں ٹھہرتی ہے وہیں اسلم بھی چکر لگاتا ملتا ہے دونوں میں ملاقات ہوتی ہے اور اب رضیہ کو معلوم ہوتا ہے کہ اسلم کی جس محبت کو وہ عشق سمجھی ہوئی تھی وہ محض ہوس تھی ادھر جمیل اپنی ہر بات سے نازبردار نظر آتا ہے تنگ آ کر رضیہ جمیل سے محبت کرنے لگتی ہے اور اسلم نفرت سے۔

تمام ناول شاعری اور رومانیت سے لبریز جوانی کی سرمستیاں، اور شباب و شاہد کی ہر جگہ رہا ئی ہے ہر باب پرانے طریقے پر کسی شعر سے شروع ہوتا ہے اور جگہ جگہ پر دیرینہ اشعار لکھے جاتے ہیں شاعری اور رومان کی

زیادتی سے، اسے ایک بڑے قوم کا ہماری دنیا سے دور ایک شاعرانہ ناول بنا دیا ہے۔

بہ حال ناولوں کی طرف ناشرین نے اب توجہ دینا شروع کی ہے امید ہے آئندہ اچھے اچھے ناول ظہور پذیر ہو سکیں گے۔ (م ح)

آفتاب (اسلام اور اسلامی مفکرین)۔ مرتبہ جناب خورشید الاسلام صاحب صدر آفتاب مجلس مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، سائز ۲۲×۱۸ حجم ۲۰۸ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت نفیس، قیمت (؟)

آفتاب پڑھ کر اس بات کا کوئی اندازہ ہو جاتا ہے کہ بیسویں صدی کا تعلیم یافتہ نوجوان اسلام کو کس زاویے سے دیکھنا چاہتا ہے اور کس حد تک اس کا اسلام زمانہ کی قوتوں میں ایک زندہ قوت کی حیثیت سے شامل ہے آفتاب میں تجدید و احیائے دین، اسلامی تہذیب پر دوسری تہذیبوں کے اثرات، کیا موجودہ تصوف خالص اسلامی ہے؟ حضرت امام غزالیؒ، مختصر سیرت محمد بن وہاب، علامہ سید جمال الدین افغانی کے عنوانات پر مقالے ہیں اور ہر مقالے کا مصنف معتبر حیثیت کا مالک ہے مقالوں کے ساتھ ہی خورشید الاسلام صاحب کا پیش لفظ اپنی ادبی لطافت اور روح کے اعتبار سے خاص چیز ہے بحیثیت مجموعی آفتاب نہ صرف خود پڑھنے کی چیز ہے بلکہ ذوق رکھنے والے دوستوں کے لیے ایک مسلمان کی طرف سے اچھا تحفہ بھی ہو سکتا ہے۔

تمدن اسلام:- از مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کا ۲۲×۱۸ سائز پر ۲۳ صفحی مقالہ ہے جسے انجمن اسلامی تاریخ و تمدن مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے شائع کیا ہے۔

مقالے میں اکثر عمومی اور سطحی باتوں سے بحث کی گئی ہے انداز بیاں ضرور ایک بانکپن رکھتا ہے جہاں مولانا نے دوسرے مذاہب کے تمدن کا ذکر کیا ہے وہاں ان کا لہجہ سخت ہو گیا ہے جو اخلاق اور مصلحت دونوں کے منافی ہے (ف ا-ا)

ایک تصحیح:- ہمیں افسوس ہے کہ اکتوبر کے رسالہ جامعہ میں "ساز و آہنگ" پر تبصرہ کرتے ہوئے ہمارے تبصرہ نگار سے دو ایک غلطیاں ہو گئیں اول تو یہ کہ ساز و آہنگ سیماب صاحب کی نظموں کا پہلا مجموعہ نہیں جیسا کہ ہمارے تبصرہ نگار کا خیال تھا دوسرے یہ کہ ساز و آہنگ، اقبال کی نقل میں نہیں نکالی گئی ہے بلکہ زمانہ کا چلن دیکھتے جب سے سیماب صاحب نے نظموں کی طرف زیادہ توجہ دینا شروع کر دی ہے امید ہے کہ ناظرین کرام تصحیح فرمالیں گے

(ادارہ)

رفتارِ زمانہ

جب سے دنیا میں لڑائی کا سلسلہ شروع ہوا ہے لوگ سمجھتے آئے ہیں کہ لڑائیوں میں فوجوں کا مقابلہ ہوتا ہے اور فتح اس کی ہوتی ہے جس کی فوج میدان میں جیت جائے اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ سپہ سالار کی قابلیت سپاہیوں کی بہادری اور جنگ کے لئے صحیح موقع کے انتخاب کا ئی کے انجام پر بہت اثر پڑتا ہے اگر صورت ایسی ہو کہ دو ایک معرکوں میں بات طے ہو جائے تو قسمت کا فیصلہ وہیں ہی کرتی ہیں لیکن بڑے بڑے پیمانے کی جنگ میں فوج کو لڑنے کا صرف ایک ذریعہ ، فوجوں کے مقابلے کو لڑنے کا صرف ایک ہی طریقہ سمجھنا چاہیئے ایسی جنگ میں آخری فیصلہ لڑنے والی قوموں کا مقصد ان کا ارادہ ۔ ان کی تیاری ، ان کی استعداد کرتی ہے ۔ اور جب تک اس میں کسر ہو فوجوں کی کامیابی بھی زیادہ کام نہیں آتی ۔ جرمنی ، اٹلی اور جاپان نے اس بھروسے پر لڑائی کی ٹھانی تھی کہ ان کے مقابلے پر جو قومیں ہیں ان کی سمجھ میں نہ آئے گا کہ لڑیں تو کس مقصد کے لئے ، وہ لڑائی کا پکا ارادہ نہ کر سکیں گی جنگ کی تیاری میں ان کا دل نہ لگے گا ۔ اور لڑائی اچانک اور بڑے پیمانے پر ہوئی تو اس کی نوبت نہ آئے گی کہ وہ اپنی پوری انتظامی اور صنعتی استعداد سے فائدہ اٹھا سکیں یہ اندازہ غلط نہیں تھا ، لیکن پچھلے دنوں جمہوری قوموں کا جو اتحاد فاشسٹ ریاستوں کے خلاف ہوا ہے اور برطانیہ اور متحدہ ریاستوں کے درمیان اتحاد عمل کی جو صورتیں پیدا ہو رہی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اندازہ صحیح بھی تھا کہ جرمنی ، جاپان اور اٹلی کا مطلب حاصل ہو سکے ۔ جمہوری قوموں کی صف آرائی میں ذرا سی کسر بس اب یہ رہ گئی ہے کہ روس نے جاپان کے خلاف اعلان جنگ نہیں کیا ہے ۔ روسی کہتے ہیں کہ ان کے اور جاپانیوں کے درمیان پانچ سال کے لئے معاہدہ ہوا ہے کہ ایک دوسرے پر حملہ نہ کریں گے ، وہ جاپان پر صرف ہوائی حملے کر سکتے ہیں اور اس وقت کا تجربہ یہ ہے کہ خالی ہوائی حملوں سے اتنا نقصان نہیں پہنچایا جا سکتا کہ جس سے جنگ کے انتظام میں کوئی بڑی رکاوٹ ہو روسی یہ بھی کہتے ہیں کہ امن اور

جمہوریت کا اصل دشمن جرمنی ہے اور ان کا منشا یہ ہے کہ جمہوری ملک اپنی ساری قوت جرمنی کو شکست دینے کی کوشش میں صرف کریں۔ لیکن روسیوں نے یہ بھی جتا دیا ہے کہ ان کی مشرقی ایشیائی فوج ہر مہم کے لئے تیار ہے۔

فاشسٹ قوموں کے خلاف جو اتحاد ہوا ہے اس کے رہنما برطانیہ اور امریکہ ہیں مسٹر چرچل کی دوراندیشی نے اس تکلف کو بالکل برطرف کردیا جو اب تک سیاست کے آداب میں شامل تھا جن سے سفیروں اور سیاسی لیڈروں کی شان قائم رہتی تھی چاہے قوم کو نقصان اٹھانا پڑتا۔ مسٹر چرچل کی بے تکلفی سے خلوص ٹپکتا ہے۔ اس سے دوست اور دشمن سب پر ظاہر ہو گیا ہے کہ فاشسٹوں کو شکست دینے کے بڑے مسئلے کے آگے وہ اور کسی چیز کا خیال نہیں کرتے اور وہ اپنی طرح جمہوری ملکوں کے دوسرے رہنماؤں میں وہ جوش اور یک جہتی پیدا کرلیں گے جو کامیابی کو یقینی کردیتی ہے۔ مسٹر چرچل کے واشنگٹن جانے سے بہت سے معاملات چند گھنٹوں میں طے ہو گئے ہیں جو معمولی طریقے پر مہینوں میں بھی طے نہ ہوتے، اور برطانیہ اور متحدہ ریاستوں کے اتحاد عمل کے نتیجے بھی نظروں کے سامنے آرہے ہیں ایک بڑا نتیجہ یہی ہے کہ جنرل ویول (WAVELL) جنوب مغربی بحرالکاہل کی جنگ کے ذمہ دار بنادیے گئے ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ اب ہر تدبیر وہی کریں گے۔ انھیں جنگ کے تمام وسائل پر پورا اختیار ہوگا اور فوج ہوائی جہاز اور بیڑے کو وہ اس طرح استعمال کرسکیں گے کہ زیادہ سے زیادہ بچاؤ ہو اور دشمن کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچے۔ اب تک ہر محاذ پر جو تجربہ ہوا ہے اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ اگر ایک شخص کو پورا اختیار نہیں دیا جاتا تو اکثر تدبیریں کارگر نہیں ہوتی ہیں۔

بڑے کام کو سنبھالنے میں دیر لگتی ہے اور جاپانیوں نے اب تک جو کچھ کیا ہے اس کا مقصد یہ بھی تھا کہ برطانیہ اور متحدہ ریاستوں کو سنبھلنے اور اپنی قوت کو یک جا کرنے میں دیر لگے۔ جزیرہ ویک اور گوام کے فتح ہو جانے سے جو دشواری پیدا ہوتی تھی وہ ہانگ کانگ اور منیلا کے فتح ہونے سے اور بھی بڑھ گئی ہے، اور جاپانیوں کو اس کا موقع مل گیا ہے کہ ملایا

اور جزائر شرقی الہند میں اپنی فوجیں اتار دیں اور اطمینان کے ساتھ کمک اور سامان بھیجتے رہیں۔ ان کی فوج خاص طور سے ملایا پر ہے۔ یہاں انھوں نے جنگ کا ایک نیا طریقہ اختیار کیا ہے جس کی ہر تفصیل وہ پہلے سے طے کر چکے تھے اور جس کی مشق انھوں نے پرانے اور منتخب سپاہیوں کو اچھی طرح سے کرائی تھی۔ یہ نیا طریقہ جسے (INFILTRATION) کہتے ہیں جرمنی کی ایجاد ہے اور اسے پہلی مرتبہ فرانس میں آزمایا گیا۔ جاپانیوں نے اس تجربے سے سبق لیا اور اسے وہ ملایا میں اب تک خاصی کامیابی کے ساتھ برت رہے ہیں۔ اس میں فوج ایک دھارے کی طرح رکاوٹوں سے ٹکراتی، توپوں اور مشین گنوں کی مار کھاتی آگے نہیں بڑھتی، اس لئے کہ اس کے راستے میں ایسی رکاوٹیں ہو سکتی ہیں، وہ توپ خانوں کا اس طرح نشانہ بنائی جا سکتی ہے کہ ایک ایک گز زمین کے بدلے ہزاروں جانیں قربان کرنا پڑے۔ بڑی فوج کو اس طرح قابو میں رکھنا بھی بہت مشکل ہے کہ دشمن کی ذراسی غفلت یا بے پروائی یا غلطی سے پورا فائدہ اٹھایا جا سکے۔

(INFILTRATION) کے نئے طریقے میں فوج سینکڑوں چھوٹے چھوٹے گروہوں میں تقسیم کر دی جاتی ہے، جس میں کبھی سو پچاس، کبھی دس پانچ سپاہی ہوتے ہیں، انھیں بتا دیا جاتا ہے کہ کہاں جانا ہے اور کیا کرنا ہے۔ مقصد کے مناسب انھیں ہتھیار اور دوسرا سامان دے دیا جاتا ہے اور پھر وہ اپنا کام اپنے طریقے پر کرنے کے لئے چھوڑ دئے جاتے ہیں۔ اس طرح جنگ کا ایک عام مقصد طے کر کے ہر چھوٹے سے چھوٹے فوجی افسر اور ہر سپاہی کو اس کا موقع دیا جاتا ہے کہ وہ اپنی استعداد سے کام لے، اگر کسی گروہ کے سپاہی گرفتار کر لئے گئے یا قید کر دئے گئے تو جان اور سامان کا بہت نقصان نہیں ہوتا اور ایسے نقصان کے باوجود اس کا امکان رہتا ہے کہ مختلف گروہ چپکے چپکے رکاوٹوں سے بچتے اور خالی جگہوں کو تلاش کر کے نکالتے چلے جائیں جیسے سیلاب کا پانی چڑھتا ہے اور دشمن کو آخر میں ایک بارگی معلوم ہو کہ اگر وہ پیچھے نہ ہٹا گھر جائے گا۔ دشمن ہوشیار ہو تو وہ ایسے گروہوں کو پکڑ پکڑ کر ختم کر دے جیسا کہ ملایا میں برطانوی فوجوں نے کیا بھی۔ مگر ملایا کے جنگلوں نے جاپانی سپاہیوں

کو چھپ چھپ کر آگے بڑھنے کا بہت موقع دیا۔ اور ایک بات یہ بھی ہے کہ فوج جس طریقے پر لڑنے کے لئے تیار کی گئی ہو اس طریقے پر وہ کامیابی کے ساتھ لڑ سکتی ہے۔ جاپانی سپاہیوں نے جس طریقے کی مہینوں مشق کی تھی جس کے لئے ہر ضروری سامان مہیا کیا جا چکا تھا اور جسے کارآمد بنانے کی ہر تدبیر سوچی جا چکی تھی اس کا برطانوی فوج فوراً توڑ نہیں کر سکتی تھی اور اس طرح جاپانی شمالی اور وسطی ملایا کے جنگلوں کو پار کر کے نکل آئے۔ ان کے چھوٹے چھوٹے گروہوں نے جو کام کیا ہے اس سے فائدہ اٹھا کر اب بڑی فوجیں اور جنگ کا بھاری سامان جنگ کے لئے محاذ تک بھیجا جا سکتا ہے۔ لیکن جو طریقہ فرانس کی غیر مسلح آبادی کو سہمانے اور ملایا کے گھنے جنگلوں سے گذرنے میں کارآمد ثابت ہوا اس پر کھلے میدان میں عمل کرنا بہت مشکل ہوگا۔ برطانوی فوجیں اب یکجا ہو کر نئے اور زیادہ مضبوط محاذ قائم کر رہی ہیں جنہیں چپکے سے گھیرا نہ جا سکے گا اور ان محاذوں پر سنگاپور کے مرکز سے بہت جلد مدد بھی پہنچائی جا سکے گی۔ غالباً جاپانی اب اپنا طریقہ بدل دیں گے اور برطانوی فوج کی ٹکر لینے کے سوا انہیں کوئی چارہ نہ ہوگا۔

(INFILTRATION) کے طریقے میں اور صرف اس میں نہیں بلکہ (BLITZ-KRIEG) کے پورے اصول میں بس جرمن اب تک عمل کرتے رہے ہیں۔ یہ بڑی خامی ہے کہ وہ حملہ کرنے میں تو بہت کارآمد ہوتی ہے مگر حملہ روکنے کے لئے بیکار رہے۔ اس میں فوج کے قدم جمتے نہیں ہیں، وہ آگے بڑھتی رہے تو جس زمین پر قبضہ ہو گیا ہو اس پر قبضہ رہتا ہے لیکن اگر وہ روک لی جائے یا جیسے کہ روس میں ہوا ہے، موسم کی وجہ سے ہوائی جہاز اور ٹینک استعمال نہ کئے جا سکیں اور جنگ کو ملتوی کرنا پڑے تو فوج کے لئے کوئی سہارا کوئی ٹھکانا نہیں ہوتا اور وہ پیچھے ہٹنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتی۔ جرمن سپہ سالاروں کا پہلے یہ خیال تھا کہ وہ فوج کو آگے بڑھتے ہوئے حصوں کو واپس بلا کر ایک مستقل محاذ قائم کر لیں گے اور یہاں پر روسیوں کا مقابلہ کریں گے لیکن یہ محاذ بھی قائم نہ کیا جا سکا ہوگا۔ ورنہ جرمن فوج کرش (KERCH) فیودوسیہ (FEODOSIA) جیسے مورچوں کو ہرگز نہ چھوڑ

من پروگرام کے بگڑ جانے کی بات بہت پرانی ہوگئی ہے اور بار بار بیان کی جا چکی ہے
بں اس نقطۂ نظر سے دیکھئے تو اس کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔ جرمن سپہ سالار یقیناً
نے بھول گئے کہ ان کا طریقۂ جنگ ایک جگہ پر ٹھہر کر لڑنے کے لئے بالکل موزوں نہیں ہے۔ اگر انھوں نے
خاص مدت کے اندر روسی فوجوں کو منتشر، دربدر کا رنہ کر دیا تو انھیں پس پا ہونا پڑے گا، اور یہ
ں پائی جاری رہے گی جب تک موسم کچھ موافق رہو اور ہوائی جہاز اور ٹینک میدان میں لائے
سکیں۔ بہت ممکن ہے لڑائی ملتوی کرنے کا ارادہ کرتے ہی (BLIZKRIEG) کا بیشتر
ماں محفوظ مقاموں پر بھیج دیا گیا ہو اور فوج کے ساتھ بس اتنا رکھا گیا ہو کہ پس پائی بھگدڑ
صورت اختیار نہ کرلے۔ جرمن فوج نے لڑائی بند نہیں کی تھی تب بھی یہ خبریں آرہی تھیں کہ بڑی جا
سی محاذ سے اِدھر اُدھر بھیجی جا رہی ہیں لیکن بہت کچھ سامان رہ بھی گیا ہوگا جو اب روسیوں کے
آئے گا۔ روسیوں کے ہاتھ پیر تو معلوم ہوتا ہے سخت سردی پڑنے پر اور بھی کھل گئے
، اور ان کے حوصلے اس قدر بلند ہو رہے ہیں کہ ہر ہٹلر کو خود جرمن فوج کی ہمت بڑھانے
لئے محاذ پر جانا پڑا۔ اب تک تو (BLIZ KRIEG) کا یہ بگڑا کام کسی کے بنائے
نہیں بنا ہے۔ اب دیکھئے ہر ہٹلر کیا کرشمے دکھاتے ہیں۔

بہرحال جب تک روسی محاذ کی طرف سے اطمینان نہ ہو جائے ہر ہٹلر بھی اسی مصلحت
میں لگے کہ دوسرے منصوبے ملتوی رکھے جائیں اور لیبیا کی شکست کا کڑوا گھونٹ
طرح چپ چاپ پی لیا جائے۔ یہاں پر برطانوی فوجیں بن غازی کے آگے تک پہنچ گئی ہیں
غالباً اب وہ اور آگے نہ بڑھیں گی کیونکہ وہ اپنے مرکزوں سے بہت دور ہو گئی ہیں اور
رل رومل (ROMMEL) نئی فوج کا بیشتر حصہ بچا لے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ جب
ٹلی کا بیڑہ سلامت ہے اور اس کا امکان ہے کہ فرانسیسی بیڑہ جرمنی کے اختیار میں
سے برطانوی فوج کا طرابلس میں داخل ہونا احتیاط کے خلاف ہے۔ فرانس کے ۱۵ لاکھ
ی غرمنی میں قید ہیں۔ جرمنی کے قبضے سے فرانسیسیوں کو طرح طرح کی تکلیفیں ہوتی ہیں

جو بڑی حد تک ٹھکائی جا سکتی ہیں۔ اگر فرانس جرمنی کی تمام شرطیں منظور کر کے باقاعدہ اتحاد کرے۔ دوسری طرف برطانیہ اور متحدہ ریاستوں سے فرانس کے تعلقات بگڑتے ہی جارہے ہیں ابھی حال میں آزاد فرانسیسی فوجوں نے جزائر سیں پی ار (St PIERRE) اور میکوئے لون (MIGUELON) پر قبضہ کر لیا ہے اور فرانسیسی حکومت جانتی ہے کہ برطانیہ کی مدد کے بغیر یہ قبضہ نہیں ہو سکتا تھا اس لئے فرانس کا کچھ اعتبار نہیں ہے اور اس کی سیاست کسی وقت بھی پلٹا کھا سکتی ہے ہر ہٹلر بیتاب ہوں گے کہ اس صورتِ حال سے پورا پورا فائدہ اُٹھائیں جرمن فوجوں کی جو بے آبروئی ہوئی ہے اس کے داغ کو کسی طرح مٹائیں۔ اسی وجہ سے ان کو اس کا بڑا دکھ ہے۔ روس میں جرمن فوجوں کی پس پائی کا سلسلہ بند نہیں ہوتا اور سیاست اور جنگ کے لئے کرتب دکھانے کا موقع نہیں آتا۔ وہ صبر اور سکون اور اطمینان جس پر مہذب دنیا کا گذر بسر ہوتا ہے ان کے اور ان کی سیاست کے لئے ایک قاتل زہر ہے۔

مغربی دنیا میں تو برطانیہ اور متحدہ ریاستوں نے جرمنی کے مقابلے کا انتظام کر لیا، لیکن جنوب مشرقی ایشیا میں جنگ کی جو صورت ہوگئی ہے۔ اس نے یہ سوال پیدا کر دیا ہے کہ جنگ کے پرانے محاذوں پر زیادہ توجہ کی جائے یا اس نئے محاذ پر۔ آسٹریلیا اور چین کی خواہش ہے کہ اس نئے محاذ کو زیادہ اہمیت دی جائے آسٹریلیا کے وزیر اعظم مسٹر کرٹن نے پریزیڈنٹ روزولٹ سے براہِ راست گفتگو اسی خیال کو پیش کرنے کے لئے کی تھی۔ چین کے اخبار میں کچھ دن ہوئے ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں جنوب مشرقی ایشیا کی جنگ کو کم اہمیت دینے کی مصلحت ثابت کی گئی ہے۔ مضمون نگار کی رائے تھی کہ برطانیہ اور متحدہ ریاستوں کو بحر اٹلانٹک اور بحر روم پر تسلط حاصل ہے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جرمنی کو بالآخر شکست ہوگی بحرالکاہل پر بھی برطانیہ اور متحدہ ریاستیں اگر چاہیں ایسا ہی تسلط قائم کر سکتی ہیں۔ لیکن اگر انھوں نے اس کے اہتمام کو ملتوی رکھا تو ممکن ہے جاپان، ملایا، جزائر شرقی ہند اور فلپائن

کرے ایک ایسا مورچہ بنائے کہ جس سے اس کو بے دخل کرنے کے لئے خالی بحری قوت کافی نہ
برطانیہ پارلیمنٹ میں بعض ممبروں کو اندیشہ ہے کہ ایشیائی محاذ کو کافی اہمیت نہیں دی
ہے، اور مجموعی طور پر اراکین کو جنگ کے متعلق بحث کرنے اور سوالات پوچھنے کی اتنی
بس ہے کہ مسٹر چرچل نے اس بحث کے لئے تین دن رکھنے کا وعدہ کیا ہے۔ لیکن بحث
سے بات طے نہیں کی جا سکتی۔ جنگ کا میدان بہت پھیل گیا ہے اتفاق سے ہر جگہ پیش
لڑنے کے بہتر موقعے دشمن ہی کو حاصل ہیں، اور کوئی محاذ ایسا نہیں ہے کہ جسے اہمیت میں
دوسرے محاذ سے کم قرار دیا جا سکے۔

رجسٹرڈ ایل نمبر ۱۸۹۲

قابل دید کتابیں

درس سیاسیات :- مغربی ڈپلومیسی کے بنیادی اصول۔ یورپ کے مشہور سیاستداں میکیاولی کی زبان سے۔ قیمت [illegible]

کسان، اس کی تحریک و تنظیم :- ملک کے سب سے بڑے فرقے کو منظم کرنے کے سلسلے میں [illegible] کی غربت، مجبوریاں، زمین، قدیم دیہاتی نظام کی بربادی، سرمایہ داری، زراعتی بحالی، [illegible] زراعتی اصلاحات، قومی تحریک، تحریک ترک موالات آخری تحریک کا دوسرا دور، کسان سبھا۔ اس کا کام [illegible] غرض ہر موضوع پر مفصل بحث ہے قیمت [illegible]

معاملہ زمین :- جناب برج نرائن ایم اے پروفیسر اقتصادیات نے زمین کے جدید [illegible] کے متعلق حکومت کا اعلان اردو میں شائع کیا قیمت [illegible]

فرشتوں کا امتحان :- حاجی لق لق صاحب اس مطائباتی افکار کو سید خادم حسین صاحب خادم شاگرد رشید مولانا الطاف حسین صاحب حالی نے نظم کیا ہے۔ [illegible]

آتش پارے :- مصنفہ سعادت حسن منٹو۔ چند فکر طلب افسانوں کا مجموعہ قیمت [illegible]

انقلاب میں کسانوں کا ہاتھ :- مغل بادشاہوں کے زمانے سے لے کر اب تک کی کسانوں کی تحریک اور تنظیم کا تذکرہ۔ قیمت [illegible]

سوویٹ روس کا نظام کار :- اس میں روس کے انقلاب کے حالات اور موجودہ طرز حکومت کا نہایت وضاحت سے تذکرہ ہے۔ قیمت [illegible]

شہید گمسونی :- آئرلینڈ [illegible] جو اپنے ملک کی [illegible] کے لئے جان بحق ہوا۔ قیمت [illegible]

مکتبہ [illegible] دہلی قرولباغ

[illegible] شائع [illegible] محبوب المطابع پریس دہلی

جامعہ

مکتبہ جامعہ دہلی

چند اہم کتابیں

مسلمانوں کا روشن مستقبل:۔ مسلمانوں کی تین سو سال کی مذہبی، اقتصادی، تعلیمی اور سیاسی تاریخ ہے۔ مصنف نے مسلمانوں کے ہر شعبہ زندگی پر اس قدر مواد جمع کر دیا ہے کہ اس کی روشنی میں ہندوستان کے سیاسی و تمدنی مسائل بڑی آسانی سے حل کئے جا سکتے ہیں۔ قیمت مجلد عہ

اقبال کا مطالعہ:۔ از سید نذیر نیازی۔ اس مجموعہ میں اقبال کی شاعری، فلسفہ اور آخری ایام رندگی پر چار مضمون شامل ہیں جن سے علامہ کی عظمت کا بخوبی علم ہو جاتا ہے۔ قیمت عہ۔ مجلد عا

نئے مسائل:۔ یورپ کے مشہور مفکرین کے اچھوتے خیالات، انفرادی اور اجتماعی رندگی کی نئی صداقتیں، نوجوانوں طلبار اور والدین کے لئے فکر و عمل کی نئی راہیں۔ ۱۱۲ صفحے، قیمت صرف ۸ر

محشر خیال:۔ سجاد علی انصاری مرحوم کے مجموعۂ مضامین کا دوسرا ایڈیشن۔ اس مرتبہ مرحوم کا ڈراما "روزِ جزا" بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ کتابت طباعت عمدہ قیمت مجلد عمر، عہ۔ غیر مجلد عا

جامعہ

زیر ادارت - نور الحسن ہاشمی ایم۔ اے

جلد ۳۶ - نمبر ۳ | بابتہ ماہ مارچ سنہ ۱۹۴۲ء | چندہ سالانہ ۵ر فی پرچہ آٹھ آنہ

فہرست مضامین

(پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکسن) محبوب المطابع دہلی)

مکتبہ جامعہ دہلی

سے

دارالمصنفین اعظم گڈھ، دارالترجمہ حیدرآباد، ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد، دائرہ حمیدیہ سرائے میر اعظم گڈھ، ندوۃ المصنفین دہلی انڈین پریس الہ آباد اور تقریباً دوسرے تمام اداروں کی مطبوعات اصلی قیمت پر مل سکتی ہیں۔

اگر آپ اردو کی تازہ ترین مطبوعات کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں تو **اردو اکادمی** کی ممبری قبول فرمایئے اور قواعد و ضوابط ایک کارڈ لکھ کر مفت طلب فرمایئے۔

نادر خطوط غالب

مرتبہ رسا ہمدانی

پر ایک نظر

یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ غالب کے سینکڑوں دوست تھے اور انہوں نے اپنی زندگی میں ہزاروں خط لکھے۔ ابتدا میں وہ فارسی میں لکھتے رہے جن میں سے کچھ خط آج آہنگ میں موجود ہیں۔ بعد میں انہوں نے اردو میں لکھنا شروع کیا اور اگرچہ فارسی میں خط و کتابت بالکل ترک تو نہیں کی لیکن اس کے بعد آخر تک بیشتر اردو ہی میں لکھتے رہے۔ ان کے اردو خطوں کے دو مجموعے اردوئے معلیٰ اور عودِ ہندی پہلے سے موجود تھے ۱۹۳۷ء میں تیسرا رامپور سے مکاتیب غالب کے نام سے شائع ہوا اس میں وہ خطوط ہیں جو میرزا نے نواب یوسف علی خاں بہادر فردوس مکاں اور نواب کلب علی خاں بہادر خلد آشیاں اور بعض اصحاب رامپور کے نام لکھے تھے ۱۹۴۹ء کے وسط میں ایک مختصر مجموعہ "نادر خطوط غالب"[1] کے نام سے جناب سید محمد اسمٰعیل صاحب رسا ہمدانی نے شائع کیا۔ اس میں کل ۲۷ خطوط ہیں جن کے متعلق جناب مرتب کا دعویٰ ہے کہ ان میں سے پہلے ۲۳ میرزا نے ان کے پردادا سید کرامت حسین ہمدانی مرحوم کے نام لکھے تھے آخری چار خطوں میں سے تین سید فرزند احمد صفیر بلگرامی کے نام ہیں اور ایک شاہ فرزند علی صوفی منیری کے نام۔

ایک دوست کی مہربانی سے یہ خطوط شائع ہونے سے پہلے مجھے دیکھنے کو مل گئے تھے۔ ان پر ایک سرسری نظر ڈالنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ ان میں سے بیشتر جعلی ہیں اور جناب رسا نے نہایت جسارت سے کام لیا ہے جو یہ کہا ہے کہ میرزا نے یہ ان کے پردادا مرحوم کے نام لکھے تھے لیکن چونکہ اس وقت میرے پاس کوئی کتاب نہیں تھی نیز میں عنقریب ایک لمبے سفر پر روانہ ہونے والا تھا اس لیے میرے لیے مزید ثبوت مہیا کرنا دشوار تھا

---

[1] نادر خطوط غالب، مرتبہ سید محمد اسمٰعیل رسا ہمدانی گیاوی ٹرپل ایم اے (گولڈ میڈلسٹ) بی۔ ایل ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۲۶+۲۶ ۱۹۴۹ء کاشانۂ ادب لکھنؤ۔

میں نے اپنی اس رائے کا اظہار ان دوست سے کر دیا اور ہندوستان سے روانہ ہو گیا جب تھوڑے دنوں بعد یہ کتاب شائع ہوئی تو اس کا ایک نسخہ مجھے بھی موصول ہوا۔ اب مجھے ان پر زیادہ غور کرنے کا موقعہ ملا اور میں دوبارہ اس کے زیادہ یقین کے ساتھ اسی نتیجہ پر پہنچا کہ جناب رسا نے میرزا کے شائع شدہ خطوط میں سے ادھر ادھر کے بعض ٹکڑے لے کر یہ خطوط خود لکھے ہیں اور انھیں شائع کر دیا ہے گویا میرزا نے یہ ان کے پردادا احسان کرامت ہمدانی مرحوم کے نام لکھے ہوں میں اس مضمون میں کتاب زیر بحث کے خطوط اور ان کے بالمقابل اُن خطوں کی نقل پیش کروں گا جو اردوئے معلیٰ اور عود ہندی میں پہلے سے موجود ہیں۔ ناظرین اس سے میرے دعویٰ کی صحت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

خط نمبر (۱)

دلی یکم جنوری ۱۸۶۱ء

شاہ صاحب کو غالب ناتواں کا سلام پہنچے یہ پہلا خط
ہے جو میں تمھیں اردو زبان میں لکھ رہا ہوں۔ زبان فارسی
میں خطوں کا لکھنا آج سے متروک ہے پیرانہ سری اور ضعف
کے صدموں سے محنت پژوہی اور جگر کاوی کی قوت
مجھ میں نہیں رہی ؎
مضمحل ہو گئے قویٰ غالب — اب عناصر میں اعتدال کہاں
میرے آم کھانے کا حال۔ پوچھو۔ نہار منہ آم نہ کھاتا تھا
کھانے کے بعد آم نہ کھاتا تھا رات کو کچھ کھاتا ہی نہیں
جو کہوں میں الطعام ہیں۔ ہاں آخر روز بعد ہضم معدی آم
کھانے بیٹھ جاتا تھا بے تکلف عرض کرتا ہوں اتنے آم
کھاتا تھا کہ پیٹ بھر جاتا تھا اور دم پیٹ میں نہ سماتا تھا
اب بھی اسی وقت کھاتا ہوں مگر دس بارہ اگر پیوندی آم

(۱) مدت ہوئی زبان فارسی میں خطوں کا لکھنا پہلے
سے متروک ہے پیرانہ سری و ضعف کے صدموں سے
محنت پژوہی و جگر کاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی حرارت
غریزی کو زوال ہے اور یہ حال ہے۔
مضمحل ہو گئے قویٰ غالب — اب عناصر میں اعتدال کہاں
(بنام عبدالرزاق شاکر اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۲۰)
(۲) خدا اور مجھے مارہرہ بلاتے ہیں اور میرا قصد مجھے
یاد دلاتے ہیں ان دنوں میں کہ دل بھی تھا اور طاقت
بھی تھی۔ شیخ محسن الدین مرحوم کی معرفت تقاضا کیا گیا تھا کہ جی یوں
چاہتا ہے کہ برسات میں مارہرہ جاؤں اور دل کھول کر
اور پیٹ بھر کر آم کھاؤں اب وہ دل کہاں سے لاؤں
طاقت کہاں سے پاؤں۔ نہ آموں کی طرف رغبت نہ
معدہ میں اتنے آموں کی گنجائش۔ نہار منہ آم نہ کھاتا تھا

بڑے ہوئے تو پانچ سات سے
دریغا کہ عہد جوانی گذشت   جوانی گذر زندگانی گذشت
بدہ اور میٹھے آموں کا پارسل گر آئے گا تو میں خوش
ضرور ہوں گا اور اگر نہ آئے گا تو طلب بھی نہیں کروں گا
(اس کے بعد حق لال کی کتاب سراج المعرفت کے دیباچے
کی کچھ سطریں نقل کی ہیں جو میرزا نے لکھا تھا اور اردوئے
معلیٰ میں بھی موجود ہیں)

رات کو کچھ کھاتا ہی نہیں جو کہوں میں الطعام۔ ہاں آخر
روز بعد ہضم معدہ آم کھانے بیٹھ جاتا تھا بے تکلف عرض
کرتا ہوں اتنے آم کھاتا تھا کہ پیٹ بھر جاتا تھا اور دم
پیٹ میں نہ سماتا تھا اب بھی اسی وقت کھاتا ہوں مگر
دس بارہ اگر پیوندی آم بڑے ہوئے تو پانچ سات سے
دریغا کہ عہد جوانی گذشت   جوانی گذر زندگانی گذشت
اب اس کے واسطے کیا سفر کروں مگر حسرت دیکھنا اس
کے واسطے متحمل رنج سفر ہوں تو جانے میں نہ برسات میں
ع لے دلے رہروی دیدار گر ہیچ

(بنام چودھری عبدالغفور سرور۔ رقعہ بعد ۱۸۶۲ء اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۴۱)

آپ نے دیکھا کہ یہ خط پورے کا پورا اس سے پہلے ہمارے پاس موجود ہے۔ البتہ ایک جگہ کامل نہیں بلکہ ٹکڑوں میں دو ملا۔ اب آئیے ذرا رسا صاحب کے خط پر ایک نظر ڈالیں۔

سب سے پہلے "دہلی یکم جوری ۱۸۵۰ء" کا ٹکڑا ہے۔ میرزا عموماً تاریخ آخر میں لکھا کرتے تھے اگرچہ کسی کسی خط کے شروع میں یا درمیان میں بھی تاریخ کا اشارہ موجود ہوتا ہے۔ جناب رسا صاحب فرماتے ہیں:۔

"موجودہ روش کے مطابق میں نے تاریخ و مقام خطوط کے سرنامہ پر لکھ دیے ہیں ورنہ زیادہ تر غالب کے خطوط میں تاریخ آخر میں مرقوم ہے" (دیباچہ صفحہ ۲۵)

جہاں تک میں نے دیکھا ہے غالب نے اپنے کسی خط میں مقام کا نام نہیں لکھا۔ تاریخ وہ ضرور لکھتے ہیں۔ اگر دہلی غالب کے خطوں میں نہیں لکھا تھا تو جناب رسا صاحب کا فرض تھا کہ وہ بھی نہ لکھتے یا کم از کم اشارہ کر دیتے کہ مقام کا نام میں نے اپنی طرف سے اضافہ کیا ہے۔ اس خط کے متعلق دیباچہ کے صفحہ ۱۴-۱۵ پر وہ لکھتے ہیں:۔

"یہ خط ۱۸۵۰ء کا لکھا ہوا ہے اور اس میں غالب نے لکھا ہے کہ اردو زبان میں یہ میرا پہلا خط ہے اس سے مولانا حالی کے کلام کی تائید ہوتی ہے یعنی میرزا مہر نیمروز کی تصنیف سے پہلے خط فارسی میں لکھا کرتے

> تھے اور انھوں نے ۱۸۵۰ء کے بعد خطوط نویسی شروع کی) اور میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ غالب نے سب سے پہلا خط میرے جد اعلیٰ کرامت ہمدانی بہاری مرحوم کے نام لکھا دوسری تاریخ جو ہے ۱۸۵۰ء کو لکھا اردوئے معلی میں جو خطوط شائع ہوئے ہیں ان میں سب سے پہلا خط بلحاظ تاریخ کے دو رکیست چہارم جنوری ۱۸۵۰ء کا ہے جو منشی ہرگوپال تفتہ کے نام ہے"

جناب رسا کی اس مختصر عبارت میں ایک آدھ نہیں تین تین غلطیاں ہیں غالب نے یہ نہیں لکھا کہ "اردو زبان میں یہ میرا پہلا خط ہے۔" انھوں نے سب سے پہلا اردو خط ان کے جد اعلیٰ جناب کرامت ہمدانی بہاری مرحوم کے نام لکھا" اور نہ اردوئے معلی میں سب سے پہلا خط باعتبار تاریخ چہارم جنوری ۱۸۵۰ء کا لکھا ہوا ہے۔ جہاں تک میں غور کرسکا ہوں اردوئے معلی میں سب سے پہلا خط اوائل ۱۸۴۸ء کا لکھا ہوا ہے اور یہ منشی جواہر سنگھ جوہر کے نام ہے جس میں انھوں نے لنگی کا تقاضا کیا ہے چونکہ اس خط پر تاریخ موجود نہیں تھی اس لیے جناب رسا کو معلوم نہیں ہوا۔ یہ خط اردوئے معلی کے صفحہ ۲۳۳ پر چھپا ہوا ہے۔ جیسا کہ میں ایک مضمون میں لکھ چکا ہوں جوہر والے محولہ فوق خط سے ثابت ہوتا ہے کہ میرزا اردو خطوط نویسی ۱۸۴۸ء میں بلکہ عین ممکن ہے کہ اس سے پہلے) شروع کر چکے تھے جناب رسا نے مولانا حالی کی تحریر پر بھروسا کر کے یہ خط تصنیف فرمایا اور اس پر تاریخ یکم جنوری ۱۸۵۰ء درج کر دی غرضیکہ اگر یہ خط اصلی ہوتا تو بھی یہ کسی طرح میرزا کا اردو میں پہلا خط نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ ہمارے پاس اردوئے معلی کے مطبوعہ خطوں میں کم از کم دو خط ایسے موجود ہیں جو اس تاریخ سے پہلے لکھے گئے تھے ایک میر تفتہ کے (اردوئے معلی صفحہ ۲۵۹) اور ایک منشی جواہر سنگھ جوہر کے نام (اردوئے معلی صفحہ ۲۳۶) ان دونوں کے متعلق تفصیل سے میں اپنے گزشتہ مضمون میں لکھ چکا ہوں خیر یہ تو رسا صاحب کے خط کا ایک پہلو تھا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پورے کا پورا خط پہلے سے ٹکڑوں میں موجود ہے جن میں سے ایک خط پر کوئی تاریخ نہیں لیکن دوسرا خط یقیناً غدر ۱۸۵۷ء کے بعد کا لکھا ہے کیونکہ اس کی شروع کی سطروں میں مہر نیمروز کے بعد ماہ نیم ماہ کے نہ لکھنے کی وجہ اور غدر کا ذکر ہے میرزا اپنے خطوں کی نقل اپنے پاس نہیں رکھتے تھے ورنہ وہ بعد میں اردوئے معلی میں چھاپنے کے لیے منشی غلام غوث خاں بے خبر اور نواب علاءالدین احمد خاں سے خطوط کی نقل نہ طلب کرتے پس یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ انھوں نے ۱۸۵۰ء میں کرامت مرحوم کے نام یہ خط لکھا ہو اور چھ سات برس بعد اسی کو دو حصوں میں تقسیم

کرکے جلد اول اور جلد دوم کے نام بھیج دیا ہو۔

وصا صاحب کے خط میں ایک اور بات غور طلب ہے اس خط میں آموں کے نہ بھیجے کا ذکر ہے خط یکم جنوری کا لکھا ہوا ہے اور یہ سردیوں کے شباب کا زمانہ ہے کیا بہار میں آموں کی فصل ان ایام میں ہوا کرتی ہے؟

مجھے نہیں معلوم کہ منشی لال سید رحمت علی خاں کی کتاب سراج المعرفت کب شائع ہوئی لیکن اس کے دیباچہ کے آخر میں میرزا لکھتے ہیں:۔

"بادشاہ سے کیا عجب ہے کہ دو برس کی تنخواہ دے کر مجھے خانہ خدا کے طواف کی رخصت دیں کہ یہ گنہگار وہاں جاوے اور اگر زیست باقی ہے تو وہاں جا کر اور اپنے ستاون برس کے گناہ کہ جس میں سوائے شرک کے سب کچھ دھلوا کر پھر آئے۔"

دوہ کی طرف اشارہ سے ثابت ہوتا ہے کہ میرزا تاریخ نویسی پر ملازم ہو چکے تھے جو جولائی ۱۸۵۰ء کا واقعہ ہے ستاون برس کی عمر سے یہ نتیجہ نکلے گا کہ یہ دیباچہ انھوں نے سنہ ۱۲۶۹ھ (۱۸۵۲ء) میں لکھا اگر یہ استنباط صحیح ہے تو رسالے والے خط کے جعلی ہونے پر قطعی دلیل ہے جس پر تاریخ یکم جنوری ۱۸۵۸ء ہے۔

حاشیہ نمبر (۲)

دلی ۱۱ جنوری ۱۸۵۸ء

سنو میاں طرح بفتح اول و سکون ثانی بمعنی فریب ہے اور تصویر کے خاکے کو بھی کہتے ہیں، اور بمعنی آسایش دنیا بھی معار ہے مرادف طرز و روش بھی طرح بفتحتین۔ پنج آہنگ مسلفہ و دیوان فارسی تمھارے پاس ہے مگر یہ سمجھو کہ یہ دونوں ناتمام ہیں اور ان سامنیں سے اس کا اتمام ممکن نہیں۔ جو کچھ ہو غنیمت ہے دستنبو میں نے نذر کی ہے مہر نیم روز معلوم نہیں تمھارے پاس ہے یا نہیں الخ

(۱) طرح بفتح اول و سکون ثانی بمعنی فریب ہے اور تصویر کے خاکے کو بھی کہتے ہیں اور بمعنی آسایش دنیا بھی معار ہے مرادف طرز و روش بھی طرح بفتحتین اس کی تفرقہ منظور رہا کرے۔

(بنام چودھری عبدالغفور سرور، عود ہندی صفحہ ۱۶۵)

(۲) پنج آہنگ آپ نے لی دیوان فارسی آپ کے پاس ہے مگر یوں سمجھیے کہ یہ دونوں ناتمام ہیں اور ان کسیں سے اس کا اتمام ممکن نہیں جو کچھ ہے دستنبو میں نے نذر کی ہے مہر نیم روز معلوم نہیں آپ کے پاس ہے یا نہیں الخ۔

(بنام صاحب عالم مارہروی، عود ہندی صفحہ [illegible])

اس خط کے متعلق سب سے بڑا لطیفہ یہ ہے کہ جب اشاعت سے پہلے یہ خطوط میرے پاس آئے ہیں تو اس پر تاریخ ۱۲ جنوری ۱۸۵۸ء درج تھی میں نے کہا یہ خط جعلی ہے کیونکہ اس میں دستنبو کے نذر کرنے کا ذکر ہے اور یہ کتاب کہیں نومبر ۱۸۵۸ء میں شائع ہوئی تھی جس چیز کا جنوری ۱۸۵۸ء میں وجود ہی نہیں تھا اس کا مہیا آنا یعنی چہ اب اشاعت کے بعد جو دیکھتا ہوں تو اس پر تاریخ ۱۲ جنوری ۱۸۵۹ء چھپی ہوئی ہے۔ چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد

خط نمبر (۳)

دہلی ۲۵ ستمبر ۱۸۵۸ء

جان غالب ــ

گرمی از آب بروں رفت حرارت رہا
گل مہر جہاں تاب بہ سیران آمد

موسم اچھا آگیا ہے حسب رائے طبیب تنقیہ ضروری تھا آج دسواں مسہل ہے پانچ سات دن کے بعد مسہل ہوگا جو شعر تم نے لکھا ہے اس پر خط البطلان غلطی سے کھینچ دیا گیا ہے قصد کر کے بیٹھا تھا کہ اس شعر پر صاد کروں گا خدا جانے قلم سے خط کیونکر کھنچ گیا ہے اب جو شعر لکھا نہیں حافظہ نہیں رہا اکثر الفاظ بے قصد لکھ جاتا ہوں جس غزل کے بارے میں تم نے لکھا ہے وہ میری ضرور ہے لیکن میرے پاس موجود نہیں میں نے وہ غزل نواب انوار الدولہ سعد الدین خاں بہادر شفق کو بھیج دی ہے صرف تین شعر یاد رہ گئے ہیں وہ تمہیں بھیجتا ہوں ۔ مطلع یاد ہے یہ مقطع (اس کے بعد جوش آور حروف آور روانی ہیں میں جو غزل ہے اس کے تین شعر ہیں)

(۱) جس دن صبح کو میں نے خط بھیجا اسی دن آخر روز حضور کا فرمان پہنچا معلوم ہوا کہ حرارت ہنوز باقی ہے انشاء اللہ تعالیٰ رفع ہو جائے گی موسم اچھا آگیا ہے ؎

گرمی از آب بروں رفت حرارت رہا
گل مہر جہاں تاب بہ سیران آمد

اگر صرف تبرید و تعدیل سے کام نکل جائے تو کیا کہنا ورنہ حسب رائے طبیب تنقیہ کرا دیجئے مجھ کو بھی آج دسواں مسہل ہے پانچ سات دن کے بعد مسہل ہوگا۔ (بنام انوار الدولہ شفق عود ہندی صفحہ ۱۵۹ اسی خط کے آخر میں جو شعر کی وہ غزل ہے جس میں سے تین شعر رسالے والے خط میں دیئے ہیں)

(۲) نوازش نامہ کو دیکھ کر جانا کہ میں نے "کمر" جیذ کے شعر پر خط البطلان کھینچ دیا ہے یہ تو کوئی گمان نہ کرے گا کہ میں کمر کو کمربند نہیں جانتا مقصد وہاں پہلے مصرع میں اگر کمر معنی کمربند فرض کیجئے تو بھی تو شعر کاٹ ڈالنے کے قابل نہیں قصد کر کے بیٹھا تھا کہ اس شعر پر صاد کروں گا

> خدا جانے قلم سے خط کیوں کر کھنچ گیا۔ اب حواس بجا نہیں، حافظہ رہا نہیں۔ اکثر الفاظ بے قصد لکھ جاتا ہوں۔ ستر برس کی عمر ہوئی کیا عجب کہ بات نہ آئے۔ اس شعر کا گنہگار اور حضرت سے شرمسار ہوں۔ معاف کیجیے۔ زیادہ حدِ ادب۔
>
> (بنام انوار الدولہ شفق۔ عود ہندی صفحہ ۔۔)

شفق کے نام کے جن دو خطوں کے اقتباس اوپر دیے گئے ہیں، ان دونوں پر تاریخ درج نہیں اور بظاہر ان کی تاریخِ تحریر معلوم کرنا محال نظر آتا ہے لیکن ایک قرینے سے ظاہر ہوتا ہے کہ میرزا نے ہوش آور گوش آور والی زمین میں غزل دستنبو کی اشاعت کے بہت بعد لکھی تھی۔ جیسا کہ اوپر لکھ چکا ہوں دستنبو نومبر ۱۸۵۹ء میں شائع ہوا تھا۔ پس اگر یہ غزل نومبر کے بعد لکھی گئی تھی تو ظاہر ہے کہ وہ ستمبر سے پہلے شفق یا کرامت مرحوم کو نہیں بھیجی جا سکتی تھی۔ وہ قرینہ کیا ہے؟

صاحب عالم مارہروی کے نام جس خط کا اقتباس اوپر نمبر ۲ کے بالمقابل دے آیا ہوں اس کے آخر کی عبارت ہے۔

> خلاصہ یہ کہ شعر کو مجھ سے اور مجھ کو شعر سے ہرگز نسبت باقی نہیں رہی۔ اس فتنہ و فساد کے بعد ایک قصیدہ جو دستنبو میں ہے اور ایک قصیدہ نواب لفٹنٹ گورنر بہادر مغرب و شمال کی مدح میں، اور ایک قصیدہ نواب لفٹنٹ گورنر پنجاب کی مدح میں، اور دو بیت کا ایک قطعہ اور ایک رباعی۔ اس نظم کے سوا اگر کچھ لکھا ہو تو مجھ سے قسم لے لیجیے۔ قطعہ آدم زن بہ شیطان طرق لعنت الخ رباعی دنیا عجیب و شادی غم عجیب الخ (بنام صاحب عالم مارہروی۔ عود ہندی صفحہ ۲۹)

میرزا کو ہمیشہ یہ حسرت رہتی تھی کہ انھیں کوئی ان کی فارسی نظم و نثر کا قدردان ملے۔ اگر وہ یہ غزل لکھ چکے تھے تو کوئی وجہ نہیں نظر آتی کہ وہ کیوں صاحب عالم کے خط میں اس کا ذکر نہ کرتے جب کہ مکتوب الیہ خود ان سے تازہ کلام طلب کر رہے تھے اور جیسا کہ ان کے خطوں سے ظاہر ہے میرزا بھی ان کو دوسرے ہندوستانی فارسی دانوں کے مقابلے میں اپنی برتری کا یقین دلانا چاہتے تھے۔ اس سے لازماً یہی نتیجہ نکلے گا کہ انھوں نے یہ غزل اس وقت تک لکھی ہی

نہیں آئی اور رُسا صاحب والے خط میں جس پر تاریخ ۵ ستمبر ہے اس کا ذکر نا ممکنات میں سے ہے۔

خط نمبر (۴)

دہلی بلی ماراں ۔ مئی ۱۸۵۹ء۔

جیتے رہو اور خوش رہو تمھارے وقت تو خوش کرتا
خوش کردی تھا۔ خط آج صبح کو آیا میں دوپہر کو جواب
لکھتا ہوں۔ آج کل یہاں کا حال ۔ یہ ہے سوائے
اناج اور اپلے کے کوئی چیز نہیں جس پر محصول نہ لگا ہو
جامع مسجد کے گرد پچیس پچیس فٹ گول میدان نکلے گا
دکانیں حویلیاں ڈھائی جائیں گی دارالبقا فنا ہو جائیگا
رہے نام اللہ کا خان چند کا کوچہ شاہ بولا کی بڑ تک
ڈھے گا دونوں طرف سے پھاوڑہ چل رہا ہے باقی
سب خیر و عافیت ہے (اس کے بعد غالب کے ایک
شعر کی شرح اور کرامت کے ایک شعر پر اصلاح ہے)

۔ شہر کا حال میں کیا جانوں کیا ہے۔ پون ٹوٹی۔
کوئی چیز وہ جاری ہو گئی ہے سوائے اناج اور
اُپلے کے کوئی چیز ایسی نہیں جس پر محصول نہ لگا ہو
جامع مسجد کے گرد پچیس پچیس فٹ گول میدان نکلے گا
دکانیں حویلیاں ڈھائی جائیں گی۔ دارالبقا فنا
ہو جائے گی رہے نام اللہ کا خان چند کا کوچہ
شاہ بولا کی بڑ تک ڈھے گا دونوں طرف سے پھاوڑہ
چل رہا ہے۔ باقی خیر و عافیت ہے ۔
(نام میر مہدی مجروح اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۱۱)
نوشتہ سہ شنبہ ۸ دسمبر ۱۸۵۹ء۔

یہ خط بہت دلچسپ ہے جن اصحاب نے غالب کی تحریروں کا غور سے مطالعہ کیا ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ انھیں اس بات سے سخت چڑ تھی کہ کوئی ان سے خط پر لکھنے کے لیے گلی محلہ کا نام پوچھے یا خط کے عنوان میں یہ لکھ دے بلامبالغہ اردو فارسی تحریروں میں بیسیوں جگہ انھوں نے مکتوب الیہ کو لکھا ہے کہ عنوان میں صرف میرا نام اور دہلی لکھ دیا کرو گلی یا محلہ لکھنے کی ضرورت نہیں (در دہلی بہ اسد اللہ رسد) بس انھیں اپنی شہرت اور نام آوری کا بڑا خیال تھا اگر کوئی ان سے محلہ کا نام پوچھتا تھا تو وہ اس پر برا مانتے اور خیال کرتے تھے گویا سائل انھیں گمنام اور ذلیل سمجھ رہا ہے کہ جب تک محلہ اور تھانہ کا نام نہ لکھا جائے ہرکارہ پتہ نہ پائے۔ الغرض مجھے یقین ہے کہ غالب کبھی بلی ماران نہیں لکھ سکتے تھے اور یہ ایجاد بندہ ہے۔

یہ محصول دہلی میں انگریزی قبضہ کے بہت بعد، دسمبر ۱۸۵۹ء سے جاری ہوا تھا۔ میرزا ایک دوسرے

خط میں حسین مرزا کو لکھتے ہیں :-

"آج کل یہاں پنجاب احاطہ کے سب حاکم فراہم ہیں۔ یون ڈپٹی کے باب میں کونسل ہوئی۔ یہ سوال
درپیش ہے جاری ہو یہ سالک رام مرا اچھی چیسال ہیش داس ان تین شخصوں کو یہ کام ملے گا۔ تیق
اعانی سپرد ہوا غلط اور اسی لیے کے سوا کوئی شخص ایسی نہیں کہ جس پر یہ گمان نہ لگا ہو (اردوئے معلی صفحہ ۱۲)
پس جب یہ گھوڑوں ، روسے شروع ہوا تو حوالہ قتل رہیں کے خط میں اس کا ذکر کیسے ہو سکتا ہے
اب ایک لطیفہ سنیئے آپ نے دیکھا کہ دونوں جگہ میرزا نے ایک لفظ "یون ڈپٹی" لکھا ہے لیکن رسا
صاحب والے خط میں یہ لفظ موجود نہیں مجھے تو یہ شبہ ہے کہ وہ سمجھ ہی نہیں سکے کہ یہ لفظ کیا ہے ورنہ وہ ضرور
اسے بھی لکھ دیتے اور اگر رسا صاحب والا خط واقعی میرزا کا لکھا ہوتا تو اس میں بھی آپ یہ لفظ ضرور پاتے۔ یہ لفظ
تاون ڈیوٹی ہے جو میرزا نے کسی سے یونہی سنا اور رکھ دیا۔ ورنہ وہ خود بھی نہیں سمجھے کہ یہ کیا بلا ہے اسی لیے میر مہدی
کے خط میں لکھتے ہیں۔ "یون ڈپٹی کوئی چیز ہے وہ جاری ہو گئی ہے"

خط نمبر (۵)

دہلی ۲۵ اکتوبر [illegible]

میاں غالب : یہ دن مجھ پر برے گزرتے ہیں میرا حال
لعینہ وہ ہوتا ہے جیسا زبان سے پانی پینے والے جانوروں
کا خصوصاً اس تنور میں کہ غم و الم کا ہجوم ہے
آتش دوزخ میں یہ گرمی کہاں
سوز غم ہائے نہانی اور ہے
عربی میں گھوڑے کے ہنہنانے کو صہیل بوزن دلیل
کہتے ہیں صیہہ بوزن سفینہ عموماً معنی ہر صدائے بولنا کو
عیب آتا ہے کیونکر فرہنگ نگاروں اور ان کے
مددگاروں کے قیاس کو دخل ہوا اور کیونکر کا توں

(۱) یہ دن مجھ پر برے گزرتے ہیں گرمی میں میرا حال
لعینہ وہ ہوتا ہے جیسا زبان سے پانی پینے والے جانوروں
کا خصوصاً تنور میں کہ غم و الم کا ہجوم ہے
آتش دوزخ میں یہ گرمی کہاں
سوز غم ہائے نہانی اور ہے
(بنام امراؤ الدولہ شفق - اردوئے معلی صفحہ ۱۲۲)
(۲) تمہارا محبوب راہ دیکھی سنسنیں منقطع
سے التفاتی کے بیان میں تیسہ کو گھوڑے کے ہنہنانے
کی فارسی بتاتا ہے عربی میں گھوڑے کے ہنہنانے کو

کے املا کو مصحف مجید کی طرح سر پر دھروں یہ تو جب ہو سکتا ہے کہ میں اپنے کو حماد و نبات فرض کروں۔

میں نے ابتدائے سن تمیز میں اردو زبان میں سخن سرائی کی ہے پھر اوسط عمر میں بادشاہ دہلی کا نوکر ہو کر چند روز اسی روش پر خامہ فرسائی کی ہے نظم و نثر فارسی کا عاشق اور مائل ہوں ہندوستان میں رہتا ہوں مگر تیغ اصفہانی کا گھائل ہوں جہاں تک زور چل سکا فارسی زبان میں بہت کچھ بکا اب نہ فارسی کی فکر نہ اردو کا ذکر نہ دنیا میں توقع نہ عقبیٰ کی امید میں ہوں اور امروز ناکامی جاوید جیسا کہ خود قصیدۂ نعت کی تشبیب میں کہتا ہوں ؎

چشم کشودہ اند بہ کردار ہائے من
زاینده ناامیدم و از رفتہ شرمسار

نجات کا طالب غالب

صمیل و رن ذیل کہتے ہیں صیغہ پورن حصہ نمونا جیسے بہ صدائے ہولناک و مہیب آتا ہے کیونکر دہنگ کار ہا کے اوراق کے مددگاروں کے قیاس کروں محمول اور کیونکر کاتبوں کے املا کو مصحف مجید کی طرح سر پر دھروں یہ تو جب ہو سکتا ہے کہ اپنے کو حماد و نبات فرض کروں۔ (نامۂ غالب بنام میرزا رحیم بیگ نوشتہ ۱۸۶۵ء۔ عود ہندی صفحہ ۱۲۱)

(۳) تم دانائے رموز اردو زبان ہو سرمایۂ نازش قلمرو ہندوستان ہو خاکسار نے ابتدائے سن تمیز میں اردو زبان میں سخن سرائی کی ہے پھر اوسط عمر میں بادشاہ دہلی کا نوکر ہو کر چند روز اسی روش پر خامہ فرسائی کی ہے نظم و نثر فارسی کا عاشق اور مائل ہوں ہندوستان میں رہتا ہوں مگر تیغ اصفہانی کا گھائل ہوں جہاں تک زور چل سکا فارسی زبان میں بہت بکا اب نہ فارسی کی فکر نہ اردو کا ذکر نہ دنیا میں توقع نہ عقبیٰ کی امید میں ہوں اور امروز ناکامی جاوید جیسا کہ خود قصیدۂ نعت کی تشبیب میں کہتا ہوں ؎

چشم کشودہ اند بہ کردار ہائے من
زاینده ناامیدم و از رفتہ شرمسار

(بنام عبدالغفور خاں بہادر نساخ ۱۸۶۲ء اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۳۰)

اس خط کے تین ٹکڑے ہیں اور تینوں زبان حال سے اپنے مرتب کے جعل کی گواہی دے رہے ہیں تصریح کی

میں گرمی اور تموز کی شکایت ہو۔ رسا صاحب کو معلوم رہے کہ ممکن ہو بہار میں دسمبر جنوری آموں کا موسم ہو لیکن دہلی میں یقیناً ۲۰ اکتوبر گرمی کا زمانہ نہیں کہ میرزا یوں بے تابی کا اظہار کرتے۔ شفق کے جس خط سے یہ ٹکڑا لیا گیا ہے اس کا سال تو میں متعین نہیں کر سکتا ہوں، غالباً ۱۸۶۲ء ہو لیکن مہینہ جون یا جولائی ہے اس میں ہرگز شبہ کی گنجائش نہیں۔ جون جولائی واقعی گرمی کا زمانہ ہے اور وہاں غالب کی شکایت بجا ہے۔

دوسرا ٹکڑا اس سے عجیب تر ہے۔ میرزا رحیم بیگ کو توصیل اور شیہہ اور صیحہ وغیرہ کے متعلق لکھنے کا کچھ تک تھی؟ کیونکہ وہاں میرا مولف برہان قاطع محمد حسین دکنی اور دوسرے ہندوستانی فرہنگ نگاروں اور ان کے مددگاروں، سعادت علی خاں مولف محرق قاطع اور امین الدین پٹیالوی مولف قاطع القاطع اور خود میرزا رحیم بیگ مولف ساطع برہان اور اسی قماش کے دوسرے بزرگوں پر نکتہ چینی کر رہے ہیں لیکن کیا رسا صاحب بتا سکتے کہ چھ برس قبل جب قاطع برہان طبع بھی نہیں ہوئی تھی اور فرہنگ نگاروں اور ان کے مددگاروں کا وجود بھی نہیں تھا یہ سطریں کرامت مرحوم کو لکھنے کا کون موقعہ تھا۔

پھر ان دونوں عبارتوں کے بعد اپنی صلاحیتوں اور حسرتوں کے بیان کا کون مقام ہے اور یہ جواب س سوال کا ہو!

میرے خیال میں مزید بالمقابل عبارت نقل کرنے کی ضرورت نہیں اس سے مضمون بیکار لمبا ہو جائیگا اصحاب کو تصدیق منظور ہو وہ میرے درج کردہ حوالے ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

خط نمبر ۶ اور ۷ کی پوری عبارتیں بھی اسی طرح اردوئے معلیٰ اور عود ہندی میں موجود ہیں خط نمبر ۶ دو خطوں سے مرتب ہوا ہے یہ دونوں خط چودھری عبدالغفور سرور کے نام ہیں۔ پہلا حصہ عود ہندی صفحہ ۲۹ پر ہے اور آخری حصہ صفحہ ۱۲ پر۔ خط نمبر ۷ کی عبارت دو تین جگہ تقسیم ہو کر چھپی ہوئی موجود ہے

خط نمبر ۸ ذرا زیادہ دلچسپ ہے اس لیے اسے نقل کرتا ہوں:

دہلی بلی ماراں ۷ اکتوبر ۱۸۵۳ء

"جان غالب مشاعرہ یہاں شہر میں کہیں نہیں ہوتا قلعہ میں شاہزادگان تیموریہ جمع ہو کر کچھ غزل خوانی کر لیتے ہیں میں کبھی اس محفل میں جاتا ہوں اور کبھی نہیں جاتا

برسات کا حال کیا پوچھتے ہو خدا کا قہر ہے قاسم جان کی گلی سعادت خاں کی نہر ہے میں جس مکان میں رہتا ہوں عالم بیگ خاں کے کٹڑے کی طرف کا دروازہ گر گیا مسجد کی طرف کے دالان کو جاتے ہوئے جو دروازہ تھا گر گیا سیڑھیاں گرا چاہتی ہیں صبح کے بیٹھنے کا حجرہ جھک رہا ہے چھتیں چھلنی ہو گئی ہیں مینہ گھڑی بھر برسے تو چھت گھنٹہ بھر برسے۔ کتابیں قلمدان سب توشہ خانے میں فرش پر کہیں لگن رکھا ہوا ہے کہیں چلمچی دھری ہوئی ہے خط کہاں بیٹھ کر لکھوں ایسی حالت میں اگر خط کے جواب میں دیر ہوا کرے تو خیال نہ کرو (اس کے بعد نقش فریادی ہے الخ کی شرح درج ہے)

بلی ماران کے متعلق اوپر لکھ چکا ہوں قارئین حیران ہو گئے کہ سنہ ۱۸۵۹ء اور سنہ ۱۸۶۰ء کے خطوں کے بعد یہ سنہ ۱۸۵۳ء کا خط کہاں سے ٹپک پڑا لیکن تعجب بے جا ہے جب یہ خط تصنیف ہوا ہو تو واقعی اس پر تاریخ سنہ ۱۸۶۰ء ہی تھی لیکن جب میں نے خط دیکھنے کے بعد عرض کیا کہ قبلہ غدر کے بعد سنہ ۱۸۶۰ء میں قلعہ اور شاہزادگان اور ان کے مشاعرہ اور میرزا کے وہاں جانے کا ذکر کچھ بے محل سا معلوم ہوتا ہے تو حضرت متنبہ ہوئے اور تاریخ سنہ ۱۸۵۳ء کر دی جو آپ دیکھ رہے ہیں۔ یہ پہلا ٹکڑا لفظ بلفظ جان بہادر قاضی عبدالجمیل صاحب جنون بریلوی کے خط میں موجود ہے (اردوئے معلی صفحہ ۱۵۴)

پہلے ٹکڑے کو درست ثابت کرنے کے لیے انھوں نے سنہ ۱۸۶۰ء کی جگہ سنہ ۱۸۵۳ء تو لکھ دیا لیکن یہ خیال میں نہ آیا کہ دوسرے ٹکڑے کے طوفان نوح کی تاریخ کا کیا بنے گا یہ عبارت حرف بہ حرف میر مہدی مجروح کے خط کی ہے (اردوئے معلی صفحہ ۱۳۳) اور یہ خط جولائی سنہ ۱۸۶۲ء کا لکھا ہوا ہے میرزا کے متعدد خطوں میں اس برسات کا ذکر ہے اسی موقع پر انھوں نے نواب علاؤالدین احمد خاں سے کہہ کر مکان مانگا تھا جس کے متعلق ان کا صاحب بہادر اور میم اور بابا لوگ والا لطیفہ مشہور ہے نیز جناب رسا کو معلوم ہونا چاہیے کہ دلی میں اکتوبر میں ایسا برسات کا موسم نہیں کہ مینہ گھڑی بھر برسے تو چھت گھنٹہ بھر برسے یہ جولائی کا زمانہ ہے اور ان دنوں شدید بارش تو درکنار عموماً ایک بوند تک نہیں گرا کرتی۔

ایک اور بات اس خط کے دو فقرے "عالم بیگ خاں کے کٹڑے کی طرف کا دروازہ گر گیا" اور "مسجد کی طرف کے دالان کو جاتے ہوئے جو دروازہ تھا گر گیا" ظاہر کرتے ہیں کہ مکتوب الیہ میرزا کے مکان سے خوب

واقف ہو مجروح کے متعلق تو کسی قسم کا شبہ نہیں کیا رسا صاحب کے پردادا کبھی دہلی تشریف لائے تھے ؟

خط نمبر ۹ پر تاریخ "دہلی ۲ ر دسمبر ۱۸۶۰ء" درج ہے اور اس میں وہ لطیفہ لکھا ہے جو حالی نے یادگار غالب میں بیان کیا ہے کہ میر مہدی نے میرزا کے پاؤں اس شرط پر دابے کہ وہ اس کی اجرت قبول کریں گے اور بعد میں میرزا نے کہا "بھیا اجرت کیسی؟ تم نے میرے پاؤں دابے میں نے تمھارے پیسے دابے چلو حساب برابر سرابر"

رسا صاحب خط شروع کرتے ہیں :-

"سنو صاحب! ایک لطیفہ لکھتا ہوں رات میں پلنگ پر پڑا کراہ رہا تھا میر مہدی پاس بیٹھے تھے اٹھ کر پاؤں دابنے لگے الخ"

صرف یہ کہ دسمبر ۱۸۶۰ء میں ان کے کراہنے کے لیے ہمارے پاس کوئی وجہ اور ثبوت نہیں دسمبر کی ان تاریخوں میں میر مہدی مجروح دہلی میں تھے ہی نہیں اور یہ اردوئے معلیٰ کے مطبوعہ خطوں سے ثابت کیا جا سکتا ہے۔

خط نمبر (۱۰)

دہلی ۹ جنوری ۱۸۶۱ء

"شاد صاحب! یہ جو تم نے شکایت نامہ بھیجا ہے اس کے بعد ایک خط میرا بھی تم کو بھیجا ہوگا یہ خط آج آیا ہے آج ہی اس کا جواب لکھتا ہوں اپنا حال کیا لکھوں ایک بی بی دو بچے تین چار آدمی گھر کے کلو کلیان ایاز یہ باہر مداری کے جورو بچے بدستور گویا مداری موجود ہے میاں گھس گئے گئے مہینہ بھر سے آ گئے کہ بھوکا مرتا ہوں۔ اچھا بھائی تم بھی رہو۔ ایک پیسے کی آمد نہیں بیس آدمی روٹی کھانے والے موجود مقام معلوم سے کچھ آئے جاتا ہے وہ بھی بقدر رسد رمق ہے محنت وہ ہے کہ دن رات میں فرصت کام سے کم ہوتی ہے۔ ہمیشہ ایک فکر برابر چلی جاتی ہے آدمی ہوں دیو نہیں بھوت نہیں ان رنجوں کا تحمل کیونکر کروں۔ بڑھاپا ضعف قویٰ اب مجھے دیکھو تو جانو کہ میرا کیا رنگ ہے صاحب فراش ہوں نہ کہیں جانے کا ٹھکانا نہ میرے پاس کوئی آنے والا۔

چلبی کے متعلق جو تم نے دریافت کیا ہے تو یہ لفظ صحیح ہے غلط نہیں ابھی ابھی میں نے عبدالرزاق شاکر کا قصیدہ دیکھا ہے اور ان کا مطلع درست کیا ہے وہ مطلع یہ ہے :-

ہے تمھارا آفتابہ آفتابِ آسماں دیکھ لو اپنی چلپی میں حبابِ آسماں
دیکھو اس میں چلپی ہے سلپچی نہیں نجات کا طالب غالب

اس خط کا پہلا فقرہ یوسف مرزا کے خط میں موجود ہے جو ۵ نومبر ۱۸۵۹ء کا نوشتہ ہے (اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۵۴) "ایک بی بی دو بچے" سے لے کر آخر تک پورا پیرا اس سے اگلے خط میں ہے۔ (اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۵۵) جو ۲۰ نومبر ۱۸۵۹ء کی تحریر ہے۔ قطع نظر اس سے کہ اس خط کا لب و لہجہ اور مضمون بھی حد درجہ ناقص کا رانہ ہے اور مکتوب الیہ کے لیے میرزا کے خانگی معاملات کے نشیب و فراز سے پوری واقفیت لازمی ہے اور کرامت مرحوم کے متعلق ہمارے پاس ایسی کوئی شہادت موجود نہیں۔ ایک اور بات غور طلب ہے کہ اگر ۲۸ نومبر ۱۸۶۰ء کو کمن کو دالیں آئے ایک مہینہ ہوا تھا تو ۹ جنوری ۱۸۶۱ء کو بھی جو رسا صاحب کے خط کی تاریخ ہے یہ مدت ایک ماہ ہی نہیں ہو سکتی لیکن زیادہ پُرلطف چلپی والا ٹکڑا ہے اس خط کے آخر میں رسا صاحب نے ایک نوٹ بھی لکھا ہے فرماتے ہیں:-

"عودِ ہندی کے صفحہ ۱۵۴ میں میرزا غالب کا خط عبدالرزاق شاکر کے نام چھپا ہوا موجود ہے اس میں میں نے یہ مطلع اپنی آنکھوں سے دیکھا چلپی کا لفظ چھپا ہوا ہے سلپچی نہیں ہے۔ رسا ہمدانی"

آمنا و صدقنا۔ جناب رسا صاحب کو اتنی تاکید کی کیا ضرورت تھی ہم نے پہلے ان کی کونسی تحریر پر شبہ کا اظہار کیا ہے جو اب چلپی پر کرتے کہ وہ تصدیق کے لیے عودِ ہندی کو ملاحظہ فرماتے اور ہمیں یقین دلانے کے لیے اپنی آنکھوں کا واسطہ دلاتے ہیں آخر اتنی زحمت کشی کی کیا ضرورت پیش آئی تھی۔ ان کے قسمیں کھانے سے شبہ گزرتا ہے کہ اس میں پس پردہ کوئی راز ہے۔ کیا وہ اس پر روشنی ڈالیں گے؟

لیکن حیرت ہے تو اس بات پر کہ انھیں شاکر کے خط میں چلپی کا لفظ تو نظر آگیا لیکن اس کی تاریخ نظر نہ آئی حالانکہ چلپی اور سلپچی کی تکرار بحث سے یہ کہیں زیادہ اہم بات تھی کیونکہ یہ دونوں لفظ صحیح ہیں اور خود غالب نے ان دونوں لفظوں کا استعمال کیا ہے۔ شاکر کے نام میرزا کا خط شروع ہوتا ہے:-

"قبلہ آپ کو یہ تو معلوم ہو گیا ہوگا کہ ۸ جنوری کو فقیر دلی پہنچا۔ تھکا ماندہ، خستہ و رنجور ہنوز افاقت کلی نہیں پائی الخ۔"

جناب رسا کو معلوم ہونا چاہیے کہ میرزا یہاں رامپور کے دوسرے سفر سے واپسی کا ذکر کر رہے ہیں وہ اس سفر سے ۸ جنوری ۱۸۶۶ء کو دہلی پہنچے تھے۔ رسا صاحب نے اپنے خط پر تاریخ ۹ جنوری ۱۸۶۱ء دی ہے۔ اب وہ یہ فقرہ ملاحظہ فرمائیں جو انھوں نے اسی خط میں لکھا ہے۔

"ابھی ابھی میں نے ملا عبدالرزاق کا قصیدہ دیکھا ہے اور ان کا مطلع درست کیا ہے"

گویا میرزا ۹ جنوری ۱۸۶۱ء کو حوالہ دے رہے ہیں ۱۸۶۶ء کے ایک خط کا اور "ابھی ابھی" لکھ کر! بالفعل رسا صاحب یہ نہیں فرما سکتے کہ یہ کتابت کی غلطی ہے کاتب نے ۱۸۶۶ء کی جگہ ۱۸۶۱ء لکھ دیا ہے۔ اول تو جب میں نے مسودہ دیکھا ہے اس وقت بھی خط پر سال ۱۸۶۱ء ہی لکھا تھا اب بھی وہی ہے۔ دوسرے اگلے خطوں پر بھی ۱۸۶۱ء کے بعد کی تاریخیں ہیں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ان کا کوئی خط ۱۸۶۱ء کے بعد کا ہے ہی نہیں۔ چونکہ انھوں نے کتاب میں خطوط کو تاریخ وار درج کیا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک بھی اس خط کی تاریخ ۱۸۶۱ء ہی ہے ورنہ یہ سب سے آخر میں ہوتا۔

ممکن ہے کہ رسا صاحب ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کے مصداق کتابت کی غلطی پر اصرار کریں اس لیے میں ایک بات اور عرض کر دوں کہ شاکر والا خط ۹ جنوری کا لکھا ہوا نہیں بلکہ اس سے بہت دن بعد کا ہے اس سے اس کے لیے "ابھی ابھی" درست ثابت کرنے کے لیے کتابت کی غلطی کا عذر چنداں مفید نہیں ہوگا۔

خط نمبر ۱۱ کا مضمون رباعی کے متعلق ہے جو بعینہٖ چودھری عبدالغفور سرور کے خط میں موجود ہے (عودِ ہندی صفحہ ۲۶۵)۔ خط نمبر ۱۲ کی عبارت جوں کی توں منشی شیونرائن کے خط میں موجود ہے (اردوئے معلی صفحہ ۲۶۵)۔ فرق صرف اتنا ہے کہ آرام کے خط کی تاریخ ۲۲ اکتوبر ۱۸۵۸ء ہے جو موضوعِ عبارت کے لحاظ سے زیادہ قرینِ قیاس ہے۔

[1] رسا صاحب نے "دہلی بلی ماران ۲۰ جولائی ۱۸۶۱ء" لکھی ہے۔

خط نمبر ۱۳ ذرا زیادہ اہم ہے اس لیے اسے نقل کرتا ہوں:-

دہلی بلی ماران ۱۹ اگست ۱۸۶۱ء

"بھائی! تم جیتے رہو اور مراتب عالیہ کو پہنچو۔ تمھارے خط میں پچاس پچاس روپے کے دو نوٹ پہنچے۔ میں مسہل میں ہوں یہ نہ سمجھنا کہ بیمار ہوں حفظِ صحت کے لیے مسہل لے لیا ہے تمھاری غزل غور

سے دیکھ کر تمھارے پاس بھیجتا ہوں ؎

بلبل نہ جا قریب کہ بیٹھے ہیں خار دیکھ ہو کر الگ تو باغ سے گل کی بہار دیکھ

اس مطلع کے دوسرے مصرع کو یوں بنا دو گے ؎ تو دور ہی سے باغ میں گل کی بہار دیکھ۔

تمھارے اشعار کی کاپی دیکھی۔ ہائے کیا بُری کاپی ہے اشعار کی اور اس کاپی کی مثال جب تم پر کھلتی کہ تم یہاں ہوتے اور بیگمات قلعہ کو پھرتے چلتے دیکھتے۔ صورت ماہ دو ہفتہ کی سی اور کپڑے میلے پائنچے لیر لیر جوتی ٹوٹی یہ مبالغہ نہیں بلکہ اقتدا تمھاری مثنوی ایک معشوق خوبرو ہے مگر بدلباس ہو اور بھائی تمھاری مشق جیتم بد دور صاف ہو گئی۔ مطلب و پایں تمھارے کلام میں نہیں رہا اور اگر خواہی نخواہی تمھارا عقیدہ یہی ہے کہ اصلاح ضرور ہے تو میری جان میرے بعد کیا کرو گے۔ نجات کا طالب غالب

اس خط کا مضمون چار مطبوعہ خطوں سے مرتب ہوا ہے لیکن میں اس کے متعلق صرف دو باتیں عرض کروں گا

اول جب میں نے مسودہ دیکھا ہے تو اس خط پر سلہ ۱۸۶۰ء درج تھا میں نے کہا کہ ۱۴ راگست ۱۸۶۱ء تک بچاس بچاس روپے کے نوٹ جاری ہی نہیں ہوئے تھے اس لیے یہ خط جعلی معلوم ہوتا ہے یہ کہیں ۱۸۶۱ء میں جاری ہوئے تھے اب چھپنے کے بعد اس کا سنہ ۱۸۶۳ء ہو گیا ہے۔

دوم اشعار کی کاپی والا مضمون حرف بہ حرف تفتہ کے نام ایک خط میں ہمارے پاس موجود ہے جو میرزا نے "سنبلستان" کی اشاعت پر لکھا تھا (اردوے معلی صفحہ ۵۱) اس خط پر تاریخ ۱۹ اپریل ۱۸۶۱ء ہے ممکن ہے میرزا نے بالکل وہی لفظ ڈھائی سال بعد جناب کرامت ہمدانی مرحوم کو بھی لکھے ہوں لیکن اس کا فیصلہ آسانی سے ہو سکتا ہے جناب رسا صاحب کے پاس اپنے پردادا کی جملہ تصنیفات تو ہوں گی وہ بتائیں کہ اس خط میں کرامت کی کونسی مثنوی کا ذکر ہوا ہے اور اس کا سال اشاعت کیا ہے اور کیا یہ مثنوی ایسے ہی بُرے کاغذ پر چھپی ہے؟

خط نمبر ۱۴ کا ابتدائی حصہ حضرت صاحب عالم مارہروی کے ایک خط سے ماخوذ ہے جو عود ہندی کے صفحہ ۳۳ پر موجود ہے۔ آخری حصہ جو ایطا کی بحث سے متعلق ہے وہ بھی ان ہی کے نام دوسرے خط میں ہے (عود ہندی صفحہ ۱۹)

خط نمبر ۵ کا مضمون جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے یادگار غالب میں ہے لیکن چونکہ یہ کتاب اس وقت میرے پاس نہیں اس لیے میں نہ تصدیق کر سکتا ہوں نہ حوالہ دے سکتا ہوں۔

خط نمبر ۱۶ کا ابتدائی حصہ بھی یادگار غالب میں ہے اور آخری شعر کے خط میں ہے (اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۲۲) نمبر ۱۷ سے لے کر ۲۰ تک چاروں خط بعض اشعار کی تشریح پر مشتمل ہیں۔ چونکہ یہاں میرے پاس کوئی شرح نہیں اس لیے نہیں کہہ سکتا کہ یہ نکات و معارف کسی شارح نے بیان کیے ہیں یا نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ ان کا ماخذ یا یادگار غالب ہے یا بجنوری مرحوم کا "محاسن کلام غالب"۔

خط نمبر ۲۱ میں شعر کی تشریح کو چھوڑ کر باقی پورا مضمون جو چودھری عبدالغفور سرور کے نام نوشتہ دو خطوں میں ہے (عود ہندی صفحہ ۱۹۱ و صفحہ ۲۲۲)

آخری دو خطوں میں کچھ تصوف ہے اور کچھ شرح اشعار۔

یہ ہے سرگزشت ان ۲۴ خطوں کی جو جناب رسا صاحب ہمدانی مدظلہ نے نادر خطوط غالب کے عنوان سے مداحین غالب کے سامنے پیش کیے ہیں معلوم نہیں شائع شدہ خطوط کو دوبارہ چھاپ دینے میں کیا مصلحت ہے اور انھوں نے ایسی جرأت کیونکر کی کیا انھیں خیال تھا کہ لوگوں نے اردوئے معلیٰ اور عود ہندی پڑھنا چھوڑ دیا ہے یا یہ دونوں کتابیں دنیا کے صفحہ سے ناپید ہو گئی ہیں کہ کوئی ان کی کارگزاری پر مطلع نہیں ہوگا

ایک اور قرینہ ان خطوں کے جناب مرتب کے دماغ کی پیداوار ہونے پر یہ ہے کہ یہ غالب کے طرز نگارش کی بعض نمایاں خصوصیات سے عاری ہیں مثلاً میرزا کی یہ عام روش ہے کہ جہاں ان کا مکتوب الیہ مسلمان ہے وہاں وہ اکثر عیسوی تاریخ کے ساتھ ہجری تاریخ بھی لکھ دیتے ہیں۔ اردوئے معلیٰ میں مرتبوں کی غلطی سے بہت کم خطوں کے ساتھ تاریخیں شائع ہوئی ہیں ان میں سے بھی اکثر میں دونوں عیسوی اور ہجری تاریخیں موجود ہیں نیز ان کی عام عادت ہے کہ وہ تاریخ کے ساتھ دن کا بھی اظہار کر دیتے ہیں بہت سی حالتوں میں دن کا ذکر ہے ان ۲۴ خطوں میں ایک بھی خط ایسا نہیں جہاں ہجری تاریخ یا دن کا ذکر ہو۔

الغرض میں پورے وثوق کے ساتھ اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ سب خط جعلی ہیں۔ اس سے میرا مطلب یہ نہیں کہ یہ غالب کی تحریریں نہیں بلکہ جیسے کہ میں لکھ چکا ہوں جناب رسا نے کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا بھان متی

فلاکت کو ساری دنیا پر مسلط کر دیا ہو اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیا کی آبادی میں بھی بہت اضافہ ہوا ہو لیکن اگر تمام دنیا کی اجناس، دولت اور خدمات کی تقسیم اور تبادلہ ایک معقول طریقے سے بغیر کسی مصنوعی رکاوٹ کے ہو اور اگر زرعی، نباتی اور صنعتی پیداوار کو زیادہ سے زیادہ استعمال کیا جائے تو دنیا کے باشندے آرام و آسایش سے زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ گزشتہ ایک صدی میں صنعتی سرگرمیوں میں زبردست انقلاب واقع ہوا ہو مشینوں کی تیز رفتاری نے دنیا کی دولت میں بہت اضافہ کر دیا ہو لیکن دولت کی مناسب تقسیم میں کئی رکاوٹیں حایل کر دی گئی ہیں۔ یہ امر واضح رہے کہ معدودے چند ملک اپنی تمام ضروریات کے لیے بالذات کافی ہیں۔ اکثر ممالک ایسے ہیں جنھیں اپنی ضروریات کے لیے دوسرے ممالک کا شرمندۂ احسان رہنا ضروری ہو لیکن قومیت کے جنون نے "اقتصادی کفایت" کی آواز کو دنیا کے تمام ممالک میں عام کر دیا ہو۔ ہر ملک انتہائی کوشش کر رہا ہو کہ اپنی تمام ضروریات زرعی، صنعتی اور معدنی خود مہیا کرے موجودہ جنگ نے اس تحریک کو تقویت پہنچائی ہو بین الاقوامی تجارت کے راستے میں غیر معمولی زاید محصول عاید کیے جاتے ہیں تاکہ درآمد و برآمد کو روکا جائے اس طرح دنیا سے آزاد تجارت کا قریب قریب خاتمہ ہو گیا ہو اس کے علاوہ تمام ذرائع اور اشیائے خام آلات حرب کی تیاری میں صرف کیے جا رہے ہیں تبادلہ کی مشکلات کی وجہ سے اکثر ممالک نے آپس میں ایسے معاہدے کیے ہیں جن سے ان ممالک کی تجارت صرف مختلف اشیا کے تبادلہ کی حد تک رہ گئی ہو دنیا کے موجودہ معاشی نظام کی ان پیچیدگیوں اور مشکلوں میں دنیا کی روز افزوں آبادی کو دیکھ کر دو اہم سوال سامنے آتے ہیں جن کا اطلاق دنیا کے تمام ممالک پر یکساں ہو۔ سب سے پہلے یہ کہ ان اقتصادی مشکلات میں موجودہ معیار زندگی کس طرح قایم رکھا جا سکتا ہو، دوسرے یہ کہ اگر دنیا کی آبادی اسی رفتار سے بڑھتی رہی تو محدود ذرائع اور دولت کے ساتھ موجودہ معیار زندگی برقرار رہ سکے گا؟

ہندوستان کی آبادی کے مسائل کو بھی ہم ان دو سوالات کی روشنی میں دیکھیں گے ہندوستان میں اوسط ماہانہ آمدنی کا اندازہ چار روپے فی شخص کیا گیا ہو اس قلیل آمدنی میں معمولی ضروریات زندگی حاصل نہیں کی جا سکتیں ہمارا معیار زندگی اس قدر گرا ہوا ہو کہ دنیا کے اور ممالک سے اس کا کسی طرح مقابلہ نہیں کیا جا سکتا اس لیے آبادی کے متعلق پہلا سوال ہندوستان کے لیے ذرا تبدیلی کے ساتھ اس طرح کیا جا سکتا ہو کہ کن ذرائع کو

اختیار کرنے سے ہندوستان کا معیار زندگی بلند کیا جاسکتا ہو" ؟

ہندوستان کی آبادی تمام دنیا کی آبادی کے پانچویں حصہ کے برابر ہو یہ دنیا کے اہم ترین صنعتی ممالک میں شمار کیا جاتا ہو حالانکہ ۷۰ فی صدی باشندے زراعت پر بسر اوقات کرتے ہیں بین الاقوامی کاروبار میں ہندوستان کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا دنیا کے معاشی نظام میں ہندوستان اہم حیثیت کا مالک ہو یہاں کے حالات کا مطالعہ اور مستقبل کے متعلق غور و فکر نہ صرف ہندوستان کے لیے ضروری ہو بلکہ تمام دنیا کے لیے بھی اہم ہے

ایک ملک کا معیار زندگی وہاں کے اقتصادی حالات، باشندوں کی صحت و تندرستی اور صلاحیت کا مظہر ہوتا ہو معیار زندگی کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہو کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ جو دنیا کا سب سے زیادہ دولتمند ملک ہو اس کے مفکرین پریشان ہیں کہ وہاں کی بڑھتی ہوئی آبادی کے ساتھ ذرائع آمدنی اور قومی دولت کو کس طرح فروغ دیا جائے کہ معیار زندگی پست نہ ہو جائے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی آبادی ہندوستان کی آبادی کے ایک تہائی سے کم ہو۔ ہندوستان میں چالیس کروڑ نفوس آباد ہیں اور ریاستہائے متحدہ میں تقریباً تیرہ کروڑ لیکن اس کا رقبہ ہندوستان سے تین گنا زیادہ ہو وہاں دولت کی فراوانی ہو چین اور جاپان کی مسلسل جنگ اور یورپ کی موجودہ جنگ سے اس کی مالی حالت اور سونے کے ذخیرہ میں خطرناک حد تک ترقی ہوئی ہو۔ وہاں غیر ممالک کے باشندوں کی آمد اور ان کے شہری حقوق حاصل کرنے پر متعدد پابندیاں ہیں ضبط تولید کے مصنوعی طریقوں کے کثیر استعمال سے وہاں کی آبادی کی رفتار ترقی کم ہو۔ ان حالات کے باوجود ریاستہائے متحدہ کے ارباب حل و عقد ایک ایسا نظام عمل مرتب کرنے کے لیے بے چین ہیں کہ آبادی میں اضافہ کی وجہ سے معیار زندگی پر مضر اثر نہ پڑے ہندوستان کے حالات ریاستہائے متحدہ کے مقابلہ میں حد درجہ مایوس کن ہیں مثلاً ایک ہندوستانی کی اوسط عمر ۲۶ سال ہو اور ریاستہائے متحدہ کے باشندے کا اوسط ۶۲ سال ہمارا معیار زندگی حد درجہ پست ہو اس لیے ہمارے سامنے موجودہ معیار کو برقرار رکھنے کا سوال نہیں ہو بلکہ یہ مسئلہ درپیش ہو کہ کس طرح ہمارے رہنے سہنے کے طریقہ کو مناسب بنایا جاسکتا ہو۔

جب ہم ہندوستان کے حالات پر غور کرتے ہیں تو سوال پیدا ہوتا ہو کہ کیا ہماری آبادی بہت زیادہ نہیں ہو؟ یہ سوال اگر کسی دوسرے ملک میں وہاں کی آبادی کے متعلق کیا جائے تو مختلف مفاد کے نمائندے مختلف جواب

پیش کریں گے مثلاً جاپان، جرمنی اور اٹلی میں قومی طاقت کے بڑھانے کا جنون کارفرما ہے اور وہاں آبادی کو ہر طریقہ سے زیادہ سے زیادہ فروغ دینے کی کوششیں جاری ہیں موجودہ جنگ سے قبل فرانس کی آبادی کی رفتار ترقی بہت کم تھی۔ وہاں کی موجودہ حکومت نے جرمنی سے سبق لے کر وہ تمام تدابیر اختیار کی ہیں جن سے آبادی میں سرعت سے اضافہ ہوگا ریاستہائے متحدہ میں قومی نمائندے آبادی میں اضافہ کے طرفدار ہیں لیکن مزدور طبقہ کے رہنما اس کے مخالف ہیں موجودہ جنگ سے قبل برطانیہ میں بھی یہی حال تھا لیکن اب رائے عامہ چاہتی ہے کہ وہاں کی آبادی تیزی سے بڑھے بالعموم ہر ملک میں سرمایہ دار چاہتے ہیں کہ آبادی میں ترقی ہو تاکہ سستی مزدوری پر زیادہ کام کرنے والے آدمی دستیاب ہوسکیں لیکن مزدور طبقہ کے بہی خواہوں کا خیال ہے کہ آبادی میں غیر معمولی ترقی سے معیار زندگی پست ہو جائے گا اور وہ سرمایہ داروں سے اس معاملہ میں سخت اختلاف رکھتے ہیں ہندوستان کے حالات مذکورہ بالا ممالک سے مختلف ہیں یہاں بڑے کارخانوں میں مزدوروں کی تعداد کا اندازہ صرف پچیس لاکھ کیا جاتا ہے۔ جو آبادی کے لحاظ سے بہت کم ہے ہماری آبادی کا ۹۰ فی صدی حصہ دیہاتوں میں رہتا ہے اور ۷۰ فی صدی سے زیادہ باشندے زراعت پر بسر اوقات کرتے ہیں کسانوں کی اقتصادی حالت مزدوروں سے بھی زیادہ خراب ہے اس لیے صنعت وحرفت کی ترقی کے ساتھ آبادی دیہاتوں سے نقل وطن کر کے شہروں کی طرف رجوع ہو رہی ہے بہرحال ہندوستانی مزدور ہو یا کسان، اس کا معیار زندگی انتہائی پست ہے۔ اس طرح یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ ہماری آبادی ذرائع آمدنی کے لحاظ سے زیادہ ہے اور آبادی کی رفتار ترقی میں تخفیف کی سخت ضرورت ہے مثلاً موجودہ آبادی کے حساب سے ہندوستان میں اوسطاً آمدنی فی شخص تقریباً پچاس روپے ہے اگر آبادی بڑھتی گئی تو لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اس اوسط میں جو یوں بھی بہت ادنیٰ ہے مزید تخفیف ہوگی اس میں کوئی شک نہیں کہ آبادی کے ساتھ ذرائع آمدنی میں بھی ترقی ہوگی لیکن آبادی اور ذرائع آمدنی کی رفتار ترقی متناسب نہیں ہوتی گزشتہ پچاس سال کے اعداد وشمار اس حقیقت کو ثابت کرتے ہیں کہ یہ دونوں ایک تناسب سے نہیں بڑھتے اگر ہماری آبادی اور ذرائع آمدنی کی رفتار وہی رہی جو گزشتہ پچاس سال میں تھی تو کہا جاسکتا ہے کہ معیار زندگی اور زیادہ پست ہو جائے گا اور سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی نظام میں کئی مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔

سب سے پہلے مالتھس نے تقریباً ایک سو پچیس سال قبل یہ نظریہ پیش کیا کہ جب کسی ملک کی آبادی بہت بڑھ جاتی ہے اور ذرائع آمدنی ضروریات زندگی کے کفیل نہیں ہو سکتے تو زائد آبادی جنگ، وبا اور قحط سے دور ہو جاتی ہے گزشتہ ۱۲۵ سال میں یورپ اور امریکہ میں صنعتی تبدیلیاں ہوئیں جن کے اثر سے آبادی میں نمایاں اضافہ ہوا لیکن ساتھ ہی تعلیم کی اشاعت نے آبادی کی رفتار کو کم رکھنے میں بڑا حصہ لیا۔ وہاں مجموعی طور سے آج کل آبادی اس سرعت سے نہیں بڑھ رہی ہے جو چند سال پہلے نمایاں تھی معیار زندگی کو بلند کرنے یا اگر یہ ممکن نہ ہو تو بحالہ قائم رکھنے کی کوشش نے آبادی کی رفتار ترقی پر بندشیں پیدا کیں مثلاً ضبط تولید کے مصنوعی طریقے عام ہوئے اور شادی کی عمر کا اوسط بڑھ گیا مذہبی رہنماؤں کے زبردست احتجاج اور مخالفت کے باوجود مصنوعی طریقوں سے پیدائش کو روکا گیا مغرب کے اثر سے ہندوستان میں کئی اور معاشی تبدیلیاں ہو رہی ہیں لیکن ہماری آبادی جس سرعت سے ترقی کر رہی ہے اس کو دیکھ کر کہہ سکتے ہیں کہ مالتھس کے نظریہ کا اطلاق بڑی حد تک ہندوستان پر ہوتا ہے طاعون ہیضہ، ملیریا، چیچک اور دوسرے امراض جن کا قطعی علاج ہو سکتا ہے ہندوستان کے لیے بے انتہا مہلک ثابت ہوتے ہیں ملک کے کسی نہ کسی گوشے میں وبا کا زور رہتا ہے اور لاکھوں اموات واقع ہوتی ہیں دراصل یہ اموات غیر طبعی ہیں اور ہمارے ہم وطنوں کی جہالت، لاغری اور افلاس کو ظاہر کرتی ہیں ملک میں قحط نہیں ہے اور حکومت کسی ہندوستانی باشندے کو قحط کی وجہ سے موت کا شکار نہیں ہونے دیتی لیکن اقتصادی حالات کو غور سے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک کے طول و عرض میں غربت اور افلاس سے قحط کی ایک مستقل کیفیت طاری ہے یہ حالات گزشتہ ایک صدی سے نمودار ہیں اور واقعات پر سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دن بدن حالات زیادہ خراب ہوتے جا رہے ہیں مثلاً سنہ ۱۸۷۵ء اور سنہ ۱۹۰۰ء کے درمیان پچیس سال میں قحط کی وجہ سے ایک کروڑ تیس لاکھ جانیں تلف ہوئیں سنہ ۱۹۰۱ء اور سنہ ۱۹۲۱ء کے درمیان صرف طاعون سے ایک کروڑ اور ملیریا سے ایک کروڑ اسی لاکھ اموات واقع ہوئیں سنہ ۱۹۱۸ء اور سنہ ۱۹۱۹ء میں انفلوئنزا سے ۵۰ لاکھ انسان ہلاک ہوئے ہندوستان میں اموات کا اوسط ۲۶ فی ہزار ہے ہندوستان پر مالتھس کے نظریہ کے اطلاق کے جواز میں اس سے زیادہ بہتر ثبوت نہیں پیش کیا جا سکتا اس نظریہ کے لحاظ سے ہماری آبادی ذرائع آمدنی کی نسبت زیادہ ہے زائد آبادی کو دور کرنے کے لیے فطری قوتیں رونما ہوتی ہیں اور ہندوستان میں ان کا مظاہرہ گزشتہ ڈیڑھ سو سال سے برابر جاری ہے۔

برطانوی عہد حکومت میں امن وامان کی برکات کا اکثر ذکر کیا جاتا ہے۔ ہندوستان میں صنعت وحرفت بڑھ رہی ہے۔ تجارتی درآمد و برآمد کے اعداد و شمار ظاہر کرتے ہیں کہ دنیا کی اقوام کے ساتھ ہماری تجارت روز افزوں ہے۔ دنیا کی صنعت وحرفت اور تجارت میں ہندوستان کا نام زیادہ سے زیادہ اہم ہوتا جارہا ہے۔ ان ہمت افزا حالات کے باوجود ہماری آبادی غربت وافلاس، قحط اور مختلف امراض سے کم ہورہی ہے۔ ہمارے ذرائع آمدنی پوری آبادی کے کفیل نہیں ہوسکتے کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری آبادی میں غیر معمولی اضافہ ہورہا ہے؟ کیا ہندوستان کی دولت اس کے باشندوں کے لیے ناکافی ہے۔

اگر کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کی آبادی نہایت سرعت کے ساتھ بڑھ رہی ہے اعداد و شمار کے جائزے سے پتہ چلتا ہے کہ ہماری آبادی اوسطاً ہر دس سال میں سات فی صدی بڑھ گئی۔ یہ اوسط دنیا کے اور ممالک سے زیادہ نہیں ہے۔ اگر حالات مناسب اور موافق ہوں تو آبادی کی رفتار ترقی کا دس سالہ اوسط زیادہ دس فی صدی تک بھی تشویشناک نہیں کہا جاسکتا لیکن ہندوستان میں سات فی صدی اوسط کو خطرناک خیال کیا جارہا ہے۔ ہندوستان کی آبادی غیر معمولی سرعت کے ساتھ نہیں بڑھ رہی ہے اور صرف آبادی کا اس رفتار سے بڑھنا خطرہ کا باعث نہیں ہے۔ ہماری آبادی کی رفتار ترقی کو فکر وتشویش کی نظر سے دیکھنے کے کئی اسباب ہیں۔ ان میں سب سے اہم یہ ہے کہ ہندوستان میں دولت کے ذرائع محدود ہیں ہماری قومی آمدنی کا ماہانہ اوسط فی شخص پانچ روپے سے کم ہے۔ یہ واضح کردینا ضروری ہے کہ اس اوسط کو نکالنے میں آبادی کے مختلف طبقات مثلاً کسان اور مزدور رساہوکار اور سرمایہ دار کا خیال نہیں رکھا گیا آپ نے اکثر سنا ہوگا کہ ہندوستان کی زرخیزی کے باوجود اسے دنیا کا غریب ترین ملک کہا جاتا ہے دراصل یہ اوسط آمدنی ہے جس کی وجہ سے ہندوستان دنیا کا غریب ترین ملک کہلاتا ہے۔ اسی اوسط کی بنا پر نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ ہندوستان کی آمدنی کے مقابلہ میں اس کی آبادی بہت زیادہ ہے اور آبادی کی موجودہ رفتار ترقی کو خطرناک خیال کیا جاتا ہے۔ ہماری آبادی اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ اگر اس میں مزید اضافہ ہوا اور موجودہ حالات قائم رہے تو معیار زندگی نہایت پست ہوجائے گا اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ہماری جسمانی اور دماغی صلاحیت اور زیادہ کم ہوجائے گی فی الحال صرف زندہ رہنے اور بسر اوقات کا سامان مشکل سے ہم پہنچتا ہے آبادی میں اضافہ کے ساتھ قحط کا سامنا کرنا پڑیگا کسی ملک کی آبادی کے مسائل کا مطالعہ سب ذیل اقتصادی اصول کی روشنی میں کیا جاسکتا ہے:-

(۱) اقتصادی ترقی کا موجودہ دور۔

(۲) موجودہ ذرائع پیداوار۔

(۳) ملک کی کل پیداوار۔

(۴) جملہ پیداوار اور دولت کی آبادی کے مختلف طبقات میں تقسیم کی نوعیت

(۵) مزدوروں کا آبادی میں تناسب

(۶) مختلف طبقات آبادی کی تعلیمی حالت

(۷) آبادی میں مختلف پیشوں کی تقسیم

ہندوستان میں صنعتی ترقی ہو رہی ہے اور موجودہ جنگ کی وجہ سے صنعت و حرفت کو فروغ حاصل ہوا ہے لیکن ہمارا ملک اس وقت کسی طرح اپنی تمام صنعتی ضروریات پوری کرنے کے قابل نہیں ہے ہندوستان میں اشیائے خام کی کمی نہیں ہے بین الاقوامی تجارت میں ہندوستان کا درجہ اس منڈی کا ہے جہاں سے اشیائے خام حاصل کی جاتی ہیں اور جہاں تیار شدہ مال کی کھپت ہوتی ہے یہاں صنعت و حرفت کو ترقی دینے کے مواقع ہیں اس مختصر مقالہ میں ہم ان تمام مشکلات کا ذکر نہیں کر سکتے جو ہندوستان کی صنعت و حرفت کے راستے میں حائل ہیں لیکن لوہا، سوتی کپڑا، شکر سیمنٹ، ادویات اور صابون سازی کی صنعت کی قابل اطمینان ترقی کو دیکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ مشکلات دور کی جا سکتی ہیں صنعت و حرفت کے لحاظ سے ہندوستان ابتدائی مدارج میں ہے۔ ہندوستان کی ۷۰ فی صدی آبادی زراعت پر بسر اوقات کرتی ہے اور یہ پیشہ اہم ہے لیکن تعلیم سے محرومی، غربت اور قرض، نہروں کی کمی، مانسون پر دارومدار اور زراعت کے جدید طریقوں سے ناواقفیت کی وجہ سے ہندوستانی کسان اپنی زمین سے پورا فائدہ نہیں اٹھا سکتا ہمارے ملک میں وسیع قطعات ارض جن سے فصلیں حاصل کی جا سکتی ہیں بنجر پڑے ہیں دیہات کے [illegible] مویشیوں سے وہ فائدے حاصل نہیں کرتے جو اور ممالک میں حاصل کیے جاتے ہیں۔ ملک کی پیداوار بہت کم ہے اور یہ انتہائی بدنصیبی ہے کہ مستقبل قریب میں کوئی امید نہیں کہ ہندوستانی کسان اپنی زمین اور مویشیوں سے وہ تمام فائدہ حاصل کرے گا جو اس کا حق ہے۔

ہندوستان میں دولت کی تقسیم اس قدر غیر مساوی ہے کہ شاید دنیا کے کسی اور ملک میں نہیں ہے یہاں دنیا کا

سب سے زیادہ دولتمند باشندہ ہے اور وہ بھی جس کا دنیا کی دولت میں کوئی حصہ نہیں یہاں کے زمیندار، ساہوکار، کارخانوں کے مالک سرمایہ دار اور تجارت پیشہ دولت کے بڑے حصہ پر قابض ہیں۔ اگر تمام مزدوروں اور کسانوں کو ایک ساتھ شمار کیا جائے تو تقریباً ۹۰ فی صدی آبادی انتہائی غربت اور فلاکت میں دم توڑ رہی ہے جس مختصر طبقہ کے پاس دولت سمٹ چکی ہے وہ اس بے حسی سے قابض ہے اور آرام و آسائش سے زندگی بسر کر رہا ہے یہاں تعلیمی لحاظ سے حالات اور زیادہ افسوسناک ہیں مثلاً اگر صرف ان بالغوں کا شمار کیا جائے جو لکھنا پڑھنا جانتے ہیں تو پوری آبادی کا دس فی صدی حصہ ایسا ملے گا جو لکھ پڑھ سکتا ہے لیکن یہ ظاہر کرنا ضروری ہے کہ پڑھنے لکھنے والے زیادہ تر اسی طبقہ میں ہیں جن کے پاس دولت ہے کسان اور مزدور تعلیم کی برکات سے قریب قریب محروم ہیں۔

اگر یورپ، امریکہ اور جاپان سے ہندوستان کا مقابلہ مندرجہ بالا اصولوں کے ماتحت کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہندوستان ہر اعتبار سے بہت پیچھے ہے مثلاً ان ممالک نے صنعت و حرفت اور زراعت میں سائنس کی جدید اختراعات کو اختیار کیا ہے اور زیادہ پیداوار حاصل کرکے ملک کی دولت میں کثیر اضافہ کرتے ہیں ہندوستان میں کئی وجوہات کی بناء پر وہی طریقے رائج ہیں جو ایک صدی یا اس سے قبل عام تھے صنعتی کاروبار کو وسیع پیمانہ پر پھیلانے کی ہندوستان میں گنجائش ہے صنعت و حرفت کے ایسے کئی شعبے ہیں جن سے ہمارا ملک محروم ہے اور موجودہ حالات میں آئندہ کئی سال تک ان کے رواج پانے کی امید نہیں کی جا سکتی ہندوستان میں صنعت اور زرعی پیداوار کا اوسط یورپ اور امریکہ کے مقابلہ میں کم ہے اور ظاہر کرتا ہے کہ یہاں کام کرنے والوں کی صلاحیت بڑھائی جا سکتی ہے اور جدید انکشافات کو اختیار کرکے پیداوار میں اضافہ کیا جا سکتا ہے یورپ، امریکہ اور جاپان کی طرح ہندوستان میں بھی ممکن ہے کہ کیمیائی کھاد اور نہروں سے سال میں ایک سے زیادہ فصلیں حاصل کی جائیں اس طرح زراعت پیشہ اپنی آمدنی میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ چونکہ ہماری آبادی کا بہت بڑا حصہ زراعت پر بسر اوقات کرتا ہے ہماری سب سے بڑی صنعت زراعت ہے امریکہ اور یورپ کے حالات ہم سے مختلف ہیں یورپ کے اکثر ممالک صنعت و حرفت میں بہت آگے ہیں اور زرعی پیداوار اس قدر محدود ہے کہ وہاں کے باشندوں کے لیے کافی نہیں ہے یہ ممالک بین الاقوامی تجارت میں صنعتی اشیا باہر بھیجتے ہیں اور اشیائے خام اور غلہ خریدتے ہیں۔ ایسے تمام ممالک کی مالی حالت زراعتی ممالک سے بہتر ہوتی ہے۔ ہندوستان میں صنعت و حرفت کی ترقی کا سب سے بڑا فائدہ یہ

ہوگا۔ غیر ممالک کو وہ تمام دولت نہیں جائے گی جو اس وقت ہر سال ہم دیتے ہیں۔ ہندوستان میں اس کا بھی امکان ہے کہ صحرا اور بیکار زمین سے فصلیں حاصل کرکے زراعت کو مزید توسیع دی جائے۔ ہمارے کسان غربت اور گوناگوں مجبوریوں کی وجہ سے زراعت سے پورا فائدہ نہیں اٹھاتے۔ ہندوستانی کسان سال کا ایک حصہ بیکاری میں صرف کر دیتا ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ مناسب انتظامات کے ماتحت دیہاتی صنعتوں کو فروغ دیا جائے تاکہ کسانوں کو فرصت کے اوقات میں کام مل سکے۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ ہماری آبادی کی کثیر تعداد کا پیشہ زراعت محض برائے نام ہے۔ ان کے پاس نہ زمین ہے نہ مویشی اور نہ انھیں موقع ملتا ہے کہ زراعت کر سکیں۔ یہ آبادی ایک لحاظ سے بیکار کہی جا سکتی ہے اور ہمارے ملک پر بار گراں ہے۔ ان میں وہ اشخاص بھی شامل ہیں جو خاندان میں مشترکہ زندگی گزارتے ہیں۔ ایک ایسے خاندان کے لیے جس کے افراد کی تعداد سال بہ سال بڑھتی جارہی ہو محدود قطعۂ زمین کسی طرح کافی نہیں ہو سکتا۔ ایسے خاندانوں میں تمام افراد کام نہیں کرتے۔ بلکہ ذمہ داریوں سے بری ہونے کی وجہ سے وہ ایک لاابالی طریقۂ زندگی کے عادی ہو جاتے ہیں۔ پورے خاندان کی ملکیت ایک محدود زمین کا ٹکڑا ہوتا ہے۔ ایک مختصر اور محدود اراضی پورے خاندان کے لیے نہ کام مہیا کر سکتا ہے اور نہ اس کا کفیل ہو سکتا ہے۔ بالخصوص ایسی حالت میں کہ خاندان کے اراکین کی تعداد بتدریج بڑھتی جارہی ہو۔ اس غیر ذمہ دار طریقہ زندگی کا نتیجہ یہ ہے کہ آبادی کا تقریباً ۴۰ فی صدی حصہ دراصل کام کرتا ہے اور باقی حصہ کسی نہ کسی طرح بیکاری میں وقت صرف کرتا ہے۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ یورپ میں کام کرنے والوں کی تعداد ۵۵ اور ۶۰ فی صدی کے درمیان ہوتی ہے۔ وہاں مشترکہ خاندان نہیں ہیں اور باشندوں میں وہ غیر ذمہ دارانہ رویہ پیدا نہیں ہوتا جس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ ہندوستان میں تعلیم کے فقدان کی شکایت بارہا کی جا چکی ہے۔ یورپ، امریکہ اور جاپان میں تعلیم قریب قریب تمام طبقات آبادی میں عام ہو چکی ہے۔ مثلاً ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور جاپان میں ۹۵ فی صدی تعلیم یافتہ ہیں۔ برطانیہ اور جرمنی میں سو فی صدی آبادی تعلیم سے مستفید ہوتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں ہندوستان میں تمام جدوجہد کے بعد صرف ۱۰ فی صدی لکھنے پڑھنے سے واقف ہیں۔ تعلیم سے محرومی کا لازمی نتیجہ ـــ سیاسی جمود سے قطع نظر ـــ یہ ہے کہ ہمارے کسان اور مزدور اپنے بنیادی مسائل، زندگی کی پیچیدگیاں، حفظان صحت کے اصول اور احتیاطات سے بے خبر رہتا ہے۔ دوسرے ممالک میں تعلیم کی وجہ سے کسانوں میں نہ صرف سیاسی بیداری

ہو بلکہ وہ اپنے تمام مسائل کو سمجھتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں ہمارے ملک میں مایوسی کی بے حسی اور بے بسی پائی جاتی ہو۔ قدیم روایات، مذہبی پابندیوں اور رواج کی بندشوں میں جکڑے ہوئے ہیں اور اپنے نفع نقصان کو نہیں سمجھ سکتے۔ سیاسی رہنماؤں، اور اصلاحی کام کرنے والوں کو رسم و رواج کے خلاف زبردست جنگ کرنی ہو۔ ہندوستان کے ان تمام ناسازگار حالات کا ایک نتیجہ جس کا تعلق مسئلہ آبادی سے ہے یہ ہو کہ اوسط زندگی ۲۰ سال ہو۔ دنیا کے اور ممالک میں یہ اوسط بہت زیادہ ہو یہ اعداد و شمار ہندوستانی آبادی کی ناقص صحت کو ظاہر کرتے ہیں۔

سلسلہ ۱۹۴۱ء کی مردم شماری کی رپورٹ کے باب چہارم میں حسب ذیل خیالات کا اظہار کیا گیا ہو۔

"گزشتہ دس سال کے عرصہ میں ہماری آبادی میں تین کروڑ چالیس لاکھ کا اضافہ ہوا اس مزید آبادی کے بسر اوقات کا سامان مہیا کرنے کے لیے مزروعہ زمین پر اور زیادہ بار ڈالنا پڑے گا تاکہ گزشتہ نفوس کے ساتھ وہ اس اضافہ کی بھی کفیل ہو سکے ہمارا معیار زندگی یوں ہی بہت پست ہو ہماری زمین پر اس مزید بار کا نتیجہ یہ ہوگا کہ معیار زندگی اور زیادہ پست ہو جائیگا ہندوستان کا کوئی ہمدرد معیار زندگی کی پستی کو بغیر خطرہ کے احساس کے نہیں دیکھ سکتا اس عرصہ میں ہندوستان کی قومی دولت میں کوئی نمایاں اضافہ نہیں ہوا اور نہ مستقبل میں امید ہو کہ ہماری دولت میں (آبادی میں اضافہ کے تناسب سے) ترقی ہوگی معیار زندگی کی پستی کا ایک مایوس کن نتیجہ یہ ہوگا کہ آئندہ آبادی کی رفتار ترقی اور زیادہ بڑھ جائے گی آبادی میں غیر معمولی اضافہ ہوگا اس غیر معمولی اضافہ کی وجہ سے ہندوستانیوں کے ہمت و حوصلہ اور مستعدی و آمادگی میں نمایاں کمی ہوگی سالہا سال سے ہندوستان کے باشندے انتہائی عسرت کی زندگی بسر کر رہے ہیں اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو کہ مایوسی و ناامیدی اور بے بسی و کاہلی اجزائے زندگی بنتے جا رہے ہیں۔ ہم میں سکت باقی نہیں رہی کہ معیار زندگی کو بلند کرنے کی کوشش کریں۔ معیار زندگی کو بلند کرنے کی جد و جہد میں پہلا قدم یہ ہو کہ خاندان کے افراد کی تعداد کو محدود کیا جائے۔"

اس رپورٹ میں ہندوستان کی آبادی اور اس کے مستقبل کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے وہ

حد درجہ حوصلہ شکن ہیں لیکن بہر صورت ہمیں تلخ حقایق اور واقعات کا سامنا کرنا پڑے گا صرف یہ کہہ کر خاموشی نہیں اختیار کی جا سکتی کہ ہم مجبور ہیں۔

کوئی شخص خواہ وہ کتنا ہی رجائیت پسند ہو یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ ہندوستان کی موجودہ دولت اور قومی آمدنی چالیس کروڑ نفوس کی ضروریات زندگی کی تکمیل ہو سکتی ہے۔ اگر یہی حالات قایم رہے اور مستقبل کے خطرات کا ازالہ نہیں کیا گیا تو اور زیادہ مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ مستقبل کے خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمارے سامنے تین راستے ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک یا ایک سے زیادہ راہ عمل اختیار کرنے سے مستقبل کے متعلق دل خوش کن امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں سب سے پہلے یہ کہ ہندوستانیوں کو دنیا کے اور خطوں میں نقل وطن کے لیے تیار کیا جائے کئی ممالک ایسے ہیں جہاں فی مربع میل اوسط آبادی بہت کم ہے اور کافی انسانوں کی گنجایش ہے مثلاً سلطنت برطانیہ میں ایسے علاقے ملتے ہیں جہاں نہ صرف باشندوں کو آباد کرایا جا سکتا ہے بلکہ ان علاقوں کی معدنی اور زرعی دولت کو فروغ دے کر اور اس سے پورا فائدہ اٹھانے کے لیے بھی مزید آبادی کی ضرورت ہے۔ آسٹریلیا اور کینیڈا میں وسیع قطعات ارض غیر آباد ہیں برطانوی افریقہ میں بھی مزید آبادی کی گنجایش ہے ہندوستان کے گنجان شہروں اور اضلاع سے آبادی کو ہٹا کر ان خطوں میں منتقل کیا جا سکتا ہے۔ ہم واقف ہیں کہ آسٹریلیا کے غیر آباد خطوں پر جاپان کی نظریں پڑ رہی ہیں چین کی آبادی بہت گنجان ہے اور چینیوں کے لیے نئی سرزمین کی ضرورت ہے لیکن آسٹریلیا، کینیڈا اور برطانوی افریقہ کی حکومتیں ایشیائی باشندوں کو ان ممالک میں آباد ہونے کی اجازت نہیں دیتیں۔ سلطنت برطانیہ کو مختلف اقوام کی مشترکہ حکومت کہا جاتا ہے۔ اس "مشترکہ حکومت" میں ہندوستانیوں کو آسٹریلیا، کینیڈا اور افریقہ سے نسل کے بنیاد اور رنگ تعصب کی وجہ سے علیحدہ رکھنا حد درجہ ناانصافی ہے بالخصوص اس حالت میں کہ ہندوستان میں غیر ممالک کے باشندوں پر کوئی قید نہیں ہے۔ بظاہر برطانوی حکومت کے وسیع طول و عرض میں ایک ملک کی آبادی کو دوسرے خطوں میں نقل و حرکت میں کوئی رکاوٹ نہیں ہونی چاہیے آبادی کی نقل و حرکت کا مسئلہ دراصل بین الاقوامی حیثیت رکھتا ہے ہندوستان کی طرح ایشیا کے دوسرے ممالک اور بعض قومیں نسلی امتیاز کا شکار ہیں۔ دنیا کے موجودہ نظام میں اور خرابیوں کے ساتھ نسلی امتیاز ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے آج کل مدبرین اور سیاستدان دنیا کے لیے ایک نئے نظام کی تشکیل کی فکر میں سرگرداں ہیں دنیا کا نیا نظام اس وقت تک ناکام اور

غیر مکمل رہے گا جب تک خدا کی وسیع زمین اور اس کی دولت میں تمام انسانوں کے لیے مساوات کا درجہ نہیں ہوگا نقل وحرکت پر مصنوعی پابندیاں دنیا کے پیچیدہ مسائل کو حل کرنے میں مشکلیں پیدا کرتی ہیں اور ان کا دور کرنا نہایت ضروری ہے لیکن موجودہ حالات میں یہ بات ہماری قوت سے باہر ہے کہ ان قیود کو ہٹا سکیں۔ اس لیے ہمارے باشندوں کو ہندوستان سے باہر نوآبادی کا ملنا ناممکن ہے ہندستانی مزدور اور تجارت پیشہ لوگوں کی ایک محدود تعداد سیلون اور برما جاتی تھی لیکن وہاں کی حکومتوں کے رویہ سے آیندہ یہ دشوار ہو جائے گا۔ اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہم نقل وطن کے ذریعہ ہندوستانی آبادی کو اور ممالک میں منتقل نہیں کر سکتے۔

ہمارے معیار زندگی کو بلند کرنے کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ قومی دولت میں اضافہ کی کوشش کی جائے مثلاً آبپاشی، کیمیائی کھاد اور مشینوں کے استعمال سے زراعت کو ترقی دی جا سکتی ہے ہندوستان میں وسیع قطعات ارض بنجر پڑے ہیں جن میں کاشت ہو سکتی ہے لیکن ہندوستانی کسان کی مفلوک الحالی کو دیکھتے ہوئے توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ زراعت میں سائنس کے جدید انکشافات سے فائدہ اٹھائے گا قرض کے مارے دبے ہوئے کسان نہ کیمیائی کھاد خرید سکتے ہیں نہ مشینوں کا استعمال کر سکتے ہیں آبپاشی کا انتظام حکومت کی طرف ہے اور گزشتہ حالات کو دیکھتے ہوئے فی الحال امید نہیں کی جا سکتی کہ حکومت نہروں اور آبپاشی کے دوسرے انتظامات کے لیے خرچ کا انتظام کرے گی۔ بالخصوص اس لیے کہ کسانوں میں سکت نہیں ہے کہ آبپاشی کے مزید محصول کو برداشت کریں مالی مشکلات کی وجہ سے وہ عمدہ بیج حاصل نہیں کر سکتے کہ فصلوں سے بہتر قسم کی اجناس حاصل کریں۔ امداد باہمی کی تحریک سے کسانوں کو فائدہ ہوا ہے اور آہستہ آہستہ اس تحریک کو فروغ دیا جا رہا ہے لیکن اس کی رفتار بہت سست ہے اور نتائج زیادہ حوصلہ افزا نہیں ہیں چند اضلاع میں اس تحریک کو کامیابی ہوئی لیکن بعض علاقوں میں سخت ناکامی ہوئی اور نقصان اٹھانا پڑا ہندوستان میں صنعت وحرفت کے غیر معمولی امکانات ہیں لیکن سرمایہ، ماہرین اور مشینوں کا حاصل کرنا دشوار ہے بیرونی سرمایہ سے صنعتوں کو فروغ دینے سے زیادہ فائدہ نہیں ہو سکتا لیکن صنعتی ترقی کے سلسلے میں دو باتیں قابل غور ہیں سب سے پہلے یہ کہ ہندوستان کی قومی دولت کو صحیح معنوں میں ترقی دینے کے لیے ضروری ہے کہ کسانوں کی مالی حالت کو سدھارا جائے صرف صنعت وحرفت کی ترقی زیادہ مفید ثابت نہیں ہوگی کیونکہ اس میں زیادہ سے زیادہ دس فی صدی آبادی حصہ لے سکے گی اور آبادی کا بڑا حصہ اس ترقی سے

محروم رہے گا دوسرے یہ کہ صنعت و حرفت کی ترقی کے ساتھ آبادی کی رفتار ترقی بہت بڑھ جاتی ہے اس کی بہترین مثال صنعتی ممالک کی تاریخ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صنعتی انقلاب کے بعد وہاں کی آبادی نہایت سرعت سے بڑھی اس لیے صنعت و حرفت میں ترقی ہماری مشکلات کو صرف ایک حد تک دور کر سکتی ہے لیکن اس خطرہ کے ساتھ کہ آبادی زیادہ سرعت سے بڑھے گی۔

ہندوستان کی آبادی کے پیچیدہ اور مشکل مسئلہ کو حل کرنے کی تیسری اور آخری صورت یہ ہے کہ ہر ممکن طریقے سے آبادی کی رفتار ترقی کو کم کیا جائے سنہ ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کی رپورٹ میں آبادی کی تحدید پر بہت زور دیا گیا ہے آبادی کو مصنوعی طریقوں سے روکنے کے خلاف مذہب کے علمبرداروں نے ہمیشہ جہاد کیا ان کا خیال ہے کہ انسانی حیات مشیت ایزدی ہے اور انسان کو کوئی حق نہیں کہ نئی زندگی کو وجود میں آنے سے روکنے کی کوشش کرے اخلاق کا درس دینے والے کہتے ہیں کہ افزائش نسل کو مصنوعی طریقوں سے محدود کرنے کے بعد بداخلاقی اور غیر ذمہ داری کا ایک نیا دور شروع ہوگا جس کو روکنا نہایت دشوار ہوگا اور یہ دنیا کے لیے ایک نئی مصیبت کا پیش خیمہ ہوگا بعض ماہرین طب کا دعوی ہے کہ افزائش نسل کو روکنے کے مصنوعی طریقے صحت کے لیے مضرات ہوتے ان سب کے علاوہ معاشیات کے علما میں ایک گروہ ایسا ہے جس کا خیال ہے کہ دنیا کی دولت لا متناہی ہے اور ہمیں محض اس خیال سے آبادی کو محدود نہیں کرنا چاہیے کہ دنیا کی دولت بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے کافی نہیں ہوگی اس مختصر مقالہ میں ہم اختیاری تناسل کے مسئلہ پر بحث نہیں کر سکتے لیکن یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ آبادی کی رفتار ترقی کو کم کرنے کا یہ واحد طریقہ نہیں ہے تعلیم کے عام ہونے اور معیار زندگی کے بلند ہونے کے بعد پیدائش کی رفتار میں نمایاں کمی ہو جاتی ہے اگر شادی کی اوسط عمر بڑھا دی جائے تو اس کا اثر بھی آبادی پر پڑتا ہے ان سب کے علاوہ ضبط نفس سے بھی بڑی حد تک پیدائش کی رفتار کو کم کیا جا سکتا ہے اور مذہب و اخلاق کا کوئی نام لیوا اس کی مخالفت نہیں کر سکتا۔

بظاہر یہ بات تعجب خیز معلوم ہوتی ہے کہ اس دور میں جب کہ دنیا کی اکثر اقوام اپنی آبادی میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کی کوشش کر رہی ہیں ہم ہندوستان کی آبادی کے اعداد و شمار کو خطرہ کے احساس کے ساتھ دیکھ رہے ہیں اور ان میں تخفیف کی ضرورت ظاہر کر رہے ہیں۔ ہندوستان کے حالات دنیا کے دیگر ممالک

سے بالکل مختلف ہیں۔ یورپ کی اقوام میں ملک گیری کی ہوس اور صنعت و حرفت اور تجارت کو ترقی دینے کے جنون نے فوجی طاقت کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے میں زبردست حصہ لیا ہے۔ فوجوں کو میدان جنگ میں مصروف کار رکھنے کے لیے کارخانوں میں مزدوروں کی ضرورت پڑتی ہے چنانچہ اندازہ کیا گیا ہے کہ میدان جنگ کے ہر سپاہی کے لیے اوسطاً پانچ اشخاص کی ضرورت ہے جو کارخانوں اور شہروں سے سامان حرب، رسد اور دوسری ضروریات فراہم کریں موجودہ جنگ کے بعد بیکاری کا مسئلہ دنیا کا مشکل ترین مسئلہ بن جائے گا اور جو مدبرین اس وقت آبادی میں روز افزوں ترقی کے لیے کوشاں ہیں جنگ کے بعد بیکاری کے سوال کو کسی طرح حل نہیں کر سکیں گے گزشتہ جنگ عظیم (سنہ ۱۹۱۴ء تا سنہ ۱۹۱۸ء) اور اس سے قبل کی جنگوں کے بعد دنیا جن اقتصادی مشکلات میں پڑی ان سے ہمارے دعوی کو پورا ثبوت ملتا ہے لیکن اس وقت جب کہ ہر قوم اپنی عظمت کا دعوی کر رہی ہے جنگ میں فتح اور اس کے بعد ایک بہتر حالت اور مستقبل کے دل خوش کن وعدے پیش کر کے افراد کو بڑی سے بڑی قربانی کے لیے تیار کر رہی ہے تلخ حقائق کی یاددہانی نہ صرف مشکلات میں اضافہ کا مترادف ہوگی بلکہ ایک ناقابل معافی جرم بھی قرار دی جائے گی۔ ہندوستان میں محض اس بنا پر کہ جرمنی، اطالیہ، جاپان اور دوسری اقوام آبادی کو فروغ دے رہی ہیں یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ ہمیں اس کے خلاف آواز بلند نہیں کرنی چاہیے۔

ہندوستان میں آبادی کو محدود کرنے کے بعد جو اہم اور مفید نتائج مرتب ہوں گے ان کا پورا اندازہ لگانا مشکل ہے مختصر طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ معیار زندگی بلند ہو جائے گا تعلیم عام ہوگی، ہندوستان کے باشندوں میں بے سیاسی اقتصادی اور معاشرتی مسائل کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہوگی اور سیاسی بیداری کا ایک نیا دور شروع ہوگا ہندوستانیوں کی صحت میں خوشگوار تبدیلی ہوگی متعدی امراض جسمانی لاغری اور قحط کی موجودہ مستقل صورت میں بدرجہ اتم کمی ہوگی جسمانی اور دماغی نشو و نما پوری طرح ہوگی اور ہماری قابلیت اور صلاحیت میں نمایاں ترقی ہوگی ہندوستان میں مسرت کی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہو جائے گا۔

اختر حسین

مولانا شبلی نعمانی

بحیثیت مورخ اور سوانح نگار

مغربی اسلوب اور تصورات سے اردو ادب کی اصناف میں سوانح نگاری اور تاریخ نویسی نے خصوصیت کے ساتھ بہت زیادہ اثر قبول کیا ہے

ہندوستان میں مغربی تخیل پہنچنے سے قبل سوانح نگاری کا طرز بالکل فارسی اور عربی کے مطابق تھا اردو زبان و ادب فارسی اور عربی کی اصلیت اور ڈھانچے سے ماخوذ ہے اس لیے اس نے قدرتی طور پر تصورات و اشکال و اسالیب بھی انہیں زبانوں سے لیے اور سوانح کی قدیم کتابیں جن کی تعداد کچھ زیادہ نہیں ہے انہیں زبانوں کے طرز اور اسلوب پر لکھی گئیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ عربی لٹریچر تذکرے کی اہم کتابوں سے مالا مال ہے اور ان کی اہمیت صرف مواد اور مواد کے لحاظ ہی سے نہیں ہے بلکہ اسلوب کی دلآویزی اور عمدگی کے نقطہ نظر سے بھی ہے مگر اس کے باوجود موجودہ زمانے کی سوانح عمریوں سے مقابلہ کرنا مضحکہ خیز بات ہوگی ہمیں اس کے تسلیم کرنے میں تامل نہیں کہ قدیم سوانح عمریوں میں سچائی اور صداقت کا بہت خیال رکھا جاتا تھا مگر آہستہ آہستہ اس کی اہمیت جاتی رہی اور اب اصلیت، آزادی اور سچائی کی جگہ رسمیت اور تصنع نے رواج پالیا ہے محدثین کے تذکروں میں خاص طور پر سچائی اور صداقت کو پیش نظر رکھا جاتا تھا لیکن بدقسمتی سے ایسی کتابیں اردو اور فارسی مصنفین کے قلم سے بہت کم ہیں اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ آج کل سوانح عمری کا جو مفہوم سمجھا جاتا ہے اس لحاظ سے اردو لٹریچر غدر انقلاب سے پہلے بالکل خالی تھا اور مغرب کے اثرات جن کے لانے میں سرسید کا بڑا ہاتھ تھا اس کو وجود میں لایا یہ واقعہ ہے کہ صرف مشرق ہی میں نہیں بلکہ مغرب میں بھی موجودہ سوانح نگاری اٹھارویں صدی کے وجود میں آئی سر ایڈمنڈ گاس کا قول ہے کہ "زندگی کے مختلف واقعات کی سچی تصویر کا نام سوانح حیات ہے" چنانچہ بعد میں سچی زندگی اور صحیح واقعات پر زیادہ زور دیا جانے لگا چنانچہ مسٹر ہیرالڈ نکلس کا قول ہے کہ "تمام

جذبات میں مذہبی غلو صحیح اور سچی سوانح حیات کے لیے سم قاتل ہے۔

موجودہ دور میں سوانح نگاری نے طریقۂ ترقی کر لی ہو لسیات کو ترجیح دی جاتی ہے اور انسان کی شخصیت اور اس کی انفرادیت سے دلچسپی بڑھتی جاتی ہی اور اس نے لٹن اسٹریچی کے غیر معمولی اثر سے ترقی کر کے سائنس کی شکل اختیار کر لی ہو۔

اردو کے اولین سوانح نگار مولانا حالی اور مولانا شبلی گو انگریزی سے اچھی طرح واقف نہیں تھے لیکن ان تبدیلیوں اور ترقیوں سے بے خبر بھی نہیں تھے اس میں شک نہیں کہ ان دونوں سوانح نگاروں سے پہلے جنھیں ہم اولین سوانح نگار کہا ہو سرسید نے آنحضرت صلعم کی سیرت پر ایک مختصر کتاب لکھی تھی جس میں مغرب کے فن سوانح نگاری کو پوری طرح برتا تھا لیکن یہ واقعہ ہو کہ سرسید سوانح نگار نہیں تھے اور نہ انھوں نے کبھی سوانح نگار ہونے کا دعویٰ کیا

حیات سعدی کے دیباچہ سے معلوم ہوتا ہو کہ مولانا حالی بھی سوانح نگاری کے جدید تصور سے واقف تھے چنانچہ انھوں نے لکھا ہو کہ

زمانہ حال میں یورپ کے مورخوں نے خاص کر سترہویں صدی سے بیوگرفی کو انتہا ترقی دی ہو۔ یہاں تک کہ تاریخ کی طرح بیوگرفی نے بھی فلسفہ کی شکل اختیار کر لی ہو حال کی بیوگرفی میں اکثر مورخانہ تدقیق کی جاتی ہو اور واقعات سے منطقی طور پر نتائج استخراج کیے جاتے ہیں مصنف کے کلام پر غور کیا جاتا ہو اور اس کے عیب اور خوبیاں صاف طور پر ظاہر کی جاتی ہیں اکثر ایک ایک شخص کی لائف کئی کئی ضخیم جلدوں میں لکھی جاتی ہو۔

گر چونکہ شبلی نے مغرب کے اثرات حالی سے زیادہ قبول کیے اس لیے ان کی سوانح نگاریاں نسبتاً زیادہ مکمل اور عمدہ ہیں شبلی سے قبل تاریخ کی کتابیں تحقیق سے بالکل کوری اور فن کے نقطۂ نظر سے بالکل ناقص تھیں۔ ان میں جدید ذوق اور رجحان کا بالکل خیال نہیں کیا گیا تھا اور وہ اتنی خشک تھیں کہ کوئی پڑھنے کی ہمت نہ کرے یا ان میں دلچسپی کا سامان اس قدر پیدا کر دیا گیا تھا کہ وہ تاریخ کے پایہ سے گر گئیں۔ مولانا شبلی نے ان تمام خرابیوں

کو، ورکیسا اور تحقیق اور صحت کے لحاظ سے ایک معیار قایم کر دیا اسی کے ساتھ لطافت و دلچسپی کو اس طرح نبھایا کہ عوام و خواص کسی کو بھی شکایت نہ رہی اور زبان تو بقول سر سید رشک دلی و لکھنؤ تھی۔"

شبلی کے متعلق اردو کے ایک لایق ادیب اور فاضل نقاد کی رائے ملاحظہ ہو:

"اردو لٹریچر کے پیدا کرنے والے تھوڑے ہیں ان میں بھی تھوڑے ہی ایسے ہیں جو آج کل کے وسیع معیار قابلیت کے لحاظ سے اہل قلم کی صف اول میں شامل ہونے کے لایق ہوں سرسید سے قطع نظر کرنے کے بعد جن کو استحقاق اولیت کا فخر حاصل ہو میرا خیال ہو شبلی بلحاظ فن صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ تمام اسلامی دنیا میں کسی سے دوسرے درجہ پر نہیں ہیں اس کو میری قاصر النظری یا علمی فرومایگی پر نہ محمول کیجیے۔ فلسفہ تاریخ جو آج کل تمام علوم میں سربستہ ہو ایک مستقل فن ہو گیا ہو اور اس قدر اہم ہو کہ دنیا کے بڑے بڑے فاضل مورخانہ موشگافیوں کو بہترین مشغلہ ہستی سمجھتے ہیں مصری اور ترکی لٹریچر میں تاریخی مذاق جس حد تک موجود ہو میں اس سے بیگانہ نہیں ہوں مجھ کو معلوم ہو کہ دونوں زبانیں خاص کر اولی الذکر اس قدر معربیت سے مانوس ہو گئی ہو کہ وہاں کے روشن خیال علما مغربی طرز تحریر کی خصوصیات کے ساتھ عربی اور ترکی زبانوں میں نہایت شائستگی سے داد سخن دے رہے ہیں لیکن جن مضامین پر ان کے ہاں منقولانہ اور معقولانہ سرگرمی سے طبع آزمائیاں ہو رہی ہیں وہ شبلی کے ان فرسودہ اور مسایل ابتدائی ہیں جس کو فاضل مورخ کی سرسری جنبش قلم مدت ہوئی ایک سے زیادہ موقعوں پر طے کر چکی ہو۔ ملک کے لیے یہ کچھ کم فخر کی بات نہیں کہ مصر کے مشہور رسالہ 'الہلال' کے نامور ایڈیٹر علامہ جرجی زیدان اپنی تاریخ تمدن اسلام میں جو متعدد جلدوں میں ختم ہوئی، علامہ شبلی کی تحقیقات سے بے نیاز نہ رہ سکا اور اس نے سنداً اقتباس کیے۔

بہرحال ہم میں اب شبلی ایسا شخص ہو جو لحاظ جامعیت اور وسیع النظری مورخانہ تدقیق اور مذاق فن کی حیثیت سے آج یورپ کے بڑے سے بڑے مورخ کے پہلو بہ پہلو ہو سکتا ہو۔"[۱]

---

[۱] افادات مہدی صفحہ ۱۰

کارلائل کا مشہور فقرہ ہے کہ "تاریخ عالم صرف اس کے بڑے بڑے اشخاص کی تاریخ کا نام ہے" غالباً شبلی کے سامنے یہی فقرہ تھا چنانچہ انھوں نے سب سے پہلے "ہیروز آف اسلام" یعنی مشاہیر اسلام پر قلم اٹھایا اس سلسلے میں سب سے پہلی کتاب "المامون" شائع ہوئی اس کے دو حصے ہیں پہلے حصہ میں ترتیب خلافت، مامون الرشید کی تعلیم و تربیت، ولیعہدی، تخت نشینی، خانہ جنگیاں، فتوحات ملکی اور وفات تک عام حالات ہیں اور دوسرے حصہ میں ان مراتب کی تفصیل ہے جس سے اس عہد کے ملکی حالات اور مامون الرشید کے اخلاق و عادات پر روشنی پڑتی ہے یہاں تمام کارناموں کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے جن کی وجہ سے مامون الرشید کا عہد عموماً شاہان عالم کے عہد سے علمی حیثیت سے ممتاز کیا گیا ہے شروع میں سرسید کے قلم سے ایک مختصر سا دیباچہ بھی ہے جس میں شبلی کے طرز تحریر کی بڑی تعریف کی گئی ہے اور کتاب کی خوبیوں کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے جس میں موصوف نے اجمال کے ساتھ شبلی کی تاریخ نگاری پر بھی روشنی ڈالی ہے وہ لکھتے ہیں

> پہلے حصہ میں مصنف (شبلی) نے تاریخانہ واقعات لکھے ہیں اور نہایت خوبی اور اختصار سے دکھایا ہے کہ خلافت کا سلسلہ کیونکر اور کیوں خاندان بنی امیہ کو برباد کرکے عباسی خاندان میں پہنچا اور کیا اسباب جمع ہوئے جس سے امین اس کا بھائی محروم اور مقتول اور خود مامون الرشید تمام مملکت اسلامی کا مالک الملک لاشریک لہ بن گیا"
>
> جابجا واقعات دلچسپ سے بھی اس حصہ کو آراستہ کیا ہے جس کے سبب یہ سوکھا پھیکا تاریخانہ حصہ دلچسپ ہو گیا ہے۔ دوسرے حصہ میں انتظام سلطنت آمدنی مملکت، فوجی انتظام و عدالت اور اس کی جزئیات کو جہاں جہاں سے ملیں چن چن کر ایک جگہ جمع کیا ہے اور مامون کی فضیلت اور اس کی سوشل حالت، اس کی پرائیوٹ زندگی اس کے متعلوں اور اس کی مجلسوں کا ذکر کیا ہے اور اس زمانہ کی زندگی اور طرز معاشرت کا نقشہ کھینچ دیا ہے یہ حصہ نہایت ہی دلچسپ ہے شان اور عظمت و جلال خلافت کے ساتھ ایسی ایسی سادہ اور بے تکلف باتوں سے بھرا ہوا ہے کہ اس سے اُس کو اور اُس سے اِس کو رونق ہوتی ہے
>
> اس حصہ میں لطائف و ظرائف کے ساتھ علمی اور خصوصاً علم و ادب کے ایسے ایسے نکتے مذکور

ہیں جو ادیب کے لیے سرمایۂ ادب اور ظریف کے لیے سرمایۂ ظرافت ہیں۔
یہ کتاب اردو زبان میں لکھی گئی ہے اور ایسی صاف و شستہ اور برجستہ عبارت ہے کہ دلی والوں کو رشک آتا ہوگا۔

اردو زبان نے بہت کچھ ترقی کی ہے مگر اس بات کا بہت کم لحاظ رکھا گیا ہے کہ ہر فن کے لیے زبان و طرز بیان جداگانہ ہے تاریخ کی کتابوں میں ناول (قصہ) اور ناول میں تاریخانہ طرز گو کیسی ہی فصاحت اور بلاغت سے برتا گیا ہو دونوں کو برباد کرتا ہے ... ...

... ... ہمارے لائق مصنف نے اس کا بہت کچھ خیال رکھا ہے اور باوجود تاریخانہ مضمون ہونے کے ایسی خوبی سے اس کو ادا کیا ہے کہ عبارت بھی فصیح اور دلچسپ ہے اور تاریخانہ اصلیت بدستور اپنی اصلی صورت پر موجود ہے۔ جو خوبصورت ہے خوبصورت ہے اور جو بھونڈی ہے بھونڈی ہے۔ خوبصورتی کو زیادہ خوبصورت بنایا ہے نہ بھونڈے پنے کو زیادہ بھونڈا اور دراصل یہی کمال تاریخ نویسی کا ہے۔"

سر سید نے آخری پیرے میں جو خصوصیت بیان کی ہے وہ محض المامون کی خصوصیت نہیں ہے بلکہ شبلی کی تمام تاریخی تالیفات میں یہ خصوصیت بہت نمایاں اور ممتاز ہے اور یہی خصوصیت جس کی وجہ سے شبلی کو ان کے معاصرین پر امتیاز اور فضیلت حاصل ہے۔

اس کے بعد سیرۃ النعمان شائع ہوئی اس کی تالیف کی وجہ خود مصنف کے الفاظ میں یہ ہے "امام ابو حنیفہ کے اجتہادی مسائل قریباً بارہ سو برس سے تمام ممالک اسلامیہ میں پھیلے ہوئے ہیں بڑی بڑی عظیم الشان سلطنتوں میں ان ہی کے مسائل قانون سلطنت تھے اور آج بھی ہیں اسلامی دنیا کا غالب حصہ ان ہی کے مسائل کا پیرو ہے عربی، فارسی، ترکی بلکہ یورپ کی زبانوں میں ان کی متعدد سوانح عمریاں لکھی گئی ہیں ظلم تھا کہ ان کے حالات زندگی خود اردو میں نہ لکھے جاتے جو بلحاظ غالب ان ہی کے پیرو کی زبان ہے۔"

یہ کتاب بھی دو حصوں پر مشتمل ہے پہلے حصہ کے شروع میں ایک تمہید ہے اس کے بعد قدما کی ان کتابوں کی فہرست ہے جو امام ابو حنیفہ کے حالات کے متعلق لکھی گئی ہیں پھر امام کی ولادت اور نسب، تابعیت کی تحقیق اور

لامریہ علیہ امام کا سن رشد اور تعلیم ان کے شیوخ حدیث کی تفصیل اور مختصر تراجم تعلیم اور افتاء، تقیہ زندگی اور شادی تعلقات، وفات اور ان کی اولاد کی تفصیل ان کے اخلاق و عادات، طرز معاشرت اور عام حالات، ان کے مناظرات اور مباحثے، علمی مجلسیں، ان کی شہرت اور ہم عمروں کی ان کی نسبت رائیں دوسرے حصہ میں صرف ان کے علوم و ترتیب و فقہ و طریقۂ اجتہاد کی تفصیل ہے اور آخیر میں ان کے مشہور شاگردوں کا مختصر تذکرہ بھی ہے۔

پہلے حصہ میں ظاہر ہے مولف کو کچھ بہت زیادہ زحمت پیش نہیں آئی ہوگی امام صاحب کے حالات پر ہر زبان میں جیسا کہ خود مولف نے دیباچہ میں لکھا ہے بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں صرف مطالعہ اور تحقیق کی ضرورت تھی اور معلوم ہے کہ یہ جنس شبلی کے بازار میں بہت ارزاں ہے دوسرے حصہ کی تالیف و ترتیب میں مولف کو زیادہ محنت کرنی پڑی ہوگی کیونکہ ان مسائل سے جو دوسرے حصہ میں بیان ہوئے ہیں قدیم کتابیں یکسر خالی ہیں یہاں مولف کو "خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ" کی مثال پیش کرنی پڑی ہوگی اور حقیقت میں یہ مولانا کی کوششوں اور محنتوں کا خود ان کے الفاظ میں "تماشاگاہ" ہے۔

جس زمانہ میں مولانا کو "ہیروز آف اسلام" کا خیال پیدا ہوا تھا اسی زمانہ میں یہ خیال بھی آیا تھا کہ ہمارے ملک میں جس قدر تاریخی سرمایہ موجود ہے وہ اس مقصد کے لیے کسی طرح کافی نہیں ہو سکتا اس لیے مصر و روم کے سفر کرنے کا ارادہ کیا حالات جوں ہی مساعد ہوئے مولانا سفر پر روانہ ہوگئے واپسی پر ایک کتاب مرتب کی جس میں سفر کی عام اجمالی حالت، تاریخی اور مشہور جگہوں اور عمارتوں، سررشتۂ تعلیم، مدارس اور بورڈنگ کی زندگی، طریق تعلیم و تربیت، تعلیم نسواں، مصنفین، کتب خانے، اخبارات و رسائل اور ترکوں اور عربوں کے اخلاق و عادات پر تفصیل سے بحث کی ہے تمہید میں مولف نے بتلایا ہے کہ "اس کتاب کو پڑھ کر ناظرین کے دل میں ترکوں کی تہذیب و شائستگی کا جو درجہ قائم ہوگا وہ اس سے مختلف ہوگا جو یورپ کے عام لٹریچر سے قائم ہوتا ہے" اس کے بعد فاضل مولف نے یورپین مصنفین اور مستشرقین کے عام تعصب کا ذکر کیا ہے اور اس سرمایہ کی غلطیوں کے اسباب لکھے ہیں جو یورپ کی تاریخی تحقیقات کا سرمایہ ہیں اور جن کی بنیاد پر یورپین مورخین کی تصنیفات کی عمارت کھڑی کرتے ہیں۔

اس کتاب کی ترتیب و تالیف کے بعد مولانا نے الفاروق کی تالیف کی طرف توجہ کی جس کے لیے مصر و روم اور شام کا سفر کیا تھا اور جو نہ صرف مولانا کی تصانیف میں گل سرسبد کی حیثیت رکھتی ہے بلکہ اردو زبان کے لیے سرمایہ فخر و ناز ہے

یہ کہنا غالباً مبالغہ نہ ہوگا کہ اگر مولانا الفاروق کے علاوہ ایک کتاب بھی بلکہ میں تو یہ کہہ سکتا ہوں کہ ایک مضمون بھی نہ لکھتے جب بھی انھیں ہندوستان کے مورخوں اور محققوں میں سب سے نمایاں اور ممتاز جگہ ملتی یوں تو مجموعی حیثیت سے کتاب تحقیق و زبان کے لحاظ سے بے نظیر ہے لیکن دوسرا حصہ خصوصیت کے ساتھ مولانا کے گہرے مطالعہ اور ان کے غیر معمولی دل و دماغ کا آئینہ دار ہے مولانا نے ان مسائل پر بحث و گفتگو کی ہے جو آج کل کے مسائل سمجھے جاتے ہیں اور جنھیں مولانا کے معاصرین میں سے کسی نے بھی چھیڑنے کی جرأت نہیں کی مسلمانوں نے ایک عرصہ تک معمورۂ ارض کے ایک بڑے حصہ پر نہایت شاندار حکومت کی ہے ان کا طریق حکومت اور ان کا معاشی نظام اور اقتصادی نظام اس قدر کامیاب رہ چکا ہے کہ موجودہ ترقی و تمدن کے زمانہ اور جدید مشکلات میں بہت کچھ رہبری کر سکتا ہے لیکن یہ حقیقت کس قدر افسوسناک ہے کہ اس دور کی ابھی تک کوئی مکمل تاریخ نہیں لکھی گئی ہمیں یقین ہے کہ آیندہ جب کبھی بھی لکھی جائے گی تو مرتب الفاروق سے امداد لیے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا الفاروق کے متعلق ملک کے ایک ممتاز اہل قلم کی رائے ملاحظہ ہو۔

یہ عمروں کی کمائی ہے بڑی کاوش اور اہتمام سے سالہا سال کی موجانہ تلاش اور تحقیق کے بعد نامورانِ اسلام کے سلسلہ میں خلیفہ دوم (حضرت عمرؓ) کی لائف پر یہ ضخیم تالیف تیار کی گئی ہے مورخ نے محض تحقیق واقعات کے لیے ممالک غیر یعنی ٹرکی اور مصر وغیرہ کے مصائب سفر برداشت کیے سیکڑوں قدیم اور نایاب تاریخوں کے ہزاروں ورق الٹنے پڑے اور جہاں تک دسترس تھا اصل ماخذ کی چھان بین میں یورپ کا تاریخی سرمایہ بھی بچنے نہیں پایا۔

جس معلومات کا جو ذخیرہ جمع کیا گیا ہے وہ میرے خیال میں تاریخ فاروقی کے ہمات مسائل ہیں جن کی نسبت یہ عام دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ کسی زبان میں اس قدر مواد یکجا نہیں مل سکتا۔

جو مولانا شبلی کو اس کتاب پر بڑا ناز تھا مصر کے ایک مشہور مورخ رفیق بک العظیم نے "اشہر مشاہیر الاسلام" کا سلسلہ مولانا

کے ہیروز آف اسلام کی طرح شروع کیا تھا اس سلسلہ میں حضرت عمر فاروق اعظم کی سیرت شائع ہوئی اس کے متعلق مولانا اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں "آج کل مصر میں سیرت فاروق لکھی گئی بڑا اہتمام کیا گیا ہے مشہور مصنف نے لکھا ہے لیکن دیکھا تو الفاروق کے عشر عشیر بھی نہ تھی" مولانا الفاروق کو اپنی تمام تصانیف میں سب سے زیادہ پسند فرماتے تھے، چنانچہ انھوں نے ایڈیٹر رسالہ زمانہ کانپور کے سوال کے جواب میں انہیں لکھا تھا "میں اپنی تصانیف میں الفاروق کو سب سے زیادہ پسند کرتا ہوں" کتاب کی انہی خوبیوں کی وجہ سے فارسی، ترکی اور انگریزی زبانوں میں اس کے ترجمے کیے گئے ہیں اور غالباً عربی میں بھی۔

اس سلسلہ کی مولانا کی آخری تالیف سیرۃ النبی ہے۔ یوں تو دنیا کی ہر زبان میں آنحضرت صلعم کے حالات اور ان کی تعلیمات پر کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن اس عظیم الشان تالیف کی مثال نہ تو عربی میں مل سکتی ہے جو اس ملک کی زبان ہے جہاں آنحضرت صلعم پیدا ہوئے اور نہ دنیا کی کسی اور ترقی یافتہ سے ترقی یافتہ زبان میں۔

یہ واقعہ ہے کہ مستشرقین یورپ ہمارے خالص مذہبی علوم و فنون کا مطالعہ اور اس کی ریسرچ کرتے ہیں اور پھر ان پر جس کثرت سے کتابیں لکھتے ہیں اس کی مثال عربی، فارسی اور اردو زبانوں میں سے کوئی زبان بھی پیش نہیں کر سکتی لیکن اسی کے ساتھ یہ واقعہ بھی ہے کہ معلوم نہیں اس عناد اور دشمنی کی بنا پر جو انہیں اسلام اور مسلمانوں سے ہے یا ناواقفیت اور عربی علوم و فنون پر پوری دسترس نہ رکھنے کی بنا پر ان کی تحقیقات بے شمار فاش غلطیوں سے پُر ہوتی ہیں عموماً واقعات بھی غلط نقل کرتے ہیں صحیح اور موضوع روایات میں فرق نہیں کر پاتے اور استنتاج تو بلا مبالغہ ۹۹ فی صدی غلط ہوتے ہیں اور "ظلمات فوقہا فوق بعض" کا جامہ ٹھیک ٹھیک ان کی تحقیقات پر فٹ آتا ہے خصوصاً آنحضرت صلعم کی سیرت کو مستشرقین یورپ نے جس طرح پیش کیا ہے وہ مسلمانوں کے لیے ہمیشہ تکلیف دہ رہا ہے۔ اس لیے ضرورت تھی کہ آنحضرت صلعم کے نورانی چہرہ سے اس بدنما پردہ کو ہٹایا جائے اور آپ کی صحیح سیرت اور صحیح شکل دنیا کے سامنے پیش کی جائے۔ شبلی کو اس ضرورت کا پورا پورا احساس تھا چنانچہ انھوں نے عمر کا آخری حصہ اسی ضرورت کی تکمیل کے لیے وقف کر دیا۔ انھوں نے ایک ایسی سیرت کی تالیف کا قصد و ارادہ کیا جس میں صحیح نقل اور صحیح عقل کے ذریعہ مستشرقین یورپ کے اعتراضات کا ابطال کیا جائے۔ ان کی غلطیوں کو واضح کیا جائے اور آنحضرت صلعم کی سیرت و تعلیمات کو اصلی شکل میں پیش کیا جائے مگر ظاہر ہے یہ کام تھا مشکل

عربی کی وہ تمام کتابیں جو یا تو اس موضوع پر تصنیف کی گئی تھیں یا دوسری زبانوں سے ترجمہ کی گئی تھیں شبلی کے پاس علم میں تھیں لیکن انگریزی جرمنی اور فرانسیسی کتابوں پر عبور حاصل کرنا مشکل تھا کیونکہ شبلی ان زبانوں سے نا واقف تھے مگر تھے دھن کے پکے جس چیز کا ارادہ کر لیتے اسے پورا کر کے چھوڑتے اور مکمل بھی اس طرح کرتے کہ تحقیق اور تفتیش کا کوئی گوشہ تشنہ نہ رہتا پھر سیرت کے متعلق تو ظاہر ہے کہ تلاش و جستجو اور تحقیق و تفتیش کے جتنے ممکن طریقے تھے انہیں اختیار کرتے محض اسی وجہ سے نہیں کہ یہ ان کی آخری تصنیف تھی بلکہ اس وجہ سے بھی کہ کتاب اس کی متقضی تھی چنانچہ انھوں نے انگریزی، فرانسیسی اور جرمن زبانوں کی ان کتابوں کی ایک فہرست تیار کی جو آنحضرت کی سیرت پر لکھی گئی تھیں اور ان کے ضروری حصوں کے ترجمے کرائے جہاں مفید مطلب بات ملی اسے لے لیا اور جہاں غلطیاں نظر آئیں ان کے مدلل جواب لکھے انھوں نے اس سلسلے میں جو طریقہ اختیار کیا اسے ذیل کے خط سے بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔

"سیرت نبوی جو زیر طبع ہے میں چاہتا ہوں کہ یورپ کے مصنفین نے جو کچھ آنحضرت کے متعلق لکھا ہے اس سے پوری واقفیت حاصل کی جائے تاکہ ان کے تائیدی بیان حسب موقع حجت اسلامی کے طور پر پیش کیے جائیں اور جہاں انھوں نے غلطیاں اور بد دیانتیاں کی ہیں نہایت زور و قوت کے ساتھ اس کی پردہ دری کی جائے۔

اس بنا پر انگریزی کی کثرت سے تصنیفات مہیا کی گئی ہیں جو آنحضرت کے متعلق تصنیف ہو چکی ہیں لیکن ان سب کا اردو میں ترجمہ کرنا ناممکن ہے اس لیے یہ رائے قرار پائی ہے کہ جن صاحبوں کو اس سے ذوق ہو ان کے پاس ایک کتاب بھیج دی جائے وہ مطالعہ فرما کر قابل ترجمہ مقامات پر نشانات کرتے جائیں اور پھر کتاب واپس بھیج دیں تاکہ دفتر کے مترجمین سے ترجمہ کرایا جائے۔"

گو مولانا اس کتاب کو اپنی حیات میں مکمل نہ کر سکے لیکن اس کے لیے اتنا مواد اور مکمل خاکہ تیار کر دیا تھا کہ ان کے بعد بھی یہ کام اسی خوبی اور حسن کے ساتھ جاری رہ سکا۔

مولانا کی یہ کتاب محض تحقیق و تفحص کے لحاظ ہی سے اہمیت نہیں رکھتی بلکہ زبان کے لحاظ سے بھی ان کا شاہکار ہے خود مولانا کو اس پر بڑا فخر تھا ایک قطعہ میں تو یہاں تک فرما دیا ہے کہ اسے اگر کوئی لکھ سکتا تھا تو ہمیں لکھ سکتے تھے فرماتے ہیں

فرشتوں میں یہ چرچا ہے کہ حال سرور عالم ۔۔۔ دبیر چرخ لکھتا یا کہ خود روح الامیں لکھتے
صدا یہ بارگاہِ عالم قدوس سے آئی ۔۔۔ کہ "یہ ہے اور ہی کچھ چیز لکھتے تو ہمیں لکھتے"

حالی نے مسدس لکھ کر ایک طرف اپنے لیے اردو دنیا میں ابدی جگہ حاصل کرلی تو دوسری طرف آخرت میں نجات کا سامان کرلیا۔ شبلی نے سیرت النبی کی تالیف کا آغاز کرکے ایک طرف تو یورپ کے مورخین و محققین کی صف اول میں اپنے کو لا کھڑا کیا تو دوسری طرف اپنی تصنیفی زندگی کا خاتمہ ایک مبارک موضوع پر کیا خود فرماتے ہیں

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی ۔۔۔ مجھے چندے مقیم آستانِ غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرۃ پیغمبر خاتم ۔۔۔ خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

ان تاریخی کتابوں کے علاوہ جن کا ذکر اوپر ہوا ہے مولانا کے بہت سے تاریخی مضامین بھی ہیں جو ان کے کارناموں میں شامل کیے جا سکتے ہیں یہ مضامین گو مختصر ہیں اور تصنیف کی حیثیت نہیں رکھتے مگر تحقیق و تفحص اور تلاش و جستجو کے لحاظ سے ان کی حیثیت کسی مستقل تصنیف سے کم نہیں ہے۔

مولانا کے چند مضامین کا مجموعہ ان کی حیات ہی میں رسائل شبلی کے نام سے شائع ہو چکا تھا ان مضامین کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ جرجی زیدان جیسے مشہور اہل قلم نے بھی ان سے استفادہ کیا جیسا کہ مولانا سید سلیمان ندوی کی ذیل کی تحریر ملاحظہ ہو۔

"مصر کے عیسائی مورخ جرجی زیدان نے تمدن اسلامی کے نام سے چار پانچ جلدوں میں اسلامی تمدن کی تاریخ لکھی ہے اس کی تیسری جلد علوم و فنون کی تاریخ پر ہے بدگمانی نہیں کرتا مگر معلوم ہوتا ہے کہ یہی رسائل اس کے سامنے تھے اور انہیں کو دیکھ کر اسی رنگ سے واقعات کے حوالوں کی مدد سے جو رسائل کے حاشیوں پر لکھے ہوئے تھے اس نے یہ مرقع تیار کیا تھا"

انھیں مضامین میں ایک مضمون کتب خانہ اسکندریہ پر بھی ہے منجملہ ان افسوس ناک غلطیوں کے جو یورپ میں اسلامی تاریخ کے متعلق کسی زمانہ میں پیدا ہو گئی تھیں اور اب تک قائم ہیں ایک کتب خانہ اسکندریہ کے جلائے جانے کا بھی واقعہ ہے۔ اس واقعہ کو یورپ نے جس صدا آہنگی سے مشہور کیا ہے حقیقت میں وہ نہایت تعجب انگیز ہے۔ تاریخیں، ناولیں، حکایتیں، مثلیں، افسانے، قصہ طلب حوالے، روزمرہ کے محاورے ایک چیز بھی اس صدائے عام

نہیں ادب اور لٹریچر کا کیا ذکر ہے منطق، فلسفہ بھی اس کے اثر سے محروم نہ رہے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود
علما ء کو اس کی صحت کا یقین ہو چلا تھا مگر مولانا شبلی پہلے شخص ہیں جنھوں نے مسلمانوں پر سے اس الزام کو
دور کیا۔ اس مضمون میں مولانا کی تحقیق و تلاش پوری طرح نمایاں اور ممتاز ہے عربی کی کتابیں تو مولانا کے ہاتھ علم
میں تھیں ہی لیکن اس مضمون میں انگریزی، فرانسیسی اور جرمن کتابوں سے اس کثرت سے استفادہ کیا گیا ہے کہ
اس کی مثال اردو کی کوئی تصنیف پیش کرنے سے قاصر ہے۔

مولانا کے متعلق مولوی عبدالحق صاحب جس قسم کی رائے رکھتے ہیں اس سے ہر پڑھا لکھا شخص واقف ہے
بلکہ اس مضمون کے متعلق ان کی رائے ملاحظہ ہو۔

طالب علمی کے زمانے میں جب میں انگریزی تاریخوں اور دوسری کتابوں میں یورپین مورخوں
کا یہ الزام پڑھتا تھا کہ مسلمانوں نے حضرت عمرؓ کے حکم سے اسکندریہ کے بے نظیر کتب خانے
کو جلا کر خاک کر دیا تھا تو بعید رنج اور صدمہ ہوتا تھا لیکن جب شمس العلما مولانا شبلی نے ایک محققانہ
رسالہ لکھ کر محکم دلایل اور پر زور شہادتوں سے اس کی تردید کی تو اس بے نظیر رسالے کو پڑھ کر
پوری تسکین ہو گئی اور یقین ہو گیا کہ یہ محض فسانہ اور یورپین مورخوں کا مسلمانوں پر افترا اور بہتان ہے۔"

مولانا کا ایک اور مضمون ان کی تحقیق و تفتیش اور ان کی تنقیدی قوت کے لحاظ سے نہ صرف مولانا کے مضامین میں
بلکہ اردو زبان میں شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے جرجی زیدان کی کتاب تمدن اسلام کا ابھی ذکر آ چکا ہے اس میں
مصنف نے در پردہ مسلمانوں پر نہایت سخت اور متعصبانہ حملے کیے ہیں لیکن بظاہر مسلمانوں کی مدح سرائی کی ہے
جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کی نظر اس کی فریب کاریوں پر نہیں پڑی اور کتاب گھر گھر پھیل گئی مگر مولانا شبلی عقاب کی
سی نظر رکھتے تھے ان سے کیوں کر بچ سکتی تھی انھوں نے ان تمام اعتراضات کی جو مسلمانوں پر علانیہ یا خفیہ طور
پر کیے گئے تھے نہایت مدلل تردید کی اور مصنف کی فریب کاریوں اور خیانتوں کو آشکارا کیا یہ رسالہ پہلے عربی
میں تھا مگر اردو جاننے والوں کی واقفیت کے لیے خود ہی اردو میں ترجمہ کیا مگر اردو میں مختصر اور خود مصنف کے
الفاظ میں "طرز تحریر بھی معمولی ہے"

عبداللطیف اعظمی

بہاری ست سئی

آج ہم چاہتے ہیں کہ اردو پبلک کو ایک ہندی شاعر سے روشناس کرائیں ہمیں قوی امید ہے کہ وہ اس نئے تعارف سے خوش ہوں گے ممکن ہے بعض لوگوں کے لیے یہ تعارف نیا نہ ہو مگر ہمیں یقین ہے کہ زیادہ تر احباب کے لیے یہ کچھ نیا ہی ہوگا۔

جس شاعر کا ہم ذکر کیا چاہتے ہیں وہ ہے ہندی کا غالب بہاری لعل، وہی باریک بینی وہی نکتہ سنجی، وہی مشکل پسندی اور معنی آفرینی وہی شوخی، وہی سادگی، وہی متانت اور اس کے ساتھ ساتھ وہی انداز بیان فرق صرف یہ ہے کہ ایک نے اردو میں غزلیں اور اشعار کہے دوسرے نے بھاشا میں دوہوں سے اپنا مطلب بیان کیا غالب نے تغزل میں نئی روح پھونک دی بہاری نے شرنگار رس میں اچھوتے مضامین بیان کیے کہ بھاشا کی شاعری کو چار چاند لگ گئے۔

مگر پہلے شرنگار رس کے متعلق کچھ بتا دینا ضروری ہے جس طرح اردو میں لفظ تغزل سے فوراً ہم نفس شعر کو سمجھ جاتے ہیں ہماری نگاہوں کے سامنے اس ایک لفظ کی برکت سے رنج فرقت، شوق وصال یا لطیف چھیڑ چھاڑ، معاملہ بندی، معشوقانہ شگفتگی عاشقانہ نیاز مختصر یہ کہ حسن و عشق کے واردات قلبی کی ایک جیتی جاگتی دنیا آباد ہو جاتی ہے اسی طرح شرنگار کا لفظ جدائی کے صدموں، ساون اور بسنت میں پردیسی پیا کی یاد چاندنی راتوں کا دہکتا ہوا درد، دل کی تڑپ جسم کی مایوس پکار یا ساجن کے ملنے پر روح کی تازگی، عضو عضو میں ایک پھریری تمنائے ہم آغوشی کا جوش، ساز جذبات کا شیریں ارتعاش بس یوں سمجھیے کہ رنج و ملال، یاس و امید، سرور و انبساط کی ایک ایسی دلفریب رنگ بھومی تیار کر دیتا ہے کہ دل و دماغ مست ہو کر رہ جاتے ہیں۔

شرنگار رس کی دو بڑی قسمیں ہیں بیوگ شرنگار اور سنجوگ شرنگار۔ بیوگ شرنگار میں حزن و ملال کے ان جذبات کا اظہار ہوتا ہے جو ہجر یا فرقت میں پیدا ہوتے ہیں سنجوگ شرنگار مسرت کے ان جذبات سے بھرا ہوتا ہے جب بچھڑے ہوئے پریمی آپس میں مل جاتے ہیں ایک اور نکتہ اسی سلسلہ میں عرض کر دینا ضروری ہے اور وہ یہ کہ

ہندی یا بھاشا کی شاعری میں جذبات عشق کا اظہار اردو شاعری سے ذرا سا مختلف ہے اردو شاعری میں اظہار عشق یا تو مرد کی طرف سے عورت کے لیے ہوتا ہے یا کبھی کبھی مرد کی طرف سے حسین لڑکے کے لیے ہندی شاعری میں زیادہ تر عورت عاشق ہوتی ہے اور اظہار عشق اس کی طرف سے مرد کے لیے ہوتا ہے یہ ظاہر ہے کہ عورت مرد سے زیادہ لطیف جذبات کی حامل ہوتی ہے یہ نہیں کہ مرد کے دل میں درد نہ ہوتا ہو مگر وہ عورت کے دل کے ... اظہار کو نہیں پہنچ سکتا مثال کے لیے ایک دوہا لیجیے۔

کاگا سب تن کھائیو چن چن کھیو ماس　　　　دو نیناں مت کھائیو پیا ملن کی آس

ایک قسمت نصیب اپنے ساجن کا انتظار کرتے کرتے زندگی سے مایوس ہو چلی ہے اسے یقین ہو گیا ہے کہ اب عمر زیادہ وفا نہ کرے گی مگر آنکھیں ہیں کہ تشنگیٔ دیدار کی حسرت بھری کہانی دہرا رہی ہیں۔ امید ہے کہ بار بار جھٹ جانے پر بھی بڑھ کے دامن تھام لیتی ہے آخر کار وہ سمجھ لیتی ہے کہ وہ زندہ نہ رہ سکے گی مگر مرنے کے بعد بھی اسے یقین ہے کہ آرزوئے دید اس کی آنکھوں سے نہ جائے گی کوّے اس کے جسم کو نوچ نوچ کے کھائیں گے کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی آنکھوں کو بھی کھا جائیں پھر کیسے وہ اپنے ساجن کو دیکھ سکے گی۔ لہٰذا اس کی التجا ہے کہ سب کچھ کھا لینا مگر اے کاگا.. دو نیناں مت کھائیو پیا ملن کی آس یہی دو آنکھیں پیا سے ملنے کی امیدیں ہیں مرد نہ تو اس انداز سے عورت کا انتظار کر سکتا ہے نہ کبھی اس کے جذبات میں سوز و درد اور صبر و تحمل کی ایسی لطیف آمیزش پائی جا سکتی ہے اس مثال سے صرف یہ بتانا مقصود تھا کہ بھاشا کی شاعری چونکہ جذبات عشق کے اظہار میں عورت کے دل کی ترجمانی کرتی ہے لہٰذا سوز و گداز اس میں اردو کی شاعری سے کچھ زیادہ ہی پایا جاتا ہے

اس مختصر سی تمہید کے بعد اب ہم آپ کا تعارف بہاری سے کرائے دیتے ہیں بہاری لعل ذات کے ماتھر چوبے تھے گوالیار کے قریب بسوا گوبند پور گاؤں میں سمبت ١٦٦٠ بکرمی مطابق سنہ ١٦٠٣ء میں پیدا ہوئے تھے ان کا بچپن بندیلکھنڈ کی خوشنما پہاڑی فضا میں گزرا جوانی کے مبتدی دن جے پور میں اور بڑھاپا انھوں نے اپنی سسرال متھرا میں گزارا۔ جوانی کے آغاز ہی میں ان کا تعلق جے پور دربار سے ہو گیا تھا۔ وہاں اس وقت مرزا راجہ مہاراج جے سنگھ حکمراں تھے کہا جاتا ہے جس وقت بہاری لعل جے پور پہنچے مہاراجہ اپنی چھوٹی رانی

کے عشق میں کچھ ایسے کھوئے ہوئے تھے کہ ریاست کے کاموں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتے تھے، سارا وقت محلوں میں گزارتے تھے ریاست کو اس سے کافی نقصان پہنچ رہا تھا چنانچہ سرداروں نے صلاح کی کہ کچھ کرنا چاہیے اتفاق سے ایک شاعر بھی ان کی مدد کو حاضر تھا بہاری نے صرف ایک دوہا لکھ کر ان کو دیا اور سرداروں نے کسی طرح اس دوہے کو زنانے محلوں میں مہاراجہ کے پاس پہنچا دیا اس دوہے نے بالکل وہی اثر کیا جو زوقؔ کی مشہور غزل نے کیا تھا۔

مہاراج نے جوں ہی اس دوہے کو پڑھا محل سے نکل آئے اور اسی دن سے ریاست کے کاموں میں سرگرمی سے حصہ لینے لگے دوہا یہ تھا۔

نہیں پراگ نہیں مدھر مدھو نہیں وکاس یہی کال   الی کلی ہی میں بندھیو آگے کون حوال

یعنی ابھی کلی چٹکی تک نہیں، نہ اس میں خوشبو ہے نہ میٹھا رس مگر بھونرا ہے کہ اسی پر متوالا ہو رہا ہے آگے چل کر جب کلی کھل کر پھول بنے گی اور خوشبو اور رس کی دولت سے مالا مال ہوگی اس وقت خدا جانے بھونرے کا کیا حال ہوگا

ابھی سے عشق میں بیٹھے ہیں سر کو پھوڑ کے ہم   ابھی تو ان پہ جوانی کی آب و تاب نہیں

اس واقعہ کے بعد بہاری کی قدر و منزلت اور بڑھ گئی مہاراج نے انہیں اس قسم کے دوہے سنانے کا حکم دیا بہاری دوہے لکھ لکھ کر سنانے لگے ہر دوہے پر انہیں ایک اشرفی بطور انعام ملتی تھی۔ اس طرح کل سات سو دوہے ہے جو مجموعے کی شکل میں "بہاری ست سئی" کے نام سے مشہور ہوئے۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ بہاری کی زندگی کے مفصل حالات نہیں ملتے۔ آج سے تین سو برس پہلے بہت کم سوانح حیات لکھی جاتی تھیں اس لیے سوائے اس کے کہ کچھ شارحین نے ان کے دوہوں کی شرحیں لکھیں اور کوئی بات ہمیں ان کے بارے میں معلوم نہیں ہو سکتی۔ دوہوں سے کہیں کہیں کچھ حالات کا پتہ چلتا ہے مثلاً ایک دوہے میں انھوں نے بیان کیا ہے کہ ان کے بڑھاپے کے دن سسرال میں اچھی طرح نہیں کٹے۔

بہاری کی شاعری میں عصمت کا سوز و گداز ہے ان کے تمام دوہے جذبۂ درد سے جو شاعری کی روح ہے لبریز ہیں حسن و عشق کے مختلف پہلوؤں اور اس کی باریکیوں پر جتنے پہلوؤں سے انھوں نے نظر کی ہے آج کسی دوسرے ہندی کے شاعر نے شاید ہی کی ہو ان کے کلام میں جذبات نگاری اور وسعت تخیل کے ساتھ ساتھ ندرت خیالات

اردو فارسی بیاں کی خوبیاں بکثرت پائی جاتی ہیں، جہاں کہیں حسن وعشق کی چاشنی کے ساتھ ظرافت اور شوخی کا چٹخارہ بھی موجود ہے ایسا بھلا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تعریف ہی نہیں ہو سکتی بہاری کی شاعری کیا ہے مصوری ہے انھوں نے اکثر مناظر قدرت اور جذبات انسانی کی تصویریں کھینچ دی ہیں اس لیے ان کی شاعری میں کبھی کبھی مصوری کا لطف آجاتا ہے۔

بہاری کے کلام میں غیر فصیح الفاظ تلاش کرنے پر بھی نہیں ملتے الفاظ کی ل آوری ترکیب، عبارت آرائی زبان کی سلاست اور شیرینی ان کے کلام کے خاص جوہر ہیں درحقیقت برج بھاشا میں سورداس اور تلسی داس کو چھوڑ کر اتنا شیریں زبان اور فصیح بیاں شاعر پیدا نہیں ہوا۔

بہاری کے دوہے بے تکلفی، زندہ دلی، سادگی، روانی اور ایسی فضائیں پیدا کرنے میں جو معنویت سے تھرتھرا رہی ہوں، اپنا جواب نہیں رکھتے کہیں ادب لطیف کی روح اور رنگینی ہے کہیں شباب کی پہلی ہنسی کہ کہیں کہیں حقیقت کی جھلک اور کہیں نازک احساسات کا ظہور کہیں نرم رو ہواؤں کی تازگی و شیرینی اور اچھوتا پن ہے۔

زیادہ تر بہاری نے اپنے دوہوں میں گاؤں کی زندگی کی عکاسی کی ہے اور اسی کی وجہ یہ ہے کہ وہ دیہاتیوں کے دکھ درد میں برابر کے شریک رہے تھے دیہات کی خوبصورتی کا نقشہ کھینچتے ہوئے اکثر وہ دیہات کی فضا میں کھو سے جاتے تھے ان کے نزدیک گاؤں جوتیوں اور دلچسپیوں سے پُر ہے گا۔ ان کی طفلی کی یاد اور ان کے عالم شباب کا سنہرا خواب ہے حسن کی فضا محبت کے رنگ میں رنگی نظر آتی ہے جہاں نشۂ جوانی میں مخمور تندرست اور حسین عورتیں اپنے پریتم کے عشق میں متوالی ہیں اور جھوم جھوم کر گا رہی ہیں پریتم پاس ہیں تو ان کے ہے خوشی سے لبریز ہیں اور اگر پریتم پردیس چلے گئے تو ان کے گیت بلا کے دردانگیز ہو جاتے ہیں۔

اب ہم بہاری کے کلام سے چند مثالیں پیش کرتے ہیں جن سے ان کے سوز و گداز، دیوگ اور سنجوگ شرنگار مصوری، نازک خیالی اور معنی آفرینی، طنز، اخلاق اور پند و نصائح کا کچھ رنگ ظاہر ہو اور اردو داں سخن شناس بھی ان کے کلام کی داد دے سکیں۔

سوز و گداز:-

جوں ہی بودی بر لیں کے لور وسٹ گاؤں — کنا جان بے کہت ہیں سبھی سینگر ناؤں

گاؤں کی کھلی ہوئی فضا ہے چاند اپنی کامل رعنائیوں سے جگمگا رہا ہے چاروں طرف چاندنی چھٹکی ہوئی ہے ایک فرقت نصیب دوشیزہ ہے کہ اس کے دل میں درد و غم کا دریا موجیں لے رہا ہے اور یہ چاندنی تو اس کے دل میں اور آگ لگائے دے رہی ہے گاؤں والے سب خوش نظر آتے ہیں اور چاندنی کی تعریفیں کر رہے ہیں ان کے لیے اس چاندنی میں کتنا سکون کتنی ٹھنڈک ہے اور اس دوشیزہ کے لیے یہ تپتی آگ دہکتی ہے یا تو جدائی کے صدمے کی وجہ سے میں پاگل ہو رہی ہوں یا سارا گاؤں پاگل ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ لوگ چاند کو ٹھنڈک پہنچانے والا کیوں کہہ رہے ہیں میرے دل میں تو یہ اور آگ بھڑکا رہا ہے ایک اردو کے شاعر نے ایک رباعی میں اس دوہے کا ترجمہ کیا ہے جو یہ ہے۔

چاندنی درد کو بڑھاتی ہے   آگ فرقت کی یہ لگاتی ہے
میں ہوں پاگل کہ وہ جو کہتے ہیں   اس سے دنیا سکون پاتی ہے

ان دکھیاں اکھیاں کو سکھ سرجیو ناہیں   دیکھت بنے نہ دیکھتے بن دیکھے اکولاہیں

آنکھوں کا سکھ اسی میں ہے کہ اپنے پریتم کے جی بھر کے درشن کریں ایک عورت اپنی سکھی سے کہہ رہی ہے کہ میری سکھی، آنکھوں کی قسمت میں آرام و سکون ہے ہی نہیں کیونکہ جب وہ ہوتے ہیں تو شرم کچھ ایسی دامنگیر ہوتی ہے کہ میں انھیں تک دیکھ پاتی ہر چند چاہتی ہوں کہ میں ان کو دیکھوں مگر حیا مانع ہوتی ہے اور نگاہیں نہیں اٹھتیں جب وہ چلے جاتے ہیں تو آنکھیں ان کے دیدار کے لیے بے چین ہو جاتی ہیں۔ مختصر یہ کہ یوں دیکھا نہیں جاتا اور بغیر دیکھے چین نہیں آتا معلوم ہوتا ہے کہ آنکھوں کی قسمت میں ہی سکون و آرام نہیں ہے۔

بیوگ شرنگار رس۔ غالب کا بہت مشہور شعر ہے

ان کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق   وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے۔

بالکل اسی خیال کو بہاری نے بھی ایک دوہے میں ادا کیا ہے۔

جو واکی تن کی دسشا دیکھیو چاہت آپ   تو بلی نیکو بلو کے لیے چلی اچکاں چپ چاپ

عاشق کے دل پر جدائی میں جو کچھ گزرتی ہے معشوق کے سامنے آتے ہی بیتابی و اضطراب کی تمام کیفیات اس کے چہرے سے مٹ جاتی ہیں بیمار چہرہ میں روح بہار کی شگفتگی دوڑ جاتی ہے اور معشوق اس کی حالت کا صحیح اندازہ

نہیں کر سکتا وہ سمجھتا ہے کہ عاشق مزے میں ہے خوش ہے اب یہ کیونکر اس سے کہا جائے کہ یہ عارضی مسرت کی جھلک محض اس کے روبرو ہونے کا کرشمہ ہے اور کیسے اس پر عاشق کی وہ حالت ظاہر کی جائے جو اس کی عدم موجودگی میں ہوتی ہے۔ ہندی شاعر نے یہی بتانے کی کوشش کی ہے یہ تو میں نے شروع ہی میں عرض کر دیا ہے کہ ہندی شاعری میں بیشتر عورت عاشق ہوتی ہے چنانچہ اس دوہے میں بھی عورت ہی عاشق ہے وہ ہجر کے صدمے برداشت کر رہی ہے اور اس کی حالت ناگفتہ بہ ہے اس کا پریتم آتا ہے اور اس کی سکھی سے دریافت کرتا ہے کہ اس کا کیا حال ہے وہ جواب دیتی ہے یوں تو آپ کو اس کی صحیح حالت کا اندازہ کبھی نہ ہو سکے گا جب آپ سامنے جائیں گے اس کا چہرہ فرط انبساط سے کھل اٹھے گا اور آپ اس کے جسم کی مایوس پکار نہ سن سکیں گے ہاں طریقہ صرف ایک ہے اور میں آپ کی بلائیں لیتی ہوں کہ آپ چپ چاپ چلیں اور چھپ کر خاموشی سے اس کی حالت دیکھیں تب آپ کو کچھ اندازہ ہو سکے گا غالب کے شعر میں عاشق کی پریشانی یہ ہے کہ معشوق پر اس کا حال ظاہر نہیں ہو پاتا۔ یہاں عاشق (عورت) ہجر سے بیمار ہے۔ حالت اس کی اتنی نازک ہے کہ اس کی سکھی کو رحم آتا ہے اور بلائیں لے کے مرد سے درخواست کرتی ہے کہ آپ چھپ کر اس کی حالت دیکھ لیں کہ جدائی میں اس غریب کا کیا حال ہوتا ہے۔

دِس دِس کُسُمت دیکھیے اِہِن ہِیں سا ح   مَنو مَوگَس کو کیو یہ پِجَر رِتی   راح

بسنت رُت ہے فضائے عام میں ہر طرف بہار ہی بہار ہے۔ پھول کھل رہے ہیں کلیاں چٹک رہی ہیں سرسوں پھولی ہے آم بور سے لدے ہوئے ہیں کائنات پر رنگ و بو کا ستہ سا چھایا ہوا ہے انسانوں پر بھی سرخوشی کا عالم ہے مگر ایک فرقت نصیب کے لیے یہ ہنگامۂ کیف و نشاط کوئی معنی نہیں رکھتا یہی نہیں بلکہ اس کے دل میں درد کی شدت اور بڑھ جاتی ہے یہ تمام پھول اور ہرے ہرے پات اسے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کام دیو کے تیر ہیں ان تیروں سے کام دیو نے اس بیوگن کے لیے ایک پنجرا تیار کر دیا ہے بہار جوش شباب، دلوں کے دیوتے کام دیو کی شرارتیں اور ہجر کی حالت میں فرقت کا غم۔

بھری بہار کے دن ہیں خیال آ ہی گیا   اُجڑ نہ جاتا تو پھولوں میں آشیاں ہوتا

سنجوگ شرنگار:۔

دمیں گو ڑے مین یہ گہیں نہ جیت اَجیت   میں کس کے رہیں کر دل یہ نر کھے منس دیتا

عورت چاہتی ہو کہ اپنے ساجن کے آنے پر بے اختیار اظہار مسرت نہ کرے لگا کچھ خودداری کچھ مان قائم رکھے پر یہ کہ دیرتک انتظار کرنے کے بعد جب وہ آئے تو ادھر سے کچھ اظہار ناراضگی بھی ہو وہ سوچتی ہو کہ خوب کھنچی رہوں گی ترش رو ہو کے بات کروں گی۔ غرض یہ کہ طرح طرح کے منصوبے ہیں مگر یہ آنکھیں کہ بحت اس کے قابو میں نہیں جہاں ساجن آنکھوں کے سامنے آئے یہ مسکرا دیں اور خودداری اور اظہار ناراضگی کے وہ تمام حوصلے دم بھر میں مٹ کر رہ گئے لہذا کہتی ہو کہ یہ آنکھیں جل جائیں تو اچھا کیونکہ میں تو چاہتی ہوں کہ کچھ غصہ کروں مگر یہ نہیں مانتیں اور بے قابو ہو کر ہنس دیتی ہیں اور میرے جی کی جی ہی میں رہ جاتی ہو۔

یا اس سے زیادہ لطیف پیرایہ میں قریب قریب اسی مضمون کو یوں بیان کیا ہو۔

موہیں لجاوت مج۔ نیکس ملت سب گات بھانوار دے کی اوس لوں مان نہ جایہو جات

یعنی کیا بتاؤں جب وہ آتے ہیں تو میں چاہتی ہوں کہ کچھ مان کروں مگر میرے تمام اعضائے جسم میرے کہنے میں نہیں رہتے کان ان کی باتیں سننے کے لیے بیتاب ہو جاتے ہیں آنکھیں انہیں جی بھر کے دیکھنے کے لیے بے قرار باہیں ان کے گلے کا ہار بننے کے لیے پھڑک اٹھتی ہیں غرضیکہ میرے تمام اعضا مجھے شرمندہ کراتے ہیں اور مری خودداری یا مان اس طرح سا ہو جاتا ہو جیسے کہ طلوع صبح سے قطرۂ شبنم۔ یہاں تشبیہ کی دلکشی اور موزونیت دیکھنے کے قابل ہو اپنے مان کو قطرۂ شبنم اور پریتم کے آنے کو طلوع صبح سے تشبیہ دی ہو کیا اس سے لطیف تشبیہ دماغ میں آسکتی ہو؟

مصوری:۔ مصوری میں بہاری کا آرٹ اس مصور کا سا ہو جس کو ایک بڑے قرطاس پر تصویر بنانی ہوتی ہو کہیں سے ایک پوراستہ دکھانا ہو کہیں ایک دلکش منظر قدرت کی عکاسی کرنی ہو اس کے پاس اتنا وقت نہیں کہ تمام جزئیات کو نمایاں کرے مصور کامل ہو ایک تصویر کے بنانے میں اپنے برش کو وہ صرف چھ سات مرتبہ حرکت دیتا ہو اور تصویر اپنی تمام جزئیوں کے ساتھ مکمل نظر آتی ہو بہاری الفاظ سے مصوری کرتا ہو چنانچہ کہیں کہیں صرف آدھے درجن لفظ ایک مکمل تصویر ہمارے سامنے پیش کر دیتے ہیں ملاحظہ ہو۔

کہت، نٹت، ریجھت، کھجت، ملت، کھلت لجیات بھرے بھون میں کرت ہیں نینن ہی سوں بات

بھرا گھر ہو بات کرنے کا موقع نہیں مگر محبت بھرے دل ہیں کہ بے چین ہیں کہ کچھ کہا ضرور جائے۔ قدم

قدم پر بھرے گھر کی اسا نی کا می خیال ہو ما آخر آنکھیں دل کی ترجمان بنتی ہیں سب کی نظریں بچا کر عاشق آنکھوں ہی آنکھوں میں عورت سے کچھ درخواست کرتا ہی عورت بھی صرف آنکھوں کے اشارے سے انکار کر دیتی ہی اس انکار کی ادا عاشق کو بہت بھلی معلوم ہوتی ہی اور عورت کو شرمندہ ہونا پڑتا ہی پھر نگاہیں ملتی ہیں ہنستی ہیں اور شرم سے جھک جاتی ہیں چہرہ گلنار ہو جاتا ہی اس طرح بھرے گھر میں بھی آنکھوں آنکھوں میں بات ہو لیتی ہی یہاں شاعر نے ایک پورا سین نگاہوں کے سامنے پیش کر دیا ہی اور محض چند الفاظ میں یہ واقعی کمال مصوری ہی۔

یا ایک دوسری جگہ۔

سن پگ دھنی جینی اتے نہات دیٹھی بیٹھ ۔۔۔ چکی جھکی سکوچی، ڈری ہنسی لجیلی دیٹھ

ایک عورت تالاب پر نہا رہی ہی کہ یکایک اپنے پریتم کے قدم کی چاپ سنتی ہی اس کے خیالات میں ایک عجیب تلاطم سا ہو جاتا ہی اسے اس بات کی تو خوشی ہوتی ہی کہ وہ اپنے پریتم کے درشن کرے گی مگر اپنی حالت پر غور کر کے وہ چونک اٹھتی ہی ادھر اشتیاق دید اسے مجبور کرتا ہی کہ وہ مڑ کر پریتم کی طرف دیکھ لے ایسا کرتے ہی فوراً سے اپنی بے حجابی کا احساس ہوتا ہی وہ جھک جاتی ہی شرما جاتی ہی اور اپنے جسم کو سکوڑتی ہی مگر جذبۂ مسرت اسے ہنسائے بغیر نہیں چھوڑتا ایسی حالت میں بھی چنانچہ نہ جانے کیا سوچ کر کچھ بے باک سی ہو کر وہ ہنس دیتی ہی شاعر نے یہاں صرف سات لفظوں سے (چکی جھکی، سکوچی ڈری ہنسی لجیلی دیٹھ) ایک واقعہ کی مکمل تصویر کھینچ دی ہی جس میں کیفیات مادی کی مصوری کے ساتھ ساتھ کیفیات ذہنیہ کی مصوری بھی شامل ہی۔

نازک خیالی۔

مانھو بدھوتن اچھہ چھبی سوچھہ راکھیے کاج ۔۔۔ درگ پگ پونچھن کو کیے بھوشن پایںداج

یہاں بہاری نے عورت کے حسن کی تعریف میں بڑی لطیف بات کہی ہی۔ اس کا حسن اتنا نازک اور صاف ستھرا ہی کہ پائے نگاہ سے اس پر گرد آ جانے کا احتمال ہی اس لیے شاید صانع قدرت نے اس کے جسم پر زیوروں کا پاانداز بنا دیا ہی کہ نگاہ پہلے زیوروں پر پیر صاف کر لے تب اس کے حسن کے فرش شفاف پر قدم رکھے صفائی حسن کا یہ عالم ہی کہ نگاہ سے میلی ہو جاتی ہی اور زیور اس لیے نہیں ہیں کہ حسن نکھر جائے بلکہ پائے نگاہ کی گرد پونچھنے کے لیے ہیں پائے نگاہ (درگ پگ) غالب نے بھی استعمال کیا ہی اکثر بہاری نے اردو اور

فارسی کے لفظ نہایت بے تکلفی سے استعمال کیے ہیں آخری لفظ "پا انداز" فارسی ترکیب ہے۔ اسی طرح ایک اور دوہے میں میں بہاری نے نازک خیالی کا کمال دکھایا ہے شبیہ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

لکھن بیٹھ جا کی سبیہ گہہ گہہ گرب گرور
بھئے نہ کیتے جگت کے چتر چتیرے کور

اس کی تصویر بنانے کے لیے دنیا کے بہت سے قابل مصور آئے اور کمال فن کے غرور میں اس کی تصویر بنانے کے دعوے پیش کیے اور کوششیں بھی کیں مگر سب کو بیوقوف بننا پڑا کیونکہ اس حسن دلفریب کی صحیح تصویر وہ نہ بنا سکے انھوں نے تصویر بنائی اور بنانے کے بعد جب اسے دیکھا تو فوراً محسوس کیا کہ تصویر اس کی ہیں اس کے حسن کی دلکشی نہیں زیادہ ہے انھوں نے پھر کوشش کی مگر ہر مرتبہ دلکشی حسن زیادہ ہی ہوتی جاتی تھی اور ان کو آخر کار منہ کی کھانی پڑی۔ تصویر وہ کیا بناتے!

کاگد پر لکھت بنت کہت سندیس لجات
کہیئے سب تیرو ہیو میرے ہیے کی بات

ایک عورت اپنے پریتم کے پاس پیغام بھیج رہی ہے کہ جو کچھ دل میں ہے اسے کاغذ پر لکھ نہیں سکتی کہنا چاہتی ہوں تو حیا مانع آتی ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ کیونکر سندیس بھیجوں یہی سمجھ میں آتا ہے کہ تم خود اپنے دل سے پوچھ لینا کہ میرا کیا پیغام ہے تمہارا دل میرے دل کے تمام راز میری سب آرزوئیں میرا سارا پیغام مختصر یہ کہ میرے دل کا سب حال تمہارا دل تمھیں بتلا دے گا یہی میرا سندیسہ ہے۔

معنی آفرینی :-

درگ ارجھت، ٹوٹت کٹم، جرت چتر چت پریت
پرت گانٹھ درجن ہیئے دئی نئی یہ ریت

قاعدہ یہ ہے کہ جو چیز الجھتی ہے اسی کو ٹوٹنا چاہیئے اسی کو جڑنا چاہیے اور اسی میں گانٹھ پڑنی چاہیے مگر محبت کے آداب اور آئین نرالے ہیں آنکھیں ملتی ہیں اور نگاہیں ایک دوسرے سے الجھ جاتی ہیں اس کا نتیجہ یہ نہیں ہوتا کہ تار نگاہ ٹوٹیں یا آنکھوں پر کوئی مصیبت آئے ٹوٹتے ہیں خاندان اور خوش مذاق طبیعتوں میں محبت کا رشتہ جڑ جاتا ہے بدا طوار لوگوں میں یہی آنکھ کا ملنا دشمنی کا باعث ہوتا ہے یہ عجیب بات ہے کہ صرف ایک ذرا سی بات کے اتنے مختلف اور متضاد نتیجے رونما ہوتے ہیں دور حاضر کے ایک ہندی کے شاعر دلارے لعل بھارگو نے اسی مضمون کو ذرا سی تبدیلی کے ساتھ یوں بیان کیا ہے۔

لڑیں نین، ہلکیں جکیں بیت ترلپت دن رات
اُٹھت سول اُر پریت یہ عجب انوکھی بات

یہی لڑتی ہیں آنکھیں جھکتی ہیں پلکیں اور محبت میں بے چین ہوتی ہیں طبیعتیں درد دل میں اُٹھتا ہے یہ کیسی عجیب بات ہو۔

ڈھرنہ ٹرٹے نیند نہ پرے ہرے شرکال بیاک　　　　　　حنک جاک ایکے نہ پھر کھر دستم جیسی جیاک

یعنی یہ وہ نشہ نہیں جو خوف کی وجہ سے اتر جائے یہ وہ نشہ نہیں جس کی خنودگی سلادے اس نشہ کا تو شاید خمار بھی نہیں ایک مرتبہ تھوڑا سا چڑھ جانے کے بعد یہ نشہ اترنا تو جانتا ہی نہیں حسن اور جوانی کا نشہ بھی کتنا عجیب اور کس بلا کا ہوتا ہے

پوچھ مت نشہ شباب حسن　　　　　　انتہا کا سرور ہوتا ہے

نیمہ نہ نینن کو کچھو اچھی بڑی بلا سے　　　　　　نیر بھرے نت پرت رہیں تو نہ پیاس بجھائے

ان آنکھوں کو محبت نہیں کوئی بیماری لگ گئی ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کی پیاس کیوں نہیں بجھتی ہر وقت تو یہ پانی میں ڈوبی رہتی ہیں۔

کہا کند کہہ کو مودی کتک آرسی جوت　　　　　　جاکی اجرائی لکھے آنکھ اجیری ہوت

اس کے حسن کی آب و تاب کے سامنے کند (ایک سفید رنگ کا پھول) کی آب، چاندنی کی دلکشی اور آئینہ کی چمک سب ہیچ ہیں۔ اس کے حسن شفاف کو دیکھ کر تو آنکھوں میں روشنی بڑھ جاتی ہے کس سادگی سے کتنی لطیف بات کہدی ہو۔

طنز :۔ ہماری کے یہاں طنز میں نازک خیالی اور کنایہ کا وہ انداز نہیں ملتا جو اردو شاعروں کے یہاں ہو واقعہ یہ ہو کہ ہندی میں عمدہ اور لطیف پیرایہ کا طنز کم پایا جاتا ہو اردو شاعری میں کنایۃً بات کہی جاتی ہو ہندی میں نہایت بے باکی کے ساتھ اور یہی سبب ہو کہ اس میں وہ خوبی پیدا نہیں ہو پاتی داغ کا مشہور شعر ہو۔

نہ ہم سمجھے نہ تم آئے کہیں سے　　　　　　پسینہ پوچھئے اپنی جبیں سے

ہندی شاعری میں اسی بات کو صاف طریقہ پر کہدیا جاتا ہو کہ آپ غیر کے گھر سے آرہے ہیں یہی نہیں بلکہ غیر کے ساتھ اخلاص کا ایک پورا مرقع پیش کر دیا جاتا ہو اس کی وجہ یہی ہو کہ اظہار عشق عورت کی طرف سے ہوتا ہو عورتیں دل میں کوئی بات نہیں رکھ سکتیں اس لیے ان کے بیان میں لطیف اشارے کم ہوتے ہیں مرقع خوشنما ضرور ہوتا ہو بات صاف ضرور ہوتی ہو مگر طنز کی خوبی مٹ جاتی ہو۔

پلن پیک۔ انجن ادھر دھرے مہاور بھال　　　　　　آج لے سوبھل کری بھلے بنے ہو لال

تغافل تھا۔ عاشق ایک عرصہ سے اپنی معشوقہ کو بھلائے ہوئے ہے لیکن اسے بھولے بسرے دنوں کی یاد آتی ہے اور وہ ایک صبح وہ اس کے پاس پہنچتا ہے جو اس کے انتظار کی گھڑیاں گن رہی ہے اتنی مدت کے بعد اس تجدید ملاقات سے عورت کو خوش ہونا چاہیے تھا مگر خوش ہونے کی بجائے اس کی کچھ اور حالت ہوئی۔ اس نے دیکھا کہ مرد کی آنکھوں میں پان کی ہلکی سی سرخی لگی ہوئی ہے ہونٹوں پر جا بجا کاجل کے نشانات ہیں اور ماتھے پر مہاور لگی ہوئی ہے ایک لمحے میں وہ سمجھ گئی کہ رات کن رنگینیوں میں گزری ہے یہ ظاہر ہے کہ آنکھوں میں پان کی سرخی صرف اس طرح آسکتی تھی کہ کسی نے اس کی آنکھوں کو چوما ہو اس کے ہونٹوں پر کاجل کے نشانات صاف غمازی کرتے تھے کہ اس نے کسی کی کاجل آلود آنکھوں کے بوسے لیے ہیں اور ماتھے پر مہاور کی سرخی اس کا قطعی ثبوت تھی کہ اس نے کسی کے قدموں میں گر کر خوشامد کی ہے ستم بالائے ستم یہ کہ عاشق منتظر ہے کہ عورت کی طرف سے کچھ خوشی کا اظہار بھی ہو چنانچہ وہ کہتی ہے آنکھوں میں پان کی سرخی، ہونٹوں پر کاجل ماتھے پر مہاور آج آپ تشریف لائے ہیں اور اس سج دھج سے واقعی آپ نے میرے ساتھ آج بڑا اچھا سلوک کیا ہے

لاج گرب آلس اُمنگ بھرے نین مسکات　　　رات رمی رت دیت کہہ اور سے پربھا پربھات

صبح کے وقت معشوقہ دلنواز کی آنکھیں شرم اور غرور امنگ اور تھکان سے ایک عجیب کیفیت سی ہنس رہی ہیں۔ یہ ہنسی رات کی رنگینیوں کی داستان کو صاف صاف کہہ رہی ہے۔

یہ اُڑی اُڑی سی رنگت یہ کھلے کھلے سے گیسو　　　تری صبح کہہ رہی ہے تری رات کا فسانہ

پند و نصائح : حسن و عشق کے سوائے کسی اور رنگ میں بہاری نے بہت کم فکر سخن کی پھر بھی کہیں کہیں اخلاقی پند و نصائح کے بے نظیر مضمون دوہوں میں کہہ دیے ہیں۔

بڑھت بڑھت سمپت سلل من سروج بڑھی جائے　　　گھٹت گھٹت پھر نا گھٹے بر سمول کمھلائے

دولت پانی کی طرح ہے اور انسان کا دل کنول کا پھول پانی بڑھتا ہے تو کنول کا پھول اونچا ہو جاتا ہے بڑھ جاتا ہے مگر پھر پانی کم ہو جاتا ہے کنول کا پھول نہیں گھٹ سکتا اور جڑ سمیت کمھلا جاتا ہے۔ اسی طرح دولت کے بڑھنے سے دل کی خواہشات بڑھ جاتی ہیں۔ دولت کم ہو جانے پر خواہشات میں کمی نہیں ہو پاتی اور انسان کو ہر خواہش پر شکست آرزو کی تکلیف اٹھانی پڑتی ہے لہذا مناسب یہی ہے کہ دولت کے بڑھ جانے پر بھی انسان اپنی خواہشات میں اضافہ نہ کرے۔

دیو سوسیں بڑھاپے لے اچھی بھات بھیر   جا پے سکھ چاہت لیونا کے دکھیں بہیر

خداوند کریم جو کچھ بھی دے آنکھوں پر لو اگر تمھیں کبھی تکلیفیں بھی ملتی ہیں تو ان کے قبول کرنے سے گریز نہ کرو یہ تو سوچو کہ تمھاری زندگی کی گوناگوں مسرتیں دلچسپیاں عیش و عشرت بھی تو سب وہی دیتا ہے پس اگر زندگی میں کبھی ناخوشگوار واقعات پیش آتے ہیں تو بھی شکر بجا لاؤ اور انھیں قبول کرو

ان مثالوں سے بہاری کی شاعری کی عظمت کا کچھ اندازہ ہو گیا ہوگا بعض دوہے اردو فارسی کے اشعار کے اتنے ہم رنگ ہیں کہ توارد ہی کہنا چاہیے کیونکہ سرقہ کا کسی پر گمان نہیں ہو سکتا۔ بہاری کا دوہا ہے۔

جن دن دیکھے وے سمن گئی سو بیت بہار   اب اِن رہی گلاب کی اپت کٹیل ڈار

اردو کا شعر ملاحظہ

بہاریں ہم کو بھولیں یاد اتنا ہے کہ گلشن میں   گریباں چاک کرنے کا بھی اک ہنگام آیا تھا

فارسی کا مشہور شعر ہے۔

چہ می پرسی زحالِ ما دلِ ہمدمہ ات چوں شد   دلم شد خوں و خوں شد آب و آب از چشم بیروں شد

بہاری نے اسی مضمون کو یوں باندھا ہے۔

تجو انچ اتی برہ کی رہیو پریم رس بھیج   نین کے مگ جل بہئے ہر ڈے پسیج پسیج

خامیاں کس کے یہاں نہیں لغزشیں تو ہر تم تک سے ہوئیں ہیں بہاری کے یہاں بھی لغزشیں ہیں مگر وہ ایسی ہیں کہ آسانی کے ساتھ نظر انداز کی جا سکتی ہیں کیونکہ زیادہ تر لغزشیں النکار (صنائع بدائع لفظی معنوی) کے استعمال کی ہیں جن کی کثرت اور بے تکا پن اکثر ناگوار ہوتا ہے کبھی کبھی مضمون اتنا شوخ ہو جاتا ہے کہ اس میں عریانی آجاتی ہے اور کہیں یہ بھی ہے کہ دوہے کا مطلب سمجھنے کے لیے ایک پہیلی سی بوجھنی پڑتی ہے مگر ایسے دوہے بہت کم ہیں زیادہ تر ان کے دوہے عمدہ تراشے ہوئے ہیروں کی طرح ہیں جو آج بھی ان کے نام کو چمکا رہے ہیں۔

میں نے بہاری کے کلام کے کچھ محاسن بیان کیے ہیں بہت کچھ ابھی باقی ہیں مگر مضمون یوں ہی طویل ہو گیا ہے لہٰذا ختم کرتا ہوں ؎

داماں نگہ تنگ و گلِ حسن تو بسیار

گل چینِ بہارِ تو ز داماں گلہ دارد

تاثرات

سر پہ اپنے پہاڑ دھر لوں گا — اور کانٹوں سے جیب بھر لوں گا
حرف آئے نہ تیری رحمت پر — میں تو دوزخ قبول کر لوں گا

اونچے محلوں کے سرد سایے میں — لہلہاتے ہیں رنگ رنگ کے پھول
چند مفلس سڑک کے دونوں طرف — سوتے ہیں پھانکتے ہیں تپتی دھول

مرے دیوانہ وار ہنسنے پر — میرے بدخواہ مجھ سے بدظن ہیں
یہ مرے قہقہے نہیں لیکن — یہ مرے آنسوؤں کے مدفن ہیں

گو ضرورت نہیں مجھے اس کی — دل کو اک بار پھر ابھرنے دے
موت کا وقت جب مقرر ہے — زندگی سے مذاق کرنے دے

تو نے جب التفات سے دیکھا — پرزے یوں اڑ گئے مرے دل کے
جیسے ٹوٹی ہوئی کوئی کشتی — ڈوب جائے قریب ساحل کے

احمد ندیم قاسمی

ریسرچ

(شاعر کے نقطۂ نظر سے)

(میں نے ایک ایسے رسالے میں جسے بہرحال جدید کہا جانا چاہیے ایک اہم مضمون دیکھا تھا یہ مضمون بھی بہرحال جدید کہا جا سکتا تھا اس کے مطالعہ کے چند تاثرات نظم کی شکل میں پیش ہیں) **باقی**

ایک مضموں پُر شکوہ و رعب دار — ناظرِ مجبور کے سر پر سوار
ایک دریا سرد مفروضات کا — ایک طوفاں خشک معلومات کا
ہر ورق پر فلسفے کی تیز دھار — ہر سطر میں علمِ منطق کا عصا
ہر جگہ جانے پرانے تعمیصِ علم — کاغذی اسٹیج پر تمثیلِ علم
یاں حوالے واں تقابل یاں نوٹ — علم کے بھوکوں کی قوتِ لایموت
ہر سطر باریک ہر جملہ طویل — اکتسابِ علم و فن کی سلسبیل
جیسے جیسے پر مسائل کا ہجوم — گوشے گوشے میں تماشائے علوم
موٹی موٹی عینکوں کی اک نگاہ — تجرباتِ عقل کی پیچیدہ راہ
لفظ میں تاریکیاں بھی ہیں راز — بے سرا نغمہ، مگر جوشِ رنگ ساز
اصل مضموں ایک سطر ادیں — باقی سب فٹ نوٹ وہ بھی لعتیں!
اصطلاحیں، نام، تشریحیں، واقعات — گرم رو لفظوں کی اک لمبی برات
سب مقولے، بحث، مطلب، اقتباس — وہم، اندیشہ، تصور اور قیاس
کاتبوں، مہروں، خطوں کی جستجو — ماضیِ مدفون کی اک ہائے ہو!
الغرض کاغذ پہ اک جوشِ دماغ — جلوہ گر الفاظ کے دھیمے چراغ
اس کے پیچھے ظلمتِ قلب و نظر — بے فروغِ آہ، بے سوزِ جگر
لے اثر الفاظ میں معنی کی لاش — موت کے پہلو میں دل کا ارتعاش
سرد سوز و ساز، شورِ جاں خموش — جیسے سوئی ہوئی بزمِ سروش
نزع کے عالم میں دل کی زندگی — محوِ چشمِ ذوق کی تابندگی
سرد سوئی تخیل کے شرر — روح اک صیدِ شکستہ بال و پر
موت پر تخلیق کو آئی ہوئی — زندگی جیسے کہ شرمائی ہوئی
گو بظاہر صبر کر جاتا ہوں میں — جب اسے پڑھتا ہوں مر جاتا ہوں میں

باقی

(مئے کہنہ)

رنج میرٹھی

(حکیم فصیح الدین رنج ولد طبیب میرٹھ کے سربرآوردہ بزرگ تھے ان کی شاعری میں جدت پسندی وندرت کاری کی متعدد مثالیں موجود ہیں صاحب خمخانۂ جاوید رنج کے حال میں صرف اتنا لکھ سکے "حکیم فصیح الدین رنج شاگرد میرزا غالب مرحوم قاضی جلیل کی بیاض میں ایک شعر قابل انتخاب نظر آیا میرٹھ میں ان کی شاعری کا اچھا چرچا تھا مگر کلام باوجود تلاش کے نہ ملا" رنج کے حالات سے آگاہی تو یہی ہو سکی البتہ کلام مل گیا ہے جس کا انتخاب درج ذیل ہے حکیم مرزا محمد علی بیگ عاقل کے دیوان میں جو سنہ ۱۲۹۷ھ میں طبع ہوا ہے رنج کی وفات پر ایک قطعۂ تاریخ موجود ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سنہ ۱۲۹۲ھ میں وفات پا گئے تھے ان کا کلیات مخزن الفصاحت مطبع ہاشمی میں سنہ ۱۲۹۱ھ میں شائع ہوا تھا)

یارب مرے گناہ کی تعذیر اور کیوں — بس ہے یہی کہ لطف نہ پایا گناہ کا
عشق میں ہم نے کیا ایسا کہ غیر — تم نے کیوں غیر کو ایسا کیا
کیوں چھوا اس کو وہ جیسے لگے — تو نے اسے دست تمنا کیا کیا
جس نے دیکھا مجھے مرا تم پر — میں ہوں جوہر تمہارے خنجر کا
اللہ رے خیال ملال شب فراق — وہ آئے تو بھی چین نہ آیا تمام رات
بے فائدہ آنکھوں سے بہا تے ہیں آنسو — ہم رشتۂ الفت میں پروتے ہیں گہر آج
بتخانہ سے گھرائے تو کعبہ سے مدد مانگی — ستم جو کرتے ہیں تو آتا ہے خدا یاد
حوروں کی میرے آگے صفت کرتا ہے ناصح — اس ست کی دلاتا ہے یہی مرد خدا یاد
ناچار دل سے تنگ بتوں کی جفا سے ہم — فریاد ایک ہو تو کریں بھی صدا سے ہم
لاکھوں بناؤ ایک تغافل میں آپ کی — لاکھوں بگاڑ ایک مرے اضطراب میں
سوز غم میں مجھے یاد ہی دلا دیتے ہیں — شعلہ رو اور بھی ایک آگ لگا دیتے ہیں

معلوم نہیں کچھ کہ میں آیا ہوں کہاں سے
جاؤں گا کہاں؟ آیا تھا کیوں؟ کون ہوں کیا ہوں

بہار آئی ہے پھر وحشت کے ساماں ہوتے جاتے ہیں
بڑھیں کیوں ہاتھ خود ٹکڑے گریباں ہوتے جاتے ہیں

کبھی اس چشم تر کے بھی الٰہی اشک سوکھیں گے
مرے دامن کے مجھ پر مفت احساں ہوتے جاتے ہیں

دکھا کر اپنی صورت کرتے ہیں آئینہ کو حیراں
اور آئینہ کی صورت خود بھی حیراں ہوتے جاتے ہیں

کسی کا کیا گلا اے رنج جب قسمت بگڑتی ہے
تو اپنے دوست اپنے دشمنِ جاں ہوتے جاتے ہیں

کیوں مدعا بر آئیں مری قسمت میں کیا نہیں
بت آشنا نہیں ہو مرا یا خدا نہیں

ڈر ہو کہ وہ نہ طعنۂ آرام دے مجھے
میں موت تک خدا سے کبھی مانگتا نہیں

دن کاٹنے کو خوب تو ہو دل لگی کی راہ
اچھا ہو جی لگا جو کسی سے برا نہیں

افسانہ ہوں زبانِ صغیر و کبیر پر
میں نے مٹا دیا ستم روزگار کو

جنوں ہو کچھ مرے دستِ فغاں کو
کہ سمجھا ہو گریباں آسماں کو

نسیم صبح دیکھو چھیڑتی ہو
تمہاری کاکلِ عنبر فشاں کو

تم اور ناز گراں بار محبت
اُٹھاؤ دیکھ کر بارِ گراں کو

کب کیا کرتے تھے اس طرح سے پامال مجھے
کب چلا کرتے تھے تم ایسی ادا سے پہلے

دل سے جاتا رہے گا خوف گناہ
مجھ کو اللہ پارسا نہ کرے

نظر آتی نہیں اپنے میں برائی اپنی
آئینہ دوسرے کا عیب نما ہوتا ہو

تیر پہلو سے وہ نکالتے ہیں
ہائے خالق ہو دل لگی دل کی

روکے گا خاک جسم مری روح کو طبیب
نکہت ہوں گل کی روک تو لے گلستاں مجھے

ہم تو کہے ہی جائیں گے یہ ماجرائے دل
تم مسکرا کے دیکھ لو قصہ تمام ہو

قاصد گیا ہر طرح سے تسکیں ہوئی لیکن
اب دل کو یہ دھڑکا ہو کہ کیسی خبر آئے

دل یہ کہتا ہو کہ اُٹھیے نہ صنم خانہ سے
لوگ کہتے ہیں کہ کعبہ کا ارادہ کیجے

مرسلہ حبیب کیفوی

تنقید و تبصرہ

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

اسلام کے حقیقی و بنیادی خط و خال (جلد دوم)، ترتیب نزول قرآن کریم:۔

مصنف پروفیسر محمد اجمل خاں ایم اے ملنے کا پتہ کتاب گھر سرائے گڑھا الٰہ آباد قیمت پانچ روپے

کتاب کا موضوع جتنا اہم اور دشوار ہے اس سے کہیں بڑھ کر مصنف کی کوشش جو اس سلسلہ میں انھیں کرنا پڑی اہمیت رکھتی ہے اب یہ کہ وہ اس کوشش میں کامیاب ہوئے یا ناکام رہے انھوں نے خود اقرار کیا ہے کہ سنیوں کا عقیدہ سا ہو گیا ہے کہ موجودہ قرآن کی تاریخی ترتیب محال ہے بڑا ظلم ہوگا اگر ایک سنی مصنف کی ایک محال بات کو ممکن ثابت کرنے کی کوشش حیرت و تعجب کے قابل نہ سمجھی جائے مصنف نے اعلان کیا ہے کہ یقیناً یورپ کے محققین قابل داد ہیں کہ انھوں نے سب سے پہلے اس امر کی کوشش کی کہ قرآن کی سورتوں کو ایک قسم کی تاریخی ترتیب دیں لیکن ان میں سے بلا استثناء ہر ایک کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا اور انھوں نے سچے محققوں کی شان کو قائم رکھا اور اپنی ناکامی کا اعتراف کر لیا یورپ کے ان محققین میں ایک مسٹر راڈول بھی ہیں جن کی کوشش اس نظریہ کے ماتحت تھی کہ یہ تعلیم اس شخص نے دی تھی جو اپنے ابتدائی دور میں جوش و خروش میں بھرا ہوا تھا اور اسے یقین تھا کہ وہ خدا کا پیغمبر ہے بلکہ وہ اپنے آپ کو صرف ایک مصلح سمجھتا تھا اس کے متعلق مصنف نے جو قابل داد بات تحقیق فرمائی ہے وہ یہ ہے کہ آنحضرت کو صرف مصلح قرار دینے میں راڈول نے صحت کی ہو یا نہ کی ہو لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ صرف جوش و خروش اس چیز کی بنیاد قرار دینے میں اس نے سخت غلطی کی ہے ہرشفلڈ نے اس نظریہ کے متعلق جو کہا ہے وہ نہایت معقول معلوم ہوتا ہے ہرشفلڈ نے خود کیا کہا مصنف نے صفحہ ۲۲ پر تصریح کی کہ اس نے (ہرشفلڈ) قرآن کے مختلف اجزا کی تمیز بیان کرنے کی کوشش کی ہے اور اپنی نظریات کی تائید میں بعض مہمل نظریات وضع کر لیے ہیں راڈول کے نظریہ کے متعلق ہرشفلڈ کی رائے جسے مصنف نے معقول بتایا ہے صفحہ ۲۲ پر دیکھیے ہرشفلڈ جذبات کے جوش پر اعتماد نہیں رکھتا پھر آپ نے اسے منگا ناکی ان مستشرقین کے بارے میں جو رائے ظاہر کی ہے ہمارے خیال

میں، وہ قرآن کی ترتیب نزول سے مطابق جمع کرنے والوں کے متعلق ایک آخری فیصلہ کا حکم رکھتی ہے جو کوشش یورپیوں نے کی ہو کہ قرآن کو ترتیب نزول کے مطابق مرتب کریں وہ اتنی ہی ناکام ہیں جتنی کہ تمام لوگوں کی۔ کیا اسے منگانا کے فیصلہ سے ہم مصنف کو مستثنیٰ کر سکتے ہیں۔ مصنف نے خود جن اصولوں سے مدد لی ہے اور جن سے صحیح اور یقینی نتائج مستنبط ہوسکنے کا ادعا کیا ہے اس میں پہلا اصول ارتقا ہے۔ فرماتے ہیں تاریخ و احادیث سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ آنحضرت اپنے ابنائے وطن کی اخلاقی اور سیاسی پستی، کیونکہ بہت زیادہ متاثر ہوتے تھے آپ نے ان کی اصلاح کرنا چاہی تھی مکہ میں تعقل و تفکر اور تواریخ کی روشنی میں اخلاقی اصلاح جیسی نظر تھی آپ ان مکاریوں اور جابر قوانین کو جو سوسائٹی میں مذہب اور سماج کے نام پر رائج تھے دور کر دینا چاہتے تھے اس مقصد کے لیے آپ نے ایک انقلاب پیش فرمایا الخ اس عبارت کو پڑھ کر ہم حیران ہیں کہ مصنف کے متعلق کیا رائے قائم کریں۔ ظاہر ہو کہ مسلم اور غیر مسلم داعیوں کی کوششوں کے درمیان صرف یہی فرق ہو کہ مسلمان قرآن کو غیر مسلمان کی طرح آنحضرت کی تصنیف نہیں مانتا پھر یہ کیا ہے یا للعجب ہم مصنف کے اس نظریہ کے متعلق صرف اسی رائے کا اعادہ کافی سمجھتے ہیں جو انھوں نے اسے منگانا کے حوالہ سے سپرد قلم کیا ہے "رسول اللہ کی عروصہ نفسیاتی ارتقا پر ہی سورۃ کی تاریخ کو منحصر سمجھنا فطری طور پر ایک غیر علمی طریقہ ہے اور نہ یہ اس طرح ممکن ہے کہ آپ کے علم کی ترقی کو اس ترتیب کی بنا قرار دے کر کچھ فائدہ حاصل کیا جاسکے"

مصنف نے ایک دوسرا اصول اور بھی اپنی کوشش کی بنیاد قرار دیا ہے جسے آپ ادبی اصول کہتے ہیں فرماتے ہیں "اگر آپ کسی مصنف کی تصنیف کو سامنے رکھیں اور اس کا تجزیہ کریں تو آپ کو یہ بات صاف نظر آئے گی کہ اپنی ادبی زندگی کے کسی مخصوص زمانے میں وہ چند مخصوص لفظ اور جملے زیادہ استعمال کرتا ہے لیکن دوسرے زمانے میں اس کثرت سے ان کا استعمال نہیں کرتا یہ چیز قرآن کریم میں زیادہ نمایاں ہے آنحضرت ایک مخصوص زمانے میں بعض ایسے جملے اور الفاظ استعمال فرماتے تھے جو دوسرے دور میں نہیں پائے جاتے اس کی مثال قرآن کے وہ الفاظ ہیں مثلاً اسمائے الٰہی کلا حروف مقطعات وغیرہ اگرچہ اس عبارت سے یہ نتیجہ کہ مصنف کو قرآن آنحضرت کی تصنیف نظر آتا ہے کسی فکر کا محتاج نہیں لیکن تاہم ہمیں معلوم نہیں کیوں جناب نے یہ تحریر فرمایا کہ اس بنا پر وحی کے مختلف دور قائم کیے جاسکتے ہیں پھر آپ نے اور بھی تصریح سے کام لیا

ہو تیسری چیز جو قرآن کریم کی تاریخی ترتیب سمجھنے میں معاونت کر سکتی ہو وہ رسول کریم کی سیرت بحیثیت ایک انسان کے ہو۔ ایک ایسے انسان کی سیرت جنھوں نے نہایت غور و خوض اور الٰہی روشنی (وحی) کی مدد سے اس چیز کو اپنا مقصد حیات بنا لیا کہ نہ صرف عرب بلکہ تمام دنیا کے انسانوں کی اصلاح ہونا چاہیئے معلوم نہیں کہ ایک انسان جو اپنے ابنائے وطن کی اخلاقی و سیاسی و مذہبی اصلاح کے درپے تھا تمام دنیا کے انسانوں کی اصلاح کے لیے کیوں بے چین ہو گیا قرآن تو یہ کہتا ہو کہ (ما ینطق عن الہوٰی ان ہو الا وحی یوحیٰ۔ تبارک الذی نزل الفرقان علیٰ عبدہ لیکون للعالمین نذیرا) ان حقائق کے اظہار کے بعد مصنف نے آنحضرت کی سیرت نگاری فرمائی ہو۔ فرماتے ہیں "اسلام کی اصطلاح میں رسول اللہ اسے کہتے ہیں جو اس خدائی حق سے معمور کیا گیا ہو جس کے ذریعہ انسانیت کی اصلاح ہو سکتی ہو" معلوم نہیں کہ یہ اصطلاح کون سے اسلام کی ہو۔

آپ نے حضرت شاہ ولی اللہ کی حجۃ اللہ البالغہ سے (جس کا اقتباس سپرد قلم فرمایا ہو) حقیقت نبوت میں بھی تحقیق فرمائی آنحضرت کی سیرت کے سلسلے میں آپ نے تشریح کی کہ آپ نے ان اقوام کے قصے بھی سنے ہوں گے جو کسی زمانہ میں ان مقامات میں آباد تھیں۔ کیا اس کا وہی مطلب ہو جو میور وغیرہ مستشرق مصنفین کے یہاں ہم پاتے ہیں کہ یہی قصے بعد کو قرآن کا ایک جز بن گئے پھر آپ نے مسائل و اوہام و شکوک کے متعلق اسلام پر یہ سوال اہم سوال سپرد قلم فرمائے ہیں لیکن ان کے حل کے متعلق پڑھنے والے کو منتظر رکھا ہو

ہم اس کتاب کے متعلق اہم نکات سے اختلاف رکھتے ہیں۔

(۱) منجملہ ان کے ہمارے نزدیک یہ قطعی ثابت ہو کہ سورتوں کی موجودہ ترتیب آنحضرت نے ہی متعین فرمائی اور عہد رسالت میں کامل قرآن مرتب ہو چکا تھا۔

(۲) حضرت ابوبکر کی جمع قرآن کی روایت صحیح زہری یا زہری پھر اس روایت کے پڑھنے والوں کی غلط فہمی پر مبنی ہو واقعہ صرف اتنا ہو کہ ایک قرآن دربار خلافت میں محفوظ رکھنے کے لیے لکھوایا گیا تھا اس کے یہ معنی نہیں کہ آنحضرت نے قرآن مرتب نہیں فرمایا تھا بلکہ یہ مطلب ہو کہ قرآن اپنے لیے نہیں لکھوایا کہ دربار رسالت میں محفوظ رہے۔

(۳) صفحہ ۸۰ پر سورہ النجم کی آیت کو والنجم کی آیتوں سے متعلق بتانا ایک یہودی تفسیر اور بے سروپا

قصہ جس کی تردید اسی آیت سے ہوتی ہے سورۂ حج کے مکی یا مدنی ہونے کے متعلق کوئی قطعی فیصلہ نہیں ہو سکتا سیرو فی الارض سے حبشہ کی طرف ہجرت کا اشارہ قطعی ثبوت کا محتاج ہے وغیرہ وغیرہ۔

قرآن کریم کی ترتیب نزولی کے معنی یہ ہیں کہ ہم سورتوں اور سورتوں کی جملہ آیات کے متعلق صحیح آثار و روایات کی بنا پر صرف یہ طے کر سکیں کہ یہ مکی ہے اور یہ مدنی ہے تو ہمیں اعتراف ہے کہ یہ ممکن ہے لیکن یہ کہ کونسی آیات کس کے بعد آئیں اور کون سورت کس کے بعد تو ہمیں صحیح و ضعیف روایتوں کے انبار میں سے ریزہ چینی کرنا پڑے گی۔ اور نقد روایت کے اصول کو استعمال کیے بغیر ہم ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتے مصنف نے کچھ اصول بنائے ہیں جن میں سے اصول ارتقاء اور اصول ادبی قطعی صحیح نہیں ہیں۔

(۱) اگر یہ تسلیم کیا جا سکتا کہ قرآن آنحضرت کی تصنیف ہے تو دونوں اصول مانے جا سکتے تھے لیکن وہ قطعی دلائل جو قرآن کے منجانب اللہ وحی منزل من اللہ پر دال ہیں جب تک مصنف باطل نہیں کر سکتے آنحضرت کے نفسیاتی ارتقا اور ادبی مدوجزر کی بنا پر ایک حرف نہیں لکھ سکتے علمی بحث میں فاسد اوہام سے کام لینا غیر علمی طریقہ ہے مصنف کو اس سلسلے میں ایسا خیال علمی طریقہ پر پیش کرنا تھا کہ قرآن آنحضرت کی تصنیف ہے جس طرح دیگر انسانوں کے کلام میں اصول ارتقاء جذبات و ادب کی بنا پر فیصلہ کیا جا سکتا ہے آنحضرت کی اس تصنیف لطیف میں بھی انہیں اصولوں سے کام لیا جا سکتا ہے مصنف اس بات کو ثابت کرنے میں ناکام رہے اس لیے انہیں اپنے دونوں اصولوں کو آپ ہی قلم زد کرنا پڑے گا۔

(۲) اصول ارتقا یوں بھی باطل ہے کہ اگر آنحضرت اپنی قوم کا کوئی تدریجی ارتقا چاہتے تھے تو پہلے اعمال و اخلاق کی اصلاح کا نظریہ پیش کرتے کہ یہ چیز خون خرابے کا باعث نہ ہوتی عقیدہ کی اصلاح یقیناً قتل و خونریزی کا پیغام ہے اس لیے پہلے ہی توحید کا وعظ اور بتوں کے خلاف لب کشائی نہ کی جاتی لیکن سورہ مدثر کی دوسری آیت کا طرز خطاب اور تیسری کا اسلوب بیان اس خیال کے قطعاً منافی ہے قم فانذر کے معنی صرف یہ ہیں کہ مخاطب کو ہولناک مصیبت سے ڈرائیے لیکن وہ کیا ہے یہ ابھی صاف صاف نہیں بتایا تیسری آیت میں کہہ دیا وربک فکبر عربی ادب کا ایک ادنیٰ طالب علم جانتا ہے کہ تقدیم معمول حصر کے لیے (رب واحد ہے جمع نہیں) اس سبب آیت کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ صرف اپنے پروردگار کی بڑائی بول اور

صرف ایک ہی ہے۔ اب ہمیں ان احادیث کی روشنی میں دیکھنا ہے کہ معلوم ہو کہ مشرکین کی خداؤں کی بڑائی بولتے اور رب کو پکارتے تھے خصوصاً وہ روایت جو غزوہ احد میں ابوسفیان کے اعل ہبل اور عزیٰ لنا ولاعزیٰ لکم کہنے اور حضرت عمرؓ کے آنحضرت کے ارشاد کے مطابق جواب دینے میں اللہ اعلیٰ واجل اللہ مولنا ولا مولیٰ لکم فرمانے کے متعلق ہے، قطعاً مان لیا پڑے گا کہ ایک رب کی بڑائی رسالت کے خلاف تھا۔ اب یہ فیصلہ آسان ہے کہ یہ توحید کا اعلان ابتدائی وحیوں میں موجود تھا اور ابتدا ہی میں پیش کر دیا گیا تھا۔

(۳) حضرت عائشہ سے مروی حدیث پر کئی حیثیت سے نظر ڈالنے کی ضرورت ہے جس سے آپ کے گمان کے مطابق یہ ثابت ہوتا ہے کہ احکام کی آیات میں تدریجی ارتقا پیش نظر تھا اور شراب کے متعلق شروع ہی سے اگر ممانعت آجاتی تو کوئی نہ چھوڑتا اور یہ کہ چھوٹی سورتیں یا بیانیہ آیتیں پہلے آئیں اور قصاصیہ آیتیں بعد کو آئیں۔

(الف) اس حدیث عائشہ کے مقابل وہ احادیث بھی ہیں جن سے نزول وحی کی کیفیت ان کا چشم دید واقعہ ہے۔

(ب) اس حدیث کی روات کی جرح و تعدیل اگر نظر انداز کی جائے تو یہ صرف خبر احاد ہے اور ہرگز مفید یقین نہیں

(ج) اس حدیث کا مضمون صرف حضرت عائشہ ہی سے روایت کیا گیا ہے لیکن کسی صحابی نے اس قسم کے تدریجی ارتقاء کا ذکر نہیں کیا اس لیے محض ایک راوی کا خیال کوئی حجت نہیں۔

(د) یہ حدیث مرفوع نہیں اور اس کے علاوہ اس حدیث میں اور بھی گفتگو ہو سکتی ہے اس لیے اس حدیث کی بنا پر کسی کتاب کی تصنیف صحیح نہیں

اب رہا اصول ادبی تو یہ اصول اس قدر غلط ہے کہ اگر مصنف قرآن کی فصاحت و بلاغت پر نظر اور عرب کے اسالیب کلام پر توجہ فرما سکیں تو اس بنا پر ایک حرف نہ لکھ سکتے ان کے نقشہ میں بعض آیات مکی ہیں اور سورتیں بھی لیکن ان میں نہ تو کلا ہے اور نہ حروف مقطعات بعض مدنی ہیں اور ان میں مقطعات ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ انداز بیان تو ہر سورت و آیت کا مختلف ہے لیکن کہیں کلام میں پستی و رکاکت نہیں اگر

کہیں کلام بلند اور مدینہ میں پست درجہ کا ہو تو اسے صفائی کے ساتھ پیش کرنا اور جواب لینا تھا۔ آپ یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ قضائیہ مضامین اور مواعظ کے بیان میں اختلاف ہو لیکن یہ غور نہیں کرتے کہ بلاغت کے معنی ہی یہ ہیں کہ کلام کا اسلوب اقتضائے حال کے مطابق ہو۔ دریافت طلب یہ ہے کہ اگر حالات کے اقتضا کے مطابق کلام ہو تو یہ کلام کی بلاغت کا اختلاف ہوگا یا عین بلاغت؟ اس لیے حالات کے اختلاف سے کلام میں بلاغت کے مدوجزر کو اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کرنا گراں فاسد سے بیش کچھ نہیں اس لیے اصول ادبی کی بنا پر سورتوں کے نزول کے زمانے کا تعین کرنا ایک غلط اقدام ہے ہو سکتا ہے کہ حالات مدینہ میں بھی کچھ اسی قسم کے پیش آئے ہوں کہ جن کی بنا پر پھر کلام میں مواعظ کے ساتھ ساتھ قضائیہ مضامین بھی ہوں اور سب جانتے ہیں کہ ایسے حالات پیش ہوئے یہ خیال کہ الفاظ و محاورات کا ایک اسٹاک ختم ہو جانے پر اس قسم کے قضائیہ مضامین یوں مدون کرنا پڑے گمان کی حد سے زیادہ کچھ نہیں۔

تیسرا اصول تاریخی جس سے آپ نے برعم خود کام لیا ہے بہت زیادہ تصحیح طلب ہے۔

(۱) آپ نے عیسائیوں سے مناظرہ اور مذہب عیسوی سے متعلقہ آیات کو مدنی قرار دیا لیکن ابن ہشام جلد ۱ صفحہ ۲۱ میں مکہ میں عیسائیوں کا آنا اور آنحضرت کا قرآن سنانا اور پھر ان کا ایمان لانا موجود ہے اس کے مطابق ضروری ہے کہ مکی آیات و سورتوں میں مذہب عیسوی کے متعلق ایسے دلائل موجود ہوں جن سے کسی عیسائی کو مطمئن کیا جا سکے جب تک آپ ابن ہشام کی اس روایت کو باطل قرار نہ دیں اس کے خلاف رائے قائم نہیں کر سکتے اب ہم ان چند نکات کے متعلق لکھتے ہیں جن پر ہمیں اختلاف رائے ہے وہ یہ ہیں :۔

(۱) قرآن آنحضرت کے عہد میں جتنا نازل ہوتا جاتا تھا آنحضرت لکھاتے جاتے تھے۔ بخاری جمع القرآن صفحہ) اور یہ بتاتے جاتے تھے کہ اس آیت کو فلاں سورت میں لکھو (اتقان احمد، ابو داؤد، ترمذی، نسائی ابن حبان حاکم)

بخاری میں اگرچہ انسؓ سے روایت ہے کہ چار (ابو درداء، معاذ ابن جبل، زید بن ثابت اور ابو زید) کے سوا اور کسی نے قرآن آنحضرت کے عہد میں جمع نہیں کیا اور ابو زید کے قرآن کا وارث میں ہوا لیکن

استیعاب میں حافظ ابن عبدالبر نے تصریح کی کہ یہ گفتگو اوسی و خزرجی کی مفاخرت کے سلسلہ کی ایک کڑی ہے بعض اوسیوں نے کہا کہ ہم میں حنظلہ غسیل الملائکہ ہیں خزرجیوں نے کہا کہ ہم میں سے چار نے آنحضرت کے زمانے میں قرآن لکھ لیا تھا کیونکہ تہذیب التہذیب اور علامہ ذہبی کی طبقات القراء (طبقات ابن سعد قسم ثانی جلد ۲ صفحہ ۱۱۲) میں درجنوں صحابیوں کے نام ملتے ہیں جنہوں نے کل قرآن لکھا یا تھا آنحضرت سے سورتوں کے فضائل بتاتے ہیں۔ آیات اور اوائل سور کا ذکر کیا ہے نیز یہ کہ اس کی قراءت کا یہ ثواب ہے اور اس کا یہ۔ اور اواخر و اوائل سور ہو نہیں سکتے جب تک آیتوں میں ترتیب اور آیتوں کی بنا پر سورتیں مرتب نہ ہوں اس لیے جب عہد نبوت میں سورتوں کی بھی ترتیب ہو چکی تھی تو اب ترتیب نزولی کی کسی قطعی شہادت کی تلاش بادر ہوا اور نتیجہ بے سود اس کے علاوہ جب نزول کے لیے آنحضرت کا ارشاد کافی حجت تھا اور ترتیب سور میں بھی ارشاد نبوی موجود ہے کسی سورت کی آیات کے متعلق قطعی حکم لگانا کہ یہ اس کے بعد ہے اور یہ اس کے بعد ہر جگہ کام نہیں دے سکتا اور بعض جزئی واقعات کی بنا پر کلیہ قائم نہیں کیا جا سکتا

(۲) آپ نے حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں قرآن کا مرتب ہونا بعض روایات کی بنا پر تسلیم کیا ہے حالانکہ زید بن ثابت کی وہ روایت جو بخاری میں درج ہو گئی ہے، صرف زید کی روایت بواسطہ عبید ابن السباق شیخ زہری کی ہے تنہا زہری اور ان کے شیخ اس روایت کا راوی ہے اور واقعہ اتنا اہم۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس روایت کے بے اصل ہونے کے متعلق کتنے اہم شبہات پیدا ہوتے ہیں بایں ہمہ ہو سکتا ہے کہ زید نے حضرت ابوبکرؓ کے لیے قرآن لکھا ہو کر دربار خلافت میں ایک نسخہ محفوظ رہے (کنز العمال) لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ قرآن آنحضرت کے عہد میں جمع نہیں ہوا تھا۔ علامہ ابن عبدالبر نے بھی زہری کی اس روایت کی مخالفت کی ہے (استیعاب جلد اول صفحہ ۱۲)

(۳) حضرت عثمانؓ کے زمانے میں جمع قرآن کے متعلق جو روایت آپ نے نقل کی ہے وہ بھی صرف زہری ہی سے مروی ہے اگرچہ ترمذی میں ہے "ہذا حدیث حسن صحیح" لیکن اس کے بعد ہی لکھا ہے کہ "وہو حدیث زہری ولا نعرفہ الا من حدیثہ" کہ ہم اسے زہری کی حدیث کے سوا اور کسی سے نہیں پہچانتے یہ روایت بھی درایتاً صحیح نہیں اور ایک محقق کی شان سے بعید تھا کہ اسے نظرانداز کرتا۔ ہم اس روایت کو کئی وجوہ سے صحیح نہیں جانتے۔ (اس حدیث کا ترمذی میں زید کا حضرت عثمان کے حکم سے قرآن لکھنا اور آیت احزاب کو صرف خزیمہ کے

کے پاس پایا ذکر ہے یا ابو خزیمہ کے۔

(۱) زہری کے (یہ روایت زہری جس کو بخاری نے روایت کیا ہے) قرآن حضرت صدیقؓ کے عہد میں لکھا
اس وقت ان کو وہ آیت کیوں یاد نہیں آئی جو نسخہ حضرت حفصہ میں درج ہونے سے رہ گئی اس روایت میں
سورۂ توبہ کی آخری آیت "لقد جاءکم" انہوں نے گم شدہ ابو خزیمہ کے پاس پائی اور ترمذی میں وہ احزاب کی
آیت رجال صدقوا ما عاہدوا خزیمہ یا ابو خزیمہ کے پاس پاتے ہیں اور تین سال تک قرآن صدیقؓ کو یونہی ناتمام
چھوڑ دیتے ہیں۔ یہی ایک بات اس روایت زہری کے بے اصل ہونے کی کافی شہادت ہے۔

(۲) اس روایت میں ہے کہ حضرت حذیفہؓ نے غزوۂ آرمینیہ و آذربائیجان کے بعد حضرت عثمانؓ سے اختلاف
قرآن کی شکایت کی حضرت عثمان نے سنہ ۲۳ھ میں ولید بن عقبہ کو آذربائیجان والوں کی بغاوت فرو کرنے
اور معاہدہ شکنی کی سزا دینے کے لئے بھیجا تھا جس نے دوبارہ آذربائیجان کو فتح کیا اور سنہ ۳۵ھ میں حضرت عثمان
شہید ہوئے پھر یہ قرآن کب لکھے گئے اور کب بھیجے گئے ہمارے خیال میں حضرت عثمان نے چھ نسخے ضرور
نقل کرائے لیکن کسی اختلاف کی بنا پر نہیں بلکہ اس لیے کہ ہر شہر میں جہاں قرآنی حافظ بھیجے ہیں وہاں ایک
دربار خلافت کا مستند قرآن لکھا ہوا بھیجدیا واقعہ صرف اتنا تھا۔ زہری کی روایت میں اسے کچھ کا کچھ بنا دیا
گیا کیونکہ حضرت زہری کے شیخ جو اس روایت میں ہیں وہ جناب عوف ہیں جن کے متعلق یہ تصریح ہے کہ وہ قدری
شیعی تھے اور عام شیعہ کے خیال کی تائید کے لیے یہ روایت تصنیف ہوئی ہے اس لیے صحت نہیں

بہرحال زیر نظر کتاب بہت اچھی لکھائی چھپائی کا نمونہ ہے۔ جن لوگوں کو تحقیق کی طلب ہے انہیں
ضرور دیکھنا چاہیئے (محمد یعقوب محق راغب البدایونی)

تجلیات: مجموعہ کلام جناب خواجہ محمد حسن صاحب کوکب مرادآبادی سائز ۲۰×۲۶/۱۶ حجم ۲۲ صفحات کاغذ دبیز
کتابت و طباعت صاف اور روشن قیمت (۱۰) ملنے کا پتہ اسلامیہ مسافرخانہ مرادآباد

زیر نظر مجموعہ میں وہ سب ہی کچھ ہے جو کوکب صاحب نے ستمبر ۱۹۱۳ء سے جنوری ۱۹۴۲ء تک غالباً کہا
ہے۔ یعنی مرثیے، مستزاد نظمیں، نظمیں (حمد، نعت) عقیدتی، قومی سہرے، تہنیت نامے وغیرہ وغیرہ ان میں غزلوں
کا حصہ سب سے زیادہ ہے

شاعری کوکب صاحب کا شغل فرصت ہے اس لیے ان کی شاعری وہی ہے جو اسے ہونا چاہیے تھا کوکب صاحب کے کلام میں قدامت و روایت کا رنگ غالب ہے تاہم کوکب صاحب کا کلام نوعیت سے قطع نظر اپنے اندر ایک ہمواری رکھتا ہے اور جدت و سادگی جہاں مل جاتے ہیں وہاں اچھا اثر پیدا ہو جاتا ہے بعض نظموں میں بعض بند اچھے ہو گئے ہیں بہتر ہوتا اگر کوکب صاحب تجلیات کو بحیثیت کلیات شائع کرنے کے بجائے صرف اس کا انتخاب شائع کرتے اور کلام کی ترتیب میں خواہ ردیف کا خواہ تاریخ تصنیف کا لحاظ رکھتے

سائنس اور اسلام:- حافظ محمد طیب صاحب کی تقریر ہے جو انھوں نے ۸ اگست سنہ ۱۹۳۹ء کو انجمن اسلامی تاریخ و تمدن مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کی دعوت پر فرمائی تھی سائز ۸/۲۲×۱۸ حجم ۴۲ صفحات گیٹ اپ خاصا قیمت پانچ آنے۔

سائنس کی ترقی روایتی مذہب کے لیے ایک شدید خطرہ تھی یورپ میں مذہب سے فائدہ اٹھانے والوں نے اس خطرہ کا احساس کچھ اس کے پیدا ہوتے ہی کر لیا تھا چنانچہ بہت احتیاط کے ساتھ سائنس اور مذہب کے راستوں میں رسم و تعلق پیدا کرنے کی سعی و کاوش کی گئی۔

قاری طیب صاحب کی کوشش بھی اسی نوع کی کوشش ہے قاری صاحب کے نزدیک سائنس کی جستجو مادہ پر ختم ہو جاتی ہے اور مذہب کی دنیا روحانی عظمت و جلال سے شروع ہوتی ہے اس عنوان پر جس بحث و گفتگو اور زاویۂ نظر کی توقع ہو سکتی تھی وہ افسوس ہے قاری صاحب کی تقریر میں موجود نہیں قاری صاحب کی تقریر میں خالص مذہبی رنگ زیادہ ہے اور سائنس کے متعلق جو کچھ انھوں نے فرمایا ہے اسے سائنس سے واقفیت رکھنے والے شاید ہی قابل قبول سمجھیں۔ ان کی تقریر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بحث و گفتگو شروع کرنے سے پہلے ہی اپنے ذہن میں ایک نتیجہ مرتب فرما چکے تھے اس لیے ان کی حیثیت اس مصنف کی سی نہیں رہی جو جہاں حقائق اسے لے جاتے ہیں بلکہ انھوں نے اس شخص کی حیثیت اختیار کر لی جو حقائق کو گھسیٹ لے جاتا ہے جہاں خود جانا چاہتا ہے۔

بہرحال قاری صاحب ایک اہم موضوع کو سامنے لائے ہیں جس کا مطالعہ یقیناً مفید ہوگا۔

فردوس گم گشتہ:- یہ بھی انجمن اسلامی تاریخ و تمدن علی گڈھ میں پڑھا ہوا ایک مقالہ ہے سائز ۸/۲۲×۱۸ حجم ۴۴ صفحے قیمت ۲ر

مقالہ نگار جناب چودھری غلام احمد صاحب پرویز نے نہایت شگفتہ انداز میں انسانی حد و اختیار، آفاقی نظام معاشرت کی ضرورت اور اسلامی معاشرت کی آفاقیت سے بحث کی ہے مقالہ ایک بار نہیں بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے

اردو زبان کی نئی تحقیق :- اویس احمد صاحب ادیب ایم۔ اے صدر شعبۂ اردو حلیم انٹر کالج کانپور کا مقالہ ہے جو انھوں نے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس صوبۂ متحدہ کے اجلاس شاہ جہاں پور میں پڑھا تھا قیمت ۴؍

اویس صاحب کے مقالہ کو ایک ریسرچ کے طالب علم کے نوٹس سے تعبیر کرنا زیادہ موزوں ہوگا اویس صاحب کے نزدیک لشکری زبان ہونے کی حیثیت سے سنسکرت ہندوستان کی پہلی اردو تھی موجودہ اردو ہندوستان کی دوسری بڑی اردو ہے اور وہ زبان جس کا زمانہ کے تقاضوں سے متاثر ہوکر جنم لینا باقی ہے ہندوستان کی تیسری بڑی اردو ہوگی۔

مقالہ دلچسپ ہے اور اس کی تیاری میں بعض اچھے حوالوں سے کام لیا گیا ہے۔

اسلامی تہذیب :- شائع کردہ دائرہ معلومات ملیہ جونپور۔ سائز $\frac{20\times30}{16}$ حجم ۴۸ صفحات قیمت (۲)

مقالہ میں اسلامی عقاید اور اسلامی آداب و اخلاق کا سادہ اور مختصر طور پر ذکر کیا گیا ہے (ف ۱-۱)

آغاز و انجام :- از جمیل احمد کندھاپوری۔ ناشر برائٹ دت سنگل اینڈ سنز تاجران کتب لوہاری گیٹ لاہور، سائز $\frac{20\times30}{16}$ صفحات ۱۶۲، قیمت عہ، کاغذ کتابت و طباعت اچھی۔

یہ جمیل احمد صاحب کے سات افسانوں کا ایک مجموعہ ہے ابتدا میں افسانہ نگاری پر ایک مضمون بھی ہے ان افسانوں میں جمیل احمد صاحب نے ہندوستان میں غربت اور سرمایہ دارانہ نظام کی جو برکتیں ہیں ان کا پردہ چاک کرنے کی کوشش کی ہے مگر معلوم ہوتا ہے کہ جمیل صاحب یہ چیز حسب رواج زمانہ کر رہے ہیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دانستہ وہی پلاٹ ڈھونڈے گئے ہیں جو اس قسم کی باتوں سے تعلق رکھتے ہوں اس آورد کی وجہ سے وہ خوبی و جستائی نہیں پیدا ہونے پائی جو افسانہ کی جان ہوا کرتی ہے اگر اس امر سے قطع نظر بھی کر لیا جائے کہ محض غریبی اور مظلومیت کا پروپیگنڈا ہی افسانہ کی جان نہیں ہے یا زندگی صرف اسی سے مراد نہیں ہے تب بھی جمیل صاحب کے افسانوں میں ابھی فن کا رانہ پختگی اور رعنائی نہیں آئی ہے یہی باتیں بھی جب تک حسین و جمیل انداز سے نہ بیاں کی جائیں محض بھونڈی تصویریں رہتی ہیں حالانکہ ہو تو یہ ہیں ہی زندگی کا ایک

ضرور ہے لیکن جمیل صاحب کا فن ابھی تکمیل نہیں ہوا ہے اس لیے ان کے افسانوں میں ابھی بھونڈا پن نظر آتا ہے مگر ہمیں امید ہے کہ موصوف آیندہ اور ترقی کریں گے اور ان ابتدائی کوششوں کی منزلوں سے بہت دور آگے جا سکیں گے۔

شکستہ دل۔۔از روشن پٹیالوی بی۔ اے ناشر نرائن دت سہگل اینڈ سنز تاجران کتب لوہاری گیٹ لاہور صفحات ۱۰۷، سائز ۲۰×۳۰/۱۶، قیمت ۱۲/ کاغذ، کتابت و طباعت اچھی۔

یہ روشن صاحب پٹیالوی کے آٹھ افسانوں کا مجموعہ ہے جس کا تانا بانا انھوں نے زیادہ تر اپنے تخیل کی مدد سے قایم کیا ہے پلاٹ میں کوئی ندرت نہیں ہے نہ افسانے ہمیں زندگی کے قریب لاتے ہیں۔ ان میں رومان ہے اور اخلاقیات اور دونوں ایسے افسانوں کے ذریعے ظاہر کیے گئے ہیں جو زیادہ تر تصوری محض ہوتے ہیں اور تخیل بھی انیسویں صدی کا۔ روشن صاحب کو چاہیے کہ دوسرے کامیاب افسانہ نگاروں کا مطالعہ کریں اور زندگی کو فن کارانہ طریقہ پر پیش کرنے کی کوشش کریں۔ (م ح)

رسالہ ہندستانی ادب ٹیگور نمبر (ایڈیٹر غلام محمد خاں ایم اے (عثمانیہ)، قیمت ٹیگور نمبر ۸ر سالانہ چندہ للعہ ملنے کا پتہ جینیل گوڑہ حیدرآباد دکن

ہندستانی ادب جون ۱۹۴۱ء میں جاری ہوا ہے اور اردو ادب کی معیاری اور قابل قدر خدمات انجام دے رہا ہے اس کا مقصد نام سے ظاہر ہے یعنی ملک میں ہندستانی کے نام سے جو لسانی تحریک کچھ مدت سے جاری ہے اس کی تائید و حمایت اور اس کی نشر و اشاعت اس کا اولیں مقصد ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ اپنے مقصد میں ایک حد تک کامیاب ہے۔

پیش نظر اشاعت ٹیگور سے متعلق ہے اب تک متعدد ٹیگور نمبر شایع ہو چکے ہیں مگر یہ فخر صرف ہندستانی ادب کو حاصل ہے کہ اس نے سب سے پہلے اور نہایت مختصر مدت میں یہ نمبر مرتب کر کے پیش کیا ہے گو مہلت کی وجہ سے اس قدر مبسوط اور مفصل مضامین پیش کیے نہ جا سکے جو اس شاعر اعظم کے صحیح مقام اور حیثیت کو متعارف کرانے کے لیے ضروری تھے لیکن پھر بھی اس قلیل عرصہ میں ادارہ نے جو مضامین پیش کیے ہیں اس پر وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ علاوہ ازیں شاعر مرحوم کے متعلق ملک کے رہناؤں اور قائدوں خصوصاً حیدرآباد کے عظیم المرتبت لوگوں کے بیانات اور اخبارات و رسایل کے خیالات و افکار بھی پیش کیے گئے ہیں۔ شاعر مشرق کا آرٹ اور ان کی متعدد تصویریں بھی شامل ہیں۔

(ع۔ل)

رجسٹرڈ ڈی ایل نمبر ۱۸۹۲

مکتبہ کی دو نئی کتابیں

جگ بیتی حصہ اوّل ۔ پنڈت جواہر لال نہرو کی کتاب Glimpses of World History کا سلیس ترجمہ۔ مصنف نے دُنیا کے تمام ممالک اور اقوام کی تاریخ سنین و سلاطین کی فہرست اور مختلف حکمراں خاندانوں کے عروج و زوال سے قطع نظر کرکے افراد کے ذہنی اور سماجی ارتقا، جماعتی نظام کی تنظیم، تہذیب و تمدن کی تدوین اور علوم و فنون کی ترویج کی مختلف زمانوں کے لحاظ سے یکجائی تصویر کھینچی ہے۔ اس لئے ان کی یہ کتاب ہندوستان کے تاریخی ادب میں ایک جدت ہے۔ مترجمہ محمود علی خاں جامعی (کتاب وسط مارچ تک شائع ہوجائے گی)

سیر کائنات ۔۔ یہ کتاب انگلستان کے مشہور سائنس داں سر جیمس جینس کی لکھی ہوئی ہے۔ موصوف نے رائل انسٹیٹیوٹ آف لندن میں زمین، ہوا اور چاند ستاروں وغیرہ پر آٹھ تقریریں کی تھیں بعد میں ان تقریروں کو ترمیم و اضافے کے بعد کتابی صورت میں شائع کرایا ہے۔ ارضیات و فلکیات کے مسائل کیسے خشک ہوتے ہیں مگر اس ماہر سائنس داں نے انھیں سلیس عبارت میں اس طرح سمجھا کر لکھا ہے کہ افسانے کا سا مزا آتا ہے۔ بڑی خوشی کی بات یہ ہے کہ ترجمے میں بھی عبارت کی اس خوبی کو باقی رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ (کتاب وسط مارچ تک شائع ہوجائے گی)

مکتبہ جامعہ

دہلی۔ نئی دہلی۔ لکھنؤ۔ بمبئی ۳

پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکسن) مطبوعہ جمال پرنٹنگ پریس دہلی۔

جامعہ

مکتبہ جامعہ دہلی

مکتبہ کی دو نئی [illegible]

جگ بیتی حصہ اول۔ پنڈت جواہر لال نہرو کی کتاب [illegible] World History کا سلیس ترجمہ۔ مصنف نے دنیا کے تمام ممالک اور اقوام کی تاریخ سنین و سلاطین کی فہرست اور مختلف حکمراں خاندانوں کے عروج و زوال سے قطع نظر کرکے افراد کے ذہنی اور سماجی ارتقار، جماعتی نظام کی تنظیم، تہذیب و تمدن کی تدوین اور علوم و فنون کی ترویج کی مختلف زمانوں کے لحاظ سے یکجائی تصویر کھینچی ہے۔ اس لئے ان کی یہ کتاب ہندوستان کے تاریخی ادب میں ایک جدت ہے۔ مترجمہ محمود علی خاں جامعی۔ قیمت مجلد [illegible]

سیرِ کائنات:۔ یہ کتاب انگلستان کے مشہور سائنس داں سر جے جینس کی لکھی ہوئی ہے۔ موصوف نے رائل انسٹیٹیوٹ آف لندن میں زمین، ہوا اور چاند ستارے وغیرہ پر آٹھ تقریریں کی تھیں۔ بعد میں ان تقریروں کو ترمیم و اضافے کے بعد کتابی صورت میں شائع کرایا ہے۔ ارضیات اور فلکیات کے مسائل کیسے خشک ہوتے ہیں مگر اس ماہر سائنس داں نے انھیں سلیس عبارت میں اس طرح سلجھا کر لکھا ہے کہ افسانے کا سا مزا آتا ہے۔ بڑی خوشی کی بات یہ ہے کہ ترجمے میں بھی عبارت کی اس خوبی کو باقی رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ قیمت مجلد [illegible]

جامعہ

زیر ادارت - نورالحسن ہاشمی ایم۔ اے

جلد ۳۶ نمبر ۴ | بابتہ ماہ اپریل سنہ ۱۹۴۲ء | چندہ سالانہ صہ فی پرچہ آٹھ آنہ

فہرست مضامین

(پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکسن) محبوب المطابع دہلی)

یادگارِ حسینؑ

[illegible] ۱۹۴۳ء کو یادگار حسینی کے جلسے میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کی یہ تقریر آل انڈیا ریڈیو دہلی سے نشر کی گئی)

[illegible] ہندوستان کی سرزمین پر جہاں ہر مذہب اور ہر ملت کے اہل دل ہمیشہ سے کثرت میں وحدت دیکھتے اور دکھلاتے رہے ہیں یہ بات سمجھنے کے لئے کچھ بہت دلیل اور بحث کی ضرورت نہیں ہے کہ حق کا نور ایک ہے مگر دیکھنے والے اس میں جیسی اور جتنی دیدار کی طاقت ہے اس کا جلوہ اپنے اپنے رنگ میں دیکھتے ہیں اور اس کی کیفیت اپنی اپنی زبان میں بیان کرتے ہیں۔ جب کوئی بات اس طرح کہنی ہو کہ ہر مذہب و ملت کے لوگ اسے سمجھ سکیں، اور اس سے اپنے دل پر ٹھیک ٹھیک اثر لے سکیں تو [illegible] مذہبوں کی جدا جدا بولیوں اور الگ الگ مخصوص اصطلاحوں کو چھوڑ کر اسے انسانیت کی عام زبان میں کہنا ہوتا ہے۔ یادگارِ حسینی کی تحریک کا مقصد جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہی ہے کہ فخر انسانیت اور مایہ نازش بشریت حسینؑ کے کارناموں کی قدر و قیمت کو انسانیت کے عام معیاروں پر پرکھا جائے اور اس کا نتیجہ انسانیت کی عام زبان میں بیان کیا جائے سب جانتے ہیں کہ ایک محاورے سے دوسرے محاورے میں ترجمہ کرنا بڑا کٹھن کام ہے اور جب اس کے ساتھ یہ شرط ہو کہ ترجمے کی زبان وہ ہو جو انسانوں کے دل کی زبان ہے تو یہ کام اور بھی کٹھن ہو جاتا ہے۔ ایک مسلمان کے لئے جو امام حسینؑ کا حال مذہبی رنگ میں سننے اور سنانے کا عادی ہے اسے اس نئے رنگ میں اس طرح بیان کرنا کہ اس ذکر سے جو کیفیت اس کے دل میں پیدا ہوتی ہے وہی دوسروں کے دل میں پیدا [illegible] مشکل ہے مگر یہ بات ہمت بندھاتی ہے کہ جب سننے والوں کے دل ہمدردی اور [illegible] سمجھنے پر آمادہ ہوں تو وہ ادھ کہی بات بلکہ ان کہی بات بھی سمجھ لیتے ہیں۔

[illegible] میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اس عام انسانیت کے لئے حسینؑ کی رودادِ شہادت کیا محض طلبی کی بس ایک ایسی ناکام کوشش ہے جس میں آپ کو ناکام فریق سے تاریخی ہمدردی [illegible] بس ایک مغرور المزاج سردار کی ضد یا ناعاقبت اندیشی ہے جس میں صبر کرنے والا

اتفاق سے آپ کے محبوب اور مخدوم آقا کا جگر گوشہ ہے اس لئے آپ اس کی پیچ کرتے ہیں۔ گیا یہ ہمدردی اور سفاکی سے ایک کمزور جماعت کے مٹانے کی دل ہلانے والی کہانی ہے جس کو سُن کر رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں اور آنسوؤں کی بوندیں آنکھوں سے بے اختیار ٹپک جاتی ہیں۔ دنیا کی تاریخ میں ہمدردیوں اور طرف داریوں کے لئے اتنے اور مواقع ہیں اور شخصی اور جماعتی ناکامیوں اور نامرادیوں، بیدردیوں اور سفاکیوں کی کہانیوں سے اٹی پڑی ہے کہ صرف ان کے لئے تو دنیا کو حسینؑ کی داستان کی خاص ضرورت نہیں۔ لیکن نہیں حسینؑ کی کہانی ان میں سے کوئی چیز نہیں وہ تو انسانی سرفرازی اور سربلندی کی داستان ہے۔ شرف انسانیت کی کہانی ہے۔ انسان کے پستی سے بلندی کی طرف ارتقاء کی روداد ہے۔ اس کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے معیاروں کی تفسیر ہے۔ یہی غلامی سے انسانی حریت کی طرف سفر کی منزل ہے۔ وہ دنیا میں خدا کی بادشاہت کا اعلان ہے اور انسانوں میں اس کے قیام کے امکان بلکہ لزوم پر کسی حربے سے نہ لوٹنے والی شہادت ہے۔ وہ منزل تکمیل انسانی کی راہ کا چراغ ہے۔ اس چراغ کو باطل کی قوتیں جب کبھی اپنی پھونکوں سے بجھانا چاہتی ہیں تو حسینؑ کی یاد اس کی لَو کو روشن کر دیتی ہے جب راہ حق وحریت میں انسانیت کے قدم ڈگمگاتے ہیں۔ اور کیسے کیسے نہیں ڈگمگاتے۔ تو حسینؑ کی مثال اسے سہارا دیتی ہے اور سنبھال لیتی ہے۔ جب دولت وقوت واقتدار کی فرعونیت حق پرستوں کی تہی دست اور بے وسیلہ جمعیتوں پر عرصۂ زندگی تنگ کرتی ہے اور جب پیہم ناکامیوں کا ہجوم حق پر باطل ہونے کا وسوسہ دل میں ڈالتا ہے تو حسینؑ ہی کی مثال انھیں ثبات قدم کا سبق دیتی ہے اور یاس کی کفر آفرینی سے بچاتی ہے۔ جب جماعتی زندگی کا فساد فرد کو بے حقیقت سا بنا دیتا ہے تو حسینؑ کی مثال اس فرد کو اس کی یہ ذمہ داری یاد دلاتی ہے کہ جماعت کو اخلاقی جماعت بنانے کا فرض آخری طور پر اس پر عائد ہوتا ہے۔ چاہے اس کی کوشش میں جماعت اُسے زہر کا پیالہ پلائے یا سولی پر چڑھائے سنگسار کرے یا سر تن سے جدا کر کے شہادت کے خون سے زمین کو لالہ زار بنائے زندگی

کے حریص انسانوں کو حسینؑ یاد دلاتے ہیں کہ زندگی ہر حال میں جیئے جانے کا نام نہیں ہے اور جیلے میں کبھی جان اور کبھی تسلیم جانِ زندگی۔ جب کامیابی کے طلائی بچھڑے کی پرستش ہر سو ہو رہی ہو تو حسینؑ ناکام کا نام ہی اس سحر سامری کا توڑ بن جاتا ہے اور حسینؑ کی ناکامی کے مقابل کی ساری فتح مندیاں سرنگوں و شرمسار نظر آتی ہیں۔

لیکن آخر یہ سب کیوں؟ اس لئے کہ حسینؑ نے اپنی جان دے کر خدا کی اور انسان کی شرافت پر شہادت دی ہے اور اس دستاویز پر اپنے خون سے مہر ثبت کی ہے۔ یہ انسانی شرافت کیا ہے؟ بہائم پر انسان کو کون سی چیز برتری کا مرتبہ دیتی ہے؟ اس کے سینے میں قانونِ اخلاق کا وجدان یہ جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں؟ اس کے ذہن میں اعلیٰ اقدار کا آنا۔ ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف جانے کا فطری قصد ہے۔ اعلیٰ کو جان کر ادنیٰ پر قناعت سے اس کی فطری بیزاری۔ پھر ان اقدارِ اعلیٰ کا مطلق اور کامل حیثیت میں یقین اور اس پر اس کے قلب وضمیر کی تصدیق۔ یہی صفاتِ اخلاقی کے وہ مکمل نمونے ہیں جن پر ہر چیز کی قدر و قیمت پرکھی جاتی ہے۔ مثلاً عدل، حق، خیر، حسن۔ انھیں سے اس کی شب تار حیات میں روشنی کی جھلک ہے۔ انھی سے اس کی بے چینی میں سکون اور پراگندگی میں دلجمعی کا سامان ہے وہ بھٹکتا ہے تو یہی دلیلِ راہ ہوتی ہیں زندگی کے دوراہے پر جب یہ کفر کی طرف جاتا ہے تو یہی اُسے شکر کی طرف کھینچتی ہیں۔ اسفل سافلین میں یہی احسن تقویم یاد دلاتی ہیں انھیں بھلایا جاتا ہے مگر یہ پھر بار بار یاد آتی ہیں انھیں دبایا جاتا ہے مگر یہ پھر اُبھرتی ہیں۔ ان سے بدکنے والے وحشی بھی پھر پھر کے ان کو جاتے ہیں کھنچے، یہ اقدارِ مطلقہ حواسِ ظاہری سے محسوس نہیں ہوسکتیں۔ ان کا تصور کیا جاسکتا ہے چشمِ ظاہر ان کے نظارے سے محروم ہے صرف چشمِ باطن ہی کو ان کی جھلک نظر آتی ہے۔ ہر ملک میں ایسے خدا کے بندے پیدا ہوتے ہیں جو ان اقدار کو بے حجاب اس طرح دیکھتے ہیں جیسے ہم چاند سورج، ستاروں کو دیکھتے ہیں اور ان کے نور سے وہ دنیا کی ہر چیز کو، زندگی کے ہر شعبے کو۔ انفرادی ہو کہ اجتماعی منور کرنا چاہتے ہیں۔ اپنے قول سے ان اعلیٰ قدروں کی تلقین

کرتے ہیں اپنے عمل سے ان کی تصدیق کرتے ہیں - انھیں اپنے چہرے کا رنگ بنا لیتے اپنے وجود کا حصہ بنا لیتے
ہیں اور اس طرح اپنی زندگی کی روشنی سے دوسروں کی نظریں ان تک پہنچاتے ہیں اور دوسروں
کے دل ان کی طرف جھکتے ہیں - اور جب انسان کی بہیمیت ان پر حملہ کرتی ہے تو ان کی حفاظت
کے لئے کمربستہ ہو جاتے ہیں - حفاظت میں کامیاب بھی ہو جاتے ہیں لیکن ان کا اصلی رنگ ناکامی
میں نکھرتا ہے - ان کی ظاہری کامیابی سے ان کی پیش کردہ اقدار پر یقین اتنا راسخ نہیں ہوتا جتنا
اس وقت ہوتا ہے جب باطل کی یلغار اتنی شدید ہوتی ہے کہ کامیابی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی
شکست یقینی ہوتی ہے اور یہ ناکامی اور شکست کے یقینی ہونے کے باوجود اعلیٰ کو چھوڑ کر ادنیٰ کے
ساتھی نہیں بنتے ان کی گالیاں کھاتے ہیں - ذلتیں سہتے ہیں تکلیفیں اٹھاتے ہیں اور اگر یہ مرتبہ
بلند نصیب میں ہوتا ہے تو آخرکار جان کی نذر پیش کرکے اپنی سچائی کا آخری ثبوت دے دیتے ہیں -
اور انسانیت کو جتا دیتے ہیں کہ کامیابی اور اقتدار کی لاگ سے وہ کہیں یہ نہ سمجھ لے کہ
ان اقدار مطلقہ کی سیادت اسی وقت تک ہے جب تک فتح مندیاں ہیں - نہیں ان کے ساتھ رہ
کر ناکامیابی دوسروں کے ساتھ کی کامیابیوں سے اعلیٰ کی خاطر بدنامیاں ادنیٰ کے ساتھ کی نیک
نامیوں سے بہتر ہیں ان کی جلو کی رسوائیاں بڑی بڑی کامرانیوں سے زیادہ وقیع
اور ان کی سنگت کی تنہائیاں، لشکروں اور جیشوں پر قابل ترجیح ہیں جیسے انھیں اقدار
مطلقہ کے علم بردار تھے - انھیں کے لئے جئے - انھیں کے لئے لڑے - اور انھیں پر اپنی جان
نثار کر گئے اور اپنی زندگی اور اپنی موت دونوں سے انسانیت کے لئے ایک دائمی شمع ہدایت
روشن فرما گئے اس شمع کی روشنی زندگی کے ہر شعبے میں راہ نما ہے لیکن جماعتی زندگی کی گرائیوں
میں اس شمع سے اکتساب نور کی طرف آج خاص طور پر توجہ دلانا چاہتا ہوں -

اسلام کے نزدیک دین کی بنا اقدار کی وحدت پر ہے - بنیادی اقدار حکم، حکمت اور
حق ہیں - حکمت اور حق بنیادی اقدار کی حیثیت سے معروف ہیں - میں صرف حکم کی تشریح کرنا
چاہتا ہوں - اس سے مراد ہے حکومت - اقتدار اعلیٰ - ذرا سوچئے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے

[illegible] انسانی کی اچھی سیاسی تشکیل عدل اور انصاف پر مبنی حکومت کا قیام۔ انسان کی اخلاقی [illegible] تقاضا ہے۔ اس لئے اچھی حکومت بھی ایک اخلاقی قدر رکھتی ہے اور اس کا ایک [illegible] ہماری ہدایت کے لئے ہونا بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا حکمت اور حق کا۔ اس کا نام حکم [illegible]۔ حکمت اور حق کو ایک ماننا اسلام کی تعلیم ہے۔ یعنی اسلام یہ کہتا ہے کہ حکم بھی اسی ذات کے لئے ہے جو عین حق اور عین حکمت ہے۔ عبادت یعنی غیر مشروط اور غیر محدود اطاعت صرف اسی کی [illegible] اور کسی کی نہیں۔ شرطوں کے ساتھ اور حدوں کے اندر دوسرے کی اطاعت بھی کی جا سکتی ہے مگر شرط اور حد یہی ہے کہ مجازی حکم حقیقی حکم اور حکمت اور حق کے خلاف نہ ہو۔ اگر دنیا میں حکم حقیقی قائم ہو تو انسان کا کھلا ہوا فرض ہے کہ بغیر کسی شرط کے اس کی اطاعت کرے لیکن اگر حکم مجازی کا دور دورہ ہے تو اطاعت کے لئے لگانی پڑتی ہیں جن میں سب سے پہلی چیز یہی ہے کہ انسان کو کوئی کام اس حکم کے خلاف نہ کرنا پڑے جسے وہ حکم حقیقی جانتا ہے۔ لیکن سب سے بڑی مشکل اس وقت پیش آتی ہے جب حکم مجازی سراسر حکم حقیقی کے خلاف ہو اور انسان کو اس کی خلاف ورزی پر مجبور کرتا ہو۔ اس سے بڑھ کر مشکل جس کے تصور تک سے حق پسند کا دل کانپ اٹھتا ہے یہ ہے کہ باطل کی حکومت یہ مطالبہ کرے کہ اسے حکم حقیقی سمجھا جائے جب دنیا پر یہ مصیبت آئے تو آدمی کا فرض ہے کہ وہ قول سے فعل سے یہ اعلان کرے کہ یہ باطل کی حکومت سراسر حکم حقیقی کے خلاف ہے میں اس کے آگے ہرگز سر نہ جھکاؤں گا اور کوئی اس کے آگے سر نہ جھکائے۔ اس اعلان کا نام شہادت ہے۔ اس شہادت پر باطل کی قوتیں ٹوٹ پڑتی ہیں مگر اس کے سارے ظلم سہہ کر ہی مرد حق دوسروں کو حق و باطل کا فرق دکھا سکتا ہے۔ میں نے ابھی کہا تھا کہ قدر اعلیٰ کو بے حجاب دیکھنے والے کم ہوتے ہیں اب یہ مرد حق جو حکم حقیقی کو بے حجاب دیکھ رہا ہے دنیا کے کم نگاہوں کو کس طرح دکھلائے۔ سوائے اس کے کہ اس راہ میں قربانیاں کرکے اپنے عقیدے کی قوت سے اپنے دلوں کو پگھلائے۔ کبھی کبھی اس راہ میں جان دے کر آخری قربانی دینی پڑتی ہے۔ جو شخص جان دے کر باطل کے مقابلے میں آخر دم تک حق کا اعلان کرے وہی شہادت کے سب سے اونچے درجے پر فائز ہوتا ہے اور عام طور پر شہید صرف اسی کو کہتے ہیں۔

اب آپ تاریخ کے صفحات پلٹ کر دیکھئے۔ اسلام کا ابتدائی زمانہ جسے مسلمان سب سے زیادہ اچھا زمانہ سمجھتے ہیں گذر چکا ہے۔ حکم حقیقی یعنی خلافتِ راشدہ کا دور ختم ہوتا ہے حکم مجازی یعنی ملوکیت کا دور آتا ہے۔ حکم حقیقی کے خلاف ملک کے محاصل ذاتی ملک بنتے ہیں اور بادشاہ بہت بڑا خزانہ جمع کرکے دولت کے بل پر اپنی قوت بڑھاتا ہے اور عالم اسلامی کو اپنی اطاعت پر مجبور کرتا ہے۔ کچھ لوگ ڈر سے کچھ لالچ سے سر جھکا دیتے ہیں۔ بعض سر ایسے ہیں جو نہیں جھکتے۔ انہی میں رسول کے نواسے حسینؓ کا سر ہے۔ لالچ دھمکی، فریب سب سے کام لیا جاتا ہے مگر حسینؓ یزید کی اطاعت سے انکار کرتے ہیں۔ بھلا حسینؓ جن کی رگوں میں علیؓ فاطمہؓ اور محمدؐ کا خون تھا۔ جن کے دل میں حق کا خون اور حق کا عشق تھا حکم باطل کو حکم حق کیسے کہہ دیتے۔ حسینؓ نے بیعت کرنے سے انکار کر دیا گویا اعلان کر دیا کہ یزید کا حکم، حکم باطل ہے یہ پہلی شہادت تھی۔

ان کو ان کا وطن چھوڑنے پر مجبور کیا گیا۔ مکے میں بھی چین نصیب نہ ہوا۔ ترک وطن کرکے عراق کا قصد کیا یہ اس بات کا اعلان تھا کہ مجھے یزید کے حکم کے باطل ہونے پر اس درجہ یقین ہے اور اسے قبول کرنے سے اس شدت سے انکار ہے کہ ترک وطن کی تکلیف اٹھانے کو تیار ہوں یہ دوسری شہادت تھی۔

کوفے کی راہ میں کربلا کے مقام پر یزید کے لشکر نے حسینؓ کی راہ روکی اور ان کا چھوٹا سا لشکر گھر گیا۔ اب آخری قربانی اور آخری امتحان کا سامنا تھا۔ حسینؓ نے آخری قربانی پیش کی، آخری امتحان میں پورے اترے ان کے ساتھیوں اور عزیزوں میں سے ایک ایک مارا گیا۔ چھوٹے چھوٹے بچے قتل ہوئے آخر خود حسینؓ زخموں سے چور چور زمین پر گرے مگر ان کے دل میں یہی تھا۔ ان کی زبان پر یہی تھا اللہ کے سوائے کوئی معبود نہیں۔ حکم صرف اللہ ہی کے لئے ہے۔ یہ تیسری اور آخری شہادت تھی۔

کہتے ہیں کہ جب لشکر شام والے حسینؓ کے اہل بیت کو اسیر کرکے اور کربلا کے شہیدوں

کے سر نیزوں پر چڑھا کر لے چلے تو راہ میں ہر جگہ حسینؓ کا سر اللہ کی وحدت اور بڑائی اور اس کے حکم کی شہادت دیتا تھا۔ مذہبی عقیدت اس بات کو لفظاً بھی صحیح مان سکتی ہے مگر اس سے قطع نظر کرکے دیکھا تو واقعی حسینؓ کا سر جہاں کہیں جاتا ہوگا زبان حال سے حکم حق کی شہادت دیتا ہوگا۔ آج تیرہ سو سال بعد بھی حسینؓ کی مثال بلکہ حسینؓ کا نام اس کی شہادت دیتا ہے اور قیامت تک دیتا رہے گا کہ حکم صرف اللہ ہی کے لئے ہے۔

جب کبھی دنیا میں حکم حقیقی کی قدر کا تسلط ہوگا تو دنیا ضرور یاد کرے گی کہ اس کے سب سے بڑے محسن کے نواسے نے کس طرح اس کی حمایت میں اپنی جان نذر دی تھی۔ جب دنیا میں افراد اور اقوام ان اقدار اعلیٰ کے سلوک کی حیثیت سے ارتقاء روحانی و ذہنی کے منازل سبک رفتاری سے طے کرتی ہوگی اور ان قدروں کے حاملوں کو ناکامی سے دوچار نہ ہونا پڑے گا تو وہ ضرور یاد کرے گی کہ صدیوں پہلے ایک بے یار و مددگار حق پرست نے ناکامی سے ڈرے بغیر ان اقدار اعلیٰ کی حمایت کی ہمت کی تھی اور جس دنیا کی طاقت و جبروت اس کے خلاف تھی تو انہیں کی خاطر اس نے اپنا سب کچھ لٹا دیا تھا۔ جب دنیا ایک خدا سے ڈرے گی اور اس طرح سب ڈروں کے ڈر سے نجات پا چکی ہوگی تو وہ یہ نہ بھولے گی کہ فاطمہ کے لال نے میدان کربلا میں اپنا سر کٹوا کر اسی اطاعت اور اس سربلندی کا مظاہرہ کیا تھا اس وقت یہ بے نوا حکمرانوں کا حکمراں دکھائی دے گا۔ یہ ناکام دین و ایمان کا پشت پناہ نظر آئے گا اور اس کا خاک و خون میں تھڑا ہوا سر ان سطوت و جبروت کا علم معلوم ہوگا اور عارف اجمیری کے لفظوں میں سب پر روشن ہو جائے گا کہ

شاہ است حسینؓ بادشاہ است حسینؓ — دین است حسینؓ دین پناہ است حسینؓ
سر داد نداد دست در دست یزید — حقا کہ بنائے لا الہ است حسینؓ

تمدن انسانی کا انتشار

(یہ مقالہ زیر صدارت جناب ڈاکٹر عابد حسین صاحب انجمن اتحاد جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں پڑھا گیا)

ولولا دفع اللہ الناس بعضہم ببعض
لفسدت الارض ولکن اللہ ذو فضل
علی العالمین ط

اور اگر بعض لوگوں کے ذریعہ سے بعض کو
کرسی حکومت پر سے نہ ہٹاتا رہے تو ملک کا
انتظام درہم برہم ہو جائے لیکن اللہ دنیا
جہان کے لوگوں پر بڑا مہربان ہے۔

جنگ کے آتشیں شعلوں نے بالآخر تمام کرۂ ارض کو گھیر لیا یورپ میں یہ آگ بھڑکی اور اس نے مغرب و مشرق، جنوب اور شمال کو خاکستر کر دیا فرانس، روس، یونان، پولینڈ غرضکہ کوئی ملک اس کی دسترس سے بچ نہ سکا یورپ سے یہ افریقہ پہنچی اور لیبیا کو اپنا ہدف بنایا اور اس کے شعلوں کی گرمی مصر اور نہر سوئز تک بھی پہنچنے لگی۔ افریقہ اور یورپ کے دو براعظموں کے بعد ایشیا کی باری آئی ایران، عراق اور شام اس کی نذر ہو گئے نئی دنیا ایک عرصہ تک اس سے بچی رہی لیکن ابھی دو برس ہی کا عرصہ ہوا تھا کہ جاپان اور امریکہ میں بھی جنگ چھڑ گئی۔ آسٹریلیا کا براعظم تو برطانیہ کی نو آبادی کی حیثیت سے اس میں پہلے ہی سے شریک تھا غرضکہ آج دنیا کے چپہ چپہ پر خون اور آتش کی ہیبت ناک بارش ہو رہی ہے۔ پانچوں براعظموں پر انسانیت کا قتل و خون جاری ہے مہیب دیو ایک دوسرے سے دیوؤں کی طاقت سے بھی زیادہ ٹکراتے ہیں اور انسانوں کو پاش پاش کر دیتے ہیں مشین گنیں بارش سے بھی زیادہ تیزی سے گولیوں کو برساتی ہیں اور انسانوں کے سینوں میں پیوست ہو کر انھیں بے روح کر دیتی ہیں۔ ہوائی جہازوں سے بموں کی بارش ہوتی ہے وہ بم جس میں انسان کی تباہی اور ہلاکت کے تمام آتشیں سامان پوشیدہ ہوتے ہیں جو اپنے شکم میں تمدن انسانی کی تباہی کیلیے تمام زہریلا مادہ چھپا رکھتے ہیں۔ یہ انسانی آباد

ن میں آگ لگا دیتے ہیں عالیشان عمارتوں کو خاکستر کر دیتے ہیں غریب امیر
عورت، بچوں وغیرہ سب ہی کو لقمہ اجل بنا دیتے ہیں ہری ہری کھیتیاں ویران
ہو جاتی ہیں اور شاداب فصلوں اور شگفتہ پھولوں کی جگہ جانوروں اور انسانوں کی لاشوں کے انبار
لگ جاتے ہیں نہ صرف یہ کہ زمین پر انسان دوسرے انسان کا خون پی رہا ہے اور اس کے
گوشت کے لوتھڑے نوچ رہا ہے بلکہ اس کے ظلم و بربریت سے سمندر بھی محفوظ نہیں ہیں عظیم الشان
جہاز اور آبدوز کشتیاں ایک دوسرے کے تعاقب میں ہزاروں میل کی دوڑ لگاتے ہیں اور بالمقابل
ہوتے ہی اپنی توپوں کے دہانے کھول دیتے ہیں توپوں کی گرج اور بموں کے پھٹنے سے سمندر میں
کا سا سماں پیدا ہو جاتا ہے خدا جانے کتنی جانیں تباہ ہوتی ہیں اور بسا اوقات گولوں کے باعث
جہازوں میں شگاف پڑتے ہیں جس میں سے پانی جہاز میں گھس جاتا ہے اور سمندر کی بے پناہ گہرائی
جہازوں کو مع انسانوں کے اپنی آغوش میں لے لیتی ہے جہاں موت ان کو ہمیشہ کے لیے سلا دیتی ہے
یہ خونیں کھیل اب نہ صرف بحر روم میں کھیلا جا رہا ہے بلکہ دنیا کے تمام سمندروں میں یہ ہولی اب
دھوم دھام سے منائی جا رہی ہے بحر اوقیانوس اور بحر الکاہل میں جرمنی، برطانیہ، امریکہ اور جاپان ایک
دوسرے سے دست و گریباں ہیں کسی قدر بحر عرب اور بحر ہند اب تک اس سے محفوظ ہیں مگر یہ مہلت
بھی اب صرف چند دن کی ہے

غرضکہ انسانیت نے ان تمام آلات سے مسلح ہو کر جو جدید سائنس نے مہیا کیے ہیں اپنی
تباہی پر کمر باندھ لی ہے معلوم ہوتا ہے کہ انسانیت نے حیوانیت کا جامہ پہن لیا ہے حیوانیت کا کیا بلکہ شیطانیت
تو بھی حقیقت کی پوری ترجمانی نہ ہوگی لاکھوں انسان قتل ہو چکے، لاکھوں اپاہج ہو کر
ہسپتالوں میں زندگی کے تلخ ایام گذار رہے ہیں۔ لاکھوں عورتیں بیوہ ہو چکیں لاکھوں بچے یتیم اور
لاوارث ہو کر حیران و سراسیمہ پھر رہے ہیں لیکن انسان ہے کہ ابھی تک قتل و غارت گری پر تلا ہوا ہے
اس کی آباد اور پر رونق بستیاں جن پر اس کو ناز تھا اب اس کے ہاتھوں تباہ ہو رہی ہیں لندن
اور روم پر ہوائی آتشیں بم ہزاروں کی تعداد میں برسائے جا رہے ہیں تمدن انسانی

کے وہ تمام مظاہر جو مدارس، عجائب خانوں، کلیساؤں اور محلوں کی شکل میں انسانی شہری زندگی کو قابل فخر بناتے تھے اب صرف مٹی کے ڈھیروں میں تبدیل کیے جا رہے ہیں۔

یہ انسانی تباہی کیوں جاری ہے؟ یہ قتل و خون کیوں ہو رہا ہے؟ انسان نے بالآخر اپنی عقل خرد کو کیوں بالائے طاق رکھ دیا ہے؟ کیا وہ اس وحشت و بربریت سے باز بھی آئے گا یا اسی خوفناک کھیل ہی میں تباہ ہو جائے گا؟ یہ ایسے سوالات ہیں جو بار بار سامنے آتے ہیں اور ان کے جواب کے لیے ہمیں مجبور کرتے ہیں۔

(۲)

جنگ دراصل اس انتشار کا خارجی مظہر ہے جو اس وقت تمدن انسانی میں موجود ہے تمدن انسانی کے تمام شعبوں میں ایک عرصہ سے ایک انتشار پیدا ہو گیا ہے۔ اس میں کوئی ہم آہنگی اور نظام نہیں پایا جاتا۔ انسانی تمدن کا ہر شعبہ چاہے وہ معاشی ہو یا سیاسی، قومی ہو یا بین الاقوامی، اخلاقی ہو یا مذہبی ایک دوسرے سے علیحدہ ہے اس میں کسی قسم کا ربط نہیں ہے پھر تمدن انسانی کے ان مختلف شعبوں کے داخل میں بھی کسی قسم کا نظام، کسی قسم کا ربط، کسی قسم کا ایک مقرر کردہ لائحہ عمل موجود نہیں ہے انسان عمل کر رہا ہے لیکن اس کے اعمال کا کوئی مقرر کردہ انسانی نصب العین نہیں ہے بعض مقاصد کے حصول کے لیے اس نے اپنی جان کی بازی تک لگا دی ہے مگر یہ وہ مقاصد ہیں جو بسا اوقات غلط اور انسانیت کی تباہی کا باعث ہیں ہم عہد جدید کی تمدنی زندگی پر ایک سرسری نظر ڈالنا چاہتے ہیں تاکہ ہم اس انتشار سے واقف ہو سکیں جو اس وقت تمدن انسانی میں موجود ہے۔ اس واقفیت کے بعد ہی ہم اس موجودہ ہیبت ناک جنگ کے اسباب جان سکیں گے ان اسباب کے جاننے کے بعد ہم ان کو دور کرنے کی تدابیر پر غور کر سکیں گے جب تک انسانیت کی راہ سے ان رکاوٹوں کو دور نہ کیا جائے احیائے انسانی کی تمام کوششیں محض بیکار ثابت ہوں گی انسان کی نئی زندگی کے متعلق ہم تب تک کوئی امید قائم نہیں کر سکتے جب تک ہم اس تمام خس و خاشاک کو انسانیت کی راہ سے نہ ہٹا دیں جو ایک عرصے سے اس کی آئندہ راہ کو روک رہا ہے کسی مریض کے علاج کرنے کے لئے ضروری ہے کہ

پہلے اس کے مرض کی ٹھیک ٹھیک تشخیص کی جائے مرض کی ان تمام علامتوں کا غور سے مطالعہ کیا جائے جو مریض میں پائی جاتی ہیں۔ پھر ان علامات کا کیا بنیادی سبب ہے اس کا پتہ چلانا ضروری ہے پھر ان اسباب کا رفع کرنا ازبس ضروری ہے۔ جب مرض کے تمام اسباب دور ہو جائیں اور مریض اپنی اصلی حالت پر آجائے تب اس کو مقوی غذائیں دینا ضروری ہیں تاکہ اس میں حسن صالح پیدا ہو اور وہ آئندہ تمام امراض کا مقابلہ کر سکے۔ انسانیت آج مریض ہے اس کا مرض نہایت خطرناک ہے بلکہ اگر یہ کہ وہ لب گور ہو چکی ہے تو بے جا نہ ہوگا یہاں بھی نہایت ضروری ہے کہ پہلے اس کے مرض کی علامتوں کا بغور مطالعہ کیا جائے پھر ان تمدنی امراض کا اصلی سبب کیا ہے۔ اس کی جستجو کی ضرورت ہے جب اس سبب اصلی کا پتہ چل جائے تو اس کو دور کیا جائے جب یہ دور ہو جائے گا تو انسانیت اپنی معمولی حالت پر واپس آجائے گی اس وقت پھر ایک صحیح انسانی نظام کے ذریعہ اس کو مادی و روحانی غذا پہنچائی جائے گی تاکہ وہ صحت مند رہے اور آئندہ تمدن انسانی کو فنا کرنے والی مہلک بیماریوں میں مبتلا نہ ہونے پائے۔

تمدن انسانی کے مرض کی علامات کا پتہ تمدن انسانی کے مختلف شعبوں کے مطالعہ سے چل سکتا ہے وہ شعبے کون سے ہیں؟ تمدن انسانی انسان کی معاشی، سیاسی، اجتماعی، قومی، بین الاقوامی فنی علمی، ادبی جمالی، اخلاقی، مذہبی اور روحانی زندگی پر مشتمل ہے۔ آج ہر اس شعبہ میں انتشار پایا جاتا ہے انسان کی معاشی زندگی میں سرمایہ دارانہ مزدور کی جنگ جاری ہے اس کی قومی زندگی مختلف طبقوں کی حرص و آز کی آماجگاہ ہے اس کی بین الاقوامی زندگی جنگ کی صورت میں ہلاکت و تباہی کی تفسیر ہے اس کی جمالی زندگی میں حسن کی ہم آہنگی کا فقدان ہے اس کا ادب اعلیٰ انسانی جذبات کی بجائے سفلی جبلتوں کا نمائندہ ہے اُس کا علم شیطانی قوتوں کا مددگار ہے۔ اُس کی اخلاقی زندگی وحشت و بربریت کے سبب پامال ہو چکی ہے اس کی مذہبی زندگی تعصب اور کوتاہ نظری سے مملو ہے۔ اس کی روحانی زندگی الحاد اور دہریت کے باعث فنا ہوئی جا رہی ہے۔

ہمارے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ ہم تمدن انسانی کے ان تمام شعبوں پر تفصیل سے نظر ڈالیں اس لئے

ہم صرف ابھی کے چند اہم شعبوں پر ایک نظر ڈالنے پر اکتفا کریں گے۔ مرض کی علامات کے بعد ہم ان
کے اصل سبب کو معلوم کرنے کی کوشش کریں گے اس اصل سبب کے معلوم ہو جانے کے بعد کوشش
کریں گے اس کو دور کرنے کے لیے اور انسانیت کو مکمل صحتور اور طاقتور بنانے کے لیے حکما جو مختلف
نسخے تجویز کر رہے ہیں ان پر ایک غائر نظر ڈالیں ان کے فوائد اور نقائص کا باہم موازنہ کریں اور یہ معلوم
کریں کہ کون نسخہ انسانیت کی شفا کے لیے بہتر ہے وہ کونسا نسخہ ہے جو انسانیت کے مادی، عقلی، جمالی
اخلاقی اور مذہبی، روحانی قوی کی انتہائی ترقی کی راہ سے نہ صرف خس و خاشاک کو دور کرتا ہے بلکہ
ان کی انتہائی ہم آہنگ ترقی کرتا ہے اس کوشش کو ہم احیائے انسانی کی کوشش سے تعبیر کریں گے
اسی مناسبت سے ہم نے اس کتاب کا نام بھی "احیائے انسانی" رکھا ہے اس میں ان تمام مسائل سے
بحث ہوگی جو انسانیت کی نئی زندگی کے لیے ازبس ضروری ہیں ایسی صورت میں جبکہ انسانیت
تباہی کے غار کے قریب آ گئی ہے اس قسم کی کوشش ازبس ضروری ہے جب یہ جنگ ختم ہوگی اور جنگجو
اقوام تھک چکی ہوں گی اُس وقت شاید انسانیت کو اپنے ظالمانہ افعال پر کچھ افسوس ہو اس وقت شاید
ان کو یہ خیال پیدا ہو کہ گزشتہ جارحانہ قومی نظامات نے ان کو اور ان کے تمام انسانی ہمسایوں کو
تباہ کر دیا ہے اس وقت شاید وہ ایک ایسے نظام کی تلاش کریں جو ان کو اور تمام انسانیت کو امن
امان دے اور تمام انسانیت بجائے باہمی غارت گری کے انسانیت کی مادی اور روحانی ترقی میں
مصروف ہو جائے ممکن ہے کہ یہ خیال درست ہو ممکن ہے کہ یہ محض خواب ثابت ہو بہرحال ایک امید افزا
خواب میں زندگی گزارنا اس سے بہتر ہے کہ انسان عہد جدید کی وحشت اور بربریت کے حوصلہ شکن
واقعات کا شکار ہو جائے حالات چاہے کسی قدر حوصلہ شکن کیوں نہ ہوں لیکن افق پہ امید کی کرن
اب تک دکھائی پڑتی ہے اقوام پاگل ہو چکی ہیں ان کی حکومتیں اور ان کے ارباب حل و عقد اس سے
بھی زیادہ پاگل لیکن آج بھی کروڑوں انسانوں کے گلہ میں اکا دکا ایسا دکھائی پڑتا ہے جس کا دل انسانیت
کی محبت سے لبریز ہے جس کی آنکھیں انسانیت کے درد دکھ سے پُرنم ہیں اور جس کے قوی انسانیت
کو اس تباہی سے بچانے کے لیے مضطرب ہیں۔ شاید ان روحانی انسانوں کی آواز جبکہ انسا

کا جذبہ غصہ کم ہوگا کچھ اثر کر جائے اور انسانیت اپنی احیا کی کوشش میں مصروف ہو جائے اور انسانی زندگی کا آغاز ہو لیکن قبل اس کے کہ ہم احیائے انسانی کے اصول اور ان پر مبنی نظام عمل پیش کریں ہم تمدن انسانی کے موجودہ انتشار کا ٹھیک ٹھیک مطالعہ کر لینا چاہتے ہیں اس مطالعہ ہم کو اس کی معاشی، سیاسی، ادبی، علمی، جمالی، بین الاقوامی، اخلاقی اور مذہبی زندگی میں کرنا چاہیئے۔

(۳)

دنیا کی معاشی زندگی پر نظر ڈالی جائے تو اس میں ایک عجیب قسم کا انتشار دکھائی دیتا ہے دنیا کی تقریباً دو سو کروڑ آبادی میں ایک طرف چین اور ہندوستان کی تقریباً سو کروڑ آبادی ہے جو فقر و فاقہ میں زندگی گزار رہی ہے تو دوسری طرف انگلستان اور امریکہ میں دولت کے چشمے بہہ رہے ہیں ہندوستان کی روزانہ اوسط آمدنی بمشکل ایک آنہ فی کس ہے اور چین کی بھی کچھ اس سے بہتر نہیں ہے۔ اس کے برخلاف امریکہ میں دولت کا یہ حال ہے کہ ہر چھ آدمیوں میں سے ایک کے پاس وہاں موٹر کار موجود ہے ہندوستان سے سونا اور چاندی برابر کھیچ کھیچ کے انگلستان کو پہنچ گیا۔ امریکہ کے پاس تو تمام دنیا کے نصف سے زائد سونا ہے اور اسی قدر چاندی ہے ہندوستان میں تقریباً دس کروڑ انسان ایسے موجود ہیں جن کو صرف ایک مرتبہ کچھ تھوڑی سی غذا میسر آتی ہے۔ اور دوسرے وقت وہ بھوکے ہی سوتے ہیں چین کی غربت کچھ یہاں سے کم نہیں ہے عالم اسلام کا بھی کچھ اس سے بہتر حال نہیں ہے غربت کے باعث لوگوں کی صحت تباہ ہو گئی ہے اور دن بدن بد سے بدتر حال ہوا جا رہا ہے غربت کے باعث لوگ اپنے بچوں کو تعلیم نہیں دلا سکتے ہیں جس کے باعث جہالت کا عام طور سے دور دورہ ہے بچوں کی شرح اموات بہت زیادہ ہے مشرق کی غربت کا باعث بہت بڑی حد تک یورپ کی سرمایہ داری ہے۔ اٹھارویں صدی عیسوی میں بیشتر مشرقی اقوام مثلاً ہندوستان، سماترا، جاوا وغیرہ یورپ کی تازہ دم اقوام کا شکار ہو گئیں ان مغربی اقوام نے ہر طرح ان مفتوح ممالک کو لوٹا اور ان کی معاشی زندگی کو تباہ کر ڈالا ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی ظلم و ستم کی داستان کو کون نہیں جانتا اسی کا نتیجہ ہے کہ آج تک بھی باوجود

ڈیڑھ سو برس گزر جانے کے ہندوستان اپنی پارچہ کی صنعت کو دوبارہ زندہ نہ کر سکا اور تقریباً ساٹھ کروڑ روپیہ کا کپڑا وہ باہر کے ملکوں سے خرید رہا ہے جاوا اور ساترا کو بھی اہل ہالینڈ نے خوب تباہ کیا چین کو تو جرمنی، انگلستان، فرانس اور امریکہ سب ہی نے مل کر اپنی حرص کا آماجگاہ بنایا۔ مغربی سرمایہ داری نے بہت جلد ان مفتوح ممالک میں اپنی حکومتیں بھی قایم کر لیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ معاشی لوٹ اور بھی زیادہ منظم اور مستقل ہو گئی جو اب تک بدستور قایم ہے۔ اسلامی ممالک بھی مغرب کی سرمایہ داری اور شہنشاہیت کا شکار ہوتے جس کا نتیجہ وہاں غربت اور معاشی بربادی کی شکل میں ظاہر ہوا۔ مصر شام عراق اور ایران کے کسان غریب ہوتے چلے گئے اور اب تک ان کی حالت درست ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

مغربی سرمایہ داری کے علاوہ تمام مشرقی اقوام اس جاگیرداری نظام کا بھی شکار رہیں جو ان ممالک میں پھیلا ہوا ہے دیہات کے دیہات اور قصبے کے قصبے صرف چند زمینداروں کی ملکیت ہیں۔ زمینداروں کی سالانہ آمدنی بغیر کسی مشقت کے لاکھوں کی ہے حالانکہ وہی کسان جو ان کے لیے ہل جوتتا ہے دن بھر تپتے ہوئے سورج کی گرمی میں اپنے خون کا پسینہ کرتا ہے ماہانہ چند روپیوں سے زائد نہیں کماتا یہ قلیل آمدنی نہ اس کی اور نہ اس کے اہل وعیال کی کفالت کرتی ہے۔ ہندوستان، ایران، عراق، مصر وغیرہ سب ہی میں اب تک زمین زمینداروں کے قبضہ میں ہے اور کسان فاقہ کشی کر رہے ہیں۔

دولت، دولت کو کماتی ہے غریب عوام کے پاس دولت نہیں ہے اس لیے وہ کسی قسم کی تجارت نہیں کر سکتے تمام دولت سمٹ سمٹ کر بڑے بڑے تاجروں کے پاس مرکوز ہو رہی ہے۔ وہ دن بدن زیادہ دولت مند ہوتے جا رہے ہیں اور اپنی دولت کے باعث بیشتر تجارتوں پر ٹھیکوں Monopoly کے ذریعہ قابض ہوتے چلے جا رہے ہیں جس کے باعث چھوٹے چھوٹے تاجر برباد ہوتے جا رہے ہیں۔

مشرق کے مقابلہ میں مغرب کی معاشی حالت بہتر ہے وہاں کی حکومتیں چونکہ عوام کی بہت حد تک نمائندہ ہیں اس لیے انھوں نے عوام کی معاشی بہبودی اور بہتری کے لیے بہت کچھ کیا ہے پھر چونکہ انگلستان اور فرانس وغیرہ امیر ممالک ہیں اس لیے وہاں کا معیار زندگی بھی بلند ہے لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں

سرمایہ داری کی دست برد سے یہ ممالک محفوظ ہیں معاشی زندگی میں اصول انفرادیت کی کارفرمائی کے باعث بعض افراد اور کمپنیوں نے بے حساب دولت جمع کرلی ہو دولت ایک جگہ جمع ہوگئی ہو اس لیے بحیثیت مجموعی تمام ممالک کی صنعتی و حرفتی ترقی میں اس سے پوری مدد نہیں مل رہی ہو بیروزگاری ان ممالک میں بھی موجود ہو تاہم یہاں غربت کا وہ حال نہیں جو مشرق میں ہو گزشتہ نصف صدی سے اجتماعیت کی تحریک ان ممالک میں برابر ترقی کر رہی ہو اس لیے اب یہاں غربت کم ہوگئی ہو اور بیروزگاری بھی گھٹ گئی ہو معیار زندگی بھی کافی بلند ہوگیا ہو تاہم ابھی تک عوام کی معاشی حالت میں ترقی کی گنجایش ہو امریکہ کے تمول کے باوجود بھی وہاں کی تیرہ کروڑ آبادی میں سے اس وقت ایک کروڑ انسان بیکار رہیں حبشی امریکہ جو برائے نام غلامی سے تو آزاد ہوگیا ہو لیکن ممالک متحدہ کی جنوبی ریاستوں میں اس وقت اس کی حیثیت غلامانہ ہو اور وہ سفید لوگوں کی معاشی دست برد کے لیے صرف ایک ذریعہ ہو جنوبی امریکہ میں تو سفید اقوام نے سرخ ہندیوں کی پوری کی پوری قوم کو صرف ربڑ کے حصول کے لیے تباہ و برباد کیا ان پر دنیا کا کوئی ظلم نہیں ہو جو روا نہ رکھا گیا یہی حالت افریقہ میں بھی ہوئی بلجیم کے بادشاہ لیوپولڈ نے اپنی سرپرستی میں چند کمپنیاں قایم کیں جنھوں نے ربڑ کے زیادہ سے زیادہ حصول کے لیے بلجیم کانگو کی تمام آبادی کو برباد کر ڈالا یہی فرنچ کانگو میں بھی پیش آیا غرضکہ رنگین اقوام آج امریکہ، افریقہ اور ایشیا میں سفید اقوام کی معاشی دست برد کا شکار رہیں۔

روس میں اجتماعی تحریک کی کامیابی کے باعث البتہ حالات بالکل مختلف ہوگئے ہیں وہاں سرمایہ داری کا مطلق خاتمہ کر دیا گیا ہو بالشویکوں کو چاہے اپنے مقاصد میں مکمل کامیابی نہ ہوئی ہو لیکن یہ بات ضرور ہو کہ انھوں نے روس جیسے عظیم الشان ملک میں جہاں کی آبادی تقریباً اٹھارہ کروڑ ہو بیروزگاری کا بالکل خاتمہ کر دیا ہو وہاں اب ہر شخص کو کام میسر ہو اور ہر شخص کی احتیاجات زندگی پوری ہوتی ہیں بے شک وہ اس قدر آرام سے زندگی نہیں گزارتے جس قدر کہ اس کا ہمسایہ انگلستان اور جرمنی میں گزارتا ہو لیکن اب اس کو اپنے پیٹ کے لیے روٹی، اپنے جسم کے لیے کپڑے اور اچھے

تن کو چھپانے کے لیے مکان کی فکر نہیں ہے۔ اس معاشی تجربہ میں بہت خامیاں ہیں جس کے متعلق ہم بعد میں بحث کریں گے لیکن انسانوں کے معاشی مسئلہ کو حل کرنے کے لیے یہ سب سے عظیم انسانی تجربہ ہے جو بہت بڑی حد تک کامیاب بھی ہوا ہے۔

جرمنی اور اطالیہ میں اس معاشی مسئلہ کا ایک عجیب قسم کا حل پیش کیا ہے یہاں نہ نظام معیشت میں پوری طور پر اصول انفرادیت کو تسلیم کیا گیا ہے اور نہ اصول اجتماعیت کو۔ بیروزگاری کا انہوں نے خاتمہ کر دیا ہے لیکن سرمایہ داروں کا انہوں نے خاتمہ نہیں کیا ہے حکومت سرمایہ دار اور مزدوروں کے نمایندوں پر مشتمل ایک کمیٹی بناتی ہے جو تمام معاشی مسائل کا حل کرتی ہے۔ اس طریقہ سے ملک کی بیروزگاری کا تو خاتمہ ہو گیا ہے لیکن مزدوروں اور کسانوں کی زندگی کے معیار میں کوئی معتد بہ فرق نہیں پڑا ہے۔

دنیا کی پیدایش دولت چونکہ کسی نظام کے ماتحت نہیں ہوتی اس لیے اس کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ بعض چیزیں اس قدر افراط سے پیدا ہوتی ہیں کہ اس کی دنیا کو ضرورت نہیں رہتی ان چیزوں کی افراط کے باعث اس کی قیمت گھٹ جاتی ہے۔ ان قیمتوں کو مصنوعی طور پر باقی رکھنے کے لیے بالآخر ان چیزوں کو تباہ کر دیا جاتا ہے امریکہ میں اس طرح لاکھوں ٹن گیہوں اس وقت جلا دیا گیا جبکہ ہندوستان اور چین میں مخلوق خدا کے چند دانوں کے لیے ترس رہی تھی۔

دنیا میں چونکہ ایک سکہ رائج نہیں ہے اس لیے شرح مبادلہ کے باعث مفتوح ممالک کا کروڑوں روپیہ کا ہر سال نقصان ہوتا ہے۔ انگلش پونڈ سے ہندوستانی روپیہ کو وابستہ کر دیا گیا ہے اور وہ بھی اس طرح جس سے انگلستان کو تجارت میں فائدہ پہنچے اس کا نتیجہ ہو رہا ہے کہ انگلستان اور ہندوستان کی تجارت میں انگلستان بغیر کسی محنت کے کروڑہا روپیہ سالانہ وصول کر رہا ہے غرضکہ سکہ اور شرح مبادلہ کے باعث پس ماندہ اقوام اور بھی گھاٹے میں پڑ گئی ہیں۔

ہم نے اس وقت تک انسان کی معاشی زندگی کے خارجی مظاہرات پر صرف نظر ڈالی ہے لیکن اگر یہ دریافت کیا جائے کہ انسان کیوں ضرورت سے زائد دولت جمع کرتا ہے؛ وہ کیوں حصول دولت میں اپنے جسم، جان، عقل، اخلاق اور مذہب تک کو گنوا دیتا ہے، وہ کیوں اس کے لیے ہر قسم کا

[illegible] شقاوت قلبی کو روا رکھتا ہے؟ ان سوالات کے جوابات کے لیے ہم کو نفس انسانی [illegible] ہوگی ہمیں پتہ چلتا ہے کہ حصول دولت کا بعض افراد میں کچھ فطری جذبہ موجود ہے وہ [illegible] سب سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں اسی جذبہ کے باعث وہ اس کے حصول کے لیے ہر قسم [illegible] کرتے ہیں تکلیفیں اٹھاتے ہیں ذلتیں سہتے ہیں۔ ہر قسم کے مکر و فریب سے کام لیتے ہیں، اخلاق [illegible] کو قربان کرتے ہیں مگر ہر طرح ملکیت کے اس جذبہ کی بالآخر تسکین کرتے ہیں یہ جذبہ انسان [illegible] میں اس وقت سے چلا آرہا ہے جب وہ محض ایک کاشتکار رہتا کا شتکار کو اپنی زمین، اپنا گھر، اپنے آلات بہت زیادہ عزیز ہوتے ہیں۔ ان پر ہر وقت قبضہ رکھنا چاہتا ہے ملکیت کا جذبہ اس میں [illegible] طور پر ہوتا ہے۔ اسی جذبہ کا اظہار جب دوسرے معاشی شعبوں مثلاً تجارت یا صنعت و حرفت میں [illegible] وہ معاشی تعصب کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ ضرورت سے زائد حصول دولت کے اس جذبہ [illegible] طور پر اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ بیشتر انسان اس وقت تک اس نفسیاتی بناوٹ سے آزاد نہیں ہوئے ہیں جو ایک کاشتکار کی مخصوص علامت ہے پھر چونکہ انسانیت کے بیشتر افراد اسی جذبہ سے معمور [illegible] کی ہر کامیابی کو بھی اسی مال و دولت کے اجتماعی معیار پر جانچا جاتا ہے اس دنیا میں وہ زیادہ کامیاب انسان ہے جو زیادہ دولت مند ہو چاہے یہ دولت اس نے ہر قسم کی اخلاقی قیود سے آزاد [illegible] کر حاصل کی ہو انسان اس کو پوجتے ہیں جس کے پاس زیادہ سیم و زر ہو چاہے وہ خود ان انسانوں کو [illegible] کت کے غار ہی میں کیوں نہ دھکیل دے اخلاقی محرکات سے زیادہ دولت انسانی زندگی میں [illegible] اثر رکھتی ہے۔ اور یہ انسانی زندگی کے انتشار کی بڑی علامت ہے سیاسی وقار، سماجی عزت و احترام بہت بڑی حد تک آج کل دولت کے ذریعہ خریدا جا سکتا ہے حکومتیں آج اہل زر کے قبضہ میں ہیں نہ صرف ملکوں، قوموں بلکہ انسانیت کی قسمت کا فیصلہ بھی یہی اہل زر کر رہے ہیں لندن اور نیویارک کے یہودی تاجران ملکوں کی سیاسی پالیسی میں بہت حد تک دخل انداز ہیں ہندوستان۔ کے مارواڑیوں کا اپنی دولت کے باعث ملکی معاملات میں کچھ کم اثر نہیں ہے۔

مختصر یہ کہ بعض جگہ انسان کی معاشی زندگی میں ضرور کچھ نہ کچھ ظلم پایا جاتا ہے بعض جگہ

اجتماعی تحریکات کے باعث اس معاشی زندگی کی اصلاح بھی ہوئی ہو لیکن بحیثیت مجموعی انسانیت کا کوئی معاشی نظام نہیں ہے اس میں کوئی نظم و ترتیب نہیں ہے اس کا کوئی پرزہ دوسرے پرزے سے جڑا ہوا نہیں ہے اس لیے انسانیت کا بیشتر حصہ فقر و فاقہ میں مبتلا ہے اور اس کی زندگی کی احتیاجات بھی پوری نہیں ہو رہی ہیں۔

(۴)

اقوام کی قومی زندگی پر نظر ڈالی جائے تو وہ بھی زیادہ تسلی بخش دکھائی نہیں دیتی تقریباً تمام ملکوں میں غریبوں اور امیروں میں ایک کش مکش جاری ہے امرا کو اپنی دولت کے باعث اقتدار حاصل ہے وہ اپنی دولت کے باعث حکومتوں پر قابض ہیں اور اپنے طبقہ کے مفاد کی حفاظت کے لیے ہر قسم قوانین بناتے رہتے ہیں جن ملکوں میں غربا کو اپنی حالت کا احساس نہیں ہے وہ خاموشی سے اس تمام ظلم و ستم کو برداشت کرتے ہیں لیکن اب ایسے بہت ہی کم ممالک ہیں جہاں غریبوں کو اپنی حالت کا احساس نہ پیدا ہو گیا ہو انقلاب روس نے تو یہ احساس نہایت شدت کے ساتھ دنیا کے مزدوروں اور کسانوں میں پیدا کر دیا ہے۔

ہندوستان میں غریبوں کی یہ تحریک برابر زوروں پر ہے مختلف جماعتیں ان کے حقوق کی حفاظت اور نمائندگی کے لیے کھڑی ہو گئی ہیں کانگریس ٹریڈ یونین اور کسان سبھائیں اس کام کو انجام دے رہی ہیں چین میں بھی اشتراکی پارٹی اور مرکزی حکومت کے تعلقات اچھے نہیں ہیں گو کہ وہ جاپانی شہنشاہیت کے مقابلہ میں فی الحال متحد ہو گئے ہیں عالم اسلام یعنی عرب، ترکی اور ایران میں اس وقت کوئی واضح اشتراکی تحریک موجود نہیں لیکن شعرا اور ادبا کے دلوں کو غربت اور فلاکت نے متاثر کر دیا ہے اور غالباً وہاں بھی یہ مسائل بہت جلد قومی زندگی کے اہم ترین مسائل بن جائیں گے۔ یورپ میں مزدوروں کی غربت کافی زور پکڑ چکی ہے اور روس میں تو یہ کامیابی حاصل کر چکی ہے نئی دنیا اور امریکہ میں امرا کا بڑا اثر ہے لیکن وہاں بھی اب اشتراکی تحریک پیدا ہو گئی ہے اور حبشی تو برابر اپنے حق کے لیے جد و جہد کر رہا ہے افریقہ کی سیاہ اقوام تعلیم و تمدن میں اس قدر پست ہیں کہ ابھی ان میں سے اچھی

احساس ہے اور نہ اپنی غرت کا اس لیے امید نہیں ہو کہ ایک عرصہ تک ان میں کوئی تحریک پیدا ہو سکے۔

امیروں اور غریبوں کی اس باہمی خلیج کے باعث ہر جگہ قومی زندگی میں ایک انتشار پیدا ہو گیا ہے ایک کش مکش ہے جو برابر جاری ہے اور قومیں بجائے متحدہ طور پر انسانی بہبودی کے لیے تخلیقی کام کرنے کے آپس ہی کی لامتناہی جنگ میں اپنی طاقت صرف کر رہی ہیں

قوموں کے سامنے بحیثیت مجموعی انسانی فلاح و بہبود کا کوئی نصب العین نہیں ہے وہ خود صرف اپنی قومی زندگی اور اس کے مفاد ہی کو سب سے اعلیٰ نصب العین تصور کرتی ہیں ہر قوم خود کو دنیا کی سب سے بہتر قوم سمجھتی ہے۔ جرمن سمجھتے ہیں کہ وہ دنیا کی سب سے بہتر قوم ہیں اس لیے انہیں دنیا پر چھا جانا چاہیے انھیں جرمن کلچر کو تمام دنیا پر جاری کر دینا چاہیے انگریز سمجھتے ہیں کہ تمام دنیا کی بادشاہت [redacted] ان کا موروثی حق ہے جس کا اظہار اس قومی گیت میں ہوا ہو کہ

[redacted] برطانیہ لہروں پر حکومت کرتا ہے۔

جاپان کا خیال ہے کہ وہ فطری طور پر مشرق کا راہ نما ہے اس لیے مشرق کو اس کا تابع فرمان ہونا چاہیے پھر اس قومی تفوق کے خیال کے ساتھ نسلی تحریک کے باعث اب نسلی برتری کا خیال بھی شامل ہو گیا ہے۔ ہٹلر اور اس کے ساتھی [redacted] اعلیٰ اور برگزیدہ قوم آریہ ہے جرمن قوم چونکہ آریہ ہے اس لیے وہ بھی سب سے اعلیٰ قوم ہے۔

آج کل جس قومیت کا یورپ [redacted] روسو اور فشٹے کی اخلاقی قومیت نہیں ہے جس کا مقصد یہ تھا کہ قومیں آزاد طریقہ پر اپنے مادی نفسی اور اخلاقی قوتوں کی اس طرح ترقی کریں کہ وہ انسانیت کے لیے مفید ثابت ہوں بلکہ اس قومیت کا دور دورہ ہے جس کا امام میکاؤلی تھا میکاؤلی نے اقوام کو سکھایا کہ سب سے اعلیٰ مقصد خود غرضی ہے اور اس خود غرضانہ مقاصد کے حصول کے لیے ہر قسم کے اخلاقی اور غیر اخلاقی ذرائع کو اختیار کرنا عین اخلاق ہے انسانیت بحیثیت مجموعی کوئی وجود نہیں رکھتی بلکہ صرف اقوام کا وجود ہے ان اقوام کو اپنا مفاد حاصل کرنے کے لیے اگر انسانیت کی دھجیاں

بھی اُڑانا پڑیں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے

اس قومی تفوق اور نسلی برتری کے خیال نے اقوام میں شہنشاہیت کا جذبہ پیدا کر دیا ہے ہر قوم تمام کرۂ ارضی کو اپنے قبضہ و تسلط میں دیکھنا چاہتی ہے جس کا نتیجہ آج کل کی ہیبت ناک جنگ کی شکل میں ظاہر ہو رہا ہے برطانیہ اور فرانس نے آج سے دو صدی قبل ہی دنیا کے اکثر حصوں پر قبضہ کر لیا تھا چنانچہ آسٹریلیا، نیوزیلینڈ، ہندوستان، جنوبی افریقہ، کنیڈا، مصر وغیرہ سب انگریزوں کے زیر فرمان ہیں اور اب تو اس میں فلسطین، شام، عراق، اور ایران کا بھی اضافہ ہو گیا ہے اسی طرح مراکش، ٹیونس، چینی ہند وغیرہ پر فرانس کا تسلط ہو گیا تھا۔ جرمنی اور اٹلی میں قومی حکومتیں انگلستان اور فرانس کے بعد قائم ہوئیں اور ان میں شہنشاہیت کا جذبہ بھی ان اقوام کے بعد ہی پیدا ہوا لیکن یہ نوجوان قومیں اب اسی قدر طاقتور ہو چکی ہیں جس قدر کہ پرانی اقوام اس لیے اب وہ دنیا کی اس لوٹ میں اپنا بھی حصہ طلب کر رہی ہیں جاپان مشرقی قوم ہونے کے باوجود بھی مغربی اقوام سے مشرق پر قبضہ حاصل کرنے میں پیچھے رہ گیا تھا اس لیے اب وہ اس کمی کو پورا کرنا چاہتا ہے غرضکہ شہنشاہیت کے جذبہ نے دنیا کی ان طاقتور قوموں کو ایک دوسرے سے دست وگریباں کر دیا ہے اور انسانیت کی قسمت کو تاریک بنا دیا ہے۔

مشرقی اقوام خصوصاً ہندوستان اور اسلامی قومیں آج کل اسی شہنشاہیت کا شکار ہیں۔ مراکش پر اسپین قابض ہے تو ٹیونس پر فرانس، طرابلس پر اٹلی کا قبضہ ہے تو مصر و فلسطین پر انگریز مسلط۔ اس کے علاوہ شام، عراق اور ایران پر انگریزوں نے دوبارہ قبضہ کر لیا ہے چین کے بڑے بڑے حصوں کو جاپان نے ہضم کر لیا ہے۔ اور مغرب کی بیشتر قومیں اب جرمنی کی تابع فرمان ہو چکی ہیں۔ مشرقی اقوام بیشتر کمزور ہیں اس لیے وہ خود اپنی بھی مدافعت نہیں کر سکتی ہیں صرف ترکی ایک طاقتور قوم ہے جو اب تک جرمنی اور انگلستان کے درمیان خود کو بچائے ہوئے ہے اور دنیا کو امن کا سبق دے رہا ہے لیکن ترکی بھی اپنی اس غیر جانبداری کو کب تک ان دو حریفوں کے درمیان بچا سکے گا یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا فیصلہ صرف مستقبل ہی کر سکتا ہے جن مشرقی اقوام نے کسی قدر اپنی آزادی کو محفوظ رکھا ہے۔

مثلاً چین، ترکی انھوں نے بہت حد تک یورپ کی تقلید کی ہے اور انھیں سے وہ سبق سیکھا ہے جس کے [illegible] اب تک کسی قدر آزاد ہیں۔

[illegible] کی داخلی زندگی پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہاں طبقاتی جنگ جاری ہے اور ان کی بین الاقوامی زندگی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں ایک عجیب خلفشار ہے کوئی بین الاقوامی [illegible] موجود نہیں ہے اور اگر کسی قدر ادھورا سا موجود بھی ہے تو اس کی کوئی قوم پروا نہیں کرتی جمعیۃ الاقوام [illegible] گذشتہ جنگ عظیم کے بعد قائم ہوئی تھی اس نے خود اپنے آپ کو ہلاک کر لیا ہے اس کے بانی پریزیڈنٹ [illegible]ن چاہے کسی قدر بھی نیک نیت کیوں نہ ہوں لیکن پرانی دنیا کے سیاستدانوں لائڈ جارج اور کلیمنشو کے سامنے ان کی کچھ بھی نہ چل سکی جمعیۃ الاقوام بجائے اس کے کہ صحیح معنوں میں جمعیۃ الاقوام ہوتی جو مساوی [illegible]در پر سب کے ساتھ سلوک کرتی بڑی طاقتوں اور یعنی برطانیہ اور فرانس کا آلہ کار ہو کر رہ گئی امریکہ خود اس سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور بالآخر جرمنی، جاپان اور اطالیہ بھی اس سے علیحدہ ہو گئے [illegible] اطالیہ نے حبش پر حملہ کیا تو وہ خاموش رہی جاپان نے جب چین کو ہضم کرنا شروع کیا تو اسے جنبش نہ ہوئی بھلا ایسی جمعیۃ الاقوام کی پھر کس طرح دنیا کی نظروں میں عزت ہوتی اس لیے وہ ختم ہو گئی ایک بین الاقوامی ادارہ کا جو تمام اقوام سے برتر ہو [illegible] تصور پیش کیا لیکن دنیا کی نفسی حالت ابھی اس قابل نہ تھی کہ اس تصور کو قبول کرے پھر بڑی طاقتوں نے جو اس پر حاوی تھیں کبھی بھی اس [illegible] معنوں میں ایک انصاف پسند جمعیۃ نہ ہونے دیا۔

قومی زندگی میں معاشی کشمکش کیوں ہے، اس میں مختلف طبقات کیوں موجود ہیں؟ اس کی نفسیاتی تشریح ہم گزشتہ فصل میں بتا چکے ہیں ہم نے کہا تھا کہ [illegible] بیشتر کاشتکار تھی اور زمین کی کاشت کے ساتھ ملکیت کا جذبہ لازمی طور پر وابستہ ہوتا ہے اسی باعث ملکیت اور حصول دولت کا جذبہ جبلی طور پر انسانوں میں پایا جاتا ہے اور اسی جذبہ کی زیادتی کے باعث سرمایہ داری پیدا ہوتی ہے بعینہ جارحانہ قومیت اور شہنشاہیت کی بھی ایک نفسیاتی تشریح ہے وہ یہ کہ انسان اوائل ایام میں شکاری بھی تھا۔ وہ جانوروں کو مارتا اور اپنا پیٹ بھرتا تھا شکاری کسان کے مقابلہ میں کم کام

کرتا تھا وہ کسی خاص ماحول اور زمین سے اس قدر وابستہ نہ تھا اس میں زیادہ جرأت اور ہمت پائی جاتی تھی یہ اپنے لیے رزق زیادہ محنت سے نہیں بلکہ اپنی ہوشیاری، چالاکی اور بہادری سے کمایا کرتا تھا۔ یہ طبقہ تعداد میں اس قدر زیادہ نہ تھا جس قدر کاشتکار۔ شکار کی یہ جبلت اب تک بعض انسانوں میں پائی جاتی ہے۔ یہ لوگ اپنی بہادری اور چالاکی سے دوسرے انسانوں پر حاکم ہو جاتے ہیں اور اُن کو اپنے لیے کام کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ جدید حکومتوں میں یہ لوگ حکومت کے ارباب عمل و عقد بن جاتے ہیں اور اپنے اقتدار اور اعزاز کی خواہشوں کو پورا کرنے کے لیے قوموں اور ملکوں کو جنگ میں دھکیل دیتے ہیں غرضکہ شہنشاہیت کا نمایندہ انسانوں کا وہ طبقہ ہے جو نفسیاتی اعتبار سے اب تک شکاری ہے البتہ اب یہ شکار صرف جانوروں تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کو بے گناہ اور مظلوم انسانوں تک وسیع کر دیا گیا ہے۔

جارحانہ قومیت جس کا لازمی نتیجہ شہنشاہیت ہوتا ہے انسانیت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اس جذبہ نے مغربی اقوام میں مذہب، اخلاق اور انسانیت کے تمام محرکات کو کمزور کر کے اپنا تسلط جما لیا ہے۔ شہنشاہیت کے جذبہ کی سب سے بڑی اقوام عہد جدید میں فرانس اور برطانیہ ہیں فسطائیت بھی جارحانہ قومیت ہی کا [illegible] نسلی برتری کا خیال قومی برتری کے خیال سے ساتھ آکر مل گیا ہے یہ تحریک انسانیت کی راہ میں بڑی رکاوٹ ہے کیونکہ انسانوں اور قوموں کی مساویانہ حیثیت تسلیم نہیں کرتی اس تحریک کے سب سے بڑے نمایندے جرمنی، اطالیہ اور جاپان میں شہنشاہیت اور فسطائیت نے غرضکہ انسانیت کو پارہ پارہ کر دیا ہے اور انسان کی بین الاقوامی زندگی میں وہ انتشار پیدا کر دیا ہے جس کا رفع ہونا بہت ہی مشکل نظر آتا ہے۔ روس نے اپنی نئی زندگی کی ابتدا ایک بین الاقوامی نصب العین سے کی تھی مگر اسٹالن کے زمانہ میں بہت جلد اس نے بھی ایک قومی رنگ اختیار کر لیا اور اس جنگ میں پولینڈ پر قبضہ کر کے اور فنلینڈ پر چڑھائی کر کے یہ ثابت کر دیا کہ وہ بھی دوسری جارحانہ اقوام سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔

(۹)

انسان کی معاشی اور سیاسی زندگی کے علاوہ اگر ہم اس کی تعلیمی، ادبی، اخلاقی اور مذہبی زندگی

[illegible] نظر ڈالیں تو وہاں بھی ہمیں ایک عجیب قسم کا خلفشار، ایک عجیب قسم کی بے ہنگامی دکھائی دیتی ہے۔ جن معنوں میں ہم انسان کی تعلیمی، ادبی، سیاسی، اخلاقی اور مذہبی زندگی کو اس کی تعلیمی زندگی سے تعبیر کر سکتے ہیں اس تعلیمی زندگی کا نمائندہ معلم ہے۔ معلم بھی اس وقت اسی خلفشار میں پھنسا ہوا ہے جس میں کہ عام طور پر تمام انسانیت پھنسی ہے لیکن نئی زندگی کے جو کچھ بھی آثار دکھائی دیتے ہیں اس کی بہر حال نمائندہ بھی معلم کی ذات ہے اور انسانیت کے مستقبل کی اگر کوئی رہنمائی کر سکتا ہے تو وہ صرف معلم ہے۔ معلم سے ہمارا مفہوم صرف وہ مدرس نہیں ہیں جو مدرسوں کے بچوں کی تعلیم و تربیت کرتے ہیں بلکہ اس تصور میں تمام مدرسین قانون داں، معلمین اخلاق، قومی راہنما اور مذہبی پیشوا اور پیغمبر شامل ہیں۔ انسانیت کی عہد طفلی ہی سے معلم کا شکار اور شکاری کے دوش بدوش زندگی کی جولانگاہ میں مصروف عمل رہا ہے ہندوستان میں برہمن اس کام کو انجام دیتا رہا یونان میں بھی پریسٹ طبقہ موجود رہا افلاطون نے اپنی مشہور عالم کتاب 'جمہوریت' میں فلاسفر کہا اور اس نے یہ خیال پیش کیا کہ اگر حکومت اس طبقہ کے سپرد کر دی جائے تو تمام نظام سلطنت بہترین ہو سکتا ہے رومن کلیسا نے تو پادریوں کے ایک علیحدہ مستقل وجود کو تسلیم کر کے مذہبی راہنمائی کا کام کلیتاً ان کے سپرد کر دیا بہر حال پادری، پریسٹ، برہمن اور معلم کی نفسیاتی ساخت ایک ہی ہے اور یہ ہمیشہ سے انسانیت کی راہبری کا کام انجام دے رہے ہیں تعلیم و تربیت کا یہ جذبہ بھی بعض انسانوں کو اپنے آباؤ اجداد سے وراثتاً ملا ہے اس لیے ان میں اس کام کے لیے نفسیاتی صلاحیت پائی جاتی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اگر اصلاح انسانیت کی [illegible] ہو سکتی ہے تو وہ [illegible] ہی طبقہ ہے لیکن اس کی حالت بھی آج قابل اطمینان نہیں ہے۔

انسانیت کے تعلیمی نظاموں پر اگر نظر ڈالی جائے تو جو چیز سب سے نمایاں نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ انسانی تعلیم کا آج کل کوئی معینہ اور واضح مقصد ہی موجود نہیں ہے مختلف قومیں اپنے قومی حدود و مقاصد نسلی برتری، معاشی اور سیاسی اغراض وغیرہ کے لیے تعلیم دیتی ہیں لیکن بحیثیت مجموعی انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے کوئی بھی تعلیم نہیں دیتا ہر قوم اپنے بچوں کو اس لیے تعلیم دیتی ہے کہ وہ ایک اچھا انگریز

جرمن، جاپانی جیسی بنے لیکن کوئی قوم اپنے بچوں کو اس بے تعلیم نہیں دیتی کہ وہ ایک اچھا انسان بنے۔ دنیا میں آج کل ہر مقصد کے لیے انسان کی تربیت کی جا رہی ہو حتیٰ کہ اسے جوان بنانے کے لیے بھی لیکن اگر اس کی کسی چیز کے لیے تربیت نہیں کی جا رہی ہو تو وہ یہ ہو کہ وہ انسان بنے انسانیت کا ایک واضح مقصد نہ ہونے کے باعث اس کے تعلیمی مقصد میں بھی ایک عجیب انتشار پایا جاتا ہو انسان کے جسمانی، ذہنی، جمالی اخلاقی اور مذہبی قویٰ کی ہم آہنگ ترمیت نہیں ہو رہی ہو بلکہ بعض جگہ انسان کے صرف جسمانی قویٰ کی تربیت پر زور دیا جا رہا ہو تو بعض جگہ صرف اس کی ذہنی تربیت اس کی تمام دیگر صلاحیتوں کو قربان کرکے کی جا رہی ہو پھر ذہنی تربیت بھی صحیح معنوں میں عقلی قویٰ کی مکمل نشو ونما نہیں ہو بلکہ اس کی نشو ونما ہزاروں تعصبات کی بنیاد پر ہو رہی ہو عقل کے ذریعہ ان تعصبات کو ابھارا جاتا ہو جن کو تباہ کرنا دراصل عقل کا سب سے اول ترین مقصد ہونا چاہیے مثلاً عقل ہزار مرتبہ مابعد الطبیعاتی مسائل کے حل کرنے میں اپنی بے چارگی و درماندگی کو تسلیم کر چکی ہو لیکن آج تک بھی عقل کی مطلق نشو ونما کا یہی مقصد عام طور پر سمجھا جاتا ہو کہ وہ ان تمام مابعد الطبیعاتی مسائل کو حل کرے اور صرف اسی کی کسوٹی پر ان مسائل کی نفی یا اثبات کیا جاتا ہے۔

اخلاقی تعلیم کا اثر آج کل کے نظامات تعلیم میں بہت کم ہو گیا ہو۔ ذہنی تعلیم پر جس قدر زور دیا جاتا ہو اس کی عشر عشیر بھی توجہ اخلاقی تعلیم پر نہیں دی جاتی آج کل کی مغربی نسلیں عموماً ذہنی اعتبار سے کافی بلند ہیں لیکن اخلاقی اعتبار سے بہت گھٹیا درجہ کی ہیں مشرقی نسلیں ذہنی اعتبار سے بھی کم تر ہیں اور اخلاقی اعتبار میں بھی فروتر ہیں گو کہ اخلاق کے بلند بانگ دعوے ان کی زبانوں پر اپنے مغربی بھائیوں کی بہ نسبت زیادہ پائے جاتے ہیں۔

مدرسوں میں ضرورت سے زیادہ انسان کی انفرادی زندگی پر زور دیا جاتا ہو اس کو بہت حد تک خود غرضی، مطلب پرستی اور انسان دشمنی کی تعلیم دی جاتی ہو اس کو یہ سکھایا جاتا ہو کہ وہ ہر طریقہ سے دنیا میں مادی کامیابی کرے چاہے اس کامیابی کے حصول میں اسے کوئی طریقہ ہی کیوں نہ اختیار کرنا پڑے پھر چونکہ سماج میں انسان کی اصل ذہنی اخلاقی اور روحانی صلاحیت کی قدر نہیں کی جاتی بلکہ

صرف مادی کامیابی کی توقع کی جاتی ہے اس لیے مدارس اس معاملہ میں اور بھی لاچار ہیں وہ سوائے اس کے اور کیا کرسکتے ہیں کہ اپنے بچوں کو بھی اسی معیار پر پورا اتارنے کی کوشش کریں جو معیار کہ سوسائٹی اُن سے طلب کرتی ہے مدارس بہرحال اپنے آپ کو کلیتاً اپنے سماجی ماحول سے آزاد نہیں کرسکتے جب تک سماج میں بھی تبدیلی پیدا نہ ہو مدارس میں مکمل تبدیلی ہونا ممکن ہے غرضکہ مدرسے اور سماج عملاً اس کی تعلیم نہیں دیتے کہ وہ ایک دوسرے کے بھائی ہیں بلکہ انہیں سکھاتی ہے کہ وہ ایک دوسرے کے حریف ہیں وہ انہیں آپس میں اشتراک اور تعاون کی تعلیم نہیں دیتا بلکہ ایک دوسرے کے گلے کاٹنے کا سبق دیتا ہے محبت، الفت، اخوت اور انسانیت کے جذبات ابھارنے کی بجائے عموماً نفرت، عداوت، رقابت [illegible]نیت کے جذبات کو ابھارا جاتا ہے۔ مغرور مغربی اقوام تو اپنے بچوں کو یہ سکھاتی ہیں کہ دنیا کی دوسری اقوام متلاصثی یا مشرقی اقوام کمتر درجہ کی ہیں ہندوستان کے برہمنوں میں بھی غرور و نخوت کا مادہ کچھ کم نہیں پایا جاتا جو خود کو دنیا کی [illegible] برگزیدہ قوم تصور کرتے ہیں اور دوسروں کو [illegible] خیال کرتے ہیں یہ برہمن خود برہما کے منہ سے پیدا ہوئے ہیں اس لیے مقدس ہیں، ان کا مقدس جسم نیچ انسانوں کے سایہ پڑنے سے بھی ناپاک ہو جاتا ہے [illegible] اخوت انسانی [illegible] سے زیادہ حائل ہیں ہندوستان میں کروڑہا اچھوت اس نسلی برتری کا شکار رہیں اور ہزارہا برس سے نہایت ذلت کی زندگی گزار رہے ہیں انہیں اس [illegible] ہیں وہ پبلک کنوؤں پر پانی نہیں بھر سکتے، وہ مدارس میں شریک نہیں ہوسکتے وہ مندروں میں داخل نہیں ہوسکتے ان کی جھولی میں باسی روٹی کا ٹکڑا دور سے ڈالا جاتا ہے [illegible] انسانیت کے اخلاقی نصب العین پر اس سے زیادہ [illegible] کاری لگائی جاسکتی ہے

ان تمام اخلاقی بیماریوں کے علاوہ انفرادی اخلاقی برائیاں بھی آج کل کچھ کم نہیں پائی جاتی ہیں جھوٹ، مکر، دغا، فریب، ریاکاری، جاہ پرستی، حب دولت، حسد، بغض، کینہ وغیرہ جیسی مہلک بیماریاں انسانیت کے جسم میں گھن کی طرح لگ گئی ہیں اور اندر ہی اندر اسے کھوکھلا کر رہی ہیں

انسان کی جمالی دنیا میں بھی اسی قسم کا خلفشار پایا جاتا ہے ذوق حسن اور احساس جمال کی جگہ بوالہوسی

اور شہوت پرستی نے لے لی ہے۔

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی   اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی

سینما، تھیٹر، رقص خانوں اور عام طور پر شہوت انگیز مناظر نے تو مغربی زندگی کو حیوانیت کی حد پر لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ مشرق کی زندگی بھی کچھ مغرب سے بہتر نہیں ہے وہاں جو مناظر برسرِ عام ہیں یہاں وہ ریاکاری کے پردے میں چھپے ہوئے ہیں جنسی آزادی کے باعث وہاں یہ تعلقات فطری ہیں لیکن پردہ اور سخت سماجی پابندیوں کے باعث ان تعلقات کا اظہار مشرق میں غیر فطری اعمال میں بھی بکثرت ہوتا ہے۔ ایرانی اور اردو شاعری نے تو ان غیر فطری جذبات کو شاعرانہ رنگ دے کر اور بھی پروان چڑھایا

انسان کی اس سوقی شہوانی زندگی کا اظہار آج کل اس کی شاعری و ادب کے علاوہ اس کی دیگر جمالی تخیلات میں بھی ہو رہا ہے مثلاً یورپ میں اب بیتھوون اور باخ کی روحانی موسیقی کی جگہ جاز کی حبشی موسیقی مقبول ہو رہی ہے۔ امریکہ اور انگلستان کی موسیقی کا مذاق بہت ہی پست ہو گیا ہے ہندوستان میں بھی عموماً اعلیٰ روحانی موسیقی کی بجائے وہ غزلیں پسند کی جاتی ہیں جن میں کسی قسم کی عمدہ روحانی جذبات کا اظہار نہ ہو بلکہ صرف عشق و عاشق کے شہوانی پہلو کا رنگین نقشہ کھینچا گیا ہو۔ غالب اور اقبال باوجود اپنی عظمت کے اس قدر مقبول نہیں ہیں جس قدر کہ داغ اور دیگر اہل تغزل۔

مغرب میں جدید مصوری بھی پست سطح پر اتر گئی ہے عہد متوسط کی مصوری جو ایک اعلیٰ اخلاقی اور روحانی نصب العین کی نمائندہ تھی اب مقبول نہیں ہے بلکہ اس کی جگہ اب اس مصوری نے لے لی ہے جو انسان کے سفلی جذبات کو پیش کرتی ہے ٹیگور اسکول کی مصوری باوجود اس ملک کی تخلیق ہونے کے بھی یہاں اس قدر مقبول نہیں ہے جس قدر کہ وہ تصاویر جو انسان کے مادی حسن کو پیش کر کے اس کے شہوانی جذبات کو برانگیختہ کرتی ہیں

تمدنِ انسانی کے انتشار کا لیکن سب سے بڑا اظہار اس کی مذہبی زندگی کی تخریب میں ہوا ہے آج کل عموماً انسانیت کے پیش نظر کوئی ایسا بلند و بالا نصب العین موجود نہیں ہے جو اس کی زندگی کے مختلف شعبوں کو مربوط و ہم آہنگ کر کے اس کو ایک معنی اور مقصد دے سکے انسانیت ایسا دہ روحانی نصب العین

تحریک پیوند اس کو نہ صرف اس دنیا سے بلکہ کل کائنات سے وابستہ کرتا ہے ایک دور دہریت عام طور پر دنیا میں پھیل رہی ہے خدا کے وجود پر لوگوں کو بہت کم یقین رہا ہے

روس کی اشتراکی تحریک تو کھلم کھلا ایک مادی تحریک ہے جو نہ کائنات کے کسی روحانی نظام پر یقین رکھتی ہے اور نہ کسی خالق کائنات کو تسلیم کرتی ہے اشتراکیت کا حکومت پر قبضہ ہونے کے باعث وہ حکومت کی مدد سے بھی اپنے ان دہریانہ خیالات کو تمام نسلوں میں جاگزیں کر رہی ہے وہاں ایک اینٹی گاڈ یعنی خدا دشمن سوسائٹی قائم ہے جو اپنے خیالات کی تبلیغ میں حد درجہ سرگرم ہے اور حکومت اس سوسائٹی کی پوری مدد کرتی ہے یورپ کی دوسری اقوام میں مثلاً جرمنی اطالیہ، برطانیہ اور امریکہ میں خدا کی ذات سے انکار تو نہیں کیا جاتا لیکن وہاں خدا سے بھی زائد قوم کی پرستش کی جاتی ہے صحیح مذہب کو جسے انسانیت کے نصب العین کا حامل ہونا چاہیے قومی سیاست کا تابع فرمان بنا لیا گیا ہے اور اسے سرمایہ دارانہ اور ناجائز قومی اغراض کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جاپان میں تو مذہب نے ایک عجیب قسم کی جارحانہ قومی شکل اختیار کر لی ہے وہاں کے بادشاہ کو نہ صرف خدا کا نمائندہ بلکہ تقریباً خدا تسلیم کیا جاتا ہے اس کے احکامات کی بلا چون و چرا اطاعت کی جاتی ہے اس اندھے یقین کی بنا پر جاپانیوں میں حد درجہ قومیت کا جذبہ پیدا ہو گیا ہے ان کا یہ جذبہ ایک انسانی نصب العین کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ ہے۔

ہندوستان میں مذہبی جذبہ بہت زیادہ پایا جاتا ہے لیکن اس جذبہ نے یہاں ایک غلط راہ اختیار کر لی ہے بجائے اس کے کہ وہ باہم انسانوں کو متحد کرے جو دراصل مذہب کا مقصد ہے یہاں اس کے غلط تصور کے باعث لوگوں میں تعصب پیدا ہو گیا ہے اس تعصب اور کوتاہ نظری کے باعث یہاں ہندوؤں اور مسلمانوں میں آئے دن فسادات ہوتے رہتے ہیں دیگر اسلامی ممالک مثلاً ایران اور ترکی وغیرہ یورپ سے بہت کافی متاثر ہو چکے ہیں اور غلط مذہبی تصور کے برخلاف وہاں اس قدر ردعمل ہوا ہے کہ مذہب کے صحیح تصور کا بھی اثر کم ہو رہا ہے۔

(۷)

تمدن انسانی پر ہم نے جو ایک سرسری نظر ڈالی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی معاشی زندگی ہر